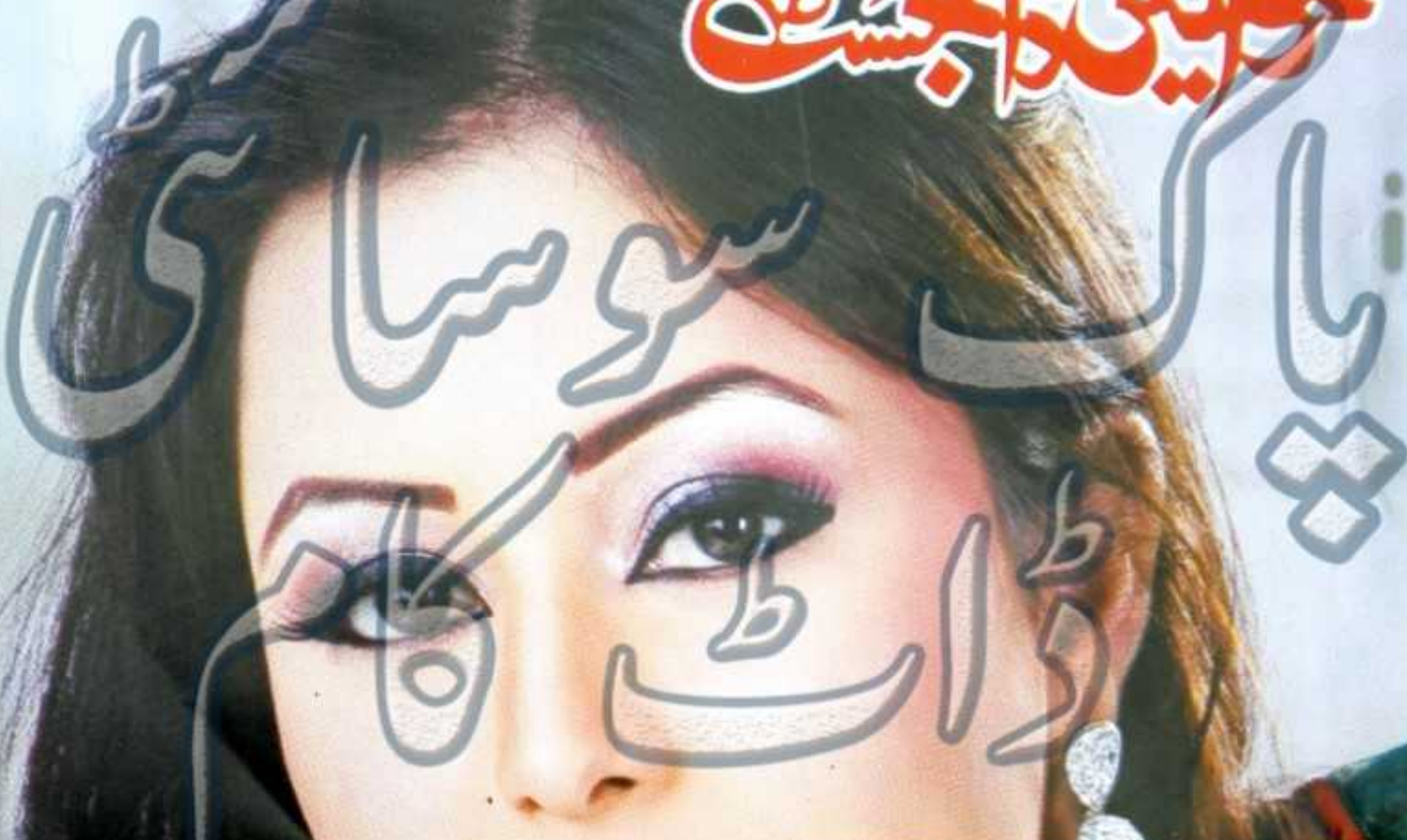


نومبر 2015

WWW.PAKSOCIETY.COM

خواتین اور دو شیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا

خواتین کی سب سے



READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING Section



خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

رکن آل پاکستان نوز پبلسٹرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نوز پبلسٹرز
MEMBER
APNS
CPNE

نومبر 2015

جلد 43 نمبر 7

قیمت 60 روپے

بانی و مدیر اعلیٰ — محمود ریاض

مدیر — نگارہ خاتون

مدیر — آذر ریاض

نائب مدیر — رضیہ جمیل

مدیر خصوصی — امت الصبور

بلقیس بھٹی

نفسیات — عدنان

رشتہ رات — خالد جیلانی

ترجمہ سالانہ بیک کیئر جگتوری

پاکستان (سالانہ) — 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ — 6000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا — 7000 روپے



READING
Section

	مکمل ناول		14	مسیر	کہنی و سنتی
110	نمرا احمد	نمرا	15	ادارہ	کرن کرن روتی
114	امتہ العزیز شہزاد	شہزاد شوب	268	نادرہ خاتون	ہمارے نام
	ناولٹ			آپ سے کیا پردہ	
80	صدف رحمان	مثل ماہتاب	20	دو اسے حوالات میں	انشاجی
192	ملیحہ صدیقی	ادراک کالمی		خاتون کی ڈائری	
	افسانے		264	میری ڈائری سے	امت (الصبور)
67	حنایا سمین	ہم کہاں کے عقل مند		مجھ سے ملے	
74	ہاجرہ رحمان	فریب	276	گوہر رشید	شایین رشید
106	عتیقہ محمدیگ	دروازہ		انٹرویو	
186	نور فاطمہ	عہد		اعجاز کارنگ	امت (الصبور)
162	عمارہ خان	صاف گو	29	اقبال بانو	شایین رشید
250	صدف آصف	ارزوںے محبت	23	خامشی کوزباں ملے	ادارہ
	نظمیں غزلیں		32	ناول	
260	علامہ اقبال	غزل		آب حیات	عمیرہ احمد
259	فرحت عباس شاہ	نظم	36	بن مانگی دعا	عفت سحر طاہر
260	شکیل بدایونی	غزل	164		
259	امجد اسلام امجد	نظم			

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعل اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت و دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

READING
Section



284 خالہ جیلانی 'موسم کے پکوان'
282 نبیلہ گل زار احمد 'آپ کا باورچی خانہ'



290 بیوٹی بکس کے مشورے، امت الصیور



261 شگفتہ جاہ 'رزگارنگ سلسلہ'
280 واصفہ سہیل 'خبریں و خبریں'



266 خالہ جیلانی 'آپ کی بیاض سے'



287 عدنان 'نفسیاتی ازدواجی الجھنیں'
290 بیوٹی بکس کے مشورے، امت الصیور

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

READING
Section

مدیر کچی کھیتی

قوسبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔
دس سال پہلے اکتوبر میں پاکستان نے ہولناک زلزلے کا سامنا کیا تھا آج دس سال بعد زمین ایک بار پھر لرز اٹھی۔ درود یوار ہل گئے۔ ہزاروں مکانات تباہ ہو گئے۔ سینکڑوں انسان اپنی جانیں گنوا بیٹھے۔ زلزلے کی تباہ کاریوں سے پاکستان کا بڑا حصہ متاثر ہوا ہے۔

ستاروں پر کند ڈالنے والا انسان آج بھی قدرتی آفات کے سامنے بے بس نظر آتا ہے۔ قدرت اپنی طاقت منوا ہی لیتی ہے۔ ایک نظام کے تحت چلنے والی کائنات میں انسان کی مداخلت کرہ ارض کو تہہ و بالا کر رہی ہے۔ ماحولیاتی آلودگی اور زمین کا درجہ حرارت بڑھ رہا ہے اور اس کا نتیجہ ہے آندھیاں، طوفان، سیلاب اور زلزلے۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو آنے والا وقت کیسا ہو سکتا ہے، اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ یہ انسان کو قدرت کی طرف سے تیسہ ہے۔

آج وطن عزیز مشکل صورت حال سے دوچار ہے۔ زلزلے سے ہزاروں افراد زخمی اور بے گھر ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں کو دوائیں، خوراک کے ساتھ ساتھ گرم کپڑوں کی بھی ضرورت ہے کہ موسم شدید سرد ہے۔ بچوں کے لیے دودھ اور دیگر اشیاء درکار ہیں۔

اس کٹھن گھڑی میں ان کا ساتھ دیں۔ جس قدر بھی جو بھی ممکن ہو سکے۔ یہ سب ہمارے اپنے ہیں۔ ہماری مقننہ کی مدد ان کے لیے زندگی بن سکتی ہے۔

پچھلے دنوں بھارت میں ایک مسلمان کو گائے کا گوشت کھانے کے شبہ کی وجہ سے مار دیا گیا۔ اس کا بیس سالہ بیٹا اسپتال میں موت اور زندگی کی کشمکش میں سانس لے رہا ہے۔ یہ حقیقت ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ جو نظر یہ پاکستان کو تسلیم کرنے سے انکاری ہیں۔ ایک بار پھر ثابت ہو گیا ہے کہ ہماری بھلائی کے لیے پاکستان تازہ رہتا۔

علامہ اقبال وہ عظیم مفکر، فلسفی اور شاعر جن کی بصیرت نے اس حقیقت کو بھانپا اور پاکستان کا تصور پیش کیا۔ تو م کو خودی کا پیغام دیا۔ سرائی کر جیسے کا دس دیا جو وہی خودی تو شاہی نہ وہی تو روسیا ہی۔
۹ نومبر علامہ اقبال کا یوم پیدائش ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے۔ آمین۔

نیٹا ناول،

اس ماہ بہن عفت سحر طاہر کا ناول اختتام کو پہنچ رہا ہے۔ آغاز سے اختتام تک ناول میں قارئین کی دلچسپی برقرار رہی ہماری قارئین کی اکثریت نے اسے پسند کیا۔

آئندہ ناول کس مصنف کا ہوگا۔ اس بار یہ فیصلہ ہماری قارئین کریں گی۔ آپ کس مصنف کا ناول پڑھنا چاہتی ہیں۔ ہمیں خط لکھیں یا فون کر کے بتائیں۔ اکثریت کی رائے کے مطابق ہی فیصلہ کیا جائے گا۔

اس شمارے میں،

- ۱۔ عمیرہ احمد کا ناول۔ آب حیات،
- ۲۔ نمل۔ نمرہ احمد کا مکمل ناول،
- ۳۔ شہر آشوب۔ امت العزیز شہزاد کا مکمل ناول،
- ۴۔ صدق ریسکان گیلانی اور ملیحہ صدیقی کے ناول،
- ۵۔ حنا یا سہین، ماجرہ ریسکان، عینقہ محمد بیگ، عمارہ خان، نور فاطمہ اور صف آصف کے افسانے،
- ۶۔ افسانہ نگار، ناول نگار اقبال بانو سے ملاقات، حرف سادہ کو دیا اعجاز کارنگ۔ مصنفین سے سرنے،
- ۷۔ کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔
- ۸۔ خواتین ڈائجسٹ کا یہ شمارہ آپ کو پسند آیا؛ یہ جاننے کے لیے منظر ہیں۔ خط ضرور لکھیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کون روشنی

ادارہ

قرآن مجید پڑھنے کا ثواب

کو تلاش کے باوجود صحتِ مخارج اور صفاتِ حروف کا لحاظ رکھ کر الفاظ ادا نہیں کر سکتے لہذا وہ تلاوت ترک نہ کریں بلکہ یہ عمل صالح جاری رکھیں۔
3۔ خلوص نیت کے ساتھ ادا کیا ہونا نقص عمل بھی اللہ تعالیٰ کو بہت پیارا ہے جب وہ عمل نقص کے بغیر ادا کرنا ممکن نہ ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”قرآن کریم (صحت کے ساتھ) پڑھنے میں ماہر (قیامت کے دن) معزز نیکو کار فرشتوں کے ساتھ ہوگا اور جو شخص اسے اٹک اٹک کر پڑھتا ہے اور اسے پڑھنے میں مشقت ہوتی ہے اس کے لیے دگنا اجر ہے۔“

حافظ و قاری کا درجہ

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”قرآن والے (حافظ یا قاری) سے (قیامت کے دن) جنت میں داخل ہوتے وقت کہا جائے گا ”قرآن پڑھتا جا اور (جنت کے درجات میں) چڑھتا جا“۔ وہ پڑھتا جائے گا اور ہر آیت کے ساتھ ایک ایک درجہ بلند ہوتا چلا جائے گا حتیٰ کہ اسے جو آخری آیت یاد سے پڑھی پڑھ لے۔“

فوائد و مسائل : 1۔ قرآن کے ماہر سے مراد حافظ اور تجوید کے ساتھ پڑھنے والا قاری یا عالم باعمل ہے۔

2۔ جو شخص تجوید کے ساتھ روانی سے نہیں پڑھ سکتا اس کے باوجود شوق سے پڑھتا ہے اور پڑھنے میں جو مشقت ہوتی ہے اسے برداشت کرنا ہے اس کے لیے دگنا ثواب ہے۔ اس میں ان معمر حضرات کے لیے بڑا خوش خبری ہے جن کی زبان موٹی ہو جاتی ہے تو وہ

فرمایا ”اگر کوئی نماز میں تین آئینیں پڑھے تو وہ اس کے لیے تین بڑی بڑی مولیٰ تازی حاملہ اونٹنیوں سے بہتر ہیں۔“

فوائد و مسائل : 1۔ قرآن مجید کی تلاوت کا

فائدہ اتنا زیادہ ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی دولت اس کے مقابلے میں بیچ ہے۔

2۔ حاملہ اونٹنیوں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ اس دور میں عربوں کے نزدیک یہ سب سے عمدہ اور قیمتی مال تھا۔

3۔ نماز میں تلاوت کا ثواب نماز کے علاوہ تلاوت سے زیادہ ہے۔

قرآن کی مثال

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”قرآن کی مثال گھٹنا بندھے ہوئے اونٹوں کی سی ہے۔ اگر مالک ان کے بندھنوں کے ذریعے سے ان کی حفاظت کرے گا تو انہیں اپنے قابو میں رکھے گا اور اگر

ان کے بندھن کھول دے گا تو وہ بھاگ جائیں گے۔“

فوائد و مسائل : 1۔ اونٹ کو بٹھا کر رسی سے اس کا گھٹنا باندھ دیا جاتا ہے۔ اس رسی کو عقال کہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے اونٹ بھاگ نہیں سکتا۔ قرآن

مجید یاد کرنے کے بعد اسے پڑھتے رہنا چاہیے تاکہ یاد رہے۔ اگر پابندی سے تلاوت نہ کی جائے تو حفظ کیا

ہو قرآن بھول جاتا ہے۔

2۔ اگر تلاوت فرض اور نفل نمازوں میں ”خصوصاً“ نماز تہجد میں ہو تو برکات کا حصول زیادہ ہوتا ہے۔

سورہ فاتحہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے ”اللہ عزوجل فرماتا ہے میں نے نماز کو اپنے اور

اپنے بندے کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کر لیا ہے۔ وہ آدمی میرے لیے ہے اور آدمی میرے بندے کے

نوائید و مسائل : 1۔ اس سے قرآن مجید کے حافظ اور کثرت سے اس کی تلاوت کرنے والے کی فضیلت کا اظہار ہوتا ہے۔

2۔ اگر پورا قرآن مجید یاد نہ ہو تو بھی جتنا یاد ہے اس کے مطابق درجات بلند ہوں گے۔

3۔ اس حدیث میں تلاوت اور حفظ قرآن کی ترغیب ہے۔

قرآن کی گواہی

حضرت پریدہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ نے فرمایا ”قیامت کے دن قرآن

مجید ایسے مرد کی شکل میں آئے گا جس کا رنگ اڑا ہوا ہو اور کئے گا میں وہی ہوں جس نے مجھے رات کو بیدار

رکھا اور دن کو بے سار رکھا۔“

فوائد و مسائل : 1۔ شاحب سے مراد وہ انسان ہے جس کا رنگ بیماری کی وجہ سے یا سخت محنت اور تھکاوٹ کی وجہ سے تبدیل ہو گیا ہو۔

2۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جس طرح قرآن پڑھنے والا تہجد میں تلاوت کی محنت اور تھکاوٹ

برداشت کرتا تھا، قرآن کو بھی اسی شکل میں ظاہر کیا جائے گا اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح

قرآن کی تلاوت اور قیام کی وجہ سے آدمی کا رنگ بدل جاتا تھا، اسی طرح قرآن بھی انتہائی بھاگ دوڑ کرے گا

کہ مومن کو زیادہ سے زیادہ بلند درجہ مل سکے اور اس بھاگ دوڑ کا اثر اس کی ظاہری صورت میں نظر آئے

گا۔ واللہ اعلم۔

تلاوت کا اجر و ثواب

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”کیا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہے کہ جب وہ گھر جائے تو اسے گھر میں تین بڑی بڑی مولیٰ تازی

حاملہ اونٹنیاں ملیں؟“

جی ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

استدلال درست نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صحیح حدیث میں اس بات کی قطعی طور پر صراحت اور وضاحت موجود ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم سورہ فاتحہ کی ایک مستقل آیت ہے۔ ابراہیم بن محمد بن سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”یعنی جب تم سورہ فاتحہ پڑھو تو بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھا کرو کیونکہ یہ (سورت فاتحہ) ام القرآن ام الكتاب اور السبع الثانی ہے اور بسم اللہ الرحمن الرحیم اس (سورہ فاتحہ) کی ایک آیت ہے۔“

3۔ دوسری سورتوں کے شروع میں جو بسم اللہ ہے وہ سورتوں کا جزو نہیں، تاہم یہ بھی اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی آیت ہے اور سورہ توبہ کے سوا ہر سورت کے ساتھ نازل ہوئی ہے اس لیے ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا ضروری ہے۔

4۔ جہری نماز میں سورت کے ساتھ بسم اللہ بلند آواز سے پڑھنا بھی جائز ہے، تاہم آہستہ پڑھنا راجح ہے۔

5۔ اللہ کی حمد و ثنا بھی ایک لحاظ سے دعا ہے کیونکہ اللہ کی تعریف سے مقصود اس کی رضا اور قرب کا حصول ہوتا ہے اور حمد و ثنا کرنے والے کو یہ مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔

نمازی کو اگرچہ اسلام کے ذریعے ہدایت حاصل ہو چکی ہے۔ اس کے باوجود انسان کو زندگی میں ہر قدم پر اللہ کی رہنمائی اور توفیق کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ بندہ نماز میں سورہ فاتحہ کے ذریعے اللہ سے ہدایت کی درخواست کرتا رہے واللہ اعلم۔

سب سے بڑی سورت

حضرت ابو سعید بن معلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔ ”کیا میں مسجد سے نکلنے سے پہلے تجھ کو قرآن مجید کی سب سے بڑی سورت نہ سکھاؤں؟“ (اس کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سے باہر تشریف

لے۔ اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو وہ انگتا ہے۔“ انہوں نے کہا اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”پڑھو! بندہ کہتا ہے۔“ الحمد للہ رب العالمین“ سب تعریفیں جہانوں کے مالک اور پالنے والے کے لیے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ میرے بندے نے میری تعریف کی اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو وہ مانگے۔ بندہ کہتا ہے۔

”الرحمن الرحیم“ بہت مہربان نہایت رحم کرنے والا۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثنا کی اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو وہ مانگے۔ بندہ کہتا ہے۔

”مالک یوم الدین“ جزا کے دن کا مالک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ میرے بندے نے میری عظمت بیان کی۔ یہ (سب تعریف) میرے لیے ہے اور یہ آیت میرے درمیان اور میرے بندے کے درمیان نصف نصف ہے۔ (یعنی جب) بندہ کہتا ہے ”ایاک نعبد و ایاک نستعین“ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ تو یہ میرے اور بندے کے درمیان نصف نصف ہے اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو اس نے مانگا۔ اور سورہ کی (باقی) آخری آیات میرے بندے کے لیے ہیں۔ (پھر) بندہ کہتا ہے ”ہمیں سیدھا راستہ دکھا“ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا جن پر تیرا غضب نہیں ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔“ (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) یہ میرے بندے کا حصہ ہے اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو اس نے مانگا۔“

فوائد و مسائل : 1۔ سورہ فاتحہ سب سے عظیم سورت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو ”نماز“ فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تلاوت نماز کا رکن ہے۔

2۔ اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم سورہ فاتحہ کی آیت نہیں، لیکن یہ

4۔ قرآن مجید کی تلاوت ایمان کے ساتھ اور خلوص نیت سے ہو تو مغفرت کا باعث ہے۔

تہائی قرآن

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”قل هو اللہ احد“ (سورہ اخلاص) تہائی قرآن کے (تیسرے حصے کے) برابر ہے۔“

فوائد و مسائل :

- 1۔ سورہ اخلاص کا ثواب ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔
- 2۔ اس کی عظمت کی وجہ یہ ہے کہ اس میں توحید کا بیان ہے۔
- 3۔ اللہ تعالیٰ کو توحید سے محبت اور شرک سے انتہائی نفرت ہے۔

اللہ کے ذکر کی فضیلت

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”کیا میں تمہیں ایسا عمل نہ بتاؤں جو تمہارے اعمال میں سب سے بہتر تمہارے بادشاہ (اللہ تعالیٰ) کو

سب سے زیادہ پسند تمہارے درجات کو سب سے زیادہ بلند کرنے والا اور تمہارے لیے سونا اور چاندی (اللہ کی راہ میں) دینے سے بہتر اور اس بات سے بھی بہتر ہے کہ تم اپنے دشمن کا مقابلہ کرو اور ان کی گردنیں کاٹو اور وہ تمہاری گردنیں کاٹیں؟“
صحابہ نے کہا۔ ”اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! وہ کیا ہے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اللہ کا ذکر۔“

اللہ کی رحمت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لے جانے لگے تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد دہانی دہائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”الحمد لله رب العالمین۔ یہی سبع مثانی (سات بار بار دہرائی جانے والی آیت) ہیں اور یہی قرآن عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔“

فوائد و مسائل : 1۔ اس حدیث میں قرآن

مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔ ”یقیناً“ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار دہرائی جانے والی سات آیات اور قرآن عظیم عطا فرمایا ہے۔“

2۔ ”سورہ فاتحہ کو“ ”سبع مثانی“ اس لیے فرمایا گیا ہے کہ یہ ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔

3۔ سورہ فاتحہ کو ”قرآن عظیم“ کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ یہ قرآن مجید کے تمام مضامین کا خلاصہ ہے، یعنی اس میں عقیدہ توحید، عملی توحید یعنی صرف اللہ کی عبادت اور صرف اس سے مدد مانگنا، اس کی صفات، عقیدہ آخرت، وعدہ وعید، گزشتہ انبیاء اور ان کی امتوں کے نیک اور نافرمان افراد کے واقعات سے عبرت اور اس سے ہدایت کی درخواست جیسے اہم مضامین موجود ہیں۔

شفاعت

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”قرآن مجید میں ایک سورت ہے جس کی تین آیتیں ہیں۔ اس نے اپنے پڑھنے والے کی شفاعت کی۔“ حتیٰ کہ اس کی مغفرت ہو گئی۔ (وہ سورت ہے) تبارک الذی بیدہ الملک۔

فوائد و مسائل :

- 1۔ ”شفاعت کی“ یعنی قیامت کے دن شفاعت کرے گی۔
- 2۔ قیامت کے دن اعمال محسوس صورت میں سامنے آئیں گے۔
- 3۔ قیامت کو نیک اعمال بھی شفاعت کریں گے۔

ساتھ ہے۔ ایک معیت مدد اور نصرت کی ہوتی ہے جو اس کی راہ میں جدوجہد یا جنگ کرنے والوں کو ماضی ہوتی ہے۔ یہ بھی ایسی ہی معیت ہے جو ذکر کرنے والوں کو حاصل ہوتی ہے، اس کا مقصد خوشنودی کا اظہار ہے۔

2۔ اللہ تعالیٰ ذاتی طور پر ہر جگہ موجود نہیں بلکہ آسمانوں پر عرش عظیم کے اوپر ہے جیسا کہ قرآن و حدیث کی صریح نصوص سے ثابت ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے۔ الرحمن علی العرش استوی (طہ۔ 20)

3۔ اللہ کا ذکر بہت بڑی نیکی ہے۔

بجلی سے اللہ کی پناہ مانگنا

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے بیان کرتے تھے کہ ”اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں بجلی سے، میں تیری پناہ مانگتا ہوں بڑبڑی سے، میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ ناکارہ عمر میں پہنچا دیا جاؤں، میں تیری پناہ مانگتا ہوں دنیا کی آزمائش سے اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں قبر کے عذاب سے۔“

دعا سے دبا اور پریشانی دور ہو جاتی ہے

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اے اللہ! ہمارے دل میں مدینہ کی ایسی ہی محبت پیدا کر دے جیسی تو نے مکہ کی محبت ہمارے دل میں پیدا کی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اور اس کے بخار کو حجبہ میں منتقل کر دے اے اللہ! ہمارے لیے ہمارے مدد اور صلح میں برکت عطا فرما۔“



”جو لوگ بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے بیٹھتے ہیں، انہیں فرشتے گھیر لیتے ہیں اور ان پر رحمت چھا جاتی ہے اور ان پر مسکنیت نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر ان (فرشتوں) میں فرماتا ہے جو اس کے پاس ہوتے ہیں۔“

فوائد و مسائل :

1۔ ذکر کے لیے بیٹھنے والوں سے مراد مسنون انداز سے ذکر کرنے والے ہیں، مثلاً ”نماز سے فارغ ہو کر مسنون اذکار میں مشغول افراد یا وعظ و درس قرآن و حدیث کی مجلس یا آپس میں اللہ کی نعمتوں کا ذکر تاکہ دل میں شکر کا جذبہ پیدا ہو۔“

2۔ خود ساختہ الفاظ کے ساتھ، خود ساختہ طریقوں سے ذکر کرنا خلاف سنت ہے۔ جیسے روشنیاں بجھا کر اجتماعی طور پر ذکر کرنا، بالخصوص الفاظ کی ضربیں لگانا یا ایسی دعاؤں کو اہمیت دینا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں، مثلاً ”درو تاج، درود ماہی، ہفت ہیکل، شش قفل وغیرہ۔ ایسی چیزوں سے ثواب کے بجائے گناہ کا اندیشہ ہے۔“

3۔ فرشتے نیکی کی مجلس میں شریک ہوتے ہیں۔

4۔ مسکنیت سے مراد دل میں اطمینان و سکون اور خوشی کی خاص کیفیت ہے جو ذکر کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے۔

5۔ فرشتوں میں ذکر فرمانے کا مقصد اس عمل پر خوشنودی کا اظہار ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قربت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں، جب وہ میرا ذکر کرتا ہے اور اس کے ہونٹ میرے ذکر کے ساتھ حرکت کرتے ہیں۔“

فوائد و مسائل :

1۔ اللہ تعالیٰ کی عام معیت تو ہر مخلوق کے ساتھ ہے کہ وہ اپنے علم اور قدرت کے لحاظ سے ہر ایک کے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

دولت خواتین پڑھ لو کہ اسے بانگِ درا

انشائی

سوچے۔ آج کل تو کالجوں، یونیورسٹیوں تک میں تعلیم خلاصوں کے ذریعے اور امتحان گیس پیپروں کی مدد سے دیے جاتے ہیں۔ آپ بھی اپنی بات کا خلاصہ آخر میں ایک دو تین نمبر ڈال کر لکھ دیا کیجئے۔ آخر حکایات لقمان والے لقمان اور گلستانِ سعدی والے سعدی بھی تو یہی کیا کرتے تھے۔ آج تک کسی نے اعتراض نہ کیا۔ قارئین پر کند ذہنی کا گمان کیا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب کے عالی صاحب نے اپنے کالم کے آخر میں ضروری نکات مفید مشوروں کی صورت میں رقم کر دیے اور یہ کام ایسا ہے کہ اس میں ان کا حریف کوئی نہیں۔ ان کی جو سانس آتی ہے اور جاتی ہے، مفت مشوروں سے خالی نہیں ہوتی۔ گھوڑے پر سوار مولوی صاحب کی طرح مشورہ دیا اور آگے چل دیے۔ ہم نے کئی بار عرض بھی کیا کہ رک کر دیکھ لیا کیجئے۔ آپ کے مشورے کا نتیجہ کیا ہوا؟ کیا کل کھلا لیکن

دیریا کو اپنی سوج کی طغیانوں سے کام کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے



کراچی کے یوم اقبال کی عدم الشال کامیابی سے خوش ہو کر انہوں نے مشورہ دیا ہے کہ جس طرح آج کل بینکوں والے آئے دن قصبوں اور قریوں میں ایک دوسرے کی ضد میں شاخیں کھول رہے ہیں۔ خواہ وہاں کوئی اکاؤنٹ کھولنے والا ہو یا نہ ہو، اسی طرح آئندہ یوم اقبال کی بھی تاخیر قائم کی جائیں۔ یعنی آئندہ یوم اقبال ہر ڈویژن، ہر ضلع، ہر تحصیل، ہر تھانے اور ہر گاؤں میں منایا جائے۔ اس سے قطع نظر کہ وہاں اقبال کو جاننے اور سمجھنے والا کوئی ہے کہ

جنگ میں گزشتہ ہفتے ہمارے عزیز دوست جمیل الدین عالی (دوہوں والے، تماشا مرے آگے والے) نے اپنے ناطقہ کو سر بہ گریباں کرتے ہوئے ایسارقت انگیز کالم لکھا ہے کہ جدھر جائے خلقت زار و قطار رو رہی ہے۔ سارا شہر دیوار گریہ بنا ہوا ہے۔ لیاری کی جھگیاں بہہ گئی ہیں اور محرم کی مجلسیں ماند پڑ گئی ہیں۔ ہم دوسروں کو کیا کہیں، ہمارا اپنا یہ حال ہے کہ یہ مضمون ہم لکھ نہیں رہے۔ ایک گرم قریا کو لکھوار ہے ہیں کیونکہ ہمارے ہاتھ خالی نہیں۔ ایک تولیہ اس ہاتھ میں ہے، ایک اس میں۔ بولتے جاتے ہیں اور اپنی اشک شوئی کرتے جاتے ہیں۔ ہم دو آبے کے رہنے والے ہیں، لیکن ایسا دو آبہ نہ دیکھا تھا۔

اس میں کچھ تاخیر موضوع کی بھی ہے۔ ان کا یہ کالم علامہ اقبال مرحوم کے بارے میں ہے اور خود علامہ مرحوم کے متعلق سب ہی وقائع نگار متفق ہیں کہ بات بات پر رو دیا کرتے تھے۔ جہاں قوم کا نام آیا، ان کی آنکھوں سے اشکوں کا چشمہ رواں ہوا۔ عالی صاحب کا کالم، جواب کے ذرا دھندلا دھندلا چھپا ہے، اس کی وجہ بھی مشین کی خرابی نہیں، لکھنے والا کاتب بھی صاحب دل تھا۔ اس کے آنسو لکھتے میں کاغذ پر ٹپکتے گئے اور سیاہی پھیلتی گئی۔ مشین مین نے اسے درست کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ بھی پڑھا لکھا تھا۔ قوم کا درو دل میں رکھتا تھا۔ سیاہی کو مزید پھیکا کرنے میں کچھ حصہ اس کا بھی سمجھے۔

”عالی صاحب پہلے سیدھا سیدھا کالم لکھا کرتے تھے، مطلب اخذ کرنے کا کام قارئین پر چھوڑ دیتے تھے، لیکن پڑھنے والوں نے کہا کہ جناب آج کل اتنی فرصت کے کہ بیڑھے بھی اور اس کا مطلب بھی



Downloaded From Paksociety.com

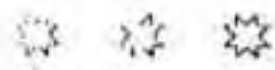
کام سے گئے۔ دیکھا کہ ایک گاؤں میں جھنڈیاں لگی ہیں اور لوگ دیکھیں پکار رہے ہیں۔ ہم نے کہا کہ ”کسی کی شادی یا عرس سے کیا ہے؟“ معلوم ہوا۔ ”نہیں“ حضرت ملنگ گڑگاٹوی کا یوم ہے۔“

ایک صاحب کو جو پیش پیش تھے ہم نے روک کر پوچھا کہ ”یہ کون صاحب تھے۔ کیونکہ ہم گڑگاٹوی میں رہے ہیں ان کا نام نہیں سنا۔“

کہنے لگے۔ ”سنا تو ہم نے بھی نہیں، لیکن اوپر سے حکم آیا ہے۔ سنا ہے ڈپٹی کمشنر صاحب کی بیگم کے ماموں تھے۔ کلام ان کا چھپا نہیں۔ رسالوں والے متعصب تھے۔ چھاپتے ہی نہ تھے۔ ورنہ شاعر سنا ہے اچھے تھے۔ آج ہم ان کی یاد تازہ کریں گے۔ قوالوں سے ان کی غزلیں گوائی جائیں گی اور جو چندہ گاؤں والوں نے تھانیدار صاحب کو رضا کارانہ طور پر دیا ہے اس سے ملنگ مرحوم کا دیوان چھاپا جائے گا۔“



نہیں۔ یوم وغیرہ رضا کارانہ طور پر منانے کی عملی وقتوں سے واقف ہونے کی وجہ سے انہوں نے فرمایا ہے کہ یوم اقبال منانا ہر مقامی حاکم کا ایک غیر سرکاری فرض قرار دے دیا جائے۔ بس اتنا سا سرکاری مراسلہ جاری کرویا جائے کہ مقامی حکام تقریبات اقبال کی ہمت افزائی کریں پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے۔



یہ بات ہمارے بھی تجربے میں آئی ہے، جہاں کوئی کمشنریا ڈپٹی کمشنر ادب سے دلچسپی رکھنے والا آیا سارا

ضلع اشعار اور استعاروں میں باتیں کرنے لگا، بنیادی جمہوریتوں والے بھی غزلیں کہنا اور رسالے نکالنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہر روز کسی نہ کسی کا یوم ہے۔ چونکہ سال میں صرف تین سو پینسٹھ دن ہوتے ہیں، لہذا بعض شاعروں اور ادیبوں کے نام قلم زد بھی کرنے پڑتے ہیں کیونکہ ایک دن میں ایک سے زیادہ آدمیوں کا یوم منانا کچھ بھلا نہیں لگتا۔ ایک ضلع میں ہم ایک

”ایسہ کہہ اقبال بھی؟“

”ڈاکٹر اقبال“

”کون ڈاکٹر اقبال؟“

”ڈاکٹر اقبال نہیں جانتے۔ حکیم الامت ڈاکٹر اقبال۔“

”یہ ڈی سی صاحب ہیں یا سول سرجن جو ڈاکٹروں، حکیموں کے دن منائے جانے لگے۔ یہ کیا لگتے ہیں ڈی سی صاحب کے؟“

”کچھ بھی نہیں لگتے۔ شاعر تھے بہت بڑے، 1938ء میں مر گئے۔“

”مر گئے تو پھر یوم منانے کی کیا ضرورت ہے۔ کیوں

اتنا خرچا کیا جائے۔ جب کہ وہ ڈی سی صاحب کے رشتہ دار بھی نہ تھے۔ کہاں کے رہنے والے تھے؟“

”سیالکوٹ کے“

”سیالکوٹ کے۔؟ پھر تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ ہماری بیگم سیالکوٹ ہی کی ہیں۔ یہ بھی ضرور کوئی گلڑے آدمی ہوں گے۔“



بعد ازاں رپورٹیں طلب کی جائیں گی۔ کس کس گاؤں میں یوم اقبال منایا گیا کہاں نہیں۔ کوئی ہزار عذر کرے کہ جناب کوئی قوال ہی خالی نہیں ملا۔ ہم یوم اقبال کیسے مناتے۔ کوئی عذر مسموع نہ ہوگا۔ تھانے والا باندھ کے لے جائے گا کہ بد معاش! یوم اقبال نہیں مناتے۔ ڈی سی صاحب کے حکم کی سرنالی کرتے ہو۔ دوجی اسے حوالات میں بڑھواؤ اسے بانگ درا۔ صبح خود ہی بانگ دیتا ملے گا کہ حضور غلطی ہوئی، بال بچوں والا ہوں، آج ہی جا کے مناتا ہوں یوم اقبال۔



اندریں حالات ہماری سفارش یہ ہے کہ اگر ادب کی ترقی مطلوب ہے تو آئندہ کسی کو حاکم ضلع مقرر کرتے ہوئے دیکھ لیا جائے کہ آیا شاعر ہے۔ کہیں نرالی ایس پی تو نہیں۔ یہ ہو جائے تو دیکھئے ادب میں کیسی بہار آتی ہے۔ سب لوگ کھیتی باڑی، آبپاشی وغیرہ چھوڑ کر یوم منانے میں لگ جائیں گے۔

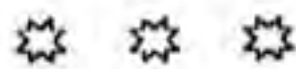
آنے والے دور کی دھندلی سی ایک تصویر یہ ہے کہ ضلع مرادپور میں نیا ڈی سی چارج لیتا ہے۔ فوراً اہل معاملہ سراغ لگائیں گے کہ آئندہ لاکھ عمل کیا ہو۔

اگر موصوف گھوڑوں کے شوقین ہیں تو گھوڑوں اور مویشیوں کا میلہ کیا جائے اور میونسپلٹی سے ریس کورس قائم کرنے کے لیے جگہ الاٹ کرائی جائے۔ اگر مزاج میں تصوف ہے تو عرس کیے جائیں اور واڑھیاں رکھی جائیں۔

اگر شاعر ہیں تو فوراً ”مشاعرہ ہونا چاہیے۔ اگر نمازی ہیں تو نماز سیکھی جائے۔ کیا عجب کبھی بڑھنی پڑ جائے“ آخر پتا چلتا ہے کہ حضرت آفتاب اکبر آبادی کا شاگرد ہے۔ سب ہی اپنا قبلہ راست کر لیتے ہیں، لیکن جو نہی حضرت کا تاولہ ہوا، ہم نے یہ دیکھا کہ دوسرے ہی روز بزم ادب کے دفتر میں کھلی بنولوں کی دکان کھل گئی۔



ہفت روزہ آفتاب عالمتاب کے دفتر میں کورے لکھے کاڈپو قائم کیا گیا کیونکہ تحقیق کرنے والوں نے تحقیق کر لیا کہ نیا ڈی سی شاعری کو پسند نہیں کرتا۔ تھانے میں شعر کہنے والوں کی فائل کھلو اور تباہ ہے۔



خیر اقبال تو قومی شاعر ہے۔ تصور پاکستان کا خالق ہے، تاہم یہ بعد از امکان نہیں کہ گاؤں کی یونین کونسل میں سرکلر ہینچے کہ اب کے یوم اقبال منایا جائے تو اس قسم کی گفتگو ہو۔



معروف افسانہ نگار ناول نگار

اقبال بانو سے ملاقات

شاہین رشید

راج ہے ”سسرال میری بہن کا“ وہ کامیاب سوپ جو ابھی حال ہی میں حتم ہوا ہے ”اقبال بانو“ کی ہی کاوش تھی تو ”بہ کثیثیت ایک افسانہ نگار“ ناول نگار اور اب ڈرامہ نگار کے ہماری جو گفتگو ہوئی آپ کی نذر ہے۔

”جی اقبال بانو۔۔۔ کیسی ہیں آپ؟“
”شکر ہے اللہ کا۔“

”کہاں تھیں؟ میں کافی دیر سے فون کر رہی تھی؟“
”میں پکن میں تھی اور اب پکن میں میں نمون لے کر نہیں جاتی کیوں کہ پہلے ایک بار میری لاپرواہی سے میرا موبائل گھی کے ڈبے میں گر گیا تھا۔ موبائل گھی کے ڈبے کے ڈھکن پر رکھا تھا جیسے ہی ڈھکن ہٹایا موبائل اندر جا گرا۔“

”واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ کیا بات ہے مشہور رائٹرز کی۔ مجھے یاد ہے کہ شروع کی تحریروں میں تم کبھی پکن کا ذکر نہیں

صلا حیتیں تو خدا داد ہی ہوتی ہیں مگر کچھ صلاحیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو پالش کیا جاتا ہے تو وہ مزید نکھر کر سامنے آتی ہیں اور کچھ ایسی ہوتی ہیں جنہیں پالش کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ جیسے شاعری کی صلاحیت اور لکھنے کی صلاحیت۔ تخلیقی صلاحیت اللہ کسی کسی کو ہی عطا کرتا ہے۔ ڈرامے، افسانے، ناولز، لکھنا اور شاعری کرنا واقعی کمال کی بات ہے۔

اقبال بانو کا نام قاری بہنوں کے لیے کسی تعارف کا محتاج نہیں، ایک عرصے سے لکھ رہی ہیں اور بہت خوب لکھ رہی ہیں۔ ڈائجسٹ کی رائٹرز کو کبھی نیوی والوں نے لفت نہیں کرائی، کبھی ان کی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ مگر جب ایک ڈائریکٹر نے ہمت کی تو سب نے ہی ڈائجسٹ کی رائٹرز سے فائدہ اٹھانا شروع کیا اور آج ڈراموں کی دنیا میں ڈائجسٹ رائٹرز کا ہی

کرتی تھیں۔ کیوں؟“

”ہاں۔۔۔ مجھے اور بھی کافی لوگوں نے کہا تھا تو میں نے انہیں بتایا کہ میں چونکہ کچن میں جاتی ہی نہیں تو مجھے نہیں پتا ہوتا کہ چائے کی پتی کہاں پڑی ہے، چینی کہاں پڑی ہے کچن کا سارا کام تو میری بہنیں کرتی تھیں، تو مجھے نہیں پتا کہ کچن میں کیا ہوتا تھا۔ مگر اب

کوئی مجھ سے پوچھے تو میں بتا سکتی ہوں کہ کچن میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ شادی سے پہلے میری بہنیں میرا سب کام کر دیتی تھیں۔ حد تو یہ کہ کبھی مجھے روپال بھی نہیں دھونے دیا اور اگر میں کبھی دھو لیتی تھی تو وہ ناراض ہو جاتی تھیں اور شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں گھر کی بڑی تھی تو سب مجھ سے پیار اور میرا احترام کرتی تھیں۔“

”فیلڈ سے متعلق باتیں تو ہوں گی ہی مگر پہلے اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتاؤ؟“

”جی ہمارا تعلق ملتان سے ہے ابا امی دونوں ملتان کے ہیں اور ہم سرائیکی ہیں۔ میں جب دو سو دو سال کی تھی تو میری خالہ نے مجھے گود لے لیا تھا اور وہ مجھے لے کر کراچی آ گئیں۔ تو جب میں اپنے گاؤں آئی تھی تو اپنی امی کو خالہ کہتی تھی۔ اور جب میں پانچویں کلاس میں تھی تب مجھے پتا چلا کہ جن کو میں خالہ کہتی ہوں وہ میری سگی ماں ہیں اور جن کو ماں کہتی ہوں وہ میری خالہ ہیں اور ہاں! میں 15 جولائی کو پیدا ہوئی۔“

”اچھا یہ راز افشا کس نے کیا اور آپ کی کیا کیفیت تھی؟“

”یہ راز میری خالہ کی دیورانی نے افشا کیا، میری بڑی خالہ کی دیورانی نے۔ تو ایک دفعہ جھٹکا تو لگا اور پھر میرے لیے دونوں ماؤں میں توازن رکھنا مشکل ہو گیا۔ کیونکہ میرا دل دونوں طرف کھنچتا تھا۔ ایک مجھے پال رہی تھیں اور ایک نے مجھے جنم دیا تھا۔ لیکن ایک بات تھی کہ مجھے میری امی شروع دن سے ہی بہت اچھی لگتی تھیں۔ خالہ کہہ کر میں ان سے لپٹ جایا کرتی تھی۔ شاید قدرتی طور پر ماں والی کشش تھی اور

یہ بات مجھ میں بچپن سے تھی کہ میں لوگوں کی فیملنگز کو بھانپ لیتی تھی تو جب میں اپنی اماں سے خالہ سمجھ کر لپٹ جاتی تھی تو اپنی اماں (جنہوں نے گود لیا تھا) کی آنکھوں میں بڑی حسرت دیکھتی تھی کہ جیسے وہ سوچ رہی ہوں کہ اگر میری سگی بیٹی ہوتی تو خالہ سے اتنے لاڈ نہ کرتی کیونکہ میں اپنی دو سری خالوں سے اتنے لاڈ نہیں کرتی تھی جتنا میں اپنی اماں (سگی ماں) سے کرتی

تھی۔ تو جب میں نے محسوس کیا کہ میری پالنے والی ماں محسوس کرتی ہیں تو پھر ان کے سامنے میں اپنی سگی ماں کو زیادہ نہیں بلاتی تھی۔ لپٹتی بھی نہیں تھی۔ گود میں سر بھی نہیں رکھتی تھی بلکہ اپنی دو سری ماں (خالہ) سے زیادہ لاڈ کرنے لگ گئی تھی۔“

”آپ گھر کی بڑی بیٹی تھیں اور پہلی ہی بیٹی کو گود دے دینا کچھ بات سمجھ میں نہیں آتی؟“

”ہوا یہ کہ ایک تو میری خالہ کے یہاں اولاد نہیں ہوئی تھی، پھر جب میں پیدا ہوئی تو میرے سو سال کے بعد میری دو سری بہن پیدا ہو گئی اور وہ اکثر بیمار رہتی تھی تو میری خالہ نے بھی مجھے گود لے لیا اور میری نانی نے بھی کہا کہ ہاں دو دو لڑکیوں کی پرورش کرنا تمہارے لیے مشکل ہو رہا ہے تو بڑی کو خالہ کے حوالے کر دو۔ تو اس طرح میری خالہ نے مجھے گود لے لیا۔ ویسے ہم پانچ بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔“

”سب لکھاری ہیں؟ یا تم ہی ہو؟“

”کوئی بھی لکھاری نہیں ہے صرف میں ہی ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ سب میری تحریریں بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اور سب تعریف بھی کرتے ہیں اور پہلے بہنوں کو گھر ہوتا تھا اب ان کی اولادوں کو بھی گھر ہوتا ہے اور سب کو بتاتی ہیں کہ ہماری خالہ لکھتی ہیں۔“

”تمہارا نام اقبال سے جبکہ یہ لڑکوں کا نام ہوتا ہے۔ کیا علامہ اقبال سے متاثر ہو کر رکھا؟“

”میرے دادا کا نام ملک بہاول تھا تو شاید انہی کی مناسبت سے میرا نام اقبال رکھ دیا ہو گا۔ میرے ابا گھر کے بڑے تھے اور ان کی بڑی بیٹی میں تھی تو بس دادا کے

لکھے مگر کوئی معاوضہ نہیں ملا اور ہمیں بتاؤں کہ افسانوں میں زندگی کا ہر رنگ دکھایا جاتا ہے تو جب میرے افسانے چھپتے تھے اور میری دوسری امی جب بڑھنے لگتی تھیں تو میں کمرے سے نکل جاتی تھی، کیونکہ مجھے شرم آتی تھی کہ کہیں وہ یہ نہ کہیں کہ اس کو ان باتوں کا بھی پتا ہے؟ تو یہ لکھنے کی صلاحیت تو خدا داد ہوتی ہے تو جملے خود بخود اترتے چلے جاتے ہیں ہر ماحول کے۔“

”لکھاری لوگ رومانٹک بھی بہت ہوتے ہیں۔ کیا خیال ہے اور پہلی تعریف کس کی طرف سے آئی؟“

”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو اور میں تو ابھی تک رومانٹک ہوں۔ پہلی تعریف مجھے ریاض صاحب (بانی خواتین ڈائجسٹ) کی طرف سے ملی۔ انہوں نے جب کہا کہ ”ہیں! یہ تم نے لکھا ہے“ اور پھر امتل کے والد صاحب نے کہا کہ ”امتل یہ وہی اقبال بانو ہے جو افسانے لکھتی ہے“ (ان دنوں یونیورسٹی کے حوالے سے میرا امتل کے یہاں کلنی آنا جانا تھا) تو امتل کہتی کہ ”جی بابو“ تو کہتے کہ ”لکھا تو نہیں کہ یہ ایسے افسانے لکھتی ہو گی۔“ امتل کہتی کہ ”میرے ابا تو تمہارے زبردست صین ہیں۔“

”ناول لکھنے کا خیال کیسے آیا؟“

”میں نے دوشیزہ میں کچھ افسانے لکھے تھے جس پر مجھے رعنا فاروقی نے کہا کہ تم ہمیں ناول لکھ کر دو۔ تو میں نے کہا کہ میں نے تو ابھی اتنے افسانے بھی نہیں لکھے تو ناول کیسے لکھ سکتی ہوں۔ حالانکہ ایک سال میں میں نے اپنے خاصے افسانے لکھ لیے تھے جو کہ سب کے سب شائع بھی ہوئے تھے۔ تو اس وقت عظمت عززی بھی وہاں تھیں انہوں نے کہا کہ بانو اگر تمہیں چانس مل رہا ہے تو ضرور لکھو۔ ان دنوں عظمت عززی بھی امن میں لکھا کرتی تھیں۔ خیر اس وقت میرے ذہن میں کوئی پلاٹ نہیں تھا چنانچہ میں نے دیہاتی ماحول پہ لکھنے کا ارادہ کیا، بس سڑک سے

نام سے ملتا جلتا میرا نام رکھا گیا، ہمارے خاندان میں بہت کم لوگ پڑھے لکھے تھے بلکہ معمولی پڑھے لکھے تھے تو میں اپنے خاندان کی واحد لڑکی تھی جس نے سب سے زیادہ پڑھا۔ ایم اے کیا، ایل ایل بی کیا اور سرانجیکلی ادب میں ایم اے کیا۔ اب تو ہمارے خاندان میں لڑکیاں لی ایچ ڈی بھی کر رہی ہیں۔ صرف میری خالہ نے میٹرک کیا تھا۔ اور ایسا نہیں کہ میں ڈگریاں لے کر گھر بیٹھ گئی تھی بلکہ میں نے بینک میں جاب کی

بہ حیثیت منیجر کے۔ 1993ء میں جب میری والدہ کا انتقال ہوا تو مجھے جاب چھوڑنی پڑی کیونکہ گھر کی ساری ذمہ داری مجھ پر آگئی تھی۔“

”لکھنے کا عمل کب سے جاری ہے اور کب احساس ہوا کہ میں لکھ سکتی ہوں؟“

”جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ گزرے زمانے میں اخبار ہر گھر میں آتا تھا تو ہمارے گھر میں بھی آتا تھا۔ اس میں بچوں کا صفحہ بھی ہوتا تھا تو جب میں میٹرک میں تھی اور بچوں کی کہانیاں پڑھا کرتی تھی جو کہ میں بچپن سے ہی پڑھ رہی تھی تو مجھے احساس ہوا کہ ایسی کہانیاں تو میں بھی لکھ سکتی ہوں۔ تو میں نے لکھ کر بھیجی روزنامہ امن میں۔ اس زمانے میں بچوں کا صفحہ انور شعور صاحب نکالا کرتے تھے۔ انہوں نے میری کہانی کو بہت پسند کیا اور باقاعدہ لکھنے کو کہا یوں ہر ہفتے میری کہانی روزنامہ امن میں لگ جایا کرتی تھی۔ اور انور شعور مجھے اکثر کہتے تھے کہ تم ایک دن بہت بڑی رائٹرنوگی۔ اسی اخبار میں طلبہ کا صفحہ بھی آتا تھا اس میں بھی مضامین، کہانیاں اور سروے کیے۔ ان دنوں ایک میگزین نکلتا تھا ”گھرانہ“ کے نام سے اس میں میں نے ایک کہانی لکھی۔ فروری 79ء میں اس وقت میں میٹرک میں تھی۔“

”معاوضہ ملتا تھا؟“

”معاوضہ کیا ہوتا ہے مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔ سب سے پہلا معاوضہ مجھے ایک میگزین والوں نے دیا تھا دسمبر 99ء میں سو روپے ادرا پرچوں میں بھی افسانے

نہیں ملتے؟“

”میں اس بات کو تسلیم کروں گی کہ ہم بعض اوقات غلط بھی دکھا دیتے ہیں ہر لڑکی کو حقیقی دنیا میں شہزادہ نہیں ملتا اور میں نے بہت سی لڑکیوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ ہم نے خواتین کرن اور شعاع سے بہت کچھ سیکھا بھی ہے تو افسانوں میں تو ہر بات دکھائی اور بتائی جاتی ہے۔ برائی کا انجام بھی دکھایا جاتا ہے۔“

”کہتے ہیں کہ ڈائجسٹ کی رائٹرز نے ڈرامے کو خراب کر دیا ہے۔ تمہاری رسائی کیسے ہوئی ڈرامے کے لیے اور اب تک کتنے ناولز لکھ چکی ہو؟“

”ڈائجسٹ کی رائٹرز نے تو ڈرامے کو زندہ کر دیا ہے اور کتابی شکل میں میرے اب تک چار ناولز آچکے ہیں۔ جبکہ گیارہ کتابیں افسانوں کی آچکی ہیں۔ ایک سرائیکی ناول پہ ابھی کام کر رہی ہوں سب کا اچھا رسائس ملا۔“

”لکھنے کے کیا اوقات ہوتے ہیں؟ ایسا ہوتا ہے کہ دماغ میں اسٹوری آئی۔ چلو جی سب کام چھوڑ کر پہلے اسٹوری کی تین لائنیں لکھ لوں؟“

”نہیں ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ گھر کے کاموں سے فراغت مل جائے۔ تو صبح فجر کے بعد جب میرا بیٹا اسکول چلا جاتا ہے تو میرا دل چاہتا ہے کچھ لکھنے کا یا پھر رات کے وقت سارے کام نبٹا کے لکھنے بیٹھتی ہوں۔“

”کبھی ایسا ہوا کہ اسٹوری دماغ میں آئی اور ہجوم میں بیٹھ کر بھی لکھ لیا؟“

”اب تو ایسا نہیں ہوتا البتہ جب میں یونیورسٹی میں تھی اور کوئی پلاٹ میرے ذہن میں آتا تھا تو کتنا ہی شور کیوں نہ ہوتا ہو میں لکھ لیتی تھی اور میری دوستیں بھی کہتی تھیں کہ تم لکھو ہم تمہیں نوٹس دے دیں گے اور لیٹین کرو کہ جب امتل کو افسانہ دینا ہوتا تھا تو میں پوائنٹ کی بس میں بیٹھ کر بھی لکھ لیا کرتی تھی یعنی مکمل کر لیتی تھی افسانہ اور پھر آفس آکر دے بھی جاتی تھی اور اللہ کا بڑا شکر ہے کہ میری تحریریں کبھی

شروع کیا تو میرے ذہن میں میرے گاؤں کا پورا سینہ پورا ماحول آگیا۔ میں نے چند صفحات لکھے اور رعنا کے پاس لے گئی وہ پڑھتی رہیں۔ میں منتظر تھی کہ ابھی کہیں گی کہ یہ ٹھیک نہیں ہے مگر انہوں نے کچھ نہیں کہا البتہ جب پندرہ دن کے بعد رچہ آیا تو اس میں میرا ناول تھا۔ بہت اچھا لگا، لکھنے کا سگنل تو مجھے مل ہی گیا تھا اور ناول جیسے جیسے چھپتا گیا۔ پسندیدگی بڑھتی گئی اور ”دو شہزادے“ میں آنے والا ہر خط میری تعریف میں ہوتا تھا۔ یہ ناول 20 ماہ چلا۔ اس کا نام ”شیشہ گر“ تھا پھر یابر صاحب نے فرمائش کی تو ”دروازہ کھلا رکھنا“ کے نام سے ان کے لیے ناول لکھا۔ اسی ناول ”دروازہ کھلا رکھنا“ کی ڈرامائی تشکیل ہوئی اور کچھ عرصہ پہلے ”چینا دشوار سہی“ کے نام سے سیریل چلا۔ پھر لکھا ”تجھے ہر جگہ پکارا۔“

”موضوعات کس طرح ذہن میں آتے تھے؟“

”سچ بتاؤں مجھے آج تک یہ نہیں پتا کہ کہاں سے اور کس طرح موضوعات میرے ذہن میں آجاتے ہیں۔ میں سوچتی بھی نہیں ہوں اور موضوع میرے اندر کرو میں لینے لگتا ہے۔ میرے اللہ کا مجھ پر بہت کرم رہا۔ والدہ کے انتقال کے بعد میرے لکھنے کی روٹین بالکل ختم ہو گئی اور تقریباً ”آٹھ دس سال کا وقفہ آگیا تب میں قلم کاغذ اپنے سامنے رکھ کر روپا کرتی تھی کہ لکھا ہی نہیں جاتا تھا تو میں روتی تھی کہ کہیں اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت مجھ سے چھین تو نہیں لی۔ مجھے امتل اور دوسرے بچوں کی مدد پر فون کر کے کہیں کہ لکھو اور میں اگلے ماہ کا کہہ کر ٹال جاتی تھی۔ خیر ذمہ داریاں کم ہوئیں بہنوں کی شادیاں ہو گئیں۔ خاندان میں خوشی غمی میں آنا جانا تو رہتا ہی تھا مگر بڑی ذمہ داریوں سے فراغت ہوئی تو پھر میں نے لکھنا شروع کیا اور قلم جو روٹھ گیا تھا اسے دوبارہ میں نے منایا۔“

”افسانوں، ناولوں میں فینٹسی بہت ہوتی ہے۔ لڑکیوں کو ایک آئیڈیل شوہر دکھایا جاتا ہے اور وہ اسی کا تصور کر بیٹھتی ہیں۔ جبکہ عام لائف میں شہزادے



Downloaded From
Paksociety.com

ریجیکٹ نہیں ہوتیں۔ البتہ تبدیلی ضرور کروانی
گئی۔“

”اورٹی وی ڈراموں کے لیے سنا ہے کہ ڈائریکٹر اپنی
مرضی سے اسکرپٹ چننے کو دیتے ہیں تمہارے ساتھ
بھی ایسا ہوا؟“

”سچ پوچھو تو میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا، میرے
تین ہی پروجیکٹ ہوئے ہیں ”مرجائیں ہم تو کیا جینا
دشوار سہی“ اور ”سسرال میری بہن کا“ تو جو میں نے
لکھ کر دیا وہ ہی ڈرامہ بنا اور ڈرامہ شوٹ ہونے سے
پہلے ہر چیز ڈسکس ہو جاتی ہے۔ میرے تین پروجیکٹ
تین چینلز سے ہوئے اور کسی نے کوئی چیز خود سے
نہیں بدلی۔ عامرہ شاہد کے ساتھ میں نے دو پروجیکٹ

کیے اور ایک انڈر پروڈکشن ہے اور وہ اتنی اچھی خاتون
ہیں کہ مجھے ان سے سیکھنے کا بہت موقع ملا۔“

”سوپ لکھنا آسان ہے یا سیریل لکھنا اور معاوضہ
پرکشش ہوتا ہے اور کیا وقت پر ملتا ہے؟“

”مجھے تو دونوں ہی آسان لگتے ہیں اور معاوضہ
پرکشش ہوتا ہے اور ہاں ملنے میں دیر ہو جاتی ہے اور
ایک ادارے نے تو مجھے معاوضہ کے لیے بہت تنگ کیا
ڈرامہ ختم ہونے کے کافی ٹائم بعد میرا معاوضہ clear
کیا۔ باقی جن دو اداروں کے ساتھ کام کیا انہوں نے
فورا پے منٹ دے دی۔“

”ارے وہ سوال تو رہ ہی گیا کہ ٹی وی تک رسائی
کیسے ہوئی۔ کیا تم نے خود رابطہ کیا؟“

”نہیں نہیں۔ میں نے خود نہیں کہا، کیونکہ خود
سے کہنے والے کی کوئی عزت نہیں ہوتی خواہ وہ کتنا ہی
اچھا لکھاری کیوں نہ ہو، مجھ سے عامرہ شاہد نے ہی
رابطہ کیا۔ انہوں نے میرا ناول ”گونگے دکھ“ پڑھا تھا تو
انہیں پسند آیا اور پھر کہیں سے میرا نمبر لے کر انہوں
نے مجھ سے رابطہ کیا اور کہا کہ اس کے رائٹس ہمیں
بھیج دیں تو میں نے کہا کہ آپ بتائیں میں لکھ لوں گی۔
بس آپ مجھے کوئی اسکرپٹ بھیج دیں تاکہ مجھے پتا چل
جائے کہ اسکرپٹ کیسے لکھا جاتا ہے۔ تو بس اس طرح

ٹی وی تک میری رسائی ہوئی ”گونگے دکھ“ یہ سوپ
مرجائیں بھی ہم تو کیا بنا تھا۔“
”چلو جی۔۔۔ فیلڈ کے بارے میں بہت باتیں ہو

گئیں۔ یہ بتاؤ کہ شادی کب ہوئی۔ تمہاری پسند کو کتنا
عمل دخل تھا؟“

”میری شادی 1998ء میں ہوئی ملک فیض رسول
لنگڑیال صاحب سے۔ سب بہنوں کی شادیاں ہو گئی
تھیں۔ صرف میں اور بھائی رہ گئے تھے اور میرا ارادہ
بالکل بھی نہیں تھا شادی کرنے کا، میرا خیال تھا کہ میں
اب بڑی ہو گئی ہوں تو اب کیا شادی کرنی۔ والد
صاحب اصرار کرتے تھے کہ شادی کر لو کہ اگر میں نہ رہا
تو پھر تم اکیلی رہ جاؤ گی تو پھر والد کی بات مان کر میں نے
شادی کر لی اور جہاں تک پسند کی بات ہے تو یہ بھی زمین
دار تھے اور بینک میں جاب کرتے تھے تو پہلو ہائے تھی
ان کے ساتھ اور میری خواہش تھی کہ کوئی ایسا بندہ ہو
جو ہر مہینے اپنی تنخواہ میرے ہاتھ میں لا کر دے۔ زمین
داروں کا کیا ہے۔ گندم کی فصل آئے گی گندم کٹے گی یا
کیاس کی فصل ہوگی تو پیسہ آئے گا۔ تو اس وقت دو

حصہ لینے کا شوق ہے اور یکم کا شوق ہے۔ میرے بیٹے کا نام محمد اسماعیل بیچو ہے۔۔۔ میرے میاں میرے ڈرامے بڑے شوق سے دیکھتے ہیں اور Repeat میں بھی دیکھتے ہیں۔ جہاں میرا ڈرامہ آرہا ہوتا ہے آواز دے کر کہتے ہیں۔ ”موٹو! تمہارا ڈرامہ آرہا ہے۔“

”کہتے ہیں کہ عورتیں جب کمانے لگتی ہیں تو مردوں پر رعب ڈالتی ہیں تو تم بھی ایسی ہی ہو؟“

”میرا میاں تو مجھے 1998ء سے کھلا رہا ہے جبکہ

میری کمانی تو 2011ء سے شروع ہوئی ہے۔ ہمارا جوائنٹ اکاؤنٹ ہے، میں جتنا خرچ کروں۔ مجھے منع نہیں کرتے۔“

”مزاج کی کیسی رہیں۔ نرم یا گرم؟“

”مزاج ہمیشہ میرا نرم ہی رہا۔ مجھ سے کوئی لڑ بھی پڑے تو میں خاموش رہتی ہوں۔ میری بڑی خواہش ہوتی ہے کہ مجھ سے کسی کو کوئی شکایت نہ ہو کسی کو دکھ نہ پہنچے۔“

”کھانے پینے میں کیسی ہو مہمان نواز بھی ہو؟“

”مہمان نواز ہوں۔ تم آؤ تمہیں پتا چلے کہ میں کیسی مہمان نواز ہوں اور کھانے مجھے سب پکانے آتے ہیں کیونکہ میرے میاں کھانے کے بہت شوقین

ہیں۔ کبھی اچھا نہ پکے تو ضرور کہتے ہیں کہ تم نے آج اچھا نہیں پکایا۔“

”باہر کا کھانا پسند ہے؟۔۔۔ جاتے ہیں آپ لوگ؟“

”انہیں ایسا کوئی شوق نہیں ہے البتہ میرے بیٹے کو شوق ہے تو مہینے دو مہینے میں ایک بار ضرور باہر جاتے ہیں تو وہاڑی اور بورے والا کا کوئی ہوٹل کوئی ریسٹورنٹ نہیں چھوڑا ہم نے جہاں کھانا نہ کھلایا ہو گا۔“

باتیں بہت تھیں مگر صفحات کی کمی ہے، تو ان شاء اللہ ان کا نیا سیریل آنے پر پھر بات کریں گے۔ شکریہ اقبال بانو کہ آپ نے مصروفیات سے ٹائم دیا۔



تین رشتے تھے تو فیصلہ ان کے حق میں ہوا۔ 1998ء میں شادی ہوئی اور 2004ء میں میرے میاں صاحب نے گولڈن ہینڈ شیک لے کر جاب چھوڑ دی۔ کیونکہ ان کا ٹرانسفر لاہور ہو رہا تھا اور یہ لاہور جانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ تو اس وقت سے یہ زمین ڈاری کر رہے ہیں اور ہماری بہت اچھی زمین داری ہے۔“

”فیشن سے تمہیں لگاؤ نہیں، اس کا اندازہ تو مجھے ہے؟“

”ہاں فیشن سے مجھے لگاؤ نہیں، کچھ دن پہلے میں اپنے میاں صاحب سے کہہ رہی تھی کہ مجھے ایک لپ اسٹک لادیں کہ میں تین سال سے ایک ہی لپ اسٹک استعمال کر رہی ہوں تو ہنستے ہوئے بولے تم نے مجھے کبھی کہا ہی نہیں ویسے انہیں میرے لیے کپڑے لانے کا بہت شوق ہے۔ اچھے اچھے کپڑے لے کر آتے ہیں کہ انہیں پہنو۔ انہیں میرے لیے جوتیاں لانے کا بھی شوق ہے۔ بہت خیال رکھتے ہیں۔ بہت پیار کرتے ہیں، مجھے خود سے کوئی خواہش نہیں ہوتی۔ میں ان کے ساتھ جاؤں بھی تو کتابوں کی دکان میں گھس جاتی ہوں۔ مجھے اچھی کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔“

”کبھی میاں صاحب نے ہاتھ سے قلم کھنڈ لے کر پھاڑا کہ بس کرو، بچے کو پالو؟“

”نہیں ایسا کبھی نہیں کیا۔ اور جن دنوں ڈرامہ ”سرال میری بہن کا“ لکھ رہی تھی تو چار چار بجے تک جاگ کے لکھتی تھی تو یہ ضرور کہتے تھے کہ بس کرو تمہاری آنکھیں دکھ جائیں گی۔“

”تمہارا ماشاء اللہ سے ایک ہی بیٹا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بچے دو ہی اچھے؟“

”بس اللہ کا حکم۔ اللہ نے تم نے بچے دے کر واپس لے لیے۔ اللہ تعالیٰ میرے اس بیٹے کی زندگی لمبی کرے اور صحت کے ساتھ جیتا رہے۔ میرا بیٹا تین سال کا ہے اور 9th کلاس میں ہے اور اس کو تعین پڑھنے اور لکھنے کا شوق ہے اور تقریری مقابلوں میں

حرفِ سادہ کو دیارِ عجایبِ رنگ

امت الصبور

میرے روز و شب تھے بندھے ہوئے موسموں کے مزاج سے
کبھی ایک لمحہ بھی سال تھا، کبھی سال پل میں گزر گیا

آپ کی محبتوں کے ساتھ ایک اور سال کا سفر تمام ہوا۔
43 برسوں پر محیط یہ سفر جتنا مشکل تھا، اتنا ہی آسان بھی تھا کہ اس سفر میں لگن اور شوق شامل تھا جس نے
تھکنے نہیں دیا۔

گردش ماہ و سال کی نیرنگیوں میں کئی راستوں سے گزرے، کئی اتار چڑھاؤ دیکھے لیکن قافلہ شوق رکنے نہیں پایا،
وہ شوق وہ جستجو وہ تلاش آج بھی جاری ہے۔

اس طویل سفر میں ہماری مصنفین نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا۔ ان کی سوچ اور فکر کے رنگ لفظوں میں ڈھلے تو
ان میں زندگی کے سارے منظر سمٹ آئے۔ ان کی تحریروں میں عہد حاضر کی کرب ناک حقیقتوں کی آگہی کے
ساتھ ساتھ شگفتگی، دل آویزی اور خوابوں کے دلکش رنگ بھی شامل تھے انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے
لاکھوں قارئین کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی، ان کے دلوں میں امید کے چراغ روشن کیے، یہی وجہ ہے کہ
خواتین ڈائجسٹ کے ذریعے مصنفین کو اپنی پہچان کے ساتھ ساتھ قارئین کی بے پایاں محبت و تحسین بھی ملی۔
فطری بات ہے ہم جن کو پسند کرتے ہیں، جن سے لگاؤ رکھتے ہیں، ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانتا چاہتے
ہیں، ہماری قارئین بھی مصنفین کے بارے میں ان کی ذات کے حوالے سے جانتا چاہتی ہیں۔

سالگرہ نمبر کے موقع پر ہم نے مصنفین سے سروے ترتیب دیا ہے، سوالات یہ ہیں۔

1 لکھنے کی صلاحیت اور شوق وراثت میں منتقل ہوا؟ یا صرف آپ کو قدرت نے تخلیقی صلاحیت عطا کی۔ گھر
میں آپ کے علاوہ کسی اور بہن بھائی کو بھی لکھنے کا شوق تھا؟

2 آپ کے گھر والے، خاندان والے آپ کی کہانیاں پڑھتے ہیں؟ ان کی آپ کی تحریروں کے بارے میں کیا
رائے ہے۔

3 آپ کی کوئی ایسی کہانی جسے لکھ کر آپ کو اطمینان محسوس ہوا ہو۔ اب تک جو لکھا ہے، اپنی کون سی تحریر زیادہ
پسند ہے؟

4 اپنے علاوہ کن مصنفین کی تحریروں شوق سے پڑھتی ہیں؟

5 اپنی پسند کا کوئی شعر یا اقتباس ہماری قارئین کے لیے لکھیں۔

آئیے دیکھتے ہیں، مصنفین نے ان کے کیا جوابات دیے ہیں۔

بھائی کو بھی لکھنے کا شوق تھا؟

شازیہ جمال طارق

سب سے پہلے تو اوارے کو سالگرہ کی ڈھیر

ساری مبارکباد اور امتل کا بے حد شکریہ انہوں نے

مجھے بھی مصنفین کی فہرست میں یاد رکھا۔

(شازیہ! ہم نے آپ کو مصنفین کی فہرست میں

” لکھنے کی صلاحیت اور شوق

وراثت میں ملا ہے؟ یا صرف آپ کو قدرت نے تخلیقی

صلاحیت عطا کی؟ گھر میں آپ کے علاوہ کسی اور بہن

”خبردار! جب تک میٹرک اچھے نمبروں سے پاس نہیں کر لو گی تب تک ڈائجسٹ پڑھنے کی اجازت نہیں ملے گی۔“

ایک تو میٹرک پاس اور وہ بھی اچھے نمبروں سے؟ آہ۔

ونکہ مسکراتی کرنوں اور انٹرویوز وغیرہ کی آڑ میں چوری چھپے ”اندرونی صفحات“ پڑھنے کا چسکہ تو لگ ہی چکا تھا سو آپ کی مطلوبہ شرط پر پورا اترنے کے لیے میٹرک اچھے کیا بہت اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔

البتہ آج تک دل سے یہ قلق نہیں گیا اگر آپ اپنی شرط میں تھوڑی سی نرمی برتیں تو ہم بھی اس زمانے میں تھلکہ مچاتے ٹاولز ”پیر کامل“ رقص جنوں“ سے لطف اندوز ہو جاتے۔

خیر! بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے۔ آج جب اسی آپ کی ساتھ اپنی کہانیوں کے آئیڈیاز ڈسکس کرتی ہوں تو گزر اوقت یاد کر کے بہت مزہ آتا ہے۔

”مجھ سے پہلے اس کارہنر میں میری کزن باجی بے بی (فرحانہ ناز ملک) اور آپ (نازیہ جمال) اپنی قابلیت کے جھنڈے گاڑ چکی تھیں۔ میں نے ان دونوں سے متاثر ہو کر لکھنا شروع کیا۔

میری وہ بے حد پیاری کزن جن کے حسن سیرت کی مثالیں دی جاتیں جن کی خوبیوں کا شمار ناممکن۔ ہمیں دائمی جدائی کے دکھ سے ہمکنار کر کے خود منوں مٹی اوڑھے سکون سے سو گئیں۔ ادب کا وہ روشن ستارہ ہماری یاد کے فلک پر ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔

خدا تعالیٰ اس اندوہناک حادثے میں شہید ہونے

والی میری پیاری خالہ کو ”شہزادوں جیسی آن بان رکھنے والے خاور بھائی“ ہمارے خاندان کی پہلی ڈاکٹر ہمارا فخر گرن اور باجی بے بی کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

س ”آپ کے گھر والے“ خاندان والے آپ کی کہانیاں پڑھتے ہیں۔ ان کی آپ کی تحریروں کے بارے میں کیا رائے ہے؟“

نہیں رکھا، آپ بہت اچھی مصنفہ ہیں آپ کو یہ صلاحیت اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے؟)

کسی بھی سوالنامے میں میری یہ پہلی شمولیت ہے۔ پہلی بار اپنے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے متضاد کیفیت میں ہوں۔ خیر! زندگی میں بہت سارے کام ہم پہلی بار کرتے ہیں۔ ”یہ ڈانہ لاگ بارہا میری زبان سے ادا ہوا البتہ لکھا صرف ایک ہی بار تھا۔

ہمارے خاندان میں ادب سے شغف رکھنے والوں کی کمی نہیں ہے، میرے نانا جان مطالعے کے از حد شائق ہیں۔ تمام ادبی رسائل، میگزین، اخبارات یا قاعدگی سے پڑھتے ہیں۔ اللہ ان کو صحت و سلامتی عطا کرے۔ آمین۔

دادا مرحوم کے نزدیک مطالعہ غذا جتنی اہمیت رکھتا۔ ان کے پاس کھردری جلد اور زرد صفحات والی قدیم کتابوں کا خزانہ جمع تھا۔ جسے ایک دن ان کی نصف بہتر نے تیلی دکھا کر بالن کی نذر کر دیا۔ اپنے اس عظیم نقصان پر دادا جتنا کف افسوس ملتے کم تھا۔ دادی کو پڑھی ہوئی کتابوں دوسرے معنوں میں ان کے نزدیک فارغ کتابوں کے جلائے جانے پر ان کے اس قدر جلال میں آنے کی توقع نہیں تھی اور دادا اپنی بے ادب زوجہ کو یہ سمجھانے سے قاصر رہے تھے کہ پڑھی ہوئی کتابوں کو دوبارہ پڑھنے جیسا لطف اور کسی چیز میں کہاں۔

زندگی کے آخر ایام میں بوجہ ضعیف العمری ان کا زیادہ تر وقت اپنے گھر کے باغیچے میں کتابوں کے

مطالعہ میں گزر جاتا۔ تب ان کا حال ”کتابیں دو“ دعائیں لو“ والا ہوتا تھا۔ وفات سے پہلے وہ اپنا ”بچا کھچا دلی سرمایہ“ اپنے گھر کی پہلی پوتی آپلی نازیہ کے حوالے کر گئے تھے۔

اور نازیہ آپلی۔

اپنا معصوم لڑکھن یاد کر کے دانت کچکچاؤں یا پاؤں پٹنوں۔ کسی جابر حکمران کی مانند ہم تینوں بہنوں کو اپنی کڑی نگرانی میں رکھا۔

کار جہاں دراز ہے۔ اسی تک دو میں ہوں کچھ ایسا لکھوں جسے فخریہ والد صاحب کو پڑھوا کر ان کی داد سمیٹوں۔

س ”آپ کی کوئی ایسی کہانی جسے لکھ کر آپ کو اطمینان محسوس ہوا ہو؟ اب تک جو لکھا ہے۔ اس میں سے اپنی کون سی تحریر زیادہ پسند ہے؟“

ج ”میرا تخلیقی سفر زیادہ طویل نہیں ہے۔ البتہ اپنی ہر تحریر کو مکمل کرنے کے بعد مجھے سکون ہی ملا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ لکھتے لکھتے خیالات کا تانا بانا تھوڑا سا الجھا اور میں سب کچھ سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔“

میری فائل میں بے شمار ادھوری کہانیاں اپنے مکمل کیے جانے کی منتظر ہیں۔ ان گنت کردار مجسم ہو کر نگاہوں کے سامنے پھرتے ہیں۔ خیالات تصور کے پردے سے جھانکتے ہیں اور بے چین کر ڈالتے ہیں۔

”سرخ جوڑا“ لکھ کر بہت اطمینان ملا تھا۔ ”پارش کے ہاتھ میں پھول“ عنوان سوچ کر کہانی لکھنا شروع کی تھی اور عنوان کے مطابق ہی اینڈ کیا۔

س ”ہوئے تم مہمان؟“ بہت انجوائے کر کے لکھا تھا۔ مجھے اپنی ہر وہ تحریر لکھتے ہوئے مزہ آتا ہے جس میں بے ساختگی ہو۔

سرال ماشا اللہ بہت اچھا ملا ہے۔ بالکل بھی روایتی ماحول نہیں ہے۔ میری بڑی مند نوشین باجی اور خالہ (ساس) ہر ماہ باقاعدگی سے ڈائجسٹ پڑھتی ہیں۔

شاید ہی کسی نے ان کی طرح پڑھے ہوئے تمام ڈائجسٹ ترتیب اور احتیاط سے رکھے ہوں۔ پہلے ای اور اب خالہ لکھنے کے لیے بہت تعاون کرتی ہیں گو کہ پہلے بھی بہت جم کر نہیں لکھا لیکن شادی کے بعد

تسلسل سے نہیں لکھ پارہی تو اس کے پیچھے سراسر میری سستی اور تسال پسندی کار فرما ہے (نجانے میں لکھنے کے معاملے میں اتنی کاٹل کیوں ہو گئی ہوں؟)“

س ”اپنے علاوہ کن مصنفین کی تحریریں شوق سے پڑھتی ہیں؟“

ج ”میں تقریباً“ سب ہی مصنفین کو شوق سے پڑھتی ہوں۔“

ج گھر والوں میں میری امی میری ہر تحریر بہت شوق سے پڑھتی ہیں اور ان کو ہر تحریر کا ”اچھی اینڈ“ درکار ہوتا ہے۔ بھلے سے کہانی جتنی بھی ”ٹریجک“ ہو۔ ”میرے اچھے چاند“ ایک ہی نشست میں ختم کرنے کے بعد میری چھوٹی بہن سعدیہ نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا تھا۔

س ”اگر میں اوپر تمہارا نام نہ پڑھ چکی ہوتی تو یقیناً“ یہی سمجھتی کہ یہ ناول کسی بڑی ریاضت نے لکھا ہے۔“

ج ”تخریبی میڈم! کیا میں اسے اپنی تعریف سمجھوں؟“

س ”آپنی نازیہ کی تعریف و تنقید میرے لیے اصلاح کا درجہ رکھتی ہے۔“

س اور ہمارے گھر کی خاموش ریڈر ہماری بیوی کو سن (باجی آسیہ) سے جب بھی پوچھو یہی جواب ملتا ہے ”ہاں وہ تو میں نے پڑھی تھی۔ اچھی تھی۔“ اور بس!

س ”زین العابدین کی ممان لیں۔ تبصرے کے لیے اتنی کتنی چہ معنی وارو؟“

میری بہترین دوست انیس فاطمہ میری ہر تحریر پر بہت تسلی سے تبصرہ کرتی ہے اور مجھے اس کے تبصرے کا دل سے انتظار رہتا ہے۔

میرے شوہر حاجی طارق جدہ میں جا ب کرتے ہیں۔ اپنی ٹف روئین کی وجہ سے پڑھنے جیسے مشاغل کے لیے وقت نہیں نکال پاتے۔ یہ بات ان کے علم میں ہے کہ میں لکھتی ہوں۔ کیا لکھتی ہوں اس بات سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ البتہ شادی کے مختصر عرصے بعد ان کا یہ کہنا ”تمہیں لکھنے کے لیے صنفی وغیرہ لاؤں؟“ میرے لیے کسی حوصلہ افزائی سے کم نہیں۔

ہم دونوں بہنوں کے لکھنے میں ہمارے والد صاحب کی حوصلہ افزائی نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ ان کے بارہا یاد دلانے کے باوجود میں نے انہیں آج تک

اپنی کوئی تحریر پڑھنے کے لیے نہیں دی۔ ”ابو جی! آپ کی خواہش سر آنکھوں پر! لیکن مجھے لگتا ہے میں ابھی اس معیار تک نہیں پہنچی کہ اپنا لکھا ہوا آپ کو پڑھنے کے لیے دوں۔“

خامشی کو بیار ملے

اسات الصبوف

مسرت الطاف احمد... کراچی

محسوس کرتی ہوں۔ پودوں کے ساتھ باتیں کرنا ان کی کیئر کرنا ان کے ساتھ وقت گزارنا بہت اچھا لگتا ہے۔ سردیوں میں آئس کریم کھانے کی دیوانی ہوں۔ شاعری سے بھی لگاؤ ہے، کمپیوٹر پر بیٹھنا، میوزک سننا لیکن سوفٹ سائنگز بہت پسند ہیں ڈریس ڈیزائننگ بھی کرتی ہوں۔ فارغ اوقات میں میرے پاس کرنے کو

بہت کچھ ہوتا ہے ہمیں کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہوں۔ فارغ رہ ہی نہیں سکتی کیونکہ کہ اس سے پہلے کہ عم اور مایوسی ہمیں فنا کر دیں ہمیں اپنے آپ کو کام میں غرق کر دینا چاہیے۔ بقول شاعر۔

چراغ شب کو جیسے آندھیاں اچھی نہیں لگتیں کچھ ایسے ہی ہمیں خوش فہمیاں اچھی نہیں لگتیں

آسمان کی بلندی تک پہنچائے گا میرا ہنر مجھ کو مجھے قدموں کے نیچے سیڑھیاں اچھی نہیں لگتیں

(2) - ہر انسان خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جہاں تک میری خوبیوں اور خامیوں کا تعلق ہے تو بقول امی کے خامیوں میں ضدی طبیعت کی مالک ہوں۔ اگر کسی بات پر اڑ جاؤں تو خدا خیر کرے۔ بہت ہی حساس ہوں پھوٹی پھوٹی باتوں کو بہت محسوس کرتی ہوں اور خوبیوں میں کھانے پینے میں کوئی نخرہ نہیں کرتی کچھ بھی ہو کھا لیتی ہوں۔ پنے اوڑھنے کا بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ امی عموماً "بہنوں کے ساتھ مل کر میرے لیے بھی شاپنگ کرتی ہیں" یہ الگ بات ہے میرے کپڑوں کی ڈیزائننگ بہت اسٹائلش ہوتی ہے۔ سمیعا کا کہنا ہے "میری ایک عادت بہت بری ہے۔ میں جب بھی کسی سے ناراض ہوتی ہوں تو کبھی پہل نہیں کرتی اور خوبیوں میں سمیعا کے نزدیک میں

(1) - میرا نام مسرت الطاف احمد ہے گھر میں مجھے عموماً "موسی (Musy)" کہہ کر پکارا جاتا ہے اور اگر کچھ زیادہ ہی پیار آ رہا ہو تو میں موسی سے موسو ہو جاتی ہوں۔ میری تاریخ پیدائش 4 مئی اور اشار ثور ہے۔ میں نے لی اے کی ڈگری حاصل کی۔ ایم اے کی شدید خواہش ہونے کے باوجود ایم اے نہیں کر سکی کیونکہ یہ میرے اختیار میں ہی نہیں تھا۔ ہم پانچ بہنیں ہیں۔ بہنوں میں میرا پس صائمہ کا نمبر دو سرا ہے۔ جی ہاں قارئین! سب سے مزے کی بات تو یہی ہے کہ ہم جزواں ہیں۔ اس خوبی کی وجہ سے ہم کہیں بھی جاتے ہیں تو پسندیدگی اور حیرت و تجسس کی ملی جلی کیفیات دیکھنے کو ملتی ہیں تو ہم اس پروجیکشن کو بہت انجوائے کرتے ہیں لیکن ہم دونوں کے عادات و اطوار ایک دوسرے سے ٹوٹتی ڈفرنٹ ہیں۔ میں مطالعے کی پائلن پن کی حد تک شوقین ہوں اچھی اچھی کتابیں پڑھنا اور لکھنا میرا واحد مشغلہ ہے جس سے اپنے آپ کو بہت فریش فیل کرتی ہوں۔ جب کہ صائمہ کتابیں اور دیگر رسائل دیکھ کر روفوچکر ہو جاتی ہے۔ ہم ساری بہنیں سارا وقت ہنسی مذاق اور مستی کرتے گزارتے ہیں۔ ایک دوسرے سے نوک جھونک بھی لگی رہتی ہے۔ خوب اودھم مچاتے ہیں اور ہمارے سویٹ سے بھانجے محمد راجیل اپنی شرارتوں اور بلیک میلنگ میں ہم سے بھی آگے پائے جاتے ہیں۔

گھر ہو یا خاندان، اسکول ہو یا کالج ہر محفل کی جان ہوں۔ ہر محفل میں اپنے اسٹائل، اعلیٰ ذوق اور اپنی شخصیت کی وجہ سے ایک منفرد حیثیت رکھتی ہوں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں ہر جگہ پیار ملا، عزت و محبت ملی۔ ہر وقت اپنے آپ کو بہنوں کی دعاؤں کے حصار میں

دیتے ہیں مثبت سوچ ہی ہماری زندگی کو خوب صورت بنا سکتی ہے۔ بقول شاعرہ:

شمع بجھ جائے تو جل سکتی ہے
کشتی ہر طوفان سے نکل سکتی ہے

مایوس نہ ہو اپنے ارادے نہ بدل
کہ تقدیر کسی وقت بھی بدل سکتی ہے

(3) خواتین سے وابستگی کو پانچ سال ہو گئے اور یہ رشتہ وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ اس حسین سفر کی ابتداء کو یاد کرنے بیٹھی تو دل و دماغ مکمل طور پر ان پرانی اور خوشگوار یادوں میں ڈوب سے گئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کل ہی اس محبت کے سفر کی پہلی سیڑھی پر میں نے قدم رکھا تھا۔ وقت

گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا اور آج جب پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو یاد آتا ہے کہ اس سفر کے دوران کئی قابل فخر لمحات آئے جس سے میری خود اعتمادی میں مزید اضافہ ہوا۔ خواتین ڈائجسٹ نے میری زندگی میں جو

بہادر ہوں، بہادر ہوں پریشانیوں سے نہیں گھبراتی۔
بہت ہمت والی ہوں کیونکہ میرا اللہ سے رشتہ بہت گہرا
اور مضبوط ہے، آزمائشوں سے کبھی مایوس نہیں ہوتی۔
میرا اللہ پختہ بھروسہ ہے۔

شکوہ کرتے نہیں تقدیر کا ہمت والے

خود بدل دیتے ہیں تقدیر مگر روتے نہیں

ندا کے نزدیک خامیوں میں اپنی فلیٹنگز کسی سے
شیئر نہیں کرتی بہت جلد بدگمان ہو جاتی ہوں اور خوبی
کیزفل ہوں، ہر کسی کی اہمیت کرتی ہوں۔ ام رباب کو
میرا ہنکچو نکل ہونا بھی خامی لگتا ہے کیونکہ میں ہر
کام ٹائم پر کرتی ہوں۔ اٹھنے کے ساتھ ہی اپنا شیڈول

بناتی ہوں، کب کیا کرنا ہے۔ مجھے ست الوجود لوگ
پائلکل نہیں پسند۔ جب میں نے صائمہ سے اپنی خامی
پوچھی تو اس کا چہرہ خوشی سے لال ٹماڑ جیسا ہو گیا۔ وہ تو
جیسے پھٹ پڑی کانٹنٹس ہو، انور بہت کرتی ہو، موڈی
ہو، کسی کو ایڈوائز نہیں دیتی (یہ صرف صائمہ کا نظریہ
ہے) میں جب بھی رسالہ پڑھنے میں مشغول ہوتی
ہوں وہ جان بوجھ کر اسی وقت مشورہ لیتی ہے تاکہ میں
ڈسٹرب ہو جاؤں اور خوبی میں بس اتنا کہا کچھ زیادہ ہی
نفاست پسند ہوں، وہ بھی منہ بگاڑ کر۔ میرے نزدیک
خامیوں میں، میں کافی حد تک شدت پسند ہوں۔ جن
لوگوں کی باتیں چھید کر جائیں باوجود کوشش کے بھلا
نہیں پانی اور خوبیوں میں کچھ کر دکھانے کی لگن ہے،
مستقل مزاج ہوں، فرینڈلی ہوں، کو آریٹو ہوں، ہر
وقت ایکٹو رہتی ہوں اور ہر حال میں اللہ کا شکر ادا ضرور
کرتی ہوں۔ اپنے رب سے باتیں کرنا مجھے اچھا لگتا
ہے، مجھے مطلب پرست خود غرض لوگوں سے سخت
نفرت ہے۔ اپنے مزاج میں تبدیلی کی خواہاں ہوں
کیونکہ مجھے بہتر سے بہتر بننا ہے، جب تک ہم خود
اپنی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں لائیں گے ہماری محدود
سوچ، رویہ اور ہمارا عمل تبدیل نہیں ہوگا۔ مثبت سوچ
اور بلند خیالات، غنموں اور مایوسیوں کو ہم سے دور کر
کے ہمارے لیے فتح اور کامیابی کے دروازے کھول

ہیوٹی بکس کا تیار کردہ
Herbal
سوہنی شیمپو
SOHNI SHAMPOO

اس کے استعمال سے چند دنوں میں خشکی ختم
گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے

قیمت - 100/- روپے
رجسٹری سے منگوانے پر اور منی آرڈر سے منگوانے والے
دو بوتلیں - 250/- روپے تین بوتلیں - 350/- روپے
اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔
بذر پورڈاک سے منگوانے کا پتہ
ہیوٹی بکس 53 اورنگزب مارکیٹ، ایم اے جناح روڈ، کراچی۔
وئی خریدنے کے لیے:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار کراچی۔ فون نمبر 32216361

مثبت تبدیلی پیدا کی ہے وہ قابل تعریف ہے بقول

شاعر:

نہیں دیکھا تمہارے بعد کوئی دوسرا ہم نے
کہ آپ ہی اپنا جواب ہو تم
جیسے بھلا نہ سکے گا یہ سارا جہاں
وہی انمول شاہکار ہو تم

اس سے رشتہ اتنا خاص ہے کہ میرے ابو نہ صرف
میری تحریریں خود پوسٹ کرتے ہیں بلکہ ایک ساتھ
درجن بھر لگانے بھی لاتے ہیں۔ آج اگر میں اس
محفل میں شرکت کر رہی ہوں تو میں اس کا کریڈٹ بھی
اپنیا کو دینا چاہوں گی۔

ایسی بہت سی تحریریں ہیں جو آج بھی خوب
صورت یا دین کر دل میں نقش ہیں اور برسوں ہمارے
ذہنوں پہ حاوی رہیں گی فرحت اشتیاق کا ناول ”جو پتے
ہیں سنگ سمیٹ لو“ بہت ہی متاثر کن اور دل کو چھو
لینے والی تحریر تھی۔ اب تک سکندر شہریار کے کردار کو
بھلا نہیں پائی۔ سائرہ رضا کا ناول ”یقین کامل ہی زندگی
ہے“ اس ناول نے بہت زیادہ انسپائر کیا موضوع
بہت ہی اسٹرونک تھا۔ میونہ صدف کا ناول ”زبل“
دل دہلا دینے والی تحریر تھی۔ حقیقت کے بہت ہی
قریب تر محسوس ہوئی اس ناول کے ہر جملے نے
آنکھیں نم ہونے پر مجبور کر دیں۔ نمرہ احمد کا ناول
”قراقرم کا نوج محل“ اور ”جنت کے پتے“ بھی اپنی
مثال آپ ہیں بحر ساجد کا ناول ”پہلا اور آخری داؤ“
دل میں اترتا ہوا محسوس ہوا عنایا کا کردار بہت ہی
زبردست تھا۔ سمیرا حمید کا ناول ”خیال یار“ قناسٹک
تحریر تھی طرز تحریر بہت ہی اثر انگیز تھا اور لاسٹ میں
عمیرہ احمد کا ناول ”آب حیات“ بہت ہی آوٹ
اسٹینڈنگ تحریر ہے۔ پر تجسس اور اٹریکٹو اور ایسی بہت
سے تحریریں ہیں جو ہماری زندگی کی بھرپور اصلاح کرتی
ہیں اور میں دل سے قدر دان ہوں ان رائٹرز کی جو اپنی
خوب صورت کاوشوں سے اس کو سجاتی ہیں اور
ہمارے لیے اتنی محنت اور دل جمعی سے لکھتی ہیں۔
بقول شاعر:

تو میری سانس کی ہر ڈور سے وابستہ ہے

اب مجھے چاہتے رہنے کے سوا کیا کرنا
(4) مجھے برتھ ڈے سلیبریٹ کرنے کا جنون کی
حد تک شوق ہے۔ بہت بار کالج میں فرینڈز کے ساتھ
دھوم دھام سے برتھ ڈے سلیبریٹ کیا۔ سب فرینڈز
کے گفٹس آج بھی میں نے بہت ہی سنبھال کے
رکھے ہیں۔ ایک بار گھر والوں نے میرے اور صائمہ
کے لیے سر پر اترتے برتھ ڈے ارنج کیا، ہم نے بہت
انجوائے کیا۔ اس دن امی اسپیشل ڈش بناتی ہیں۔ ابو
آئس کریم کیک ضرور لے کر آتے ہیں وہ دن میری
زندگی کا سب سے خوب صورت دن ہوتا ہے۔

(5) شاعری سے کافی حد تک گہرا لگاؤ ہے کیوں کہ
یہ ہماری احساسات کی ترجمانی کرتی ہے، جب جذبات کو
لفظوں کا روپ دینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ پسندیدہ شعر:
عزم انساں ہے کہ بن جائے فرشتہ لیکن
ہر فرشتے کو یہ حسرت ہے کہ انساں ہوتا

(6) پسندیدہ اقتباس: ناول ”یقین کامل ہی زندگی
ہے“ اس جملے نے مجھے بہت زیادہ انسپائر کیا:

”اللہ کی انصاف پسند نگاہ تمہارے اوزان پر تھی،
تمہارا ایک پلڑا دعاؤں سے لدا رہا تھا مگر جب تولا گیا تو
دوسرے پلڑے میں موجود خدشات بھاری نکلے۔ جو
دعا کرتا ہے وہ خدشہ نہیں پالتا۔ ہم دعا نہ بھی کریں مگر
یقین کر لیں تو کامیابی قدم چومتی ہے۔“ اما یہ خان کے
ناول ”بت شکن“ کا یہ جملہ بہت ہی متاثر کن لگا:

”دنیا میں دو طرح کے انسان ہوتے ہیں، ایک خود
پرستی میں مبتلا، ایک خود ترسی میں، دونوں کیفیات
انسان کو صرف ”میں“ تک محدود رکھتی ہیں۔ وہ
صرف اپنے بارے میں ہی سوچتے ہیں، ایک ظالم تو
دوسرا مظلوم بن کر تمام عمر اسی رنج میں گرفتار رہتا ہے
کہ اسے اس کا حق نہیں ملا، یہ دونوں انسان کبھی خوش
نہیں رہتے۔ بے یقین، بے اعتبار ہی رہتے ہیں کسی
نعمت کا شکر ادا بھی نہیں کرتے۔“

آخر میں بس یہ کہوں گی ہمیشہ خوش رہیں اپنے لیے
نہ سہی دوسروں کے لیے، کیوں کہ شاید کسی کی زندگی
کی امید تم سے وابستہ ہو۔





Downloaded From
Paksociety.com

عمیرہ احمد

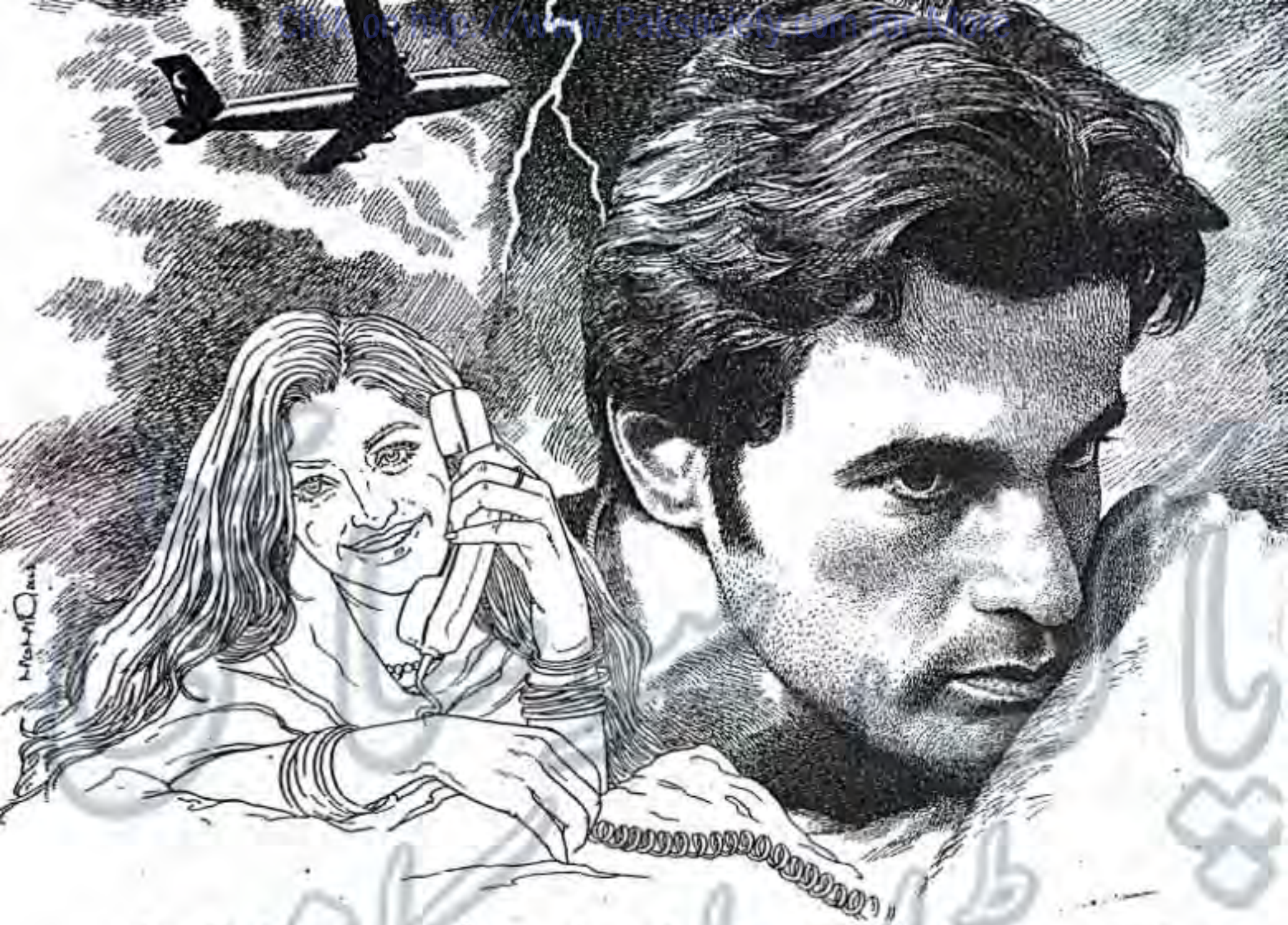


آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔
2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کر دیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ابر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سرائل جاتا ہے۔

READING
Section

36 نومبر 2015



3۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون اور ادویات کے بغیر سو نہیں پارہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ لی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ۔ منسی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتادیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست بچے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد، مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی اس نے اس بار بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

تیرہویں قسط

یا مجیب السالین

وہ ٹی وی آن نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن بے چینی کے باعث ٹی وی بند کر کے بھی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ دنیا کے بہت سے ممالک میں کروڑوں لوگوں کی طرح امامہ نے بھی ہوٹل کے کمرے میں سالار سکندر کو اس اسٹیج پر لاکھوں کے مجمع کے سامنے تقریر کا آغاز کرتے سنا اور دیکھا تھا۔ وہ سرد اور تقریباً "بے حس و حرکت وجود کے ساتھ کسی بت کی طرح اس شخص کوئی وی پر دیکھ رہی تھی۔ گو اس کے وجود میں کہیں حرکت تھی تو اس کے دل کے دھڑکنے کی۔ جو اتنی بلند تھی کہ اس وقت اس کے پاس بیٹھا کوئی شخص بھی سن سکتا تھا یا پھر اس زبان پر اس شخص کی زندگی کے لیے کی جانے والی دعاؤں کی مجنہیں اللہ سن رہا تھا۔

سالار سکندر نے زندگی میں بہت ساری تقریریں کی تھیں لیکن ان میں سے کوئی تقریر بھی لاکھوں کے ایک ایسے مجمع کے سامنے نہیں تھی جس سے وہ انسانی ہمدردی کے علاوہ اور کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔

وہ Lingala (مقامی زبان) میں ان سے بات کر رہا تھا اور جو کچھ وہ کہہ رہا تھا۔ وہ ترجمہ ہو کر ٹی وی کی اسکرین پر نظر آ رہا تھا۔ پوری دنیا میں کی جانے والی ٹی وی کوریج میں سوا حلی اور لنگالا میں کی جانے والی وہاں کے مقامی لیڈرز کی ہر تقریر کو انگلش اور دوسری بین الاقوامی زبانوں میں ترجمہ کر کے پیش کیا جا رہا تھا۔ نہ امامہ کو اندازہ تھا اور نہ ہی سالار سکندر کو کہ وہ آج افریقہ کے اس سیاہ فام مجمع کے سامنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبہ کو دہرائے گا۔ وہ الفاظ جن کی بازگشت سے وہ ہمیشہ چھپتا رہا تھا وہ اس کے لاشعور سے تصور کا سفر طے کر کے زبان پر آکر نہیں رکے تھے وہ لاکھوں کے اس مجمع کے سامنے ادا ہو کر کروڑوں لوگوں تک پہنچے تھے۔

اس نے بسم اللہ سے اپنی تقریر کا آغاز کیا تھا ہمیشہ کی طرح۔ اس نے مجمع کو قرآنی آیات سنائی تھیں۔ کہ عزت اور ذلت صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس کے بعد اس نے سراٹھا کر مجمع کو دیکھا تھا اور پھر جیسے اس کا ذہن خالی ہو گیا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ بھول گیا تھا کہ اسے وہاں کیا کہنا تھا۔ اس نے سر جھکا کر دوبارہ روٹم پر رکھے اس کاغذ پر نظر دوڑائی تھی جس پر اس نے اس تقریر کے نکات لکھے تھے۔ وہ ساری عمر صرف نکات نوٹ کر کے ہی تقریریں کرتا رہا تھا۔ اپنی یادداشت اور اپنے علم پر ایسا ہی اندھا یقین رکھتا تھا وہ اور اب وہ بالکل خالی ذہن کے ساتھ ہو نقول کی طرح اس مجمع کو دیکھ رہا تھا جو اس کے اگلے الفاظ کے منتظر تھے۔ اس کے پچھلے الفاظ ان کے سر سے گزرے تھے۔ افریقہ کے وہ قبائل جو اس وقت وہاں اکٹھے تھے وہ آج بھی اللہ کی عبادت نہیں کرتے تھے، نہ ہی اللہ کے وجود کو پہچانتے اور مانتے تھے۔ وہ بہت سی دوسری چیزوں کو اعلیٰ برتر مانتے تھے۔ ان کے لیے وہ رب (جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے) بھی اتنا ہی نا آشنا تھا جتنا وہ "رب جو عزت اور ذلت عطا کرنے پر قادر تھا۔" سالار سکندر کو اب ایسا اور کیا کہنا تھا جو سمجھ میں آتا اور بہت آسانی سے آتا اور یہی وہ لمحہ تھا جب اسے آخری خطبہ یاد آیا تھا۔

"میں ایک ایسی آرگنائزیشن کا حصہ ہوں جس نے ماضی میں اس خطے اور آپ لوگوں کے ساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں۔ آپ لوگوں کو کمتر سمجھا گیا۔ آپ لوگوں کے حقوق چھینے گئے۔ آپ لوگوں کے وسائل اور اثاثوں پر ناجائز قبضہ کیا گیا۔ میں اس سب کے لیے آپ سے معذرت خواہ ہوں کیوں کہ میں ایک ایسے مذہب کو ماننے والا ہوں جو یہ سب "گناہ" قرار دیتا ہے۔ میں ایک ایسے مذہب کا ماننے والا ہوں جس کے پیغمبر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) امانتوں میں خیانت سے منع کرتے تھے۔ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند کرنے کی تلقین کرتے تھے جو اپنے لیے جنہوں نے بتایا "کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر برتری حاصل نہیں ہے۔" وہ انسانی مساوات کی بات کرتے تھے۔ ذات پات، رنگ و نسل، چھوت چھات کو نہیں مانتے تھے۔

READING
Section

سالار سکندر حافظ تھا، مبلغ نہیں تھا۔ مقرر تھا، مفسر نہیں تھا۔ زندگی میں اس نے کبھی اپنے پروفیشن میں مذہب کو لانے کی کوشش نہیں کی تھی وہ آج بھی اس نیت سے وہاں نہیں آیا تھا پر اس وقت جو بھی اس کی زبان سے نکل رہا تھا وہ دل کی آواز تھی اور دلوں تک جا رہی تھی۔

افریقہ میں غیر انسانی حالات میں رہنے والا وہ سیاہ فام مجمع اس کی باتیں سن رہا تھا اور اب پہلی بار ساکت و صامت خاموشی کے ساتھ سن رہا تھا۔ اور اس خاموشی کو ایک بے اختیار داد و تحسین نے توڑا تھا۔ یہ داد سالار سکندر کے جملے پر نہیں ملی تھی۔ یہ داد نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخر الزماں کے آخری خطبے کے ایک بنیادی فلسفے کو ملی تھی۔ وہ اللہ کا پیغام تھا جو آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے چودہ سو سال پہلے آیا تھا اور آج چودہ سو سال بعد بھی وہ پیغام دلوں کو تسخیر بھی کر رہا تھا، ان پر مرہم بھی رکھ رہا تھا۔ اس لیے کہ وہ پیغام انسانیت کے لیے تھا۔ قیامت تک کے لیے تھا۔ ہیڈ کوارٹرز میں بیٹھے لوگ اب بھی گنگ تھے لاکھوں کا وہ مجمع اس آوی کو اپنے رعب میں نہیں لے پایا تھا لیکن اس آوی کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ اس لاکھوں کے مجمع کو جیسے اس کی تمٹھی میں لے آئے تھے۔ سالار سکندر نے وہ اسم اعظم پڑھتے ہوئے افریقہ کی نبض پر ہاتھ رکھا تھا جو چودہ سو سال پہلے بھیج دیا گیا تھا۔

Downloaded From Paksociety.com

امامہ بھی دم بخود تھی۔ وہ شخص کس جگہ کھڑا کیا دہرا رہا تھا اور اگر اسے اس آخری خطبہ کا یہ حصہ یاد تھا تو یہ کیسے ممکن تھا باقی حصہ یاد نہ ہوتا۔ اور یاد تھا تو اس لیے کہ وہ نہیں گڑ گیا تھا۔

”یہ لوگ بابا کے لیے تالیاں کیوں بجا رہے ہیں؟“

وہ جبریل کے سوال پر جیسے چونک پڑی تھی وہ اس کے پاس بیٹھانی دی دیکھ رہا تھا۔ امامہ صرف اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔

تالیوں کی گونج اب ختم رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک بھتی رہی تھیں۔ اتنی دیر تک کہ سالار سکندر کو یاد آ گیا تھا کہ اسے آج وہاں کیا کہنا تھا لیکن اب اپنے بھولے ہوئے الفاظ یاد آنے پر اسے خوشی نہیں ہوئی تھی۔ تاثر اس میں تھی جو بھول کر یاد آیا تھا۔

”میں افریقہ میں اپنے مذہب کے ان ہی اصولوں اور اسی سوچ کے ساتھ کام کرنے آیا ہوں اور کام کروں گا اور میں آپ لوگوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر مجھے یہ احساس ہوا کہ میں ان اصولوں پر آپ لوگوں کی فلاح کے لیے کام نہیں کر سکتا تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ لیکن میں ان طاقتوں کے ہاتھ مضبوط نہیں کروں گا۔ جن کے خلاف پیٹرس ایباکانے جنگ کی اور جن سے لڑتے ہوئے اس نے جان دی۔“

سالار سکندر کہہ رہا تھا۔

”لیکن ایباکانے اپنی جان اس لیے قربان نہیں کی کہ وہ اپنے لوگوں کو بدترین حالات میں جیتا دیکھے۔ وہ اپنے لوگوں کے لیے خواب دیکھتا تھا ایک اچھی زندگی کے خواب۔“

سالار سکندر اب انہیں ایباکانے کی آخری ای میل سن رہا تھا۔

”میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ میں جب تم سے پہلی بار ملا تھا تو میں اس جنگ میں ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ ناامیدی اور مایوسی کے علاوہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ میں ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا تھا۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہو رہا تھا اور میں بہت کمزور تھا۔“

میں ان دیوؤں کے سامنے واقعی ایک ہکمی تھا جو میرے ملک کو لوٹنے آئے تھے اور میں کچھ کر نہیں پار رہا تھا، اپنے لوگوں کے لیے اور پھر میں تم سے ہلا اور مجھے لگا، مجھے ابھی ہتھیار نہیں ڈالنے چاہئیں۔ ابھی امید زندہ ہے۔ تمہاری صورت میں۔ اور میں تھیک تھا میں نے امید نہیں چھوڑی۔ جنگ جاری رکھی اور میری امید مجھے یہاں

لے آئی کہ اب چند دنوں میں پوری دنیا کانگو کے بارے میں بات کرے گی۔ ہم چھوٹے کالے کالے بد صورت معمولی انسانوں کے بارے میں۔ جو دنیا میں مفتوح اور غلام بننے نہیں آئے۔ مجھے یقین ہے اب کانگو کی تاریخ بدلنے والی ہے۔ میرے لوگ اب ایک اچھی زندگی جنیں گے۔ انسانوں جیسی زندگی جانوروں جیسی نہیں۔“

مجمع سالار سکندر کے ہر جملے پر دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ وہ ایسا کاکی آخری ای میل نہیں جیسے آخری وصیت تھی جو صرف سالار سکندر کے پاس تھی۔

”اور ایسا کا جو خواب کانگو کے لیے دکھاتا تھا وہ بھوک، جنگ اور بیماری کا خواب نہیں تھا وہ امن اور انسانیت پر یقین رکھتا تھا اور زندگی کے آخری لمحے تک وہ امن ہی کی بات کرتا رہا اور یہ امن وہ اپنے لیے نہیں آپ لوگوں کے لیے چاہتا تھا“ اپنے لوگوں کے لیے ایسا کا کو اس سے بڑا خراج تحسین آپ تک پیش نہیں کر سکیں گے جب تک اس کانگو کو ایک جدید ترقی یافتہ قوم اور ملک نہ بنا دیں اور کانگو یہ کر سکتا ہے۔ ہنگامہ زیدہ کر سکتے ہیں اور میں اور میرا ادارہ پیٹرس ایسا کا کا یہ خواب پورا کرنے میں آپ لوگوں کے ساتھ کھڑا ہے۔ ہم جانے والے کل کو نہیں بدل سکتے۔ آنے والا کل ہمارے ہاتھ میں ہے۔ میری خواہش ہے کہ اکیسویں صدی کا کانگو ایسا کا جیسے اور بہت سے لیڈرز پیدا کرے۔ جو ترقی امن اور کانگو کے بہتر مستقبل کا تصور لے کر آگے چلیں اور ترقی یافتہ قوموں کی صف میں شامل ہو جائیں۔ یہ میرا پیغام نہیں ہے یہ ایسا کا کا پیغام ہے۔ جو کسی مذہب پر کاربند نہیں تھا لیکن اللہ کے وجود کو مانتا تھا اور یہ زمین اللہ کی ہے اللہ کے بندوں کے لیے ہے۔ کسی غاصب کے لیے نہیں ہے۔ سامراج کے لیے نہیں ہے۔ آپ کے لیے ہے۔ کانگو کے لوگوں کے لیے ہے۔“

لاکھوں کا وہ مجمع جو چند لمحے پہلے تک ایک ناقابل تخیر پہاڑ لگ رہا تھا اب تخیر ہو چکا تھا۔ وہ سالار سکندر کے الفاظ پر رو رہا تھا۔ اس کے الفاظ پر تالیاں بجا رہا تھا۔ اس کے الفاظ پر نعرے لگا رہا تھا۔

سالار سکندر اپنی تقریر ختم کر کے رو شرم سے ہٹ چکا تھا۔ اس کے رو شرم سے واپس اپنی نشست کی طرف جاتے ہوئے لاکھوں کا وہ مجمع سالار سکندر کا نام پکار رہا تھا۔ افریقہ سالار سکندر کا نام پکار رہا تھا۔ وہ رو شرم پر آیا بھی آوازوں کی گونج میں تھا وہاں سے واپس بھی آوازوں کی گونج میں ہی ہوا تھا لیکن اب ماحول تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ دس منٹ کی تقریر کے لیے گیا تھا اور آدھے گھنٹے کے بعد وہاں سے ہٹ سکا تھا۔ اور وہ اس کی زندگی کا طویل ترین آدھا گھنٹہ تھا صرف اس ہی کی نہیں امامہ کی زندگی کا بھی۔ آسو صرف اس مجمع کی آنکھوں سے ہی رواں نہیں ہوئے تھے۔ امامہ کی آنکھوں سے بھی برسنے لگے تھے۔ وہ مجمع سالار سکندر کو اپنا نجات دہندہ کے طور پر دیکھتے ہوئے رو رہا تھا اور امامہ ہاتھ اس ”نجات دہندہ“ کی جان ایک بار پھر بچ جانے پر۔

”آپ کیوں رو رہی ہیں ماما؟“ جبریل نے کچھ پریشان ہو کر ماں کو دکھا تھا جو پچھلے کئی گھنٹوں سے کچھ بھی بولے بغیر گم صمنی وی کے سامنے بیٹھی تھی اس کے کسی سوال کا جواب دیے بغیر اور اب ایک دم رونے لگی تھی۔ امامہ نے کچھ بھی کہے بغیر اسے لپٹا لیا۔ انسان روتا کیوں ہے؟۔ یہ آسان سوال کبھی کبھار الجبرا کا سوال بن جاتا ہے۔ وہ دس منٹ سالار کو جیسے شرم ساری کے سمندر میں ایک بار پھر غرق کر گئے تھے۔ وہ آج جس آخری خطبے کے الفاظ یاد آجانے اور دہرا دینے پر اپنی عزت بچانے میں کامیاب ہوا تھا۔ وہ آخری خطبہ اس کے اپنے ضابطہ حیات کی عکاسی کیوں نہیں کر پایا تھا۔ اس پر عمل اس کی زندگی کی ترجیحات میں کیوں شامل نہیں تھا۔ یاد دہانی تھی جو اسے بار بار کرائی جا رہی تھی۔ تنبیہ تھی جو اسے دی جا رہی تھی جو ”ارادہ نیت“ تھا ”سنے“ بنا دینے کے لیے یہ ضروری تھا۔ سالار سکندر ان دس منٹوں کے بعد اسٹیج پر گم صم بیٹھا رہا تھا۔ اس کی زبان پر اب بھی آیات تھیں، شکر کے الفاظ تھے اس رب نے آج بھی ہمیشہ کی طرح اس کی عزت رکھی تھی۔ اس ذات نے اس حافظ قرآن کو دنیا کے سامنے رسوا نہیں کیا تھا اور اس احساس نے صرف شکر ہی نہیں شرم ساری بھی بڑھائی تھی۔

”تمہیں پتا ہے تمہارے اندر خود کشی کرنے کی خواہش آج بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح سترہ سال پہلے تھی۔“

سالار سکندر نے لیپ ٹاپ پر آخری ای میل کا جواب دیتے ہوئے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے امامہ کی آخری پھٹکار سنی۔ بچے سوچے تھے اور وہ ہوٹل کی وارڈروب کھولے پتا نہیں کتنی بار اپنے اور اس کے کپڑوں کو تمہ کر کے رکھ رہی تھی۔ گھسی وارڈروب کے ایک خانے میں پھر وہ سرے خانے میں۔ پہلے خانے میں۔ اور سالاریہ سب نوٹس کرنے کے باوجود لیپ ٹاپ پر ای میلز چیک کرنے اور اپنے اگلے دن کے شیڈول کو حتمی شکل دینے میں مصروف رہا تھا اور اب جب وہ اپنا کام نبٹا چکا تھا تو وہ امامہ کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ وہ پریشان تھی اسے اندازہ تھا۔ جو کچھ آج ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ اس کے ذہنی تناؤ کا اندازہ لگا سکتا تھا۔

”تم ٹھیک کہتی ہو۔“ سالار نے لیپ ٹاپ بند کر کے اپنے بیڈ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ وہ دو گھنٹے پہلے ہوٹل واپس آیا تھا اور دو گھنٹے سے اپنا کام لیے بیٹھا تھا اور اب جب کام ختم ہو گیا تھا تو وہ امامہ کی طرف متوجہ ہوا تھا جو اس کی خاموشی اور بے اعتنائی کے مظاہرے پر اب تقریباً ”روہانسی ہو چکی تھی۔“

”تمہیں پتا ہے مجھے تمہاری کیوں ضرورت ہے اور میں کیوں فکر مند رہتی ہوں تمہارے بارے میں؟“ وہ اس کے اعتراف پر برہم ہوئی تھی اور بے حد خفگی سے ہاتھ میں پکڑی اس کی شرٹ تیسری بار تمہ کر کے رکھنے کے بجائے اسی طرح وارڈروب کے خانے میں ٹھونس کر اسے بند کرتے ہوئے سالار کے بیڈ سائیڈ کی طرف آئی تھی۔ ”کیوں کہ بچے پریشان ہو جاتے ہیں۔ تم کوئی سپر مین نہیں ہو کہ وہ تمہارے کمالات دیکھ کر تالیاں بجائیں گے۔ لطف اندوز ہوں گے۔ تمہیں کچھ ہو گا تو۔“

وہ بات کرتے کرتے پھر روہانسی ہو گئی۔ بات مکمل نہیں کر سکی۔ وہ گہری خاموشی کے ساتھ اس کی بات سنتا رہا سر جھکا کر۔ پھر اس کے خاموش ہو جانے پر اس نے سر اٹھا کر امامہ کو دیکھا۔ وہ اس کے بالقابل کھڑی تھی اور وہ بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے میں لگی ہوئی لائٹس کی زرد روشنی میں اس کی سرخ آنکھیں اور سرخ ناک اس کے روتے رہنے کو جیسے اور نمایاں کر رہی تھی۔ وہ ان ہی آنکھوں سے نظریں چرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ وہ چہرہ اور آنکھیں تھیں جو اسے کھوجنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ بے بس کرنے کی اضافی خصوصیت کے ساتھ۔

”تم ٹھیک کہتی ہو۔“ جواب پہلے سے مدہم آواز میں آیا تھا اور وہی آیا تھا۔ وہ اور برہم ہوئی۔

”میں مذاق نہیں کر رہی۔“ اسے لگا تھا جیسے وہ اسے ہمیشہ کی طرح زچ کر رہا تھا۔

”اب اگر تم نے ایک بار پھر یہ جملہ دہرایا تو میں اس کمرے سے چلی جاؤں گی۔ تمہیں میری ہر بات احمقانہ لگ رہی ہے۔“

”نو آر رائٹ۔“ وہ اس بار زچ ہو کر جھلاتے ہوئے ہنس پڑی تھی۔ پھر اس کے پاس بستر بیٹھ گئی۔

”آخری خطبہ سنا رہے تھے آج تو سارا سنا تے۔ ادھوری بات کیوں کی۔“ وہ اب اس پر طنز کر رہی تھی۔

”ہمت نہیں پڑی۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں تم جو بھی کہتی رہی ہو۔ ٹھیک کہتی رہی ہو۔ پہلے بھی۔ آج بھی۔“

وہ زندگی میں پہلی بار اس کے سامنے ایسا اعتراف کر رہا تھا امامہ اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی۔ غصہ پہلے بھی نہیں تھا پر جو گلہ تھا وہ بھی یک دم غائب ہوا تھا۔

”پیسٹرس ایبا کا اپنی زندگی کے آخری لمحے تک امن کے لیے لڑا۔ وہ نیویارک کی ایک سڑک پر اپنی جان بچانے

کے لیے لڑتا رہا ان ہی طاقتوں کے ہر کاروں کے ساتھ جن کے ساتھ تم کھڑے ہو اور جن کے ساتھ تم مل کر افریقہ

کی تقدیر بدلنا چاہتے ہو۔“

اس نے سالار سکندر کو وہ آئینہ دکھایا تھا جو اسے صرف امامہ ہاشم ہی دکھا سکتی تھی۔ ”تم سمجھتے ہو وہ تمہیں یہ سب کرنے دیں گے؟“

”تم سمجھتی ہو میں یہ سب کرنا چاہتا ہوں؟“ اس نے جواباً اس سے پوچھا تھا اسی انداز میں وہ بول نہیں سکی۔ سوال عجیب تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے پھر امامہ نے پوچھا۔

”پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”میں اپنے لیے ایک باعزت راستہ چاہتا ہوں۔ اپنے لیے تمہارے لیے اپنے بچوں کے لیے جس جنجال میں میں اپنے آپ کو اور تم لوگوں کو پھنسا چکا ہوں اس سے نکلنا چاہتا ہوں لیکن میں ایک کنویں سے نکلنے کی کوشش میں کسی دوسرے کنویں میں کودنا نہیں چاہتا۔ جو اس سے زیادہ گہرا اور تاریک ہو۔“

وہ اس کا چہرہ حیرانی سے دیکھتی رہی۔ جس ایشورہ بحث کرنا چاہتی تھی وہ اس پر پہلے ہی گھٹنے ٹیک چکا تھا۔ لیکن جو کچھ وہ کہہ رہا تھا وہ امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اور وہ سمجھنا چاہتی تھی۔

”تم کیا کرنا چاہتے ہو سالار؟“ وہ ایک بار پھر پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

”میں پہلا اسلامی مالیاتی نظام بنانا چاہتا ہوں۔ جو سود سے پاک ہو لیکن جو پوری دنیا کے لیے ہو باضابطہ قابل عمل اور جو اس کی جگہ لینے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔“ جواب اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ حیرانی سے سالار سکندر کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔ بول ہی نہیں سکی۔ وہ ہمیشہ عجیب باتیں کرتا تھا۔ وہ اب اس کی عادی ہو چکی تھی لیکن جو وہ اب کہہ رہا تھا وہ عجیب ترین تھا۔ وہ اس کی بہت ساری باتوں پر دم بخود ہوتی تھی۔ ہکا بکا بھی۔ لیکن آج اپنی خاموشی کو وہ کس کیفیت کا نام دیتی امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا۔

”تمہیں لگتا ہے میں نہیں کیاؤں گا؟“

بہت دیر تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہنے کے بعد اس خاموشی کو سالار نے توڑا تھا۔ اس نے جیسے امامہ کی کیفیت کو ہی الفاظ میں نہیں ڈھالا تھا بلکہ اس نے اپنے ہر خدشے کو بھی جیسے سوال میں بدل کر امامہ کے سامنے پیش کیا تھا۔ یہ سوال لاشعور سے آیا تھا۔ یقین سے نہیں اندیشے سے ابھرا تھا۔ جواب نہیں تسلی مانگ رہا تھا۔

”یہ کام دنیا میں اگر کوئی کر سکتا ہے تو صرف تم کر سکتے ہو سالار سکندر۔“

اس بار گنگ ہونے کی باری سالار کی تھی۔ یہ جواب نہیں تھا وہ اعتماد تھا جس کی اسے ضرورت تھی۔ اس کا خون بڑھا تھا اور سیروں کے حساب سے بڑھا تھا۔ اس نے امامہ کے چہرے سے نظریں ہٹالیں۔ اس کے جواب نے اسے تسلی اور دلا سے کی وہ تھکی دی تھی جو اس کا بوجھ ہٹا گیا تھا۔

”تھینک یو۔“ امامہ کی طرف دیکھے بغیر سر جھکائے سالار نے اپنا تشکر اس تک پہنچایا تھا۔ وہ غیر متوقع جواب تھا۔ شکریہ کی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی تھی امامہ کو۔ لیکن وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی یوں جیسے منتظر تھی کہ وہ کچھ اور کہے گا۔

”تمہیں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔“ بالآخر سالار نے کہا تھا وہ ہنس پڑی یوں جیسے اس نے کوئی عجیب بات کہی تھی۔

”تم مشکلات کی بات مجھ سے کر رہے ہو سالار؟“ سالار نے اسے دیکھا۔ اندازاً استہزائیہ تھا پر سوال نہیں تھا۔

”زندگی میں بڑے بڑے دن گزارے ہیں میں نے۔“ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

”لیکن وہ بڑے دن میری وجہ سے نہیں آئے تھے۔ اب شاید میری وجہ سے بھی آئیں۔ سب سے مشکل چیز

یہی ہے میرے لیے کہ جو کام میں کرنے جا رہا ہوں۔ اس کے اثرات تم تک اور بچوں تک آئیں گے۔ واحد کمزور کرنے والی شے یہی ہے مجھے۔ اپنے آپ پر آنے والی مصیبتیں تو برداشت کر لیتا ہے انسان لیکن بیوی بچوں کو پہنچنے والی تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔“

سالار کو یہ بات کرتے ہوئے وہ لمحات یاد آئے تھے جو اس نے واشنگٹن میں امامہ اور بچوں کی زندگی اور سلامتی کے لیے امید اور ناامیدی کے عالم میں گزارے تھے۔

”تم یہ مت سوچو۔ جو کرنا چاہتے ہو وہ کرو۔ باقی دیکھا جائے گا۔ زندگی اس سے بدتر تو بہر حال نہیں ہوگی جیسی میں گزار آئی ہوں۔ باقی سب کچھ تو سما جاسکتا ہے۔“

امامہ کو اس وقت یہ بات کرتے ہوئے اندازہ نہیں تھا کہ جن مشکلات سے سالار خوف زدہ تھا یہ وہ مشکلات نہیں تھیں جن کا وہ سوچ رہی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی وہ صرف مالی مسائل کے حوالے سے اسے متنبہ کر رہا تھا۔

”میں سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئی تھی۔ بچپن سے دنیا کی ہر نعمت ملی۔ روپیہ پیسہ کے پارے میں کبھی سوچنا نہیں پڑا۔ وہ وقت گزر گیا پھر ایک وقت آیا جب اپنی بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں کر سکتی تھی۔ دو سروں کے سر پر محتاجی کی زندگی گزارنی پڑی۔ نوکری کرنا پڑی۔ ضروریات پوری ہوتی تھیں لیکن اپنی خواہشات اور آسائشات والی زندگی نہیں رہی تھی۔ وہ وقت بھی گزر گیا۔ پھر تمہارے ساتھ گزرے پچھلے سات سال میں دنیا کی ہر نعمت ہر آسائش ملی۔ پہلے سے بڑھ کر پہلے سے بہتر۔ میری توقعات اور سوچ سے بھی زیادہ۔ لیکن میں یہ کبھی نہیں بھولی کہ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ چیزوں کی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ کبھی نہ کبھی ہی مل جاتی ہیں صرف انسان ہیں جن کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ وہ نہیں ملتے۔“ وہ بات کرتے ہوئے رنجیدہ ہوتی تھی۔ ”تو جب تک بچے اور تم میرے پاس ہو باقی کسی چیز کی پروا نہیں ہے مجھے۔ کم زیادہ۔ میں سب میں گزارہ کر سکتی ہوں۔“

اس نے سالار کو دیکھا۔ وہ خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا۔ وہ اسے ہولانا نہیں چاہتا تھا یہ کہہ کر وہ اور بچے بھی کبھی اس سے چھین سکتے تھے۔ جیسے اس سے چھین لیے گئے تھے۔ اور ہر آزمائش مال سے شروع ہو کر مال پر ختم نہیں ہو جاتی۔ لیکن وہ امامہ سے ابھی کچھ اور کہنا نہیں چاہتا تھا۔ کم از کم آج کا تاؤ بھرا دن اسے دینے کے بعد وہ اسے مزید کسی خدشے اور اندیشے میں مبتلا کر کے اس کو رات بھی سولی پر لٹکتا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

تم یہ سب کیسے کرو گے؟۔ کسی کے ساتھ مل کر؟“ امامہ نے بالآخر ذہن میں ابھرنے والا وہ سوال اس سے پوچھا جو اس کے دماغ میں کلبلا رہا تھا۔

”پتا نہیں۔“ جواب عجیب مسکراہٹ کے ساتھ آیا تھا اور بے چارگی والی ایک کیفیت کے ساتھ بھی۔ اور وہ ایک بار پھر اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی تھی لیکن اسے یقین تھا۔ سالار سکندر اپنے لائحہ عمل کے بارے میں اتنا لاعلم نہیں تھا جتنا اس نے اپنے آپ کو ظاہر کیا تھا۔

”یہ کونسا تم مجھے بتانا نہیں چاہتے۔“

”بتانے کا فائدہ نہیں۔ کم از کم اس اسٹیج پر جب ہر نکتہ صرف ایک خیال اور سوچ ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔“

سالار نے کہا اور بات کرتے ہوئے پہلی بار اس کی نظر امامہ کے ہاتھ میں پہنی اس انگوٹھی پر پڑی تھی جو اس نے اسے شادی کے تحفے کے طور پر دی تھی۔ وہ بے حد حیرانی کے عالم میں اس انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے کچھ بولنا بھی بھول گیا تھا۔ امریکہ سے واپس آنے کے بعد اور ان تمام حالات سے گزرنے کے بعد آج اتنے ہفتوں بعد وہ پہلی بار اس کے ہاتھ میں وہ انگوٹھی دیکھ رہا تھا بلکہ اس کے جسم پر کوئی زیور دیکھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ انگوٹھی بھی اس گھر میں موجود لا کر میں پڑے دو سرے زیورات کے ساتھ جل گئی تھی اس آتشزدگی میں اور اب اس جگہ گائی بیش قیمت

انگوٹھی کو اس کی مخروطی انگلی میں سجا دیکھ کر سالار سکندر کو ایک عجیب خوشی ہوئی تھی۔ ناقابل بیان خوشی۔ اس نے امامہ کا ہاتھ تھام لیا۔

”یہ کہاں سے آئی؟“ گفتگو کا موضوع عجیب انداز میں بدلا تھا۔

امامہ ہنسی اور اس نے اس کی ہتھیلی پر ہی اپنا ہاتھ پھیلایا۔ بڑے جتانے والے انداز میں۔ اسے سالار کی خوشی اور کیفیت کا اندازہ تو نہیں ہوا تھا لیکن خود وہ اس انگوٹھی کو دیکھ کر کھل سی گئی تھی۔ اس گھر میں ضائع ہو جانے والے تمام زیورات میں اگر اسے کسی زیور کا غم تھا تو وہ یہ انگوٹھی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی جذباتی وابستگی تھی۔ وہ دیر سے ملا تھا لیکن منہ دکھائی کا تحفہ تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں جب جب وہ پہنی ہوئی تھی۔ وہ دیکھنے والے کو اپنی خوب صورتی سے مبسوت کر دیتی تھی۔ امامہ اس کی قدر تو جانتی تھی لیکن اس کی قیمت کا اندازہ آج بھی نہیں تھا اسے یہ تو پتا تھا کہ وہ بیش قیمت تھی کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی فنکشن میں اسے پہن کر گئی ہو اور کسی نہ کسی سے سراہا نہ ہو۔ اسے داد نہ دی ہو اور اس انگوٹھی کی قیمت کا اندازہ نہ لگانے کی کوشش کی ہو۔ اس کا کھوجانا امامہ کے لیے عجیب کسک کا باعث بنا تھا۔ وہ اسے ہر وقت ہاتھ میں نہیں پہنے رکھتی تھی، کبھی پہنے رکھتی تھی۔ کبھی اتار دیتی تھی لیکن وہ جب بھی گھر میں زیورات اتارتی تھی تو اسے لا کر میں ہی رکھتی تھی۔ سالار کی ہدایت تھی۔ یہ کاتکو تھا۔ ان کے ملازمین قابل اعتماد اور ایمان دار تھے اور چھان پھٹک کر رکھے گئے تھے، لیکن وہ بے حد غریب تھے اور وہ زیورات کی شکل میں ان کے سامنے ترغیبات چھوڑ کر ان کو آزما کر نقصان اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔

حمین کی پیدائش کے بعد سالار کے واپس کاتکو آنے پر امامہ کو پہلی بار اس انگوٹھی کا خیال آیا تھا، جب اسے بالآخر یہ پتا چل گیا تھا کہ گھر میں کچھ بھی نہیں بچا سب کچھ جل گیا ہے یا لوٹ لیا گیا ہے۔ امریکن ایمپیسے کے اسپتال میں قیام کے دوران امامہ کو یہ یاد نہیں آیا تھا۔ اس نے آخری بار وہ انگوٹھی کب اتاری تھی۔ اس نے آخری بار اپنے گلے میں پہنی ہوئی چین کب اتاری تھی۔ اپنے بندے کب اتارے تھے۔ اس کا خیال تھا۔ یہ کام اس نے اسپتال چیک اپ کے لیے جانے سے پہلے کیا تھا۔ لیکن صرف خیال تھا اسے ٹھیک سے یاد نہیں تھا اور وہ اس کی وجہ اینسٹینہ یا کو سمجھتی تھی جو اسے سرجری کے لیے دیا گیا تھا لیکن جو اس کی یادداشت کو گڑبڑانے کا باعث بن رہا تھا۔

لیکن آج سالار سکندر کے آنے سے دو گھنٹے پہلے پاکستان کے لیے پیکنگ کرتے ہوئے اس نے اپنا ہینڈ بیگ تبدیل کرنے کے لیے اس میں سے چیزیں نکال کر ایک نئے ہینڈ بیگ میں منتقل کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ وہ ہینڈ بیگ تھا جو اسپتال جانے سے لے کر اب تک اس کے زیر استعمال تھا اور اب کچھ دن پہلے بازار سے ایک ہینڈ بیگ خرید کر وہ پرانے ہینڈ بیگ کے اندر موجود چھوٹی بڑی بہت ساری جیبوں کو کھنگال رہی تھی اور ان ہی چھوٹی بڑی جیبوں میں سے ایک جیب کے اندر وہ چھوٹا سا پاؤچ نکلا تھا اور اسے ہاتھ میں لیتے ہی چند لمحوں کے لیے امامہ کی سانس ہی رک گئی تھی۔ ایک جھماکے کے ساتھ اسے یاد آیا تھا کہ اس نے اپنے جسم پر موجود زیور سرجری کے لیے تیار ہوتے ہوئے اتار کر اس بیگ میں رکھا تھا اور پھر یہ بیگ پیڈی کو دے دیا تھا اور ان تمام ہفتوں میں اس بیگ کو اس نے کئی بار ضرورتاً کھولا تھا لیکن کبھی بھی اس نے اسے کھنگالا نہیں تھا۔ شاید کھنگال لیتی اگر اس کی زندگی نارمل حالات سے گزر رہی ہوتی۔

ہاتھ سے پاؤچ کو ٹٹولتے ہوئے اس کے دل کی — دھڑکن خوشی سے بڑھی تھی اس کے اندر زیور تھا اور انگوٹھی بھی۔ وہ اس پورے دن کی ذہنی اذیت کو منٹوں میں غائب کر دینے والی خوشی تھی جو اس لمحے اس پاؤچ کو کھول کر اپنے ہاتھ میں اس انگوٹھی کو لے کر اس نے جو چیز محسوس کی تھی۔ اور وہ پیڈی کی ایمان داری بھی تھی

جس نے کئی دن اس بیگ کو اپنے پاس رکھنے کے باوجود اسے ایک امانت کی طرح کسی خیانت کے بغیر امامہ کو لوٹایا تھا۔

وہ شکر کا ایک اور لمحہ تھا امامہ کے لیے اس نے بھیگتی آنکھوں کے ساتھ اس انگوٹھی کو اپنے ہاتھ میں دوپارہ پہنا تھا پھر سونے کی چین کو اور پھر ان کانوں کے بندوں کو اور وہ یہ سر پر ان سالار کو دینے سے پہلے ہی بھول گئی تھی اور اب سالار نے اس کے ایر رنگز اس کی چین کو نوٹس نہیں کیا تھا اور وہ اس انگوٹھی پر اٹک گیا تھا۔

”تم نے میرے ایر رنگز اور چین نہیں دیکھی۔“ وہ اب اسے وہ دونوں چیزیں بھی ہاتھ سے چھوتے ہوئے دکھا رہی تھی۔ کسی بچے کی طرح خوشی اور جوش سے اپنا کھویا ہوا کھلونا واپس اور غیر متوقع طور پر مل جانے پر۔

سالار نے مسکراتے ہوئے ان چیزوں کو دیکھا اور پھر امامہ کے یک دم سب کچھ بھول بھال کر جگمگاٹھنے والے چہرے پر نظر ڈالی تینوں چیزوں کو دیکھتے ہوئے اس کے ذہن میں آیا تھا۔ وہ چین ڈاکٹر سبط علی کی دی ہوئی تھی وہ ایر رنگز امامہ کو شادی کے تحائف میں اس کے ساس سر نے دیے تھے اور وہ انگوٹھی جو اس نے اسے دی تھی وہ؟ سکندر عثمان کی طرف سے جائیداد میں ملنے والے ایک پلاٹ کو بیچ کر خریدی گئی تھی۔ ان تینوں میں سے کوئی بھی چیز سود اور حرام کے پیسے سے نہیں خریدی گئی تھی اور وہ سالار کی طرف سے ملنے والا واحد زیور تھا جو اس کی اپنی آمدنی سے نہیں خریدا گیا تھا۔ اور وہ زیور واپس آ گیا تھا۔

”تم کیا سوچ رہے ہو؟“ امامہ نے اسے مخاطب کیا، وہ اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے اس انگوٹھی کو اسی ہاتھ کے انگوٹھے سے چھوتے ہوئے جیسے چونکا تھا اپنی گہری سوچ سے۔ کچھ حقائق اور ان کا ادراک ایسا شرمسار اور نامد کرنے والا ہوتا ہے کہ انسان چاہتے ہوئے بھی انہیں کسی کے سامنے دہرا نہیں سکتا، وہ بھی اس وقت ایک بار پھر اسی لمحہ سے گزرا تھا۔

”کچھ نہیں۔ ایسے ہی کچھ خیال آیا تھا۔“ سالار گہرا سانس لے کر بات ٹال گیا تھا۔
 ”اس انگوٹھی کی قیمت کیا ہے؟“ پتا نہیں امامہ کو یک دم اس کی قیمت پوچھنے کا خیال کیوں آیا تھا۔
 ”یہ انمول ہے کیونکہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔“ سالار نے اس کا ہاتھ چوما تھا اور وہی جواب دیا تھا جو پہلی بار اس انگوٹھی کو پہناتے ہوئے دیا تھا، وہ ہمیشہ کی طرح سرشار ہوئی تھی۔ یہ بہت دفعہ پیش کیا جانے والا ”خراج تحسین“ تھا لیکن ہمیشہ نیا لگتا تھا کیونکہ ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔ یہ وہ سالار سکندر نہیں رہا تھا جو امامہ ہاشم کو سمجھ نہیں پاتا تھا اور اسے امامہ کی دل جوئی کرنے نہیں آتی تھی۔ زندگی کے اتنے سال ساتھ گزارنے کے بعد وہ ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف ہو چکے تھے۔

”پیکنگ مکمل ہو گئی۔“ سالار نے داد دینے کے ساتھ ہی اگلے کسی جملے سے بچنے کے لیے بات کا موضوع ہی بدل دیا تھا۔

”ہاں مکمل ہو گئی۔“ امامہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ تین دن کے بعد وہ پاکستان جا رہے تھے۔
 ”پیکنگ بھی ہی کیا اس بار۔ سب کچھ تو گھر میں ہی جل گیا۔ بس بچوں کی ضروری چیزیں ہیں جو خرید کر لائی ہوں یا اپنے کچھ کپڑے۔“

”تم کتنے دنوں کے لیے ٹھہرو گے وہاں؟“ امامہ نے بات کرتے کرتے اس سے پوچھا۔
 ”ایک ہفتہ۔“ سالار نے بستر پر لیٹتے ہوئے اسے جواب دیا۔
 ”کیوں؟ تم ہمارے ساتھ وہاں زیادہ دن کیوں نہیں ٹھہرو گے؟“ امامہ کو اعتراض ہوا۔
 ”ایک ہفتہ بھی بہت زیادہ ہے میرے لیے۔ کام کا ڈھیر ہے یہاں اور مجھے تمہارے واپس آنے سے پہلے گھر کا

بھی بندوبست کرنا ہے۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ ایک ہفتہ کے بعد ہی واپس آ جاؤں گی۔“ امامہ نے کہا۔
 ”نہیں تم اب ایک ماہ کے بعد ہی واپس آؤ، تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ وہاں گھر کا ماحول تبدیل ہو گا تو تم بہتر محسوس کرو گی۔ یہاں بچوں کے ساتھ بہت پریشانی ہوتی ہے تمہیں۔“ سالار نے اسے کہا تھا۔
 ”مجھے بچوں سے زیادہ تمہاری پریشانی ہوتی ہے۔“ وہ ایک بار پھر وارڈروب کے سامنے کھڑی تھی۔ سالار نے بستر پر لیٹے لیٹے اسے دیکھا۔ وہ وارڈروب سے ٹیک لگائے اسے دیکھ رہی تھی اور اس کے انداز میں کچھ تھا جس نے سالار کو چونکایا تھا۔

”میری کیا پریشانی؟“ اس نے پوچھا تھا۔
 ”پتا نہیں تمہیں مجھے ڈر لگتا ہے۔“ اس نے آدھی بات کر کے وارڈروب دوبارہ کھول لی اور ایک بار پھر الجھے انداز میں کپڑے ٹھیک کرنے لگی۔

”کس چیز سے ڈر لگتا ہے؟“ سالار نے اسی انداز میں اسے دیکھتے ہوئے پوچھا امامہ نے ویسے ہی کھڑے کھڑے گردن موڑ کر اسے دیکھا ”کس چیز سے ڈر لگتا ہو گا مجھے؟“ وہ جیسے کسی سائیکالوجسٹ سے اپنے مسئلے کا حل پوچھ رہی تھی۔

”میری موت سے۔“ اور وہ سائیکالوجسٹ بے حد بے رحم تھا۔
 امامہ ہل نہیں سکی اس نے جیسے نشتر اس کے جسم میں موجود ناسور کے اوپر سیدھا ہی مار دیا تھا۔ اس نے کتنے آرام سے جیسے پہلی بوجھ لی تھی۔ وہ وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی یوں جیسے اب اس کے پاس کہنے کے لیے بوجھنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

”ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟“ سالار اس کی نظروں سے جیسے الجھا تھا۔
 ”تم بہت بے رحم ہو اور ہمیشہ سے ہو۔“

”تم نے سوال کیا تھا مجھ سے۔ میں نے تو صرف اندازہ لگایا۔ صحیح اندازہ لگایا ہے کیا؟“ وہ جیسے داؤ چاہتا تھا۔
 ”اب تمہیں پتا چلا میں تم سے کیوں کہتی ہوں کہ تمہارے اندر آج بھی موت کشش رکھتی ہے۔“ وہ جو کہنا چاہ رہی تھی وہ نہیں کہہ سکی اور جو کہہ رہی تھی اس کے غلط ہونے کا اسے اندازہ ہو گیا تھا۔
 ”موت سے کون فہمی نیٹ ہوتا ہے امامہ؟ کوئی پاگل ہی ہو گا جو ایسا سوچے گا اور ایک وقت میں عین پاگل تھا۔۔۔ اب نہیں ہوں۔“ وہ عجیب انداز میں مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

”اب بھی ہو۔“ امامہ کہے بغیر نہیں رہ سکی۔ وہ ہنساتھا یوں جیسے اس کے جملے سے محفوظ ہوا ہو۔
 ”You are always right۔“ (تم ہمیشہ ٹھیک کہتی ہو)

اس کی ہنسی نے امامہ کو کم تپایا تھا اس کے جملے نے زیادہ۔۔۔ وہ وارڈروب کو پوری قوت سے بند کرتے ہوئے ہاتھ روم میں گھس گئی تھی۔ اسے پتا تھا وہ اب اسے زچ کرے گا اور کرتا ہی جائے گا یہ اس کا ذہنی تھکن اتارنے کا ایک طریقہ تھا۔ اسے زچ کرنا۔۔۔ اور وہ اس وقت اپنا دماغ خراب کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔



گانگو کا بحران اور اس سے پہلے ہونے والے واقعات سی آئی اے کے لیے سالار سکندر کو اس لسٹ میں ڈالنے کا باعث بنا تھا جن پر باقاعدہ نظر رکھی جاتی تھی وہ افریقہ میں اب ان کا (Key figure) سب سے اہم کارندہ تھا ان کے لیے کام کر رہا تھا لیکن ان کا ساتھی نہیں تھا۔ ان کے پے رول پر بھی نہیں تھا۔ وہ پہلی بار ایک عجیب و غریب کام میں حصہ دار بنے تھے shadow work partner دونوں ایک دوسرے سے بھی واقف تھے

ایک دوسرے کے نام سے بھی اور ایک دوسرے کے کام سے بھی۔۔۔ اس بات سے بھی کہ دوسرا اس بات سے واقف تھا کہ اسے کوئی دیکھ رہا ہے وہ مانیٹر کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ورلڈ بینک کی طرف سے دی جانے والی ٹاپ پروفیشنلز کی ٹیم بھی سی آئی اے کے انڈر کور ایجنٹس کی ہے اور۔۔۔ دونوں پارٹنرز اپنے سائے کی موجودگی سے باخبر ہونے کے باوجود اپنا کام کر رہے تھے۔ اور کوئی کسی کو دھوکا دے بغیر ایک دوسرے کا ساتھی بنا ہوا تھا۔ سی آئی اے سالار سکندر کی سیکورٹی اور افریقہ میں ورلڈ بینک کے پروجیکٹس کو کامیاب بنانے کی ذمہ دار۔۔۔ بھی اور وہ اس رول کو بخوبی انجام دے رہے تھے۔ سالار سکندر ورلڈ بینک امریکی حکومت اور سی آئی اے کے لیے نعمت مترقہ ثابت ہوا تھا۔۔۔ اس نے کانگو اور افریقہ میں ایک بہت نازک صورت حال میں ان سب کو ایک بے حد شرمناک اور خطرناک صورت حال سے نکالا تھا اور بے حد خوبی اور مہارت سے۔۔۔ اس کی تقریر میں اپنے ہی ادارے کی اور سامراجی قوتوں پر کی جانے والی تنقید کسی کو بری نہیں لگی تھی۔ اگر صورت حال کنٹرول میں آجاتی تو وہ اس سے زیادہ گالیاں کھانے پر تیار تھے۔ لیکن اگر کوئی چیز سالار سکندر کی تقریر میں انہیں قابل اعتراض لگی تھی تو وہ اپنے مذہب اور پیغمبر کا حوالہ تھا۔ اس نے دین کو آدمیت اور انسانیت کے سیکولر لبادے میں ملفوف کر کے پیش نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنے دین اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبے کا ذکر کیا تھا اور سالار سکندر ہمیشہ ایک لبرل سوچ رکھنے والا مسلمان سمجھا جاتا تھا۔ بیٹھے بٹھائے اس کی ایک پبلک اسپیچ میں جھلکنے والی مذہبی ”انتہا پرستی“ ورلڈ بینک کے ساتھ ساتھ امریکی حکومت اور سی آئی اے کو بھی قابل اعتراض لگی تھی۔

وہ افریقہ میں بے شک ان کے لیے سب سے اہم تھا لیکن کوئی اہم ترین شخص بھی ”اسلامی سوچ“ کے پرچار کے لیے ورلڈ بینک کا عہدہ استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ نارمل حالات ہوتے تو وہ تقریر سالار سکندر سے استعفیٰ کے لیے بے حد مضبوط وجہ تھی لیکن یہ نارمل حالات نہیں تھے۔ ورلڈ بینک کے ساتھ ساتھ امریکی حکومت اور سی آئی اے نے بھی سالار سکندر کی اس تقریر سے نظریں چرا کر بظاہر اس کی پروہ پوشی کی تھی لیکن درپردہ میڈیا میں اپنے صحافیوں کے ذریعے سالار سکندر کو اس تقریر میں مذہبی حوالہ دینے کے لیے شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا اور یہ سلسلہ براہ راست کوریج کے فوراً بعد ہی شروع کر دیا گیا تھا۔ امریکہ اور سی آئی اے کو کانگو اور افریقہ میں ہر کارہ چاہیے تھا۔ مسیحا اور لیڈر نہیں۔۔۔ وہ ہر شخص کو اس کی اوقات میں رکھنا جانتے تھے اور اب اس پالیسی پر عمل کر رہے تھے۔ چینلز پر سالار سکندر کی اس تقریر کو موضوع بحث لانے والوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبے کے بہت سے دوسرے پوائنٹس کو بھی زیر بحث لانا شروع کر دیا تھا۔ ایک نئی چیخ و پکار سالار سکندر کی مذہبی شناخت مذہبی اعتقادات اور اعمال کے حوالے سے شروع کر دی گئی تھی۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبے کا ایک بنیادی حصہ سوو کے خلاف ان کے احکامات بھی تھے جنہیں مغربی میڈیا نے بہت نمایاں انداز میں پیش کیا تھا کیونکہ وہ انہیں مغربی نظام معیشت کی بنیادوں کو چیلنج کرنے والی سوچ اور فلاسفی لگی تھی وہ یہ بات علی الاعلان نہیں کہہ پارہے تھے کہ وہ مغربی نہیں۔ یہودی نظام معیشت کو چیلنج کرنے والی فلاسفی تھی۔

سالار سکندر کے خلاف مغربی میڈیا میں اٹھنے والا یہ طوفان اسے افریقہ میں اور مشہور کر رہا تھا۔ اور سالار سکندر نے مغربی میڈیا پر اپنی اس تقریر کے حوالے سے کوئی وضاحتیں۔ صفائیاں اور معذرتیں پیش نہیں کی تھیں۔ اس کے آفس کا خیال تھا کہ اس تقریر کے اقتباسات کو کچھ ہلکا کر کے نئے سیاق و سباق کے ساتھ پیش کیا جائے۔

سالار نے کسی بہانے، معذرت، وضاحت اور سیاق و سباق کو اپنی اس تقریر کے لیے پیش کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے آفس نے دو دن بعد ایک سٹری بیان جاری کیا تھا کہ سالار سکندر اپنی اس تقریر کے ہر جملے اور لفظ پر یقین رکھتے ہوئے اس کی ذمہ داری لیتے ہیں اور اسے عمل طور پر قبول کرتے ہیں۔

یہ جیسے اس میڈیا کے منہ پر مارا جانے والا طمانچہ تھا جو اس کی طرف سے اس تنقید کے بعد کسی وضاحتی بیان اور معذرت کا منظر تھا۔

وہ ورلڈ بینک کا پہلا بنیاد پرست نائب صدر قرار دیا گیا تھا۔ سی آئی اے کو سالار سکندر کو مانیٹر کرتے ہوئے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی اسلامی مالیاتی نظام کو قائم کرنے کی بات کر رہا تھا جو سود سے پاک ہوتا۔ ان کے لیے یہ پریشان کن بات نہیں تھی۔ سالار سکندر ورلڈ بینک کے ساتھ منسلک رہتے ہوئے عملی طور پر ایسا کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ اور جو خواب وہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا اس کو وہ ایک خیالی پلاؤ سے زیادہ اہمیت دینے پر تیار نہیں تھے۔ ان کے لیے اگر کوئی بات پریشان کن تھی تو وہ سالار سکندر کا یہ یک دم سامنے آنے والا مذہبی شخص تھا جو ان کے نزدیک افریقہ جیسی حساس جگہ پر ان کے لیے پریشانیوں کھڑی کرنے کا باعث ہو سکتا تھا۔ ضروری ہو گیا تھا کہ سالار سکندر کو صرف افریقہ ہی میں نہیں ہر جگہ ہی مانیٹر کیا جائے اور سی آئی اے نے یہی کیا تھا۔ اس کی سرگرمیاں سی آئی اے کے ریکارڈ کا حصہ بن رہی تھیں۔ اور پہلی غیر معمولی سرگرمی جو سی آئی اے نے ریکارڈ کی تھی وہ ایسا کا کی تدفین کے تین ہفتے بعد مسقط میں سالار سکندر کی سمندر میں ایک لانچ پر پانچ لوگوں سے ایک ملاقات تھی جس میں سے ایک مسقط کی رائل فیملی سے تھا۔ بظاہر اس ملاقات کو ایک گیٹ ٹو گیدر سمجھا جاسکتا تھا۔ سالار سمیت وہ پانچوں پرانے شناسا اور دوست تھے۔ ایک ہی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل تھے۔ مختلف قومیتوں اور پروفیشنز سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اپنی اپنی فیلڈ کے نامور لوگ تھے اور ان میں سے کسی کا بھی کانگو اور افریقہ سے کوئی تعلق نہیں تھا سوائے سالار سکندر کے۔ نہ کانگو اور افریقہ سے تعلق تھا نہ ہی ورلڈ بینک سے لیکن اس کے باوجود ان سب میں کچھ باتیں مشترک تھیں۔ وہ سب سالار سکندر کے ہم عمر تھے۔ صرف ایک شخص مسقط کی رائل فیملی سے تعلق رکھتا تھا اس کے علاوہ باقی سب مختلف قومیت رکھنے کے باوجود امریکن شہریت رکھتے تھے اور مسقط کی رائل فیملی سے تعلق رکھنے والا شخص بھی اس وقت امریکہ ہی میں مقیم تھا۔ وہ سب دنیا کے 100 انڈر 40 گلوبل لیڈرز کی فہرست میں شامل تھے جن کے بارے میں یہ پیش گوئی تھی کہ وہ دس سال بعد دنیا کے ممتاز ترین لیڈرز میں سے ہوں گے۔ ان میں سے کوئی بھی بات سی آئی اے کے لیے پریشان یا تشویش کن نہیں تھی سوائے ایک آخری ممالکت کے سالار سمیت وہ پانچ کے پانچ افراد مسلمان تھے۔ اور باعمل مسلمان تھے اور قرآن پاک کے حافظ تھے۔

Downloaded From
Paksociety.com



وہ پاکستان میں امامہ کے قیام کا تیسرا ہفتہ تھا۔ وہ شروع کے دو ہفتے لاہور میں ڈاکٹر سبط علی اور سعیدہ اماں کے پاس گزار کر اب باقی دو ہفتے اسلام آباد رہنے آئی تھی۔ زندگی اب یوں بھاگم دوڑ میں گزر رہی تھی کہ اسے اس ”برابر والے گھر“ کو دیکھ کر بار بار اداس ہونا بھی یاد نہیں رہا تھا۔ وہ گھر بیک چکا تھا۔ امامہ جانتی تھی اور اس کے کھلے کشادہ لان پر اب مزید تعمیرات ہو چکی تھیں۔ گھر کا نقشہ بھی کچھ کا کچھ کر دیا تھا اس کے نئے مکینوں نے۔ اور اب سکندر عثمان کے گھر سے شاپنگ کے لیے بار بار باہر آتے جاتے اس گھر کو دیکھ کر وہ نظریں خراہتی تھی۔ وہ اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی نہ ماضی کے اس حصے میں دوبارہ جانا چاہتی تھی جو کسی دلدل کی طرح اسے اندر ہی اندر کھینچنے لگتا تھا۔ اور نظریں خراہنا آسان ان تین نعمتوں کی وجہ سے تھا جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کی تھیں۔ جبریل، عنایہ اور حمین نے جیسے اس کی زندگی کو ماضی سے نکال کر مستقبل میں بھیج دیا تھا۔ ان کے وجود سے وابستہ مصروفیات نے اس کی زندگی کی رفتار کو بے حد تیز کر دیا تھا۔ سوچنے اور یادوں میں بھٹکنے کا وقت نہیں رہا تھا اس کے پاس۔ اور یہ بھی جیسے ایک نعمت تھی اس کے لیے۔

سکندر عثمان اور طیبہ اب وہاں اکیلے رہتے تھے۔ طیبہ وقتاً فوقتاً اپنے سب بیٹوں کے پاس دوسرے ملکوں میں آتی جاتی رہتی تھیں، لیکن ان کا زیادہ تر وقت اسلام آباد میں ہی گزرتا تھا۔ امامہ اور اس کے بچوں نے سکندر عثمان اور ان کی روئین کی زندگی کو اسی طرح توڑا تھا جیسے ان کے باقی بچوں کا اپنی فیملیز کے ساتھ آنا توڑتا تھا۔

سالار پاکستان امامہ کے ساتھ آیا تھا۔ ان کی فلائٹ اسلام آباد ہی کی تھی۔ دو تین دن امامہ اس کے ساتھ وہاں رہتی پھر اس کے ساتھ لاہور چلی جاتی اور پھر وہاں سعیدہ اماں اور ڈاکٹر سبط علی کے پاس کچھ دن گزار کر واپس اسلام آباد آجاتی اور پھر وہیں سے واپس کاٹو چلا جاتا تھا اسے۔

وہ وہاں ان کی آمد کا دوسرا دن تھا جب سالار نے اسے امریکہ میں اپنے کسی پرانے دوست کے بارے میں بتایا تھا جو اب اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان میں مقیم تھا اور سالار سکندر سے ملنا چاہتا تھا اسے مبارک باد دینے کے لیے۔ سالار اپنے پرسنل وزٹ پر تھا لیکن اس ایک ہفتے میں بھی اسے مسلسل بہت سے سرکاری عہدے داران اور احباب سے ملنا تھا جو اس کو ورلڈ بینک کی نائب صدارت سنبھالنے پر ابھی تک ذاتی طور پر مل کر۔ مبارکباد نہیں دے سکے تھے۔

کئی سالوں بعد سعد اپنی فیملی کے ساتھ سالار سے ملنے اس کے گھر آیا تھا اور سالار فوری طور پر اسے پہچان ہی نہیں سکا تھا۔ وہ مکمل طور پر بارہاں تھا۔ اور اس کی داڑھی اسی فی صد سفید ہو چکی تھی جسے رنگنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ وہ بے حد مہنگے برانڈ ڈشوار قمیض میں ملبوس تھا لیکن شلوار اس کے ٹخنوں سے اوپر تھی۔ وہ قریبی ماٹل تھا اور اسے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ کھانے پینے کا شوقین تھا اور ایک سرسبز سے اسے دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ نقاب لیے ہوئے اس کی بیوی ایک آٹھ سالہ بچہ اور دو چھوٹی بچیاں تھیں۔

وہ اور اس کی بیوی سالار اور امامہ سے بڑی گرم جوشی سے ملے تھے۔ امامہ جانتی تھی سعد سالار کے شناساؤں میں سے تھا، قریبی دوستوں میں سے نہیں، لیکن اس کے باوجود سعد اپنی گپ شب اور بلند بانگ قہقہوں کے دوران سالار کے اس کے ساتھ امریکہ میں گزرے ہوئے وقت کے بارے میں ایسے ایسے قصے نکال کر سنا تا رہا جیسے وہ اور سالار بہترین اور بے حد گہرے دوست رہے تھے۔ یار غار قسم کے دوست۔

”مجھے تو ہمیشہ سے ہی اندازہ تھا کہ سالار بڑی ترقی کرنے والا تھا بس ذرا قبلہ خراب تھا اس کا۔ وہ میں کھینچ کھینچ کر ٹھیک کرتا رہتا تھا۔“

چائے پینے کے دوران اس نے امامہ پر جیسے ایک انکشاف کیا۔ سالار اور امامہ نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرا کر رہ گئے۔

”اور اب دیکھیں بھابھی! کیسا بدلا ہے؟ میری کوششیں کیسا رنگ لائی ہیں۔“ سعد کہہ رہا تھا سالار نے اپنا کپ رکھتے ہوئے اسی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”لیکن تم بالکل نہیں بدلے۔ میری کوششیں کوئی رنگ نہیں لاسکیں اس کا مجھے بڑا افسوس ہے۔“ سالار نے جتانے والے انداز میں کہا۔ سعد نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔

”ارے، ہم پر کہاں کسی کا رنگ چڑھنا تھا۔ ہم پر تو اپنا ہی رنگ بڑا پکا تھا۔ بھابھی یہ آپ کا شوہر نائٹ کلبز اور ڈسکوز کا بڑا شوقین تھا۔ مجھے بھی کھینچ کھینچ کر لے جانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ نت نئی لڑکیوں سے دوستی تھی اس کی۔ بڑی رنگین زندگی گزار رہی ہے اس نے۔“

سالار نے سعد کے بارے میں ٹھیک کہا تھا وہ نہیں بدلا تھا۔ پشتر لوگ خود کو بہترین مسلمان ثابت کرنے کے لیے دوسروں کے ہر عیب اور خامی کو دکھانے اور جتانے کی وبا میں مبتلا ہوتے ہیں اور ان کا اسلام انہیں صرف مقابلہ اور موازنہ سکھاتا ہے۔ پردہ پوشی نہیں۔ وہ کسی انسان کے حال اور کامیابیوں پر اسے مبارکباد تو دے

سکتے ہیں اس پر رشک بھی کر سکتے ہیں۔ اسے اپنا دوست کہنے پر فخر بھی کر سکتے ہیں لیکن اس کے ماضی کے سابقوں اور لاحقوں کو بھلائے بغیر۔ دل آزاری اور دل شکنی ان کے اسلامی گناہوں کی فہرست میں شامل نہیں ہوتے۔ سعد بھی یہی کر رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی کے سامنے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کتنے ”نیک“ شخص کی بیوی تھی جو دنیاوی کامیابیوں میں سالار سکندر سے پیچھے ہو سکتا تھا لیکن مومن تھا اور روحانی دینی اور اخلاقی اعتبار سے اس سے بے حد بہتر تھا۔

احساس کمتری کی یہ ایک بے حد بھیانک شکل ہوتی ہے جس میں کوئی شخص یہ بھی طے نہیں کر پاتا کہ اسے دوست کے ساتھ دوستی کرنی ہے یا دشمنی۔

سعد اب اپنے انکشاف سے جیسے خود ہی غمگین ہوتے ہوئے اپنی پلیٹ میں ایک نیا کباب لیتے ہوئے ہنس رہا تھا امامہ کا چہرہ پھیکا پڑا تھا۔ بہت سے انکشافات کسی کے لیے بھی بے تاثر اور بے اثر نہیں ہو سکتے۔ وہ بھی جب کوئی انکشاف اس طرح کھلے عام اتنے توہین آمیز انداز میں کیا گیا ہو۔

”بھابھی! بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے سعد۔ میری کافی رنگ برنگی لڑکیوں سے دوستی تھی لیکن سعد کو صرف ایک ہی رنگ کی لڑکی پسند تھی اور میں ذرا شوقین مزاج تھا۔ ڈسکو اور ٹائٹ کلبز آتا جاتا رہتا تھا ان لڑکیوں کے ساتھ۔ لیکن سعد ظاہر ہے میرے جیسا شوقین مزاج نہیں تھا“ اس لیے وہ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ گھر پر ہی رہنا پسند کرتا تھا۔

کباب تو سعد نے پلیٹ میں رکھ لیا تھا لیکن پلیٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے ہی پچی تھی۔ سالار سکندر نے کئی سالوں کے بعد ایسی کم طرفی اور بے لحاظی کا مظاہرہ کیا تھا جو اس کا ایک زمانے میں شناختی نشان تھا اور اسے سعد کے تین کم سن بچوں اور بیوی کے سامنے اس گھٹیا پن کا مظاہرہ کرنے پر خوشی نہیں ہوئی تھی لیکن سعد کے کسی اور ممکنہ تمغہ امتیاز کو اپنے سینے پر سجانے سے روکنے کے لیے اس کے علاوہ کوئی حفاظتی اقدام کارگر نہیں ہو سکتا تھا۔

”کیا نام تھا اس کا۔۔۔ ہاں اسٹیفنی۔۔۔ اب تو علیک سلیک ہی رہ گئی ہوگی یا وہ بھی نہیں ہے؟“ اس کی یادداشت سفاکانہ حد تک تیز تھی اور اس وقت اس نے سعد کا قتل ہی کر دیا تھا۔ سعد کا اندر کا سانس اندر اور باہر کا باہر رہ گیا تھا۔ سالار یک دم اس طرح گفتگو کرنے لگا تھا جیسے وہ کسی باریا پارک میں اکیلے بیٹھے تھے اور ان کے آس پاس کسی دوسرے شخص کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس سب کی ابتدا سعد نے کی تھی لیکن انتہا اب سالار کر رہا تھا۔ سعد جواب کیا دیتا اس کا تو سانس لینا بھی محال ہو گیا تھا۔

امامہ اس کی بیوی کے تاثرات دیکھ نہیں پائی تھی۔ اس کے چہرے پر نقاب تھا لیکن اس کی آنکھیں یہ بتانے کے لیے کافی تھیں کہ وہ سالار کے انکشافات سے خوش نہیں ہوئی تھی۔ خود امامہ کو بھی سالار کا یہ جوابی وار کچھ زیادہ نہیں بھایا تھا۔

”بھابھی! آپ کچھ لیں۔“ اس نے صورت حال کو سنبھالنے کی بروقت کوشش کرتے ہوئے سعد کی بیوی عالیہ کی توجہ اس گفتگو سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔

”نہیں بچے اور یہ لے رہے ہیں بس کافی ہے۔ ہم کچھ دیر پہلے ہی کسی لنج سے آئے ہیں تو مجھے بالکل طلب نہیں ہے۔“

امامہ کو عالیہ کا لہجہ بے حد کھردرا لگا تھا۔ وہ سعد کی طرح باتونی نہیں تھی یا پھر شاید سالار کے وہاں بیٹھے ہونے کی وجہ سے اور سعد کے اس سے مسلسل باتیں کرتے رہنے کی وجہ سے اسے زیادہ بولنے کا موقع نہیں مل پاتا تھا۔

”آپ تو ختم نبوت پر یقین نہیں رکھتیں نا؟“ کیا سوال تھا جو سعد کی بیوی کی زبان سے امامہ کے لیے نکلا تھا۔

کمرے میں یک دم خاموشی نہیں سکتے چھایا تھا۔ وہ تجسس نہیں تھا، جوانی وار تھا۔ سعد سے نہیں آیا تھا اس بار اس کی بیوی سے آیا تھا۔

”نہیں! الحمد للہ میں مسلمان ہوں۔“ چائے کا کپ ہونٹوں سے ہٹا کر امامہ نے بے حد مشکل سے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ بعض لاحقے کبھی سانسے نہیں بنتے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی حصہ تھا اس کی زندگی کا۔ جس کا تعارف اس کا رنگ پھیکا کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔

”اوہ اچھا۔ مجھے انہوں نے یہ نہیں بتایا تھا۔“ وہ اسی بے نیازی سے سعد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی تھی۔ ”تو بھابھی! آپ پھر کوئی ادارہ جوائن کریں نا۔ آپ کو تو بہت زیادہ اصلاح اور علم کی ضرورت ہوگی۔ جب تک آپ پاکستان میں ہیں آپ میرے ساتھ ایک مدرسے میں چلیں۔ وہاں درس قرآن بھی ہوتا ہے اور آپ کی روحانی اور اخلاقی تربیت۔“

”آپ کا بہت شکریہ لیکن مجھے اسلام قبول کیے اور قادیانیت چھوڑے سولہ سترہ سال ہو چکے ہیں اور میں ایک حافظ قرآن کی بیوی ہوں۔“ امامہ نے اس کی بات بڑی نرمی سے کالی تھی۔

”وہ تو میں بھی ہوں۔“ عالیہ نے اسی انداز میں کہا ”لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”آپ کو نہیں پڑا ہو گا مجھے پڑا ہے۔“

”بھابھی! آپ کو اس حوالے سے جب بھی ہماری مدد کی ضرورت پڑے ہم حاضر ہیں۔ اب میل جول تو ہوتا ہی رہے گا۔ میں ان شاء اللہ اس سال وقت نکال کر تبلیغ کے لیے کچھ دنوں کے لیے کانگو بھی آؤں گا تو آپ لوگوں کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ ویسے بھی اچھا رہے گا اگر ہمارے بچے آپس میں ملتے جلتے رہیں۔“ سعد نے اپنی طرف سے بروقت موقع برآمد اخلت کرتے ہوئے گفتگو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

”جی بھابھی! ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ۔ ہمارے بچوں کو آپس میں ملتے رہنا چاہیے اور ہمیں بھی۔ بہت سی چیزوں میں آپ کو اپنے بچوں کی تربیت کرتے ہوئے ہماری رہنمائی کی ضرورت ہوگی۔“ عالیہ نے اپنے شوہر کی گفتگو کو مکمل کرنے کی کوشش کی تھی۔

”اگر کبھی ایسی ضرورت پیش آئی تو میں اور امامہ ضرور آپ سے رہنمائی لینے کی کوشش کریں گے لیکن فی الحال مجھے لگتا ہے ہمیں اس کی ضرورت نہیں پڑ رہی۔“

اس بار سالار نے اس گفتگو میں برآمد اخلت کرتے ہوئے جیسے ایک فل اشاپ گانے کی کوشش کی تھی۔

”یار! بچے کہاں ہیں تمہارے؟ تم ان سے تو ملواتے ہیں چاہ رہا تھا احسن اور جبریل بھی آپس میں متعارف ہو جاتے۔“

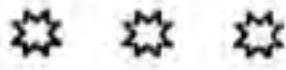
سعد سالار کو کم از کم اس حد تک ضرور جانتا تھا کہ وہ اس کے لہجے کی بے رخی اور بے اعتنائی کو پہچان لیتا اور وہ اس نے پہچان لی تھی اور ایک بار پھر اس نے بات بدل کر ماحول کو خوشگوار کرنے کی کوشش کی تھی۔

”جی جی ضرور بچے ابھی لاہی رہا ہو گا ملازم۔ باہر لان میں کھیل رہے تھے۔“ امامہ نے سعد کی اس کوشش کو کامیاب کرنے میں ساتھ دیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہاں کوئی اور بات ہوتی۔ ملازم کے ساتھ عنایہ اور جبریل کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ سعد نے بڑی گرم جوشی سے ان دونوں کو پار کیا تھا پھر جبریل اور احسن کا ایک دوسرے سے تعارف کروایا۔ چار ساڑھے چار کا جبریل اور سات آٹھ سال کے احسن سعد کی وہ پہلی ملاقات تھی لیکن وہ آخری ملاقات نہیں تھی۔

وہ دونوں ایک جیسے تھے۔ مزاجاً ”کم گو۔ ریزروڈ بہت تمیز دار۔ جبریل احسن سے عمر میں بہت چھوٹا ہونے کے باوجود اچھا قد کاٹھ رکھتا تھا اور دیکھنے میں ان کے درمیان عمر کا فرق اتنا نمایاں نہیں تھا۔ چھ سالہ آسیہ اور چار سالہ

مر وہ احسن کی نسبت اتنی ریزروڈ نہیں تھیں۔
وہ لوگ آدھ گھنٹہ اور بیٹھے تھے اور پھر انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دے کر چلے گئے تھے۔ وہ ایک یادگار اور خوشگوار ملاقات نہیں تھی لیکن انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان کی ہر ملاقات ایسا ہی تاثر لیے ہوئے رہنے والی تھی۔

سعد اور عالیہ کے جانے کے بعد سالار اور امامہ نے اس ملاقات کے دوران ہونے والے انکشافات کو دہرایا تھا نہ ان لوگوں کے بارے میں گفتگو کی تھی۔ ان کا خیال تھا وہ ان کی زندگی میں صرف شناساؤں کی کٹیگوری میں رہنے والے لوگ تھے۔ ان کا حلقہ احباب بننے والے نہیں تھے۔ انہیں اس وقت یہ اندازہ بالکل نہیں ہوا تھا کہ وہ دونوں خاندان ایک عجیب و غریب رشتے میں جڑنے والے تھے۔



سالار ایک ہفتے کے بعد واپس کانگو چلا گیا تھا اور امامہ اسلام آباد سے لاہور سالار کے ساتھ آئی تھی پھر وہیں اگلے دو ہفتے رہی تھی۔ کچھ دن ڈاکٹر سبط علی کے پاس اور کچھ دن سعیدہ ماں کے پاس۔ جو ان ہی دنوں پاکستان آئی ہوئی تھیں۔

وہاں سے واپس اسلام آباد آنے پر امامہ اور بچوں کو سکندر عثمان اور طیبہ کے ساتھ بہت سا وقت گزارنے کو ملا تھا اور اس کے واپس جانے میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا جب سکندر عثمان نے بڑے غور و خوض کے بعد اس کو ہاشم مبین کے بارے میں بتایا تھا۔

”وہ کئی دفعہ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ تمہارا نمبر لینے کے لیے۔ پاتھمارا ایڈریس لینے کے لیے لیکن میں اتنی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا تھا کہ تمہارا اور ان کا رابطہ کروا تا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا تم پھر پریشان ہو۔“
سکندر عثمان اسی سے کہہ رہے تھے۔

”لیکن مجھے لگا میں بہت زیادتی کروں گا تمہارے ساتھ بھی اور ان کے ساتھ بھی۔ اگر میں ان کی یہ خواہش پوری نہ کروں۔“

وہ بے یقینی سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی ”وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟“
”یہ سوال انسان ماں باپ سے نہیں پوچھتا۔“ سکندر عثمان نے دھیمے لہجے میں اس سے کہا تھا۔ اس کے حلق میں جیسے پھندا لگا تھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہے تھے یہ سوال انسان ماں باپ سے نہیں پوچھتا لیکن اسے تو یہ بھول ہی گیا تھا کہ اس کے ماں باپ بھی ہیں۔ زندگی کے سولہ سترہ سال اس نے ان کے بغیر گزارے تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے بھی۔ وہ آج بھی ان سے محبت کرتی تھی۔ آج بھی ان کے بارے میں جذباتی تھی۔ لیکن پچھلے کچھ سالوں نے سب بدل دیا تھا۔ وسیم کی موت نے۔ جبریل اور عنایہ اور حمین نے۔ اور سالار نے۔
”اب ملنے کا فائدہ نہیں ہے۔“

اس نے سر جھکا کر سکندر عثمان سے کہا اور اسے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ ان سے ملنے سے انکار کر رہی تھی۔ وہ تو صرف اپنے خاندان سے ملنے کے لیے منتیں ہی کرتی رہی تھی۔ انکار تو ہمیشہ دوسری طرف سے ہوتا تھا۔ آج پہلی دفعہ وہ انکار کر رہی تھی۔ کچھ نہ کچھ بدلا تھا امامہ میں۔ یا پھر سب کچھ ہی بدل گیا تھا۔

”ماں باپ کے بارے میں ہم فائدے اور نقصان بھی نہیں سوچتے۔ صرف حق اور فرض سوچتے ہیں۔“
سکندر عثمان نے ایک بار پھر بڑی رسائیت سے اس سے کہا تھا۔ انہوں نے اس بار بھی ٹھیک کہا تھا۔ سر جھکائے وہ اپنی گود میں رکھے ہاتھوں پر جیسے ماضی کو ایک فلم کے فلیش بیک کی طرح گزرتے دیکھ رہی تھی۔ اور وہ

یہ فلم اتنی بار دیکھ چکی تھی کہ اب وہ اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی وہ اپنی یادداشت کے اس حصے کو ہی جیسے کاٹ کر خود سے الگ کر دینا چاہتی تھی۔

”پاپا میں اب اس معلق پل پر نہیں جھول سکتی۔ میرے بچے ہیں اب میں اپنی ذہنی الجھنیں ان تک منتقل نہیں کرنا چاہتی۔ میں بہت خوش اور پرسکون ہوں اپنی زندگی میں۔ بس ایسے ہی رہنا چاہتی ہوں۔ کسی لعنت ملامت کا بوجھ میں نہیں اٹھا سکتی اب۔ کسی معافی تلافی کی بھی ضرورت نہیں رہی ہے اب۔ جو گزر گیا۔ بس گزر گیا۔ میں واپس پلٹ کر نہیں دیکھنا چاہتی۔“

وہ سکندر عثمان سے کہہ رہی تھی اور اسے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ اس کی آنکھیں کب برسنا شروع ہوئی تھیں۔

”ایامہ! وہ مسلمان ہو چکے ہیں۔“ وہ جامد ہو گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا رد عمل دے خوش ہو؟ وہ خوش تھی۔ رو پڑے؟ وہ پہلے ہی رو رہی تھی۔ اللہ کا شکر ادا کرے؟ وہ ہمیشہ کرتی رہتی تھی۔

”وہ مسلمان نہ بھی ہوتے تب بھی میں تمہیں کہتا تم ان سے مل لو۔ ہم سب بہت خامیوں والے انسان ہیں... غلطیاں گناہ سب کرتے رہتے ہیں۔ سب ایک جیسے ہی ہیں۔ کچھ خوبیوں میں اچھے۔ کچھ خامیوں میں برے۔ لیکن سب سے بہتر شاید وہ ہوتا ہے جو درگزر کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ اور بعض گناہوں کی سزا جب اللہ دے دیتا ہے تو پھر ہمیں نہیں دینی چاہیے۔“

سکندر عثمان نے اسے سمجھایا تھا۔ وہ اس کے اندر کی کیفیت سے بے خبر تھے۔ ہوتے تو یہ سب نہ کہتے۔ سوال معافی کا تو تھا ہی نہیں۔ اولاد اور ماں باپ کا تعلق معافی پر تو کبھی کھڑا کیا ہی نہیں جاسکتا۔ گلے شکوے کا وقت بھی اب گزر چکا تھا۔ وہ ان کا سامنا اس لیے نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ وہ اپنے وجود کو بکھرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی اس نے بے حد مشکل سے اپنے آپ کو سمیٹا تھا۔ سالار کے لیے اپنے بچوں کے لیے اپنے گھر کے لیے۔

اس نے سکندر عثمان سے بحث نہیں کی تھی۔ وہ اگلے دن ہاشم مبین سے ملنے پر بھی تیار ہو گئی تھی لیکن وہ اس رات سو نہیں سکی تھی۔ کچھ لوگوں کے روبرو ہونے کے لیے آپ ساری عمر ترستے رہتے ہیں اور پھر جب ان کا ہونا طے پا جاتا ہے تو سمجھ نہیں آتا انسان ان کا سامنا کرے گا کیسے۔

آج سے کچھ سال پہلے ہاشم مبین نے یہ کام کیا ہوتا تو اس وقت وہ ساتویں آسمان پر ہوتی۔ اپنے خاندان کو اپنے دین پر لے آئے، گمراہی کے راستے سے پلٹ آنے کے لیے اس نے بڑے سال دعا میں مانگی تھیں۔ اور اس خاندان کا معزول سربراہ اب جب نائب ہو گیا تھا تو امامہ اپنے دل کی کیفیت کو سمجھ ہی نہیں پار ہی تھی۔

وہ اگلی سہ پہر آئے تھے۔ وہ کمرے میں آئی تو باپ پر پہلی نظر ڈالتے ہی رو پڑی تھی نہ رونے کا تہیہ کیے ہوئے بھی۔ وہ بے حد ضعیف لگ رہے تھے۔ یہ سننے والا وہ وجود نہیں تھا جس سے وہ ساری عمر ڈرتی رہی تھی۔

ہاشم مبین نے اسے گلے لگایا تھا۔ وہ نم آنکھوں کے ساتھ بھی بڑے حوصلے سے ان سے مل کر الگ ہوئی تھی، پہلے کی طرح۔ عادتاً ان سے لپٹی نہیں رہی تھی اور پھر وہ آمنے سامنے دو صوفوں پر بیٹھ گئے تھے۔ اس کمرے میں ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ وہ دونوں تھے اور طویل گہری خاموشی تھی۔ پھر اس خاموشی کو ہاشم مبین کی ہچکیوں اور سسکیوں نے توڑا تھا۔ وہ بوڑھا آدمی اب بچوں کی طرح پلک پلک کر رونے لگا تھا۔

امامہ انہیں چپ چاپ بیٹھی دیکھتی رہی تھی وہ بھی بے آواز رو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے برسنے والے آنسو اس کی ٹھوڑی سے ٹپکتے ہوئے اس کی گود میں رکھے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔

”وقت واقعی بڑا ظالم ہوتا ہے۔ مجھ سے بہت بڑا گناہ ہو گیا۔ میں نے بہت ظلم کیا اپنے آپ پر۔ اپنے

خاندان پر پتا نہیں کیسے ہو گیا یہ سب کچھ؟“
ہاشم مبین روتے ہوئے اعتراف کر رہے تھے اور امامہ کو یاد آیا تھا انہوں نے ایک بار اس سے کہا تھا کہ جو کچھ وہ کرنے جا رہی تھی وہ اس پر بہت پچھتائے گی۔ ایک وقت آئے گا کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گا اور وہ واپس پلٹ کر ان سے معافی مانگنے آئے گی۔ اور تب وہ اسے معاف نہیں کریں گے۔ وقت واقعی بڑا بے رحم اور ظالم ہوتا ہے۔ اس کے سامنے بیٹھ کر بچوں کی طرح روتا ہوا یہ بوڑھا شخص اس کا اپنا باپ نہ ہوتا تو وہ آج بہت فخر محسوس کرتی کہ اس کا سر نیچا نہیں ہوا تھا۔ کسی اور کا ہوا تھا پر سارا دکھ ہی تھا کہ اس کا باپ اگر اپنے کیسے کی سزا پارہا تھا تو بھی تکلیف اسی کو ہو رہی تھی۔

”مجھے لگتا ہے امامہ! مجھے تمہاری بددعا لگ گئی۔“ ہاشم مبین نے روتے ہوئے کہا۔

”مجھے کبھی بددعا کرنے کا خیال ہی نہیں آیا ابو۔ آپ کے لیے کیا، کسی کے لیے بھی۔“

اس نے بالآخر ہاشم مبین سے کہا تھا۔ وہ آج اس تنہنے کے ساتھ اس کے سامنے ہوتے تو وہ انہیں کہتی کہ انہیں اس کی بددعا نہیں لگی۔ انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنے کی سزا ملی ہے۔ وہ رتبہ جو اللہ تعالیٰ نے صرف انہیں عطا کیا تھا اس رتبے کو کسی اور کو دے دینے کا خمیازہ بھگت رہا تھا ان کا خاندان وہ صرف قادیانی نہیں ہوئے تھے بلکہ انہوں نے اس مذہب کی تبلیغ بھی پوری جانفشانی سے کی تھی۔ پتا نہیں کتنوں کو گمراہ کیا تھا اور اس گمراہی کے بدلے میں کتنوں کی عاقبت خراب کی تھی ورنہ ان کے خاندان میں کبھی یہ تو نہیں ہوا تھا جو ان کے ساتھ ہو رہا تھا۔ وہ کروڑ پتی تھے اور ساری عمر آسائشوں میں گزارنے کے بعد وہ اپنا برہنہ اولڈ ہوم میں گزارنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ان کے خاندان میں پہلی بار کوئی ایسے بے گھر بے در ہوا تھا۔ لیکن ان کے خاندان میں گمراہی کی روایت بھی ہاشم مبین ہی کی قائم کر رہی تھی۔

”آپ نے دیر سے کیا لیکن صحیح اور اچھا فیصلہ کیا۔“ یہ ایک جملہ کہتے ہوئے امامہ کو بے حد تکلیف ہوئی تھی اسے و نسیم یاد آیا تھا۔ سعد یاد آیا تھا۔ اسے اپنا وہ خاندان یاد آیا تھا جو سارے کا سارا غیر مسلم تھا اور غیر مسلم ہی رہنے والا تھا۔ واپس تو یا وہ پٹی تھی یا ہاشم مبین۔

”تمہارا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی مجھ میں بہت وقت لگا دیا میں نے تمہارے سامنے آنے میں۔ لیکن بس معافی مانگنا چاہتا تھا تم سے اور تمہاری ایک امانت تھی میرے پاس۔ وہ مرنے سے پہلے تمہیں دے دینا چاہتا تھا۔“

”ہاشم مبین نے بالآخر اپنی ہچکیوں اور سسکیوں پر قابو پا لیا تھا۔ وہ اب اپنے ساتھ لائے ہوئے بیگ سے ایک لفافہ نکال کر اسے دے رہے تھے۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے لفافہ تھامے بغیر ان سے پوچھا تھا۔ ”جائیداد میں تمہارا حصہ۔ اسی حصے کے لیے تمہارے بھائیوں کو خفا کر دیا ہے میں نے۔ وہ یہ بھی لے لینا چاہتے تھے مجھ سے۔ لیکن میں تمہاری چیز انہیں نہیں دے سکتا تھا۔ ساری عمر تمہیں کچھ نہیں دے سکا۔ کچھ تو دینا چاہتا تھا تمہیں مرنے سے پہلے۔“

وہ ان کی بات پر رو پڑی تھی۔ ابو اس کی ضرورت نہیں تھی مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے مجھے میں اسے لے کر کیا کروں گی۔ اگر میرے بھائیوں کو میرا حصہ دے دینے سے ان کی زندگی میں آپ کے لیے کوئی گنجائش نکلتی ہے تو آپ یہ انہیں دے دیں۔“

ہاشم مبین نے بے حد مایوسی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔ ”میں ان کے لیے اب ”غیر مسلم“ ہوں امامہ۔ وہ مجھے اپنی زندگی سے نکال کر پھینک چکے ہیں جیسے کبھی میں نے تمہیں اپنی زندگی سے نکال پھینکا تھا۔“ وہ ٹھکت خورہ انداز میں کہہ رہے تھے۔

”پھر آپ میرے حصے کو بیچ کر اپنے لیے کوئی گھر لے لیں۔ کوئی جگہ۔ میرے پاس اب سب کچھ ہے۔ آپ کا کوئی روپیہ پیسہ اب میری ضرورت نہیں رہا۔“ امامہ نے وہ لفافہ پکڑ کر ان کے بیگ میں واپس رکھ دیا تھا۔

”تم نے مجھے معاف نہیں کیا؟“ انہوں نے رنجیدگی سے کہا۔
 میں آپ کو معاف کرنے نہ کرنے والی کون ہوتی ہوں ابو۔۔۔ یہ فیصلہ تو آپ کے لیے اللہ کو کرنا ہے۔ میں تو صرف یہ دعا کر سکتی ہوں کہ اللہ آپ کو معاف کر دے۔ بڑی معافی تو وہاں سے آنی چاہیے۔“
 وہ سر جھکائے بیٹھے رہے پھر انہوں نے کہا۔

”تم ہم سے ملتی رہو گی نا؟“ عجیب آس اور حسرت تھی۔ امامہ نے سر ہلا دیا تھا۔ ماں باپ کا یہ حال اسے دل گرفتہ کیے ہوئے تھا۔ ہاشم مبین کے چہرے پر اس ملاقات کے دوران پہلی بار مسکراہٹ آئی تھی۔

”میں جائیداد کا یہ حصہ تمہارے بچوں کے نام کر دیتا ہوں امامہ۔“
 ”ابو میں آپ کی جائیداد اور روپے پیسے میں سے کچھ بھی نہیں لوں گی۔ میں لوں گی بھی تو سالار واپس کر دے گا۔“ اس نے ہاشم مبین سے دو ٹوک انداز میں کہا تھا۔

ہاشم مبین کچھ دیر بیٹھ کر پھر اسے ساتھ لے کر اس کی ماں سے ملوانے گئے تھے۔ سکندر عثمان اور ان کی بیوی بھی ساتھ گئے تھے۔ وہ ایک اور جذباتی ملاقات تھی۔

”تم اب بہت بہادر ہو گئی ہو۔“ اس رات سالار نے اس سے کہا تھا۔ اس نے اپنے دن کی روداد سنائی تھی فون

”کیسے؟“ وہ اس کے تبصرے پر حیران ہوئی تھی۔ ”تم آج ایک بار بھی روئی نہیں مجھے اپنے پیرٹس سے ملاقات کے بارے میں بتاتے ہوئے۔“ وہ چپ رہی پھر اس نے سالار سے کہا۔

”آج ایک اور بوجھ میرے کندھوں اور دل سے ہٹ گیا ہے۔ بہت دیر سے ہی سہی لیکن اللہ تعالیٰ نے گمراہی سے نکال ہی لیا ہے میرے ماں باپ کو۔ دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ سالار! دیر سے ہی سہی بر قبول ہو جاتی ہیں۔“

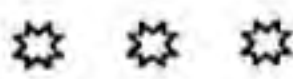
امامہ کے لہجے میں ایک عجیب طمانیت تھی جسے سالار نے ہزاروں میل دور بیٹھے بھی محسوس کیا تھا۔
 ”تمہاری ہو جاتی ہیں۔“ اس نے مدہم آواز میں امامہ سے کہا۔

”کیا تمہاری نہیں ہوتیں؟“ اس نے جواباً پوچھا۔
 ”میری بھی ہوتی ہیں لیکن تمہاری زیادہ ہوتی ہیں۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

”الحمد للہ۔“ امامہ نے جواباً کہا۔ وہ ہنس پڑا۔ ”تم میرے پیرٹس کو اولڈ ہوم سے نکال کر ایک گھر لے دو سالار۔۔۔ ان کے پاس میرے لیے جائیداد کا جو حصہ ہے اسے بیچ کر۔ بے شک کوئی چھوٹا گھر ہو لیکن انہیں وہاں اولڈ ہوم میں نہیں دیکھ سکتی۔“

”میں بابا سے کہہ دوں گا وہ کر دیں گے یہ کام۔ ان کا خیال بھی رکھیں گے۔ تم اگر اسلام آباد میں مستقل رہنا چاہتی ہو تو رہ سکتی ہو امامہ۔ تم اور بچے وہاں۔“

امامہ نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ”میں یہاں مستقل نہیں رہنا چاہتی۔ میں تمہارے پاس رہنا چاہتی ہوں اور واپس آ رہی ہوں اسی تاریخ کو۔“



سی آئی اے نے سالار سکندر کی اس سرگرمی کو صرف مانیٹر اور ریکارڈ نہیں کیا تھا انہوں نے اس ملاقات میں شامل پانچوں افراد کو بھی اپنی واچ لسٹ میں ڈال لیا تھا۔ اگلے آنے والی مہینوں میں سالار سکندر اور ان پانچ افراد

کے بہت سارے تفریحی دورے ہوتے رہے تھے۔ لیکن اب سی آئی اے صرف سالار سکندر کی نہیں ان پانچ افراد کی نقل و حرکت کو بھی مانیٹر کر رہی تھی۔ ایک عجیب پر اسرار نیٹ ورک کام کر رہا تھا۔ وہ پانچ افراد سالار سکندر سے صرف چند ماہ اچانک ملتے رہے تھے لیکن اس کے بعد سالار سکندر کے ساتھ ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ وہ پانچ افراد اب آپس میں بھی نہیں مل رہے تھے لیکن وہ پانچ افراد انفرادی طور پر ایسی ہی ملاقاتیں کر رہے تھے۔ پیٹرن وہی تھا چار پانچ اپنی اپنی فیلڈ کے ممتاز ترین لوگ۔ لیکن دنیا کے مختلف ممالک میں۔ سب ہی ایک ہی عمر کے دائرے میں اور سب ہی امریکن نیشنل۔ اور پھر یہ مماثلتیں ایک جگہ جا کر مرکوز ہو جاتی تھیں، وہ سب بھی مسلمان تھے۔ ان میں کچھ حفاظ تھے۔ کچھ نہیں تھے لیکن وہ سب با عمل مسلمان تھے۔ وہ ایک اسلامی مالیاتی سسٹم پر کام کر رہے تھے اور یہ سی آئی اے جانتی تھی لیکن اس نظام کی شکل کیا تھی۔ خدو حال کیا تھے۔ وہ اسے بوجھنے میں کامیاب نہیں ہو رہے تھے اور اس کی وجہ صرف ایک تھی۔ ایک جگہ سب کی طرح اس نظام سے منسلک ہونے والے سب افراد کے پاس اس کا ایک ایک ٹکڑا تھا۔ اور وہ اس ٹکڑے کو اچھی طرح سمجھتا اور جانتا تھا لیکن وہ ٹکڑا اس تصویر میں کہاں لگنا تھا یہ صرف ایک شخص جانتا تھا۔ سالار سکندر۔



”مئی! حمین کب بڑا ہو گا؟“ اس دن جبریل نے اپنی آرٹ بک میں کچھ بناتے ہوئے امامہ سے پوچھا جو روتے بلکتے حمین کو ہمیشہ کی طرح تھپک تھپک کر خاموش کرنے اور کچھ کھلانے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کوشش میں بے حال ہو رہی تھی اور اس کی یہ حالت جبریل اور عنایہ بغور دیکھ رہے تھے۔ وہ کچھ مہینے پہلے کانگو میں اپنے نئے گھر میں منتقل ہوئے تھے۔ اس ہوٹل میں دو تین مہینے رہنے کے بعد۔

”بڑا تو ہو گیا ہے۔“ امامہ نے اس کے سوال اور انداز پر غور کیے بغیر کہا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ساری بھول
ہماری تھی



راحت جبین
قیمت - 300 روپے

شریک سفر



زہرہ ممتاز
قیمت - 550 روپے

کسی راستے کی
تلاش میں



میونہ خورشید علی
قیمت - 350 روپے

میرے خواب
لوٹا دو



نگہت عبداللہ
قیمت - 400 روپے

فون نمبر:
32735021

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

”تو پھر رو تا کیوں رہتا ہے؟“ امام بے چارگی سے اپنے بڑے بیٹے کو دیکھ کر رہ گئی۔

”آپ اس سے پوچھ لیں کہ اس کو کیا چاہیے۔“ وہ امام کو جیسے مسئلے کا حل بتا رہا تھا۔

”میں پوچھ نہیں سکتی اور وہ بتا نہیں سکتا۔“ امام اب بھی اسے اٹھائے لاؤنج میں ٹہلتے ہوئی اسے تھپک رہی تھی اور وہ اسی طرح روتے ہوئے اس کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے مچل رہا تھا۔ وہ اسے نیچے بٹھا دیتی تو وہ گود میں اٹھائے جانے کے لیے ہاتھ بلند کر کے دھاڑیں مارتا۔ اور یہ ڈرل دن میں دو تین بار کا معمول تھا۔ رونا حمین سکندر کا من پسند۔ مشغلہ تھا۔ وہ بغیر آنسوؤں کے گلا پھاڑ پھاڑ کر روتا تھا اور پھر رونے کے بیچوں بیچ کوئی بھی دلچسپ چیز نظر آنے پر یک دم رونا بند کر کے اس کا جائزہ لینے میں مصروف ہو جاتا اور جب اس کام سے فارغ ہو جاتا تو ایک بار پھر اپنے رونے کے سلسلے کو وہیں سے جاری کرتا جہاں اس نے چھوڑا تھا۔

سات آٹھ ماہ کی عمر میں ہی اس نے بیک وقت چار دانت نکالنے شروع کر لیے تھے جو خرگوش کے دانتوں کی طرح اس کے منہ کے درمیان میں تھے اور اس کے رونے اور ہنسنے پر نظر آتے تھے۔

”اس کو جلدی کس بات کی ہے؟“ بیک وقت چار دانتوں کو نکلتے دیکھ کر سالار نے کہا تھا۔ جبریل اور وہ حمین سکندر کے بارے میں ایک جیسے تاثرات اور خیالات رکھتے تھے۔

”یہ تم خود اس سے پوچھ لو۔“ امام نے جواب دیا تھا۔

حمین کو پالنا اس کے پہلے دو بچوں کی نسبت زیادہ تھکانے اور آزمانے والا کام ثابت ہو رہا تھا۔ حمین سکندر ان چار دانتوں کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے بھی صرف بڑوں کے کھانے والی ہر اس چیز میں دلچسپی محسوس کرتا تھا

جو چٹخارے والی ہوتیں۔ اپنے پوپلے منہ کے ساتھ بھی چسپ اس کی پسندیدہ خوراک تھی جسے وہ صرف چبا نہیں نگل بھی سکتا تھا۔ وہ چسپ کا پیکٹ تک پہچانتا تھا اور ایسا ممکن نہیں تھا کہ جبریل اور عتابیہ اس کے قریب بیٹھ کر کوئی چیز اطمینان سے اسے کھلائے بغیر خود کھا لیتے۔

وہ ایک عجیب و غریب بچہ تھا۔ اور یہ بیان اس کے بارے میں سالار سکندر نے دیا تھا جس کا خیال تھا اس نے ایسی مخلوق کبھی نہیں دیکھی۔

سکندر عثمان نے اس سے کہا تھا ”میں نے دیکھی ہے۔ وہ تمہاری کاپی ہے۔“

”یہ زیادتی ہے۔“ سالار نے ان کی بات پر احتجاج کیا تھا وہ اور طیبہ ان لوگوں کے پاس کانگو آئے ہوئے تھے جب وہ دونوں حمین سکندر کے ہاتھوں بننے والی ان کی درگت دیکھ رہے تھے۔ وہ تیس ماہ کا تھا اور سب سے پہلے جو لفظ اس نے بولنا شروع کیا تھا وہ ”سالار“ تھا اور ہر بار سالار کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ بے حد خوشی سے ہاتھ پاؤں مارتا سالار سالار چلاتے ہوئے اس کی طرف جانے کی کوشش کرتا تھا۔

یہ پہلا لفظ تھا جو اس نے بولنا شروع کر دیا تھا۔ جبریل اور عتابیہ کی طرح وہ بھی جلدی بولنا سیکھ رہا تھا۔ اس میں چیزوں کی شناخت اور پہچان کی صلاحیت بھی ان ہی دونوں کی طرح منفرد تھی لیکن اس کی بولنے کی صلاحیت ان دونوں سے بھی اچھی تھی۔

”بیٹا بابا!“ پہلی بار سالار کے لیے وہ لفظ سن کر ہنسی سے بے حال ہونے کے باوجود امام نے اس لفظ کو بدلنے کی کوشش کی تھی۔ وہ سالار پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے توڑ توڑ کر سکھا رہی تھی۔ ”با۔ با۔“

”سالار۔“ حمین نے ماں کی محنت پر پانی پھیرتے ہوئے سالار کے لیے وہی لفظ استعمال کیا جو وہ سالار کے لیے ماں کو یگارتے سنتا تھا۔

”تم اسے باپا مت سکھاؤ“ صرف رگوا اور میرے نام کے ساتھ یہ بھی غنیمت ہو گا میرے لیے۔“
 سالار نے اسے مشورہ دیا تھا۔ وہ بہر حال کچھ زیادہ محظوظ نہیں ہوا تھا اس طرز تخاطب سے جو سکندر عثمان اور
 طیہ کے لیے ایک تفریح بن گئی تھی۔
 اور پانچ سالہ جبریل بدھا کے سے تحمل اور دانائی کے ساتھ اپنے اس اکلوتے چھوٹے بھائی کو دکھاتا تھا جس
 نے ان کے گھر کے امن اور سکون کو پچھلے تقریباً ”ایک سال سے تہ وبالا کر کے رکھا ہوا تھا۔ پہلے اس کا خیال تھا
 حمین بڑا ہو جائے اور چلنا شروع ہو جائے تو ٹھیک ہو جائے گا لیکن جب بالآخر اس نے چلنا شروع کیا تو دیکھ کر
 اسے اندازہ ہوا کہ وہ اس ”مسئلے“ کا غلط ”حل“ تھا۔

حمین سکندر کو پیر نہیں پر مل گئے تھے۔ اور وہ اب کہیں بھی جاسکتا تھا اور کہیں سے مراد ”کہیں“ بھی تھا۔
 اور اس کی فیورٹ جگہ ہاتھ روم تھی۔ وہ بھی وہاں اس وقت جانا پسند کرتا تھا جب جبریل اسے ہاتھ روم میں جاتا
 دکھائی دیتا۔ اور جبریل نے اس کے ہاتھوں کئی بار خاصی شرمناک صورت حال کا سامنا کیا۔ جس ہاتھ روم کو بچے
 استعمال کرتے تھے اس ہاتھ روم میں لاک نہیں تھا اور دروازے کا ہینڈل گھما کر اسے کھولنا حمین کے ہاتھوں
 کا کھیل تھا۔ جبریل کے لیے حمین کی موجودگی میں ہاتھ روم جانا جان جو کھوں کا کام بن جاتا تھا۔ وہ امامہ یا پیڈی کے
 آس پاس نہ ہونے پر ہاتھ روم کے دروازے کے اندرونی طرف ہاتھ روم میں پڑی ان سب چیزوں کو رکاوٹوں کے
 طور پر دروازے کے سامنے ڈھیر کر کے پھر ہاتھ روم کا استعمال کرتا تھا۔

سالار سکندر اگر اسے ”عجیب و غریب“ کہتا تھا تو حمین سکندر باپ کے دیے گئے اس ٹائٹل پر پورا اترنے کی
 کوشش کر رہا تھا اور پوری دل جمعی کے ساتھ۔ کبھی کبھی ان سب کو لگتا تھا حمین سکندر کو کوئی بھی کنٹرول نہیں
 کر سکتا تھا۔ مگر دنیا میں ہر فرعون راموسی ہوتا ہے اور چینی کی ان کی زندگی میں آمد ایک ایسی ہی نعمت کے طور پر
 ہوتی تھی۔



نائب صدر کے طور پر سالار سکندر نے افریقہ کے لیے کسی انسان کی طرح نہیں مشین کی طرح کام کیا تھا۔ اس
 کی ملازمت کا دورانیہ افریقہ کی تاریخ کے سنہری ترین سالوں میں گردانا جاتا تھا۔ وہ افریقہ میں تقرر ہونے سے
 پہلے افریقہ کی معشیت کا ماہر سمجھا جاتا تھا لیکن وہاں اپنے قیام کے دوران سالار سکندر افریقہ کے انسانی کلویڈیا
 میں تبدیل ہو گیا تھا۔ افریقہ کا کوئی ملک یا علاقہ ایسا نہیں تھا جس کے بارے میں معلومات اس کی انگلیوں پر نہیں
 تھیں اور جہاں اس نے کانٹیکٹس نہیں بنائے تھے۔

وہ ورلڈ بینک کی نمائندگی کرتے ہوئے افریقہ کی فلاح اور ترقی کے لیے کام کی خواہش رکھتے ہوئے جیسے وہاں
 ایک دو دھاری تلوار پر چل رہا تھا۔ اسے ورلڈ بینک یعنی عالمی طاقتوں کے اہداف بھی حاصل کرنے تھے انہیں
 ناراض بھی نہیں کرنا تھا اور اسے افریقہ میں افریقی عوام کی فلاح و بہبود کو بھی مد نظر رکھنا تھا۔ وہ مشکل ترین
 اہداف کے حصول کے لیے نامساعد ترین حالات میں کام کر رہا تھا۔ اور کامیابی سے کر رہا تھا۔ پٹرس ایسا کاگی
 موت اور اس سے پیدا ہونے والے حالات ورلڈ بینک کے لیے ایک وقتی جھٹکا تھے۔ وہ ”مصلحتاً“ پسپا ہونے پر مجبور

ہوئے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ افریقہ کے لیے عالمی طاقتوں کی پالیسیاں بدل گئی تھیں۔ اور سالار یہ
 بات بخوبی جانتا تھا۔ تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ سب کچھ نظروں سے اوجھل اور یادداشت سے محو ہونا شروع ہو
 گیا تھا۔ غریب قوموں کی یادداشت ان کے پیٹ کے ساتھ بندھی ہوتی ہے۔ پیٹ خالی ہوتا ہے تو ان کی

یادداشت بھی خالی ہو جاتی ہے۔

پیسرس ایسا کا بھی بہت جلد اپنی قوم کی یادداشت سے غائب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اور سالار کو اس بات کا اندازہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ وقتی ایال ہے جو کچھ عرصہ اس قوم کو مشتعل رکھے گا اس کے بعد زمینی حقائق انہیں یہ سب بھولنے پر مجبور کر دیں گے۔ اور زمینی حقائق یہ تھے کہ افریقہ کے عوام اپنی ہر ضرورت کے لیے ترقی یافتہ قوموں پر انحصار کرتے تھے۔ ان کی روزی رونی ان کے پروجیکٹس میں کام کر کے ہی چلتی تھی۔ ان کے اپنے لیڈرز اور حکومتیں کرپٹ تھیں، چور تھیں جو ملکی وسائل کو صرف اپنے فارن بینک اکاؤنٹس کو بھرنے کے لیے استعمال کرتی تھیں اپنے ملک اور عوام کی زندگی اور حالات بدلنے کے لیے نہیں۔

افریقہ میں سب کچھ تھا۔ اپنے حالات بدلنے کی نیت نہیں تھی۔ اور یہ نیت کوئی دوسرا انسان ان کے اندر پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ سالار سکندر بھی نہیں اور یہ وہ حقائق تھے جن سے مغربی دنیا واقف تھی تو افریقہ بھی انجان نہیں تھا۔

سالار سکندر کی وجہ سے اگر کوئی فرق پڑا تھا تو صرف یہ کہ اگر پہلے ان پروجیکٹس کا دس فی صد وہاں کے عوام کی بہتری پر خرچ ہو رہا تھا تو اب اس کا تناسب اب بیس سے تیس فی صد کے درمیان ہو گیا تھا۔ وہ اس سے بڑی تبدیلی نہیں لاسکتا تھا۔ وہ بیس سے تیس فی صد وسائل بھی اگر ٹھیک استعمال ہوتے تو وہاں بہتری کی رفتار چار گنا کی جاسکتی تھی اور یہ کام سالار نے کیا تھا۔ وہ ان وسائل کے استعمال کو سو فی صد شفاف نہیں بنا سکتا تھا لیکن اس کے استعمال کا فوکن ٹھیک کر سکتا تھا۔ ترجیحات درست کر سکتا تھا اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب رہا تھا۔

ایک نائب صدر کے طور پر افریقہ میں اس کی اور اس کے آفس کی کارکردگی اور استعداد اور دنیا کے دوسرے خطوں میں کام کرنے والے نائب صدر کے مقابلے میں بہترین تھی۔ وہاں شروع ہونے والے پروجیکٹس کیس اسٹڈیز کے طور پر دوسرے خطوں میں ورلڈ بینک۔ دوسرے نائب صدر اٹھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ وہ ورلڈ بینک کا سربراہ نہیں تھا لیکن سالار سکندر نے اپنے آپ کو بہت نمایاں نہ رکھتے ہوئے بھی ورلڈ بینک کے باقی تمام نائب صدر کو نہ صرف کنارے لگا کر غیر فعال کر دیا تھا۔ بلکہ ورلڈ بینک کے اس اگلے صدر کو بھی پس منظر میں دھکیل دیا تھا جسے پیسرس ایسا کی موت کے دوران پیدا ہونے والے کرانسیس پر قابو نہ پاسکنے کی یادداشت میں پرانے صدر کو ہٹا کر تعینات کیا گیا تھا۔

وہ تین سال مسلسل "ٹائم" کے مین آف د ایر کے طور پر اس کے سرورق کا حصہ بنا تھا اور ورلڈ بینک کے ساتھ ہونے والے اس پروجیکٹ کے بارے میں اختلافات سے پہلے وہ ورلڈ بینک کے حلقوں میں ایک بہت زیادہ پروفیشنل ورکر کی شہرت رکھتا تھا جو ہر لحاظ سے غیر متنازعہ اور بے حد اچھی شہرت کا مالک تھا۔ اور اب اس شہرت کو "خراب" کرنے والی شے صرف ایک تھی۔ اس کا "بنیاد پرست" مسلمان ہونا جو اس ایک تقریر کے علاوہ اور اس کے لائف اسٹائل کے علاوہ اس کے کام اور پالیسیوں میں کبھی نہیں جھلکا تھا۔

سالار سکندر کی ملازمت کا دورانیہ ختم ہونے کے قریب آ رہا تھا۔ بینک نے یہ دورانیہ ختم ہونے سے دو سال پیشتر ہی سالار سکندر کو ملازمت میں توسیع کی آفر کی تھی اور اس نے یہ آفر قبول نہیں کی تھی۔ پھر اس آفر کو وقفے وقفے سے بار بار بہتر کیے جانے کے ساتھ اسے اصرار کے ساتھ پیش کیا جاتا رہا۔ لیکن سالار کا انکار قائم رہا تھا۔ وہ افریقہ میں اپنے قیام کو اب ختم کرنا چاہتا تھا۔ اور ورلڈ بینک کے ساتھ ساتھ امریکن حکومت کے لیے بھی یہ

تشویش کی بات تھی۔ افریقہ کو سالار سکندر سے زیادہ بہتر کوئی نہیں چلا سکتا تھا۔ اس بات پر بورڈ آف ڈائریکٹرز میں کوئی دورانیہ نہیں تھیں اور نہ ہی امریکن حکومت کو کوئی شبہ تھا۔ اس نے پچھلے چند سالوں میں نہ صرف ورلڈ

بینک کی ساکھ اور امیج ہی افریقہ میں بدل کر رکھ دیا تھا۔ بلکہ اس نے امریکن حکومت کے لیے بھی وہاں خیر سگالی کے جذبات دوبارہ پیدا کرنے میں بہت کامیابی حاصل کی تھی۔ اس کا ورلڈ بینک کو اس وقت چھوڑ کر جانا ان کے لیے بہت بڑا دھچکا ہوتا۔ لیکن وہ رکنے پر تیار نہیں تھا اور امریکن حکومت کو سوچنا پڑ رہا تھا کہ وہ اسے ایسی کیا چیز پیش کرے جو اسے روک سکے۔

ورلڈ بینک کی صدارت ہی یقیناً "ایسا ایک تاج تھا جو اس کو پہنا کر اسے روکا جاسکتا تھا۔ سالار سکندر اس عہدے کے لیے موزوں ترین اور کم عمر ترین امیدوار تھا مگر اس عہدے پر سالار سکندر کی تعیناتی امریکی حکومت کے لیے خود ایک مسئلہ بن گئی تھی۔ وہ ایک "بنیاد پرست" مسلمان کو ورلڈ بینک کا صدر نہیں بنا سکتے تھے اور وہ اس "بنیاد پرست" مسلمان کو کسی اور چیز کی آفر کر کے روک بھی نہیں پارہے تھے۔ یہ فیصلہ انہیں کرنا تھا کہ کیا اس کی مسلم بنیاد پرستی کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ابھی امریکی حکومت اور ورلڈ بینک کے پاس اس بارے میں سوچنے کے لیے وقت تھا کیونکہ سالار کی ملازمت کا دورانیہ ختم ہونے میں ایک سال باقی تھا۔

اس ایک سال میں سالار سکندر کی زندگی میں تین بڑے واقعات ہوئے تھے اور تینوں نے اس کی زندگی پر بہت گہرے نقوش چھوڑے تھے۔ گہرے اور ہمیشہ رہ جانے والے۔ اور یہ کہنا غلط نہیں تھا کہ ان واقعات نے ایک بار پھر اس کی زندگی بدل دی تھی۔

جنی غلام فرید بھی اس کی زندگی میں اس کی آخری اور جو تھی اولاد کے طور پر اسی سال آئی تھی۔ اس کی زندگی کا پہلا بڑا واقعہ۔



جنی سے سالار سکندر کا عاںسانہ تعارف ہمیشہ بے نام رہا تھا۔ غلام فرید کے حوالے سے سکندر عثمان سے اسے کئی بار خبریں ملتی رہی تھیں بالکل اسی طرح جس طرح گاؤں میں قائم اس اسکول کے بہت سے دوسری ملازمین کے بارے میں پتا چلتا رہتا تھا۔ سکندر عثمان نے غلام فرید کے ذریعے گاؤں کی مسجد کے امام کو پہنچائی جانے والی امداد کے بارے میں بھی سالار کو مطلع کر دیا تھا کیونکہ یہ امداد سالار کے کہنے پر ہی سکندر عثمان نے شروع کی تھی۔ غلام فرید کو اس امداد میں ہیر پھیر کے نتیجے میں ملازمت سے فارغ کرنے کا حکم بھی سالار ہی کا تھا۔ بددیانتی اور بے ایمانی اس کے لیے قطعاً "نا قابل برواشت" تھی اور یہ معاملہ اسے اس لیے زیادہ سنگین اور زیادہ ناقابل برواشت لگا تھا کہ جس رقم میں ہیر پھیر کیا گیا تھا وہ مسجد کے لیے دی گئی تھی اور مسجد کی رقم میں بددیانتی کرنے والے شخص کو وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں سمجھتا تھا۔ سکندر عثمان بھی غلام فرید کو دی جانے والی اس سزا کے حق میں تھے۔ اس لیے انہوں نے سالار سکندر کی ہدایات پر پوری طرح عمل درآمد کیا تھا۔

غلام فرید کے ہاتھوں ایک بچی کے سوا اپنے پورے خاندان کا قتل سکندر عثمان کو بری طرح ہلا گیا تھا۔ اس دل خراش واقعہ کو میڈیا نے بہت دن اچھالا تھا۔ غلام فرید سے پوچھے جانے والے سوالوں کے جوابات وہ میڈیا سنز کی شکل میں دکھاتے اور چھاپتے رہے تھے جو صرف سکندر عثمان ہی نہیں سالار کی نظروں سے بھی گزرتے رہے تھے، اپنی فیملی کو اس طرح بے رحمی سے مار دینے والا شخص میڈیا کو ذہنی عدم توازن کا شکار لگ رہا تھا کیونکہ وہ اس حادثے کی توجیہات ہر روز بدل دیتا تھا۔

"اسے اپنی بیوی کے کردار پر شک تھا۔ اس لیے اس نے اپنے خاندان کو مارا۔"

یہ حادثے کے فوراً بعد میڈیا کی طرف سے بریکنگ نیوز حاصل کرنے کے چکروں میں نشر اور شائع ہونے والی

پہلی خبر تھی۔

یہ ایک غیر ذمہ دار صحافی نے اندازاً "بنا کر اپنے ٹی وی پر نشر کی تھی اور باقیوں نے آنکھیں بند کر کے اس کی تقلید کی تھی۔ ڈیسک جرنلزم کی یہ چھوٹی سی بددیانتی کئی سالوں بعد کسی شخص کے گلے کا پھندا بن جانے والی تھی یہ اس صحافی کو اندازہ بھی نہیں تھا۔

جوں جوں غلام فرید سے مختلف صحافیوں کو ملنے اور بات کرنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ مختلف انکشافات سامنے آتے رہے۔ وہ پہلی خبر چھپ گئی تھی۔ اب اس قتل کی وجہ غربت سامنے آئی تھی۔ بیوی سے لڑائی جھگڑے تھے۔ گھر میں بھوک اور بیماری تھی۔ رشتہ داروں اور قرض خواہوں کے اپنی رقم کے تقاضے تھے۔ اور ان سب کے آخر میں اسکول کی ایک نوکری سے ایک مالی بددیانتی پر نکالا جانا اور بے گھر کیا جانا تھا جو سکندر عثمان اور سالار کو احساس جرم میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔

وہ اب غلام فرید کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے سوائے اس کے کہ اس کی بیچ جانے والی واحد اولاد کی دیکھ بھال اور کفالت کی ذمہ داری اٹھالیتے اور سالار کے کہنے پر وہ سکندر عثمان نے اٹھالی تھی۔ وہ اس کے لیے ماہانہ رقم بھیجتے تھے جو اس کے رشتہ دار آکر لے جاتے تھے اور کبھی کبھار سکندر عثمان کے کہنے پر وہ چینی کو لاکر انہیں دکھا بھی جاتے تھے تاکہ انہیں یہ تسلی رہے کہ وہ رقم واقعی اس پر خرچ ہو رہی تھی۔ اس کی مناسب دیکھ بھال ہو رہی تھی اور وہ محفوظ ہاتھوں میں تھی۔ یہ شاید اسی طرح چلتا رہتا اگر اس سال سالار اپنی فیملی کے ساتھ دو ہفتوں کے لیے پاکستان نہ آتا۔ اور ایک لمبے عرصے کے بعد سکندر عثمان کے بجائے خود گاؤں اسکول دیکھنے نہ جاتا یا وہاں جا کر غلام فرید کی بیٹی کا خیال آنے پر اس کے دل میں اسے دیکھنے کی خواہش پیدا نہ ہوتی اور ہمیشہ کی طرح چینی کے رشتہ دار کو چینی کو اسکول لے کر آنے کے بجائے اسکول ہی کی انتظامیہ کے چند لوگوں کے ساتھ سالار خود اچانک اس کے گھر نہ چلا جاتا۔

جس ڈیڑھ سال کی چینی کو سالار سکندر نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ اسے سات آٹھ ماہ کی ایک بچی لگی تھی۔ بے حد کمزور۔ دہلی پتلی۔ اس کی سانولی رنگت پر قان جیسی پیلاہٹ لیے ہوئے تھی۔ اس کا جسم اور چہرہ کسی جلدی انفیکشن کے نتیجے میں چھوٹے بڑے رسنے والے پیپ زدہ دانوں سے بھرا ہوا تھا اور اس کے سیاہ بال دھوپ گندگی میں رہ کر پھوری لٹوں میں تبدیل ہو چکے تھے جو دھلنے اور نکلی نہ ہونے کی وجہ سے آپس میں جڑی ہوئی تھیں۔ اس کے اوپری دھڑ پر جو فراک تھا۔ وہ بوسیدگی اور خستہ حالی کو تو ظاہر کر رہی رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کے سائز سے بہت بڑا ہونے پر یہ بھی ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی کوئی اور استعمال کرتا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پھٹریاں جھی ہوئی تھیں جیسے وہ جسم میں پانی کی کمی کا شکار ہو رہا تھا پیروں کے بڑھے ہوئے اور میل سے بھرے میڑھے میڑھے ٹوٹے ہوئے ناخن یہ ظاہر کر رہے تھے کہ اس کی دیکھ بھال کتنے اچھے طریقے سے ہو رہی تھی۔

جس وقت سالار اس گھر کے صحن میں داخل ہوا وہ گھر کے کچے صحن میں دانہ چکتی ہوئی مرغیوں کے پاس بیٹھی تھی اور اسی دانے اور گندگی کو بلا تکلف اپنے منہ میں ڈال رہی تھی۔ سالار نے اس بڑے صحن کے ایک کونے میں مرغیوں کے پاس بیٹھی اس بچی کو غور سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی کفالت کے لیے معقول رقم بھیجنے کے باوجود وہ اس حال میں ہو سکتی تھی۔

چینی کے رشتہ دار بے حد نروس اور گھبرائے ہوئے تھے۔ سالار کو اندر لائے تھے اور مہمان خانے میں اسے بٹھانے کی کوشش کی تھی۔ سالار کو جلدی تھی۔ اسے صرف ایک نظر اس بچی کو دیکھنا تھا اور واپس جانا تھا۔ گھر کے

اندرونی حصے میں جانے کے بجائے یہ کام وہ وہیں صحن میں کھڑے کھڑے نمٹانا چاہتا تھا اور چنی کے رشتہ داروں کی یہ بد قسمتی اور چنی کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس وقت وہیں صحن میں تھی وہ لوگ display اور presentation کے لیے ہنگامی بنیادوں پر اسے اب سجا سوار نہیں سکتے تھے۔

”یہ بس ایسے ہی رہتی ہے۔ جتنی بار بھی کپڑے بدلو، یہ جا کر مرغیوں میں گھس جاتی ہے۔ حمیدہ! ارے او حمیدہ! ذرا دیکھ چنی کو۔ کپڑے بدلوا صاحب نے ملنا ہے۔“

گھر کے مالک نے بے حد گھبرائے اور شرمندہ سے انداز میں چنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیوی کو آواز لگائی تھی اور وہ پہلا موقع تھا جب سالار نے چنی کو بغور دیکھا تھا اور وہ بھی اپنا نام پکارنے جانے پر کچھ خوف زدہ انداز میں اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

حمیدہ نے ہنگامی بنیادوں پر لپک کر چنی کو اندر لے جانے کی کوشش کی تھی لیکن سالار نے روک دیا، وہ جو چھپانا چاہتے تھے اسے چھپا نہیں پائے تھے اس لیے وہ اسے سالار کے پاس لے آئے تھے۔

حمیدہ کی گود میں اٹھائی ہوئی بہتی ہوئی نزلہ زدہ ناک والی اس بچی کو دیکھتے ہوئے سالار سکندر کو عجیب رحم آیا تھا اس پر۔ وہ افریقہ میں بچوں کو اس سے بھی برے حالات میں دیکھ چکا تھا لیکن ان بچوں کے ساتھ سالار سکندر کا کوئی احساس جرم نہیں تھا۔ جو چنی کو دیکھتے ہوئے اسے محسوس ہوا تھا۔

”نہیں نہیں۔ اس کو نہ اٹھائیں، یہ بڑی گندی ہے جی۔ آپ کے کپڑے نہ خراب کر دے۔ اس کو ابھی لیٹرین میں جانا نہیں آیا۔“

حمیدہ سے پہلے اس کے میاں نے سالار کو اس بچی کو اٹھانے سے روکا تھا۔ سالار نے اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس بچی کو اٹھا لیا تھا اور چنی بڑے آرام سے کسی جھبک کے بغیر اس کے پاس آگئی تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار سالار سکندر جیسے حلیمے والا کوئی شخص دیکھا تھا۔ سالار نے اسے تھکتے ہوئے پچکارا تھا۔ وہ پلکیں جھپکائے جواب دیے بغیر لیکن اس سے چپکے ہوئے اسے دیکھتی رہی۔

”ہاں بس تھوڑی بیمار ہی رہتی ہے۔ شروع سے ہی ایسی ہے۔ ڈاکٹر کی دوائی سے فرق نہیں پڑا۔ اب پیر صاحب سے دم کرا کے لائے ہیں۔ انہوں نے تعویذ بھی دیا ہے گلے میں ڈالنے کے لیے۔ حمیدہ! وہ تو نے ڈالا نہیں ابھی تک۔“

سالار میاں بیوی سے اب اس بچی کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور وہ گڑبڑائے ہوئے اس کے چہرے اور جسم پر رستے ہوئے دانوں کی وجوہات اور علاج بیان کر رہے تھے۔

سالار سکندر کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ غلط جگہ پر تھی۔ اس کا خیال نہیں رکھا جا رہا تھا اور اس کی کفالت کے لیے دی جانے والی امداد اس پر استعمال نہیں ہو رہی تھی۔ پتا نہیں وہ کون سی ذہنی رو تھی جس میں اس نے چنی کو فوری طور پر وہاں سے لے جانے اور کسی دارالامان میں داخل کروانے کا فیصلہ کیا تھا یا کسی ایسی جگہ جہاں پر وہ بچی اچھی طرح پرورش کی پاتی اور اس ذہنی رو میں یہ فیصلہ اس نے چنی کے رشتہ داروں کو سنا بھی دیا تھا۔ ان کے احتجاج کے باوجود وہ چنی کو وہاں سے لے آیا تھا اور وہ اسے روک نہیں پائے تھے سب دھوا سی اور پریشانی کے باوجود وہ چنی کو نہیں لے جا رہا تھا۔ ان کا ماہانہ وظیفہ لے جا رہا تھا اور وہ پیسے بند ہو جاتے تو یہ اس تو کے آگے ان سب کو بہت ساری فکریں لاحق ہو گئی تھیں لیکن سالار کے ساتھ اسکول کی انتظامیہ بھی تھی اور کچھ سیکورٹی اہلکار بھی، وہ زبانی احتجاج کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکے تھے۔

حیران کن بات یہ تھی کہ اس سارے شور شرابے اور احتجاج میں چنی بے حد اطمینان اور پرسکون انداز میں سالار کی گود میں چڑھی اس کا کالر پکڑے رہی تھی۔ اس کے ساتھ گھر سے نکلتے ہوئے بھی وہ بے قرار اور پریشان

نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اس کی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بٹھائے جاتے ہوئے۔

اس گاؤں سے اسلام آباد واپسی پر سالار اپنی گاڑی خود ڈرائیو کرتا رہا تھا اور چنی برابر والی سیٹ پر بیٹھی دروازے کی کھڑکی سے چکی بے حد خاموشی اور اطمینان سے پورا راستہ باہر دیکھتی رہی تھی۔ وہ اگر بے چین ہوئی تھی تو صرف تب جب سالار نے اسے گاڑی میں بٹھاتے ہوئے اسے سیفٹی بیلٹ باندھنے کی کوشش کی تھی۔ جو اس کے ہاتھ پاؤں مارنے پر سالار نے کھول دی تھی اسے اس وقت حمین یاد آیا تھا۔ وہ بھی اس عمر میں اسی طرح سیفٹی بیلٹ سے جان چھڑاتا تھا۔

سیفٹی بیلٹ کھول دینے پر وہ ایک بار پھر سے پرسکون ہو گئی تھی۔ پورا راستہ سالار اسے وقتاً فوقتاً دیکھتا رہا لیکن وہ اس قدر اطمینان کے ساتھ شیشے سے باہر نظر آنے والی سڑک اور اس پر گزرنے والی ٹریفک کو دیکھنے میں لگن تھی کہ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر گاڑی کے اندر موجود سالار کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سالار اس کا یہ اٹھا ک دیکھ کر مسکراتا رہا تھا۔ اس نے رستے میں ایک جگہ رک کر اسے ایک جوس کا ڈبہ اور بسکٹ کا ایک پیکٹ لے کر دیا تھا۔ وہ منٹوں میں وہ دونوں چیزیں کھا گئی تھی یوں جیسے وہ کئی دنوں کی بھوکی تھی۔

اسلام آباد آتے ہوئے گاڑی کے سفر کے دوران سالار اس پنچی کی رہائش کے لیے مناسب ترین جگہ کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اس وقت اس نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اسے خود پالے گا۔ وہ اتنی بڑی ذمہ داری لینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور اگر سوچ بھی لیتا تو جیسا یہ کام امامہ سے پوچھنے بغیر نہیں کر سکتا تھا۔

جو بھی ممکن باتیں حتیٰ کے لیے اس کے ذہن میں آرہی تھیں۔ وہ خود ہی انہیں مسترد کرتا رہا تھا۔ اسلام آباد پہنچنے پر گھر کے گیراج میں اس کے بچوں نے بھاگتے ہوئے اس کا استقبال کیا تھا اور گاڑی کے اندر چنی کو سب سے پہلے ساڑھے تین سالہ حمین نے دیکھا تھا اور اس کی آنکھیں ہمیشہ کی طرح گول ہو گئی تھیں یوں جیسے اس نے جنگل کا کوئی جانور دیکھ لیا ہو۔ اس نے کھڑکی کے شیشے سے ناک اور منہ چپکائے ہیلو کہہ کر چنی کو مخاطب کیا تھا جو کھڑکی کے اندر والی سائیڈ سے شیشے سے چہرہ چپکائے ہوئے تھی اور حمین دوسری طرف سے۔ وہ کچھ خائف ہو کر تھوڑا سا پیچھے ہٹی تھی۔ اس سے پہلے کہ حمین کوئی اور حرکت کرتا۔ سالار گاڑی سے نکل کر دوسری طرف آ چکا تھا۔ اس نے حمین کو ہٹا کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور چنی کو باہر نکال لیا۔ چنی سے آنے والے بدبو کے مھکے سب سے پہلے حمین نے ہی محسوس کیے تھے۔ اس نے بے اختیار اپنے ناک پر ہاتھ رکھتے ہوئے باپ سے کہا۔

"Oh my God! she is so smelly and dirty and ugly"

(اس مانی گاڑی کی بو دار گندی اور بد صورت ہے) وہ بے اختیار ناک پر ہاتھ رکھے کتا گیا تھا جبکہ جبریل اور عتیقہ کچھ فاصلے پر کھڑے کسی تبصرے اور سوال کے بغیر گھر میں باپ کے ساتھ آنے والے اس مہمان کو دیکھ رہے تھے۔

"حمین۔" سالار نے اسے ڈانٹنے والے انداز میں پکارا اور گھورا۔

Oh but then that's ok —

May be she likes to live like this

I mean some people like to be different

I like her hairstyle...She is cool—

(لیکن ٹھیک ہے۔ شاید اسے اسی طرح رہنا پسند ہو، میرا مطلب ہے کہ کچھ لوگ مختلف — ہوتے ہیں مجھے اس کا ہنوا سائل اچھا لگا ہے یہ کول ہے)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

حمین نے ہمیشہ کی طرح باپ کی پھٹکار کے بعد سینڈز میں اپنا بیان تبدیل کیا اور اپنی بات کے آخر میں چنی کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے باپ سے کہا۔

“Baba I also want to have her hair style”

(بابا میں بھی اس کی طرح، میٹر اسٹائل بنانا چاہتا ہوں) سالار نے اس کی زبان کی قینچی کو نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سائز کا خاموش نہ ہونے والا ”جن“ تھا جو اس گھر کے افراد کے ارد گرد ہر وقت منڈلاتا رہتا تھا اور اس کے سوالات... ختم نہ ہونے والے سوالات نے امامہ اور سالار کی آئیڈیل والدین بننے کی ہر خواہش، خوبی اور معلومات کو ختم کر دیا تھا۔

“I think she is goldi lock”

حمین کی تعریفوں کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ اب باپ کو یہ بتا کر خوش کرنا چاہتا تھا کہ اسے وہ بچی اچھی لگی تھی۔
 ”یہ گولڈی لاک نہیں ہے گندی ہے اس نے کئی ہفتوں سے اپنے بال نہیں دھوئے بلکہ شاید کئی مہینوں سے“

جبریل نے اسے ٹوک کر بتایا تھا۔ وہ تینوں اب سالار کے پیچھے پیچھے اندر جا رہے تھے۔
 ”آل رائٹ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ کول نہیں ہے۔“

جواب پھر سے تراخ سے ہی آیا تھا جبریل بے اختیار پچھتا یا۔ اس نے اس کے تبصرے کا جواب دے کر سالار کے پیچھے لگنے والی بلا اپنے پیچھے لگالی تھی۔

”اگر میں کئی مہینوں تک اپنے بال نہ دھوؤں تو میرے بال بھی ایسے ہی ہوں گے، میرا مطلب ہے گولڈن براؤن یا ایش گرے یا مسٹرڈیلو۔“ اس کا ذہن اب کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔
 ”نہیں۔“ جبریل نے بے حد سخت لہجے میں فل شاپ لگایا۔

”اوکے۔“ حمین نے بے حد اطمینان سے کہا ”لیکن میں اپنے بال ڈائی تو کر سکتا ہوں۔“

جبریل نے اس بار اسے مکمل طور پر نظر انداز کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا وہ بالوں کے بعد چنی جیسے۔ ناخنوں کو بھی اپنانے کے بارے میں سوچنا شروع کر دے۔

امامہ نے سالار کو اس بچی کو اٹھائے دیکھا تھا۔ وہ طیبہ کے ساتھ بیٹھی اس وقت چائے پی رہی تھی اور وہ چائے پینا ہی بھول گئی تھی۔

شائع ہوئے ہیں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت مردوق

خوبصورت چھپائی

مضبوط جلد

آفٹ ہیک

- ☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو راحت جبیں قیمت: 250 روپے
- ☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 600 روپے
- ☆ محبت بیاں نہیں لہنی جدون قیمت: 250 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

پڑھو خواتین ڈائجسٹ 65 نومبر 2015

READING
Section

”یہ کون ہے؟“

”بعد میں بتاؤں گا۔ تم اسے نہلا کر کپڑے بدل دو اس کے پھر میں اسے ڈاکٹر کو دکھانا چاہتا ہوں۔“ اس نے چنی کو گود سے اتارتے ہوئے کہا تھا۔

امامہ کچھ الجھی تھی لیکن وہ اسے لے کر چلی گئی تھی اور اس کو نہلانے کی کوشش کے آغاز میں ہی اسے پتا چل گیا تھا کہ اس بچی کے بالوں کو کاٹنے بغیر اس کو نہلایا نہیں جاسکتا۔ اس کے سر میں بڑے بڑے پھوڑے تھے اور ان پھوڑوں سے رنے والی پیپ نے اس کے بادلوں کی لٹوں کو آپس میں اس طرح جوڑ دیا تھا کہ اب ان کا کھلنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس نے شیونگ کٹ میں پڑی قینچی سے چنی کے سارے بال جڑوں تک کاٹ دیے تھے۔ وہ اس کا سر گنجا نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہ پھوڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ امامہ کو اس بچی کو نہلاتے ہوئے بہت رحم اور ترس آیا تھا اور بے حد حیرانی بھی ہوئی تھی اسے۔ چنی بالکل چپ چاپ بیٹھی نہاتی رہی تھی۔ اس نے عام بچوں کی طرح رونا دھونا نہیں مچایا تھا۔ نہ ہی اپنے بال کٹنے یا ان پھنسیوں اور پھوڑوں پر ہاتھ لگنے پر کسی تکلیف کا اظہار کیا تھا۔

Downloaded From Paksociety.com

بیڈ روم میں جبریل اور عتابہ ہاتھ روم میں جا کر اس بچی کی صفائی ستھرائی کو بذات خود جا کر دیکھنے سے حنین کو روکنے کی کوششوں میں مصروف تھے جنہیں اس کام پر امامہ تعینات کر کے گئی تھی۔ وہ بالآخر جب چنی کو بالکل کریو کٹ میں نہلا دھلا کر حنین ہی کا ایک جوڑا پہنائے باہر لائی تھی تو اسے دیکھ کر سب سے پہلی چیخ مارنے والا حنین ہی تھا۔

”Oh my God! Momy you have made her uglier horrible and you have destroyed my most favourite shirt

”اوہ مائی گاڈ می! آپ نے اسے مزید بد صورت۔ خوفناک بنا دیا ہے اور آپ نے میری سب سے فیورٹ شرٹ بھی خراب کر دی ہے۔“

اس کو ہر انعم تھا چنی کے بالوں کے ساتھ ساتھ اپنی شرٹ کو اس کے جسم پر دیکھ کر بھی دکھ ہوا تھا۔

”Momy she was a girl. You have made her a boy. God will never forgive you for that.“

”ممی یہ لڑکی تھی۔ آپ نے اسے لڑکا بنا دیا۔ اللہ اس کے لیے آپ کو معاف نہیں کرے گا۔“ امامہ کو اس کی بات پر ہنسی آئی سالار ٹھیک کہتا تھا۔ وہ ”عجیب و غریب“ ہی تھا اور چنی اس ساری گفتگو کے دوران خاموشی سے۔ اپنے اس نئے خاندان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اس گھر میں ہمیشہ کے لیے رہنے آئی تھی لیکن اس وقت کسی کو اس کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ مہمان نہیں تھی۔



اس سال صرف چنی سالار سکندر کے خاندان میں نہیں آئی تھی۔ اس سال کا دوسرا بڑا واقعہ سالار سکندر کے برین ٹیومر کی تشخیص تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

For Next Episode Visit

Paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈائجسٹ 66 نومبر 2015

READING
Section

خایا سمین

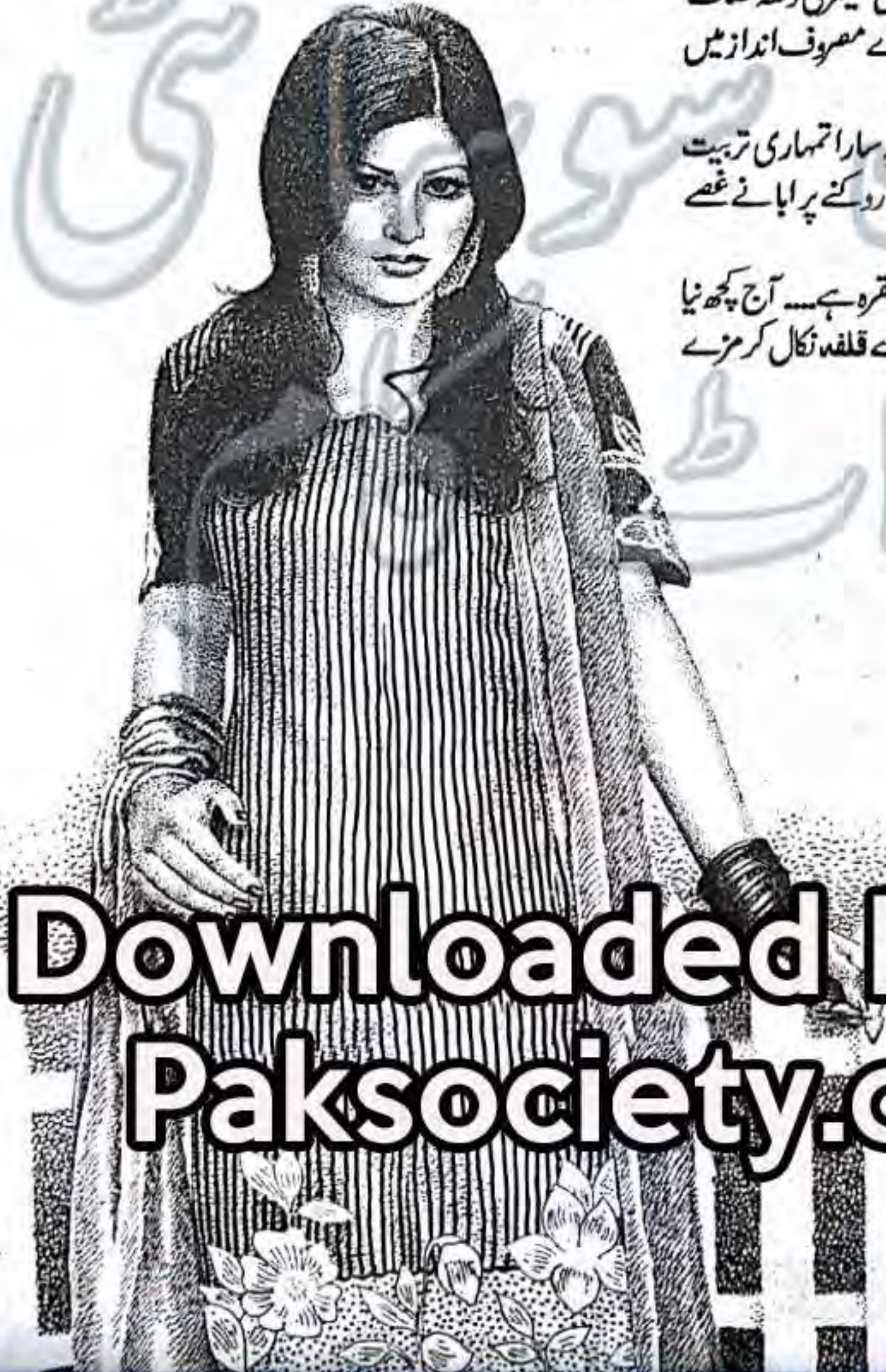
ہم کہنا کے عقول مرد

ابا جی کو ناخلف اولاد پر شدید غصہ تو آتا ہی تھا کہ حور عین کی دلخراش چیخ نے سب کو اس کی طرف متوجہ کر دیا۔ امی جی۔ جو اونگھ اونگھ کر ابا جی کی تقریر سن

”جب کبھی بچے والدین سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں ان کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔“ ابا جی نے اپنی مخصوص کالی عینک کو کوئی تیسری دفعہ صاف کرتے ہوئے غصہ نکالا۔ امی بڑے مصروف انداز میں سبزی کٹنے میں مصروف تھیں۔

ابا جی شروع ہو چکے تھے۔ ”یہ سارا تمہاری تربیت کا اثر ہے۔“ حور عین کے جمالی روکنے پر ابا نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ تو ابا جی آپ کا مخصوص فقرہ ہے۔۔۔ آج کچھ نیا ہو جائے۔“ زاریان نے فریج سے قلفہ نکال کر مزے لے لے کر کھاتے ہوئے کہا۔



Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section

رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ سے بھی چھری گر گئی۔ اباجی کی نظروں سے بچتے بچتے پچھتے پچھتے چھپ چھپ کر سیڑھیاں چڑھتے عون نے بھی گردن موڑی۔ اباجی تقریر بھلائے حور عین کی طرف بھاگے۔

”بیٹا کیا ہوا؟ کیا ہوا؟“ اباجی ایسے ہی مزاج کے تھے جتنے اولاد سے نالاں رہتے اتنے ہی ان کی ذرا سی تکلیف پر بھی تڑپ تڑپ جاتے۔

”میرا قلم۔“ حور عین نے باقاعدہ بلک بلک کے روتے ہوئے زاریان کی طرف اشارہ کیا۔ سب کے چہرے یک دم اطمینان سے پر ہو گئے کہ خدا نخواستہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔

”کتنے سو میٹر کے فاصلے پر میں تھا جو اتنی خطرناک چیخ ماری ہے۔“ اس کے یک دم چیخنے پر قلم کا باؤل ہاتھ سے گر کر نیچے جا چکا تھا۔ سواب زاریان کو غصہ آ رہا تھا۔

”یہ گھر ہے یا سارے پاگلوں کا ٹھکانہ ہے۔ صرف ایک بجھے نکال کے۔“ اباجی غصے سے کہتے اذان دینے روانہ ہو گئے جبکہ پیچھے رہ جانے والوں کے چہروں پر ریگتی مسکراہٹ۔ باقاعدہ قہقہوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔



اباجی کا زاریان کے فارغ رہنے اور عون کے تیسری دفعہ قیل ہونے پر بار بار پارہ ہائی رہتا۔ زاریان کو علمی و ادبی محفلوں میں جانے کا شوق تھا۔ اللہ کے فضل سے تھوڑی بہت شعر و شاعری پر بھی طبع آزمائی کی جاتی۔ سو کام چل رہا تھا۔ پر اباجی کی نظر میں پاکستان کے سارے گھسے پٹے شاعر ادیب حضرات زیادہ تر ویلے ہی تھے۔ (معذرت کے ساتھ یہ صرف میرے ابا کے خیالات ہیں۔) اور جو نامور ادیب۔ شاعر ہیں۔ ان میں سے آدھے تو اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں اور آدھے تیاری کر کے بیٹھے ہیں۔

”ہر بندے کو اپنے دور کے ہی شاعر و ادیب اچھے لگتے ہیں۔“ کبھی کبھی زاریان چڑ کر کہتا۔ ادبی حلقوں میں زاریان کا نام بھی مشہور تھا۔ دو دفعہ مشاعروں کے

سلسلے میں وہ انڈیا بھی جا چکا تھا۔ آج کل میں ویت نام کا چکر بھی لگانا تھا۔ پر اباجی کو کیا کہتا۔ ساری عمر وکان داری کی نماز پڑھتی۔ بس تین چار دوست بنائے رکھے۔ ان کی دنیا جتنی محدود تھی۔ سوچ بھی اتنی ہی محدود تھی۔ پر وہ اباجی تھے، زیادہ بحث نہیں کرتا تھا۔ ہاں۔ کبھی کبھی کچھ زیادہ رقم ہاتھ لگتی تو اباجی کے ہاتھ میں ضرور رکھتا۔ اباجی خوش ہو جاتے۔

زاریان کے علاوہ حور عین۔ عون اور چھوٹا فیضی تھا۔ سب بہن بھائی والدین کے فرماں بردار تھے۔ باوجود یہ کہ اباجی کی طبیعت ذرا گرم تھی۔ پر بچوں کی فرماں برداری پر ان کا مزاج خوش گوار ہو جاتا۔



پنجابی ادبی کانفرنس تھی۔ زاریان پر بھی کچھ ذمہ داری ڈالی گئی۔ وہ آج کل اسی میں مصروف تھا۔ ایک وفد انڈیا سے بھی آنا تھا۔ رمضان شروع ہونے والا تھا اور اباجی نے سامان کی ایک لسٹ اسے تھمائی ہوئی تھی۔ خیال تو یہی تھا کہ ستار رمضان بازار سے جا کر اشیائے خورد و نوش خرید لے گا۔ سستی بھی مل جائیں گی۔ پر زید نے کچھ اور کام اس کے سر پر ڈال دیے۔

چارو ناچار وہ بھی کرنے پڑے تب۔
اباجی کی کال آگئی۔ ”اوئے۔ الو کے کان کدھر ہو؟“ اباجی کی گرج چمک شروع ہو چکی تھی۔
”اباجی! غصے میں خود کو کچھ کہنے سے باز رہا کریں۔“ وہ کان کھجاتا ہنستے ہوئے بولا۔

”دانت اندر کرو۔ زیادہ مخول نہ کیا کرو۔ پتا نہیں کن میراثیوں کے ساتھ رہتے ہو۔“ سامنے بیٹھے زید کے لمبے بال اور ہاتھوں میں پہنے چھلوں کو اس نے گھبرا کر دیکھا۔ جلدی سے موبائل کان سے لگائے ایک طرف ہو گیا۔

”گھر کا سودا سلف لانا ہے کہ نہیں یا میں خود جاؤں۔“ اباجی جب سے دل کے مریض ہوئے تھے۔ زاریان کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ باقی سارے کام وہ خود کرے۔ صرف اباجی وکان میں ملازموں کے سر پر

بیٹھے رہا کریں۔
 ”نہیں نہیں اباجی! میں خود لے آؤں گا۔“
 ”کتنے دن لگ جائیں گے بیٹا۔“ اباجی کے طنزیہ انداز میں پوچھنے پر وہ شرمسار ہو گیا۔
 ”اباجی ابھی لے آتا ہوں۔“ وہ انہیں اطمینان دلاتے بولا۔



بازار جا کر گھر کے لیے سودا سلف لیا۔ بھاڑ میں جائے مشاعرہ۔ دل میں زید پر تین حرف بھیج کر وہ گھر کی طرف آ گیا۔ اباجی اس کے اتنی جلدی سامان لانے پر کھل اٹھے۔ ورنہ انہیں پوری امید تھی کہ آج کی تاریخ میں سامان نہیں آنے والا۔

”آج تو آپ بڑی جلدی آگئے ہیں۔“ عون نے زاریان کی طرف دیکھ کر دانت نکالے۔
 ”اس لیے جلدی آیا ہوں کہ تمہارے دانت توڑ دوں۔“ وہ فریج سے بوتل نکال کر منہ سے بوتل لگائے آرام سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ گرنے کا اور زید کے ہاتھوں عزت افزائی کا دکھ پھر سے جاگنے لگا۔

”ہا ہا ہا۔“ عون پھر بے شرمی سے ہنسنے لگا۔ اسے پتا تھا زاریان کا موڈ اس کی کسی دھلائی کے بعد ہی خراب ہوتا ہے۔

”تمہارے میٹرک کے رزلٹ کا میں نے پتا کروالیا ہے۔“ وہ بھنا کر بولا۔

”ہا ہا ہا رزلٹ آنے میں دو ماہ ہیں۔“ وہ زاریان کی بات کو مکھی کی طرح اڑاتے، وائٹ قورے سے انصاف کر رہا تھا۔

”دیکھوں گا کہ بھلا کیا بنتا ہے؟“ زاریان کے طنزیہ انداز پر عون منہ بنا کر بیٹھ گیا۔

پتا نہیں کیا مصیبت ہے؟ پڑے بہن بھائی خود تو بڑھ لیتے ہیں اور چھوٹوں پر دھونس جماتے ہیں کہ وہ تجھی یہ غلطی کر کے ہی سکون لیں۔ عون نے برا سا منہ بناتے سوچا۔

”اگر میں گھڑا بھی رکھ دوں تو تم اس کو بھی منہ لگا لو زاری! تمہیں کتنی دغدغہ سمجھایا ہے کہ گلاس میں پانی پیا کرو۔ بوتلیں دھو دھو کر بھر کر رکھتی ہوں اور تم لوگ منہ لگا کر پھر سے جھوٹی کر دیتے ہو؟“ امی نے اسے

”تیرے لارے تے رہ گئے کنوارے۔“ (تمہارے بہانوں سے کنوارے رہ گئے۔) یہ کہاوت تھی اور اباجی کو شوق تھا۔ پنجابی کہاوتیں کہنے کا۔ ادھر سے زید اشارے پہ اشارے کیے جا رہا تھا۔

اس نے اباجی کی کال ڈس کنیکٹ کی اور خود تیزی سے مڑتے ہوئے جوں ہی اسٹیج کی طرف بڑھنے لگا وہاں تاروں سے الجھ کر اسٹیج کے ایک کونے کے پاس سجدے میں جاگرا۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ دو منٹ کے لیے وہ گڑبڑا ہی گیا۔ لائٹنگ کا انتظام کرتے وہ دونوں چھوٹے لڑکے دانت نکالنے لگے۔ جبکہ اسٹیج پر موجود نو آموز شاعرہ کے بھی دانت نکلنے لگے۔

وہ گڑبڑا کر اٹھا۔ ”کتنی بری لگ رہی ہیں۔ ہنستے ہوئے۔“ اس نے اونہہ کہہ کر اونچی آواز میں کہا۔
 ”یاؤ۔ جی۔ تب تو اگلا بندہ برابر آ لگتا ہے۔ جب وہ

آپ کو مزاحیہ انداز میں گرتا ہوا دیکھ لے۔“ چائے لاتا لڑکا اسے اپنی طرف سے بڑا سیٹا بن کر بتاتا، آگے نکل گیا۔ اس کا موڈ اور خراب ہو گیا۔ شاعرہ صاحبہ کے دانت ابھی بھی نکل رہے تھے جبکہ وہ منہ بناتا زید کی طرف چلا گیا۔

”یار۔۔۔ یہ چیزیں کون ہے؟ دانت دیکھو اس کے اور بال ایسے کھول کر آئی ہے جیسے یہاں مشاعرہ نہیں ماڈلنگ ہونی ہے۔“ اس نے زید کے سامنے اپنی بھڑاس نکالی، آخر دوست تھا۔ پر یہ کیا زید کے چہرے کا رنگ یک دم متغیر ہو گیا۔

”تمہاری ہونے والی بھابھی ہے وہ۔ اس کا نام شائلہ ہے۔ شکل اچھی نہ ہو تو بات تو اچھی کر لینی چاہیے۔“ اس کا دل چاہا کہ یہیں پر بھسم ہو جائے۔ ابا جی تھیک کہتے ہیں کہ جس دن انسان صبح کی نماز نہ

جوان بھول گئے ہیں۔ انہیں کسی دکھ کا احساس تو دور کی بات اس کے بارے میں معلومات تک نہیں۔“

”ہاں بیٹا! ٹھیک کہتے ہو۔ پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو ہر دم دوسروں کی مدد کے لیے تیار رہتے تھے۔ کیا حرج ہے اگر ہم ان کی مدد کریں؟“ ابا جی نے زاریان سے کوئی بات منوانی ہوتی تو مذہب کا ٹیچ دے دیتے۔ وہ مان گیا اور ابا جی کو لے کر زید کی طرف آگیا۔ زید کے حلیے کی طرف دیکھ کر ابا جی کے چہرے پر پھیلی ناگواری اور اس کے دل میں اترتی شرمندگی خواہ مخواہ برہ گئی۔

”یہ میرا بیٹا تمہارا دوست ہے؟“ ابا جی اس کے کان کے پاس ہو کر بولے۔ زاریان ایک دم گڑبڑا گیا۔

”یار تم تو غصہ ہی کر گئے۔“ زید خوش گوار لہجے میں بولا۔ ”چلو آؤ۔ تمہیں گل چرن سنگھ سے ملو اور۔“

تین چار سکھوں کی طرف وہ انہیں لے گیا۔ میں تمہیں گاڑی اور ڈرائیور دے دیتا ہوں۔ تم انہیں مطلوبہ گاؤں تک لے جاؤ۔“

زید مصروف سے انداز میں بولتا دوبارہ موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

سکھ حضرات زاریان سے اور ابا جی سے خوش دلی سے ملے۔ ان کے سلام کرنے پر تو ابا جی کھل اٹھے۔ نہ پر نام نہ نمستے۔ مسلمانوں کو دیکھ کر انہوں نے ان ہی کے انداز میں سلامتی بھیجی۔ زید کا ڈرائیور ان کے پاس آگیا اور وہ لوگ گاڑی میں آ بیٹھے۔ راستے میں گل چرن نے ابا جی کو پچھڑی خالہ کی کہانی سنائی۔

”ہماری ماسی صرف ادھر رہ گئی تھی۔ باقی سب انڈیا ہجرت کر گئے۔ بہنوں میں چھوٹی تھی۔ میرے ابا جی کا ان سے بڑا پیار تھا۔ مرتے سے بھی اپنی بہن کو یاد کر کے روتے رہے۔ تب سے میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ میں جب بھی کبھی پاکستان گیا اپنی ماسی سے ضرور مل کر آؤں گا۔“

ابا جی نے سن سینتالیس کے قصبے چھڑ دیے۔ سکھ برادران پورے راستے باتیں کرتے آئے۔ راستے میں انہیں ایک مشہور دکان سے سردائی بھی پلاوائی گئی۔ زاریان ڈرہا تھا کہ سکھوں کو چڑھ گئی تو اول فول بولیں

بوٹل منہ سے لگائے پکڑ لیا اور شروع ہو گئیں۔ عوں پھر سے بننے لگا۔

”بہتر ہے کہ بندہ اس گھر میں کسی کو منہ نہ لگائے۔“ زاریان پہلے ہی جلا بھنا تھا۔ مزید جل کر بولا۔

”ہاں۔ یہ تو بھائی آپ ٹھیک ہی کرتے ہیں۔“

حور عین منہ پر مڈ ماسک لگائے لاؤنج کی طرف آتے ہوئے بولی۔

”مجھے بھی کسی افریقن بھوتنی سے بات کرنے کا کوئی شوق نہیں۔“ مڈ ماسک کے پیچھے چھپی حور عین کی گوری رنگت اس خطاب پر چرخ ہی پڑی۔

”اوئے! میرے امریکن تھینے۔ تمہارا فون ہے۔۔۔ آج لگتا ہے کہ دماغ حاضر نہیں جو میرے دواؤں والے شلر میں اپنا موبائل رکھ دیا ہے۔“ ابا جی۔ آدھی پچی کچی بات سن کر اس پر چوٹ کرتے بولے۔

حور عین کو اپنے ہمراہ اکیڈمی لے جانے کے لیے ابا جی کے پیچھے پیچھے آئی پلو شہ نے زور سے قہقہہ مارا۔

زاریان جھل ہو گیا۔ پلو شہ ابا جی کے تیا زاو کی بیٹی تھی۔ سنہری رنگت والی، تیکھے سے نقوش والی پلو شہ

اسے بڑی اچھی لگتی۔ موبائل پر آنے والی زید کی کال نے اس کی پلو شہ پر مرکوز توجہ ہٹائی تھی۔

”یار! کدھر ہو تم؟ واپس آؤ جلدی سے۔ ایک سکھ پارٹی کو ڈیل کرنا ہے۔ ان میں کوئی گل چرن سنگھ ہے۔ سن سینتالیس میں اس کی خالہ چک سینتالیس میں یہیں پر رہ گئی تھیں۔ وہ اپنی خالہ سے ملنا چاہتا ہے۔ آجاؤ جلدی۔“ زاریان نے غصے سے فون بند کر دیا۔

”خیریت ہے۔“ ابا جی نے اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات دیکھ کر کہا۔ اس نے ساری بات انہیں بتائی۔

ابا جی جوش میں آگئے۔ ”بیٹا! چلو ملواتے ہیں۔ میں بھی سکھوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ تمہیں تمہیں پتا سینتالیس کے سن میں ملنے والے دکھوں کا۔“ ابا جی کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

”ابا جی! سینتالیس کے دکھوں کو 2015ء کے

غلامی کی ہے۔ آزاد وطن میں رہ کر بھی وہی سوچیں وہی باتیں۔۔۔" گل چرن سنگھ کے تبصرے نے ان سب پر گھڑوں پانی گرا دیا۔

"اصل میں سنگھ پانی جان نے میری چھوٹی کاپی کا غصہ نکالا ہے۔" ان میں سے ایک حضرت نے بصرہ کیا۔ ماحول گرم ہو رہا تھا۔ گل چرن کے ساتھ کھڑا ایک اور سنگھ گوبند سنگھ خاصا سمجھ دار تھا۔

"او چھڈو جی۔ سانوں تهاڑے نال مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" اس نے ساری اردو ایک سائیڈ پر رکھی اور پنجابیوں کے پنجابی اشامل میں آتے ہوئے خوشدلی سے ملا۔ "اپنوں کو شرمندہ نہیں کرتے اپنوں کے رنگ میں اسی طرح رنگ جاتے ہیں۔" گوبند سنگھ کی بات پر کئی چہروں پر مسکراہٹیں ایک ساتھ نمودار ہوئیں۔

پھر خوشگوار ماحول میں کھانا بھی کھایا گیا۔ باتیں بھی ہوئی۔ تحفے کا تبادلہ بھی ہوا۔ ماسی پر آنسو بھی بہائے گئے۔ ایک خوشگوار دن کا اختتام ہوا۔ رات کو جانے لگے تو عورتیں یوں زار و قطار رو رہی تھیں۔ جیسے ماسی کے رشتے دار صدیوں سے یہیں مقیم تھے اور اچانک جانے کی وجہ سے بڑا دکھ ہو رہا ہے۔ صبح والے تندو ترش جملے کسی کے ذہن میں نہ ٹھہرا۔ ابا بڑے خوش نظر آ رہے تھے۔ واپسی کے راستے پر۔

"تمہاری نوکری بری نہیں۔ بہت سارے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ زندگی کے بہت سے رنگ سکھنے کو ملتے ہیں۔" ابا کے تبصرے پر وہ کھل کر مسکرایا۔ ورنہ اس کے ادبی ذوق نے ابا کی نظر میں اسے خاصا بے ادب کر دیا تھا۔

"پر بیٹا جی۔ کچھ اور کام بھی کرو۔ زندگی کے مسائل اور وسائل دونوں ہی حجم کے لحاظ سے خاصے بڑے ہیں۔" اس نے سعادت مند بیٹوں کی طرح سر ہلایا۔



گھر آئے تو پھپھو، بچوں سمیت آئی ہوئی تھیں۔

گے۔ بران پر بنے لطیفوں کے برعکس یہ کافی سلجھے ہوئے سمجھ دار سنگھ لگ رہے تھے۔ خیر وہ لوگ مطلوبہ گاؤں تک پہنچ گئے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ماسی کا گھر بالآخر مل ہی گیا۔ ماسی کے ماشا اللہ نونچے تھے۔

جب تعارف ہوا تو سین دیکھنے والا تھا۔ "ہائے نس پہلے آجاؤندے تے اماں نہ مری" (ہائے۔ اگر آپ پہلے آجاتے تو اماں نہ مری۔) ماسی کا بڑا بیٹا روٹے ہوئے بولا۔ وہاں ان نوبچوں میں سے کسی کی چھوٹی بیٹی کھڑی تھی۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔

"ابا بیا۔" "ابا وی سیکھ اسی اے" (ابا بھی سکھ ہی ہے) ایک دم سے ابا کڑبڑا گیا کہ سکھوں کے سامنے سکھوں کو ہی ٹائٹ (طنز) مار دیا ہے۔

گل چرن سنگھ کے منہ کے زاویے چند ٹانھے کے لیے بدلتے تھے مگر پھر وہ نارمل ہو گیا۔ لمحے بھر کی خاموشی نے وہاں کھڑے تمام نفوس کو شرمندہ کر دیا تھا۔

"لے ابا تو مرونڈا بن گیا تا۔" ابا جی نے ہنس کے زاریان کے کان میں کہا اور وہ اپنے ابا کو دیکھ کر ہولنے لگا کہ کہیں کوئی گل افشانی ادھر سے بھی نہ پھوٹ پڑے۔

"نی کون آیا اے۔" اتنی گرمی میں۔ درجن بھر چوڑیوں سے بھرے بازو والی سانولے سے رنگ کی موٹی بیسی عورت ایک دم کہیں سے نکلی۔

"لے ماسی زلیخا دے انڈیا والے رشتہ دار تے میرے وی رشتہ دار ہوئے۔ (لو ماسی زلیخا کے انڈیا والے رشتہ دار تو میرے بھی رشتہ دار ہوئے۔)"

"کی سوفتاں لیائے جے۔ (کیا تحفے لائے ہو۔)" ایک میلے سے صافے کوپنے ایک پتلا سالڑ کا بھی پیچھے سے برآمد ہوا۔ زاریان اور تذبذب کا شکار ہو گیا۔ "سوری گل چرن جی۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"کوئی بات نہیں زاریان صاحب۔ ہم انڈیا پاکستان نہیں، ہم برصغیر کے لوگ ہیں۔ جنہوں نے ایک عرصہ

منڈیں؟
جیسے اس کے ابا جی، جو پھپھا جی سے صرف اس لیے ناراض ہوئے کہ عمرے جانے والے گروپ میں ان کی بہن کو اور انہیں کیوں نہ شامل کیا۔ پھر اسی بہن پر اس کے خاوند کا غصہ نکالتے رہے۔

اس نے زید کو ساری بات بتائی تاکہ وہ افسانہ لکھ لے، بے چارے کو نئے نئے موضوع چاہیے ہوتے ہیں۔

”پار زاریان! کوئی بندہ اگر یہ سوچ لے کر سکھ کوئی ذات نہیں بلکہ ہم سب کے اندر ایک سکھ چھپا بیٹھا ہے۔ ہم سب کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں سکھ بن جاتے ہیں تو کبھی بھی ہم دوسروں کا مذاق نہ اڑائیں۔“
بظاہر حلیمے سے بقول اس کے ابا کے میراثی نظر آنے والے اس کے دوست نے بات بڑی گہری کر دی تھی۔
اب آپ لوگ سوچیں کہ کہیں آپ لوگ میں تو کوئی سکھ نہیں، کہیں آپ لوگوں کے اندر تو کوئی سکھ نہیں چھپا بیٹھا؟
نوا سموکنگ والی جگہ پر اسموکنگ کرتا سکھ۔

نوپارکنگ والی جگہ پر پارکنگ کرتا سکھ۔
چار مارڈن فرینڈز کے درمیان بیٹھ کر اپنے سے کم تر کو دیکھتے ہوئے (اسمائل) پاس کرتا سکھ۔
ایک ساتھ اسٹوڈیو کے سامنے والے گھر سے کسی نے کبوتر اڑائے تھے اور وہ گروپ میں اونچی اڑان بھرتے ہوئے آسمان کی وسعتوں کو چھونا چاہتے تھے۔
’ہم تب تک بحیثیت قوم ایک اونچی اڑان نہیں بھر سکتے تھے جب تک ہماری سوچ اونچی نہیں ہو جاتی۔ وہ افسردگی سے سوچتا رہ گیا۔

ٹوٹوٹو۔ اس کا موبائل بجایا۔ دوست کا میسج تھا۔
”ایک دفعہ دو عورتیں بس میں باتیں کر رہی تھیں، پیچھے ایک سکھ بیٹھا تھا۔“ پتا نہیں اس سے آگے کیا تھا۔ اس نے میسج پورا پڑھے بغیر ڈیلیٹ کر کے موبائل جیب میں ڈال لیا۔

کافی عرصہ سے ان کے ساتھ بول چال بند تھی۔
زاریان ابا کی طبیعت کو جانتا تھا۔ انہوں نے فوراً ”کمرے کی طرف بڑھ جانا تھا۔ پھپھو کو مکمل نظر انداز کر کے۔ اور یہ عمل یقیناً ”پھپھو کے لیے خاصا تکلیف دہ بھی تھا۔ اس کے دل میں یہ سوچ کر ہی منوں بوجھ پڑ گیا۔ پر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ابو سارے گلے شکوے بھلائے پھپھو سے مل رہے تھے۔

”ابا جی نے کوئی مووی تو نہیں دیکھ لی۔۔۔ جذباتی سی۔“ عون نے اس کے کندھے سے سر نکال کر حیرت سے پوچھا۔ وہ بھی غالباً ”ابھی گھر آیا تھا۔“
”آج تو ابا۔ ابا ہی نہیں لگ رہے۔“ حور عین کے اونچی آواز سے کیے گئے بھرے پر اسے اماں کی طرف سے ایک دھپ رسید ہوئی تھی۔
ابا مسکرا رہے تھے۔

سدا کے غصے والے۔ انا پرست ابا کا اچانک رد عمل۔ وہ بھی اتنا خوشگوار۔ سارے بچوں کو چونکانے کے لیے کافی تھا۔

”یہ ہمارے ہی ابا ہیں نا؟“ عون نے دوبارہ پوچھا۔
پچھلی دفعہ جس طرح پھپھو روتے ہوئے گئی تھیں اور ابا کے اونچے نچے جو سلوک ان کے ساتھ کیا تھا۔ وہ سارے بہن بھائی اس پر افسرہ تھے۔ لڑائی پھوپھا جی سے تھی اور ابا ناراضگی پھپھو پر نکال رہے تھے اور لڑائی بھی فضول بات پر کہ عمرے کے لیے جانے والے گروپ میں پھوپھا جی نے ابا کو کیوں نہ شامل کیا۔
”میں نے اپنے سکھ بھائیوں سے سیکھا ہے کہ اپنوں کے رنگ میں رنگ جانے سے ہی اصل خوشی ملتی ہے۔“

سب خوش تھے۔
اور زاریان سوچ رہا تھا کہ سکھ برادران پر لطفی بنانے والے اور مذاق اڑانے والے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہر بندے پر زندگی کے سارے ہی رنگ اترتے ہیں۔ عقل مندی کے۔ بے وقوفی کے۔ افسردگی کے۔ خوشی کے۔ ہم کہاں کے عقل



For More Visit

Paksociety.com 2015 نومبر 72

READING
Section

حاجرہ دیکھان



کے بچوں کے ساتھ اس آرٹ گیلری میں آئی ہوئی تھی اور اب تھک کر ایک طرف کونے پر جو کرسیاں بڑی تھیں ان میں سے ایک پر براجمان تھی۔ وقت گزر چکا تھا۔ اب مجھ میں زیادہ دیر کھڑے رہنے کی ہمت کم ہی رہ گئی تھی۔ لہذا اپنے مجھے یہاں بٹھا کر خود آگے بڑھ گئے تھے۔ میں کہاں تھی۔ کہاں آگئی ہوں۔ اس کی موجودگی۔ یوں میرے قریب بیٹھ جانے پر نہ جانے کیوں پھر سے وہ سب یاد آنے لگا تھا جیسے ابھی کل ہی کی تو بات ہو۔ کیا واقعی میں نے صدیاں گزار دیں یا یہ کل کا ہی قصہ ہے۔

میرے لیے تو اس کے دو بیٹھے بول ہی کافی تھے مگر وہ تو پوری تقریر کر گیا تھا۔ میں دم بخود رہ گئی۔ جب اس نے مجھے میرے بازو سے پکڑ کر تقریباً "کھینٹتے ہوئے" لے جا کر اپنی بہن کے بالکل پاس بٹھا دیا تھا۔ میں کیسی شرمسار تھی۔ خود سے بھی اور اس کی بہن سے بھی جو دلہن بنی کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ مجھے دلہن کی بے بسی پر بھی افسوس تھا مگر کیا کر رہی کہ میرا قصور صرف اتنا تھا کہ جب اس نے مجھے اسٹیج پر جا کر سلامی دینے کا مشورہ دیا تو میری اس بات پر کہ میرا سلیب بھی نئی نوپلی دلہن کے لیے اچھا نہیں۔ اس کو غصہ دلا گیا تھا۔ اس نے لوگوں کی پروا نہ کرتے ہوئے مجھے اچھا خاصا لیکچر دے ڈالا کہ اس طرح کی دقیانوسی باتوں پر وہ یقین کم ہی کرتا ہے اور نہ ہی مجھے کرنا چاہیے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر کسی نے مجھے چھوڑ دیا ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں اور طلاق کوئی بیماری نہیں کہ قریب بیٹھنے سے

کسی کی نظروں میں آنا کیسا لگتا ہے 'یقیناً' بہت اچھا لگتا ہے۔ مگر اس کو دیکھ کر۔۔۔ یہ دیکھ کر کہ وہ مجھے بڑے غور و خوض سے دیکھ رہا ہے، مجھے کچھ خاص اچھا نہیں لگا۔ میں نے ناگواری سے منہ پھیر لیا، مگر مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی نظریں ابھی بھی مجھ پر ہی مکی ہوئی ہیں۔ آج اتنے سالوں کے بعد اس سے اچانک ٹکراؤ ہو جانا میرے لیے پھر سے ایک آزیائش بن گیا تھا۔ مجھے کب تک انجانے میں کیے گئے قتل کی سزا ملتی رہے گی میرے مالک۔! میں نے تڑپ کر دل ہی دل میں سوچا۔ معاف بھی کروے میرے مالک! کیا اب تک میں نے کم سزا بھگتی ہے۔ کہ یہ پھر سے میرے سامنے ایک نئی سزا بن کر آگیا ہے۔ میں دکھ سے بھری بیٹھی ہوئی تھی کہ میرے برابر میں کرسی گھسیٹ کر وہ بیٹھتے ہوئے چکا۔

"ابھی تک ویسی ہی رونی صورت ہے تمہاری۔"

میں نے حیران نظروں سے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ یہ کیسا سنگ دل انسان ہے۔ اس قتل میں وہ برابر کا شریک رہا ہے میرا۔ لیکن کیسے خوش و خرم نظر آ رہا ہے جیسے اس کو یاد ہی نہ ہو اس قتل کے بارے میں۔ میں اٹھ کر جانے کے لیے پہلو بدلنے لگی تو اس نے میری کہنی کو چھوتے ہوئے ملکہ سے کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔ میں بس چند لمحوں ہی لوں گا۔ جانتا ہوں کہ ناپسندیدہ ہوں تمہارے لیے مگر برائے مہربانی بس چند لمحوں۔"

میں نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ میں اپنے بڑے بھائی

لگ جائے۔
اور پھر جو ہوا وہ سب نے دیکھا۔ مجھے شادی میں
شرکت کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ یہ میری ہی غلطی
تھی۔ اور پھر میں جو بہت ہمت کر کے بڑی جدوجہد
کے بعد پھر سے رشتہ داروں کا سامنا کرنے نکلی تھی۔
اپنی ہمت کھو بیٹھی۔ چھپ گئی۔ گم ہو گئی۔ مگر اس
نے کھوج نکالا۔ جیسے اس کو میری کمزوری سے ضد
ہو گئی تھی۔ پہلے پہل تو صرف میسج آتے رہے۔



READING
Section

خیال تھا بلکہ میرے لیے تو اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ یہ تو جب میری اس سے باتیں ہونے لگیں تو اندازہ ہوا کہ وہ کیسا ہے۔ ایک حساس اور نرم دل انسان۔ جس کو کسی بھی انسان کو دکھ دینے سے ہی خوف محسوس ہوتا ہو۔ جس کے لیے سب سے بڑی بات یہ ہو کہ وہ حق بات کہے۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھ لیا کہ۔۔۔

”اگر آپ اتنے ہی اچھے ہیں تو بھابھی کیوں ناراض ہو گئی ہیں؟“

اس نے بات گول مول کر دی اور مجھے کچھ شک ہوا کہ وہ مجھے سچ بتانے سے گریزاں ہے۔ ایک کسک سی بھی دل میں کہیں اٹھی تھی۔ مگر پھر اپنی حیثیت یاد آگئی

اور میں تو یہ تو یہ کزن کے کاموں میں لگ گئی۔ اب میرے لیے کسی کی بھی خواہش کرنا اور کسی کے بھی خواب دیکھنا ناممکن ہے۔ میری ایک ایک بات کو وہ پکڑ لیتا اور پھر اس کے لمبے لمبے لیکچر شروع ہو جاتے۔ میں ہنستی جاتی اور وہ بڑی سنجیدگی سے مجھے سمجھاتا رہتا۔

میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ کوئی ہے جو میرے لیے بھی پریشان ہوتا ہے۔ جس کو میری تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ کسی کام کا بہانا بنا کر میں اس کے لیکچر سے جان چھڑا لیتی۔ مگر گھنٹوں کام کے دوران اس کی باتوں کو یاد کر کے خوش ہوتی رہتی زندگی سے بس اور کچھ نہیں چاہیے تھا مجھے۔ بس اتنا ہی کافی تھا۔ یہی بہت تھا۔ مگر اس نے میری ایک نہیں سنی۔ اور اپنی ماں کو رشتہ لے کر بھیج دیا۔

میرے گھر پر ایک قیامت سی ٹوٹ پڑی۔ تمام بھائی، بہن اپنے مورچے سنبھالتے گولہ بارود سے لیس سامنے آگئے۔ اس کی والدہ کو تو سوچ کر جواب دینے کا کہہ دیا گیا جبکہ مجھ پر باقاعدہ حملے ہونے لگے اور ہر لمحے مجھے ایک نہایت سفاک اور خود غرض انسان کا خطاب دیا جانے لگا۔ جس نے پہلے گھر والوں کو بدنام کیا کہ اپنا گھر اجاڑا اور اب کسی معصوم لڑکی کا گھر اجاڑنے چلی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس نے بھی

سلام دعا اور کچھ ادھر ادھر کی باتیں، مگر پھر گپ شپ ہونے لگی۔ اس کا آفس کافی دور تھا آنے جانے میں بہت وقت لگتا، وہ آفس کی گاڑی میں بیٹھ کر تمام وقت مجھے دیتا اور اکثر راتوں کو بھی جگاتا۔ اس نے ہمیشہ ایک مخلص دوست کی طرح مجھ سے باتیں کیں۔ کبھی کوئی غلط بات نہیں کی اور میرے لیے اس کی دوستی بہت اہم ہوتی چلی گئی۔ میرے پاس تھا ہی کیا اس کی دوستی کے سوا۔ ہر کسی نے یہاں تک کے گھر والوں تک نے تو ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ میں گھر پر ہو کر بھی ان سب کے لیے کبھی ہی نہیں۔ کام سب میرے ذمے لگ گئے تھے

مگر میری کوئی حیثیت نہیں تھی۔ میں نے جو گناہ یا جو خطا کی بھی نہیں تھی اس کی سزا بڑے تحمل سے برداشت کر رہی تھی۔ پھر بھی میں خوش تھی کہ مجھے گھر سے بے دخل تو نہیں کیا، شکر ہے کہ سر پر چھت ہے۔ اور ایک دوست۔ زندگی پھر سے اپنا رستہ بنا رہی تھی۔

میں جانتی تھی کہ میرے گھر والوں کو وہ کچھ زیادہ پسند نہیں۔ ہمیشہ سے اپنی الگ سوچ رکھنا اور خاندان کے بڑے بوڑھوں کو احساس دلاتے جانا کہ نئے زمانے میں جو خاندانی روایات ہیں ان میں رد و بدل ضروری ہے۔ اسے بھی کچھ کم بدنام نہیں کر چکا تھا۔ مگر وہ بڑھا لکھا تھا۔ اچھا کماتا تھا۔ دو چھوٹی بہنوں کی اچھی جگہ شادی کر چکا تھا اور خود بھی شادی شدہ تھا۔ اس کی اپنی ایک الگ شناخت تھی اور میرے گھر والے جو ہمیشہ سے خاندانی روایات اور طور طریقوں سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ اس کی شخصیت میں کبھی محسوس کرتے تھے

اس کی بیوی جس کو میں بھابھی کہتی تھی، کچھ دن ہی اس کے ساتھ رہ کر اپنے میکے جا کر بیٹھ گئی تھی۔ تمام خاندان میں مشہور تھا کہ قصور وار وہی ہے۔ جس کی ایسی عادتیں ہوں اس سے بھلا کون نبھا کر سکتا ہے۔ میں جب تک اس کو جانتی نہیں تھی اس کے بارے میں ایسے ہی سوچتی تھی جیسا کہ میرے گھر والوں کا

نہیں رہا ہے۔ خود کو بس ایک قاتل محسوس کرتی رہی ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔
”کیا سمجھا تھا میں نے آپ کو۔ ایک دوست۔ ایک اچھا انسان۔ مگر۔“

وہ مسکرا اٹھا۔ ”ہاں ہاں آگے کہو۔ میں تو یہی چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے شکایت کرو۔ کوئی غصہ۔ کوئی گالی۔ کچھ کھری کھری ہی سناؤ الو۔“
میں منہ پھیر کر آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی۔ پہلے سے پتا ہوتا کہ آج اس سے ملاقات ہونی ہے تو میں کچھ جملے ہی سوچ کر آجانی لے آتی ساتھ۔ میں تو کب سے بولنا چھوڑ چکی ہوں اب اچانک کیسے بات کروں۔

”افسوس تو اس بات کا ہے کہ آپ کے ساتھ آپ کے جرم میں برابر کی شریک ہو چکی ہوں میں۔ خود کو مجرم۔ قاتل سمجھتی رہی ہوں اب تک۔“
اس کے منہ سے حیرت بھرے کچھ کلمات نکلے۔ جیسے وہ سمجھ ہی نہ پا رہا ہو کہ میں کیا بات کر رہی ہوں۔ میں نے لمبی سانس بھر کر پھر سے کہنا شروع کیا۔

”اپنی بیوی کے زہر کھا کر مر جانے کو آپ کس طرح لیتے ہیں؟ کیا وہ آپ کی ذمہ داری نہیں تھی؟ اس نے زہر کھا کر خود کشی نہیں کی اس کو قتل کیا گیا ہے۔ آپ نے اس کی جان لی ہے۔ آپ ایک قاتل ہیں اور میں آپ کے ساتھ آپ کے جرم میں برابر کی شریک ہوں میں۔“

”یہ تم کیا پاگلوں والی بات کر رہی ہو؟“ وہ بھڑک اٹھا۔ اس نے پہلو بدلا، ادھر ادھر دیکھا، جیسے اندازہ کر رہا ہو کہ کوئی اور تو ہماری گفتگو نہیں سن رہا۔ میں طنزاً مسکرا اٹھی۔

”کیوں سچ سے ڈر لگتا ہے؟ مگر خدا کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔ میں نے۔ آپ نے جو بھی کیا اس کی سزا ہم یہاں بھی بھگتیں گے اور وہاں بھی۔ یہ کوئی معمولی بات۔“

”تم بالکل ہی پاگل ہو چکی ہو کیا؟“ وہ پھر میری بات

کیا سوچ رکھا ہے۔ میں خود بھی یہ سب نہیں چاہتی تھی۔ اس نے نہ تو مجھے اپنی بیوی کے بارے میں کبھی اعتماد میں لیا تھا اور نہ ہی میں اس سے ضد ہی کر سکتی تھی۔

ایسے میں مجھے خود سے گھن آنے لگی۔ میں بستر سے جا لگی۔ سانس تو لیتی رہی مگر جان جیسے ختم ہو چکی تھی۔ مجھے خود پر غصہ آنے لگا۔ میں نے ایسا کیسے ہو جانے دیا۔ میں کیوں نہیں روک سکی خود کو، کیسے میں جذبات میں آکر بے قابو ہوتی چلی گئی اور بات اتنی بڑھا کر اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔

میرے گھر والے کافی حد تک درست تھے۔ میں اپنا گھر اجاڑ کر اب کسی اور کا گھر اجاڑنے چلی تھی۔ مجھ پر

یہ بات بہت بھاری پڑ گئی تھی اور میں جھکتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے کئی دن تک مجھے فون کیے اور بھی طریقوں سے بات کرنے کی کوشش کی مگر میں خود میں ہمت ہی نہیں پارہی تھی کہ اس کا سامنا کروں یا اس سے بات کروں۔

اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ اس کے سسرال تک بات پہنچ گئی اور ایک دن مجھے یہ خبر ملی کہ اس کی بیوی نے زہر کھا کر خود کشی کر لی ہے۔ میں بوجھ تلے دب گئی۔ یہ کیسا ظلم کر دیا تھا میں نے، کسی انسان کی جان چلی گئی۔ کیا قتل صرف اوزار کے استعمال سے ہوتا ہے۔ نہیں۔ نہیں۔ ایسے بھی قتل ہوتا ہے۔ میں نے کر دیا قتل۔ کسی انسان کی جان لے لی میں نے۔

میں اس حد تک بیمار ہو گئی کہ مجھے اپنا ہوش نہیں رہا مگر افسوس میں اس کی بیوی کی طرح بہادر نہیں تھی۔ میں پھر بچ گئی اور زندہ رہ کر اپنی شرمندہ زندگی کو سہتی چلی گئی۔ میرے گھر والوں نے میرا قاعدہ بائیکاٹ کر دیا اور جو بچی کچی عزت تھی وہ بھی چلی گئی۔ اب میں صرف ایک قاتل تھی۔ اور قاتل کسی بھی رحم کا مستحق نہیں ہوتا۔ جو سزا کاٹ کر میں اب اپنے بھائی بہنوں کے بچوں میں پناہ پا چکی ہوں۔ کیسے بھول جاؤں کہ میں کیا سے کیا ہو گئی ہوں۔ مجھے تو اپنا آپ یاد ہی

کاٹ کر چلایا۔

ملانے کی اجازت ہے، اتنے دنوں تک کچھ لوگوں نے مجھے میرے ناکرہ گناہ پر دبوچے رکھا۔ میرے پروں کو کاٹ کر مجھے پرواز سے باز رکھا اور اب جبکہ میرے اندر ہمت ہی نہیں رہی تو مجھے پنجرے سے آزادی مل گئی۔ میں جذبات کے زیر اثر نہ جانے کب کھڑی ہو گئی تھی اور باقاعدہ ڈول رہی تھی۔ اس نے میرے بازو کو تھام رکھا تھا۔ میں حیرانی سے اس کو تنگنے لگی اور پھر میرے منہ سے نکلا۔

”بے وقوف عورت۔ کیا اس بات پر تم مجھ سے اب تک چھپتی رہی ہو؟ میں نے تمہارے بھائی اور پھر تمہاری بڑی بہن کو سب کچھ بتایا تو تھا۔ کیا ان لوگوں نے تم کو کچھ نہیں بتایا؟“

میں حیرانی سے اس کو تنگنے لگی۔ یہ اب کون سا تماشا کرنے جا رہا ہے میں خود میں گم ہو گئی تھی کہ وہ پھر سے گویا ہوا۔

”میں کہاں تھی اور کہاں آئی ہوں۔“

وہ ڈبڈباتی آنکھیں لیے دھیرے سے مسکرا رہا تھا۔ ہم دونوں ہی وقت کے ہاتھوں کھلونا بنے رہے اور اب اپنے اپنے کھیل کے اختتام پر کیسے ایک دوسرے کو تھامے کھڑے تھے۔ میں بھی مسکرانے لگی۔

”تم جہاں سے بھی چلی تھیں، پہنچی مجھ تک ہی ہو۔ جہاں بھی تھیں، مجھ تک ہی آئی ہو، بس اب یہ دھوپ چھاؤں۔ چھین چھپائی کا کھیل ختم کرو۔ میں نے ہار مان لی ہے۔ میں اب تھک گیا ہوں تم کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے۔ چھوڑو۔ آؤ اب مجھ سے دوستی کر لو۔ ابھی بھی کچھ ایسی دیر نہیں ہوتی۔ ہم زندہ ہیں۔ ہمارے دل اب بھی دھڑکتے ہیں۔ ہم سانس لیتے ہوئے چلتے پھرتے ہیں، کیا بس اتنا کافی نہیں؟“

”سیکنہ نے خود کشی میری وجہ سے نہیں کی۔ اس کے گھر والے اس کی بات نہیں مان رہے تھے، اس لیے کی۔ اس کو کوئی پسند تھا، اس کے گھر والوں نے زبردستی اس کی شادی مجھ سے کروادی تھی۔ سیکنہ نے جب مجھے تمام رواداد سنادی تو میں نے اس کو اجازت دے دی تھی کہ اگر وہ چاہے تو میں اس کو چھوڑ دوں گا، وہ اپنے چاہنے والے کے ساتھ شادی کر لے۔ اور میری اجازت لے کر ہی وہ اپنے میکے گئی تھی۔ مگر چھ مہینے گزرنے کے بعد بھی اس کے گھر والے نہیں مانے، جس پر اس نے خود کشی کر لی۔ اس سے میرا کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ یہ اس کے اپنے گھر والوں کا ظلم تھا، جس کا سیکنہ نشانہ بن گئی اور مجھے اس کی موت کا دکھ ضرور ہے مگر میں کسی بھی طرح سے خود کو اس کا قائل نہیں سمجھتا۔ میں اس پر زبردستی کر کے اس کو کبھی بھی پھوی بنا کر نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے تو وہی کیا جو مجھے تھیک لگا اور یہ بات میں نے اپنی والدہ کو جب بھیجا تھا تو اس سے پہلے ہی تمہارے بڑے بھائی کو فون پر بتا دی تھی اور پھر سیکنہ کے انتقال کے بعد میں تمہاری بڑی بہن کو بھی سب دوبارہ سے بتا چکا تھا۔ مگر تم نے ایک دفعہ بھی مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔ میں نے بہت کوشش کی، مگر تم ایسی چھپ گئیں کہ میں ڈھونڈتا ہی رہ گیا۔ مجھے تو تم سے بس یہی پوچھنا ہے کہ آخر تم کو ایسا کیا مجھ پر غصہ آ گیا تھا کہ یوں غائب ہو گئیں؟“

میں سب سن کر بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ زندگی نے اب اس عمر میں لا کر مجھے کیوں یہ سب دکھایا ہے۔ میں اس موڑ پر آ کر کیوں آزاد ہو گئی ہوں۔ جیسے میری زندگی ختم ہوئی۔ مجھے سراٹھانے کی اجازت ہے، نظریں

وہ بہت محتاط انداز میں مجھے بہلا رہا تھا۔ میں زندگی کے اس موڑ پر پھر سے کھڑی تھی جہاں سب کچھ حاصل ہو جانے کی خوشی سے زیادہ خوف غالب تھا۔ ایک ہاتھ کے فاصلے پر وہ کھڑا ہے بس۔ مگر

”مگر۔۔۔ دنیا۔۔۔ لوگ۔۔۔ ہم کیا کریں گے؟“ میں نے گہرا کر پوچھا۔

وہ شرارت سے مسکرا اٹھا۔

”میں سب سنبھال لوں گا۔ مگر اب کی بار مجھ سے چھپنا نہیں۔ میرا اعتبار کرنا۔“ اس نے دھیرے سے مجھے میرے بازو سے پکڑ کر واپس کرسی پر بٹھا دیا تھا۔

خود کو کسی کی پناہ میں دے دینا کیسا لگتا ہے۔ یقیناً بہت اچھا لگتا ہے۔



تیل و تہا کے پریم

Downloaded From
Paksociety.com



READING
Section

جاتی سردیوں کی خنک سی شام اپنے مزاج کی سختی اور روکھے پن کے قطعاً برعکس نہایت پر لطف اور یادگار رہی تھی۔ شہر کے عین وسط میں بے حد مصروف شاہراہ پر واقع ریسٹورنٹ کے فرسٹ فلور پر بنے فیملی کیبن جو ہزاروں منچلوں کی رنگین ودلر باشاموں کے گواہ تھے۔ ان میں وہ بھی تھا اب ایسا بھی نہ تھا کہ وہ بہت آوارہ منش یا دل پھینک قسم کا نوجوان تھا۔ وہ بالکل ویسا ہی تھا ہمارے آج کل کے ننانوے فیصد جدت پسند عام نوجوانوں جیسا۔ وہی خود نمائی کا شوق خالی خولی شو شا کا ہڑکا پھس پھسی پھوں پھاں کا رعب جن کی شکل ذرا اچھی ہو تو خود کو ”ہالی“ کے کسی ہیرو سے کم نہیں سمجھتے اور اگر سونے برساکہ ہنسنے اوڑھنے کا سلیقہ آجائے تو سمجھو بات۔ ”ہالی“ تک چلی گئی اور اگر جیب میں اپنی کمائی کے چار پیسے بھی آنے لگیں تو پھر تو ”ہالی“ والے بھی بچارے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔

(ان کو خوابوں میں)

جبکہ وہ کسی ایسی اونچی پوسٹ پر بھی نہ تھا کہ ”عیاشیاں“ کرتا پھرتا کہنے کو سارا زمانہ جانتا تھا وہ کسی بڑے ہوٹل میں منیجر ہے مگر اندر کی بات یا تو وہ جانتا تھا یا

پھر دور کے یار دوست قریب کے اس لیے نہیں کہ وہ بے چارے اس ہوٹل میں جانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ یہ بھی فائدہ تھا کیوں کہ اس طرح کسی کو پتا ہی نہیں تھا کہ منیجر صاحب خود روم سروس دینے جاتے ہیں۔ اتنے اچھے بااخلاق منیجر صاحب کہیں ہوں گے بھلا۔۔۔ نہیں ناں تو بس یوں عزت بنی ہوئی تھی۔

جہاں وہ کام کرتا تھا وہاں لڑکیوں سے دوستی کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا تو بس وہ بھی دیکھا دیکھی اس رنگ میں رنگتا گیا۔ خوب مزارتیا ر دوستوں میں ناک مزید اونچی ہو جاتی۔ کالر اور اکڑ جاتا بڑے گر کی باتیں تھیں یہ جو وہ خوب سیکھ گیا تھا۔ حالانکہ جس علاقے محلے سے اس کا تعلق تھا وہاں تو ایسی حرکتوں پر دفعات لگ جاتی ہیں ہڈیاں توڑ دی جاتی ہیں۔ غیرت کے مسئلے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں (ہر کام ہر جگہ ہو رہا ہے بس کھلے بندوں نہ کرے کوئی) تو وہ بھی سیانا ہو گیا

تھا۔ اپنے محلے والوں کے سامنے وہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ پوری دنیا میں اس سے زیادہ شریف کوئی نہیں۔ وہ بڑا مہتمن سرشار، نئی ملاقات کے نشے میں سرشار وہ

تاکویلیچے



READING
Section

بانیک پر آہستہ روی سے آرہا تھا۔ علاقے کی لاسٹ حسب معمول اس وقت ندارو تھی۔ اکاد کا کسی خوش نصیب گھر سے روٹی کھڑکیوں، دروازوں سے لکیروں کی صورت باہر ادھار کے اجالے بکھیر رہی تھی۔ اپنے دھیان میں گنگناتے ہوئے اس نے گلی کا موڑ کاٹا تھا اور بالکل اچانک سامنے آنے والی ہستی کو بجاتے بجاتے خود تو زمین بوس ہو اہی تھا وہ بھی نہ چنے کی کوشش کرتی، پیچھے جاگری تھی۔

”اومانی گاڈ!“ اتنا اچانک ہوا تھا یہ سب کہ چند ثانیے کو تو حواس ہی مختل ہو گئے۔ مگر وہ جلد ہی تیر کی سی تیزی سے اٹھا اور اسی اٹھنے میں خبر ہوئی کہ کہیں گڑبڑ ہو گئی ہے لیکن وہ اپنی تکلیف بھلائے چادر میں چھپے وجود کی طرف لپکا جو ابھی اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جی میں تو آئی کہ ہاتھ بڑھا کر منع کر دے مگر وہ ایسا کرنے پایا۔

”سوری، ویری سوری۔ آپ کو چوٹ تو نہیں آئی۔“

قسم خدا کی اگر اس جگہ کوئی لڑکا ہوتا تو وہ اس صورت حال پر اسے ایسی ماں بہن یاد کروانا کہ الامان مگر سامنے ایک لڑکی تھی اور وہ سدا کا نرم دل۔ اگر وہ لڑکی بد صورت بھی ہوتی تو سو گناہ معاف کر دیتا۔ برابر کی قصور وار تو وہ لڑکی بھی تھی آدھی رات کو عین سڑک پر مٹر گشت کرنا کہاں کی عقل مندی ہے بھلا۔ مگر وہ اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور اٹنا اسی سے معافیاں مانگنے لگا۔

اتنی خراب صورت حال میں بھی کمال کی بات تھی، اس لڑکی نے چادر کو اپنے چہرے سے سرکنے نہیں دیا تھا۔ خود کو سنبھالتی کھڑی ہوئی تو بے اختیار ہتھیلی سامنے پھیلائی مٹی میں لت پت جو کہ اچھی خاصی چھل چکی تھی۔

”اوہو۔۔۔ آپ کو تو بہت زیادہ چوٹ آئی ہے۔“

بازل کا بس نہ چلا کہ نرم و گداز ہاتھ تھام لے۔
”نہیں میں ٹھیک ہوں۔ غلطی میری تھی سوری تو مجھے کرنا چاہیے۔ آپ تو بانیک سمیت گرے ہیں“

چوٹ تو آپ کو آئی ہوگی۔“
اوہ کوئی لطیف ٹھنڈاؤ میٹھا جھرناسا پھوٹ پڑا تھا گویا۔
”نہیں، نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں البتہ آپ کو ٹرٹمنٹ کی ضرورت ہے یہ آپ کا ہاتھ۔“ اس نے لڑکی کے ہاتھ کو دیکھا جو وہ چادر سے صاف کر رہی تھی۔
”اوہو۔۔۔ ایسے مت کرس زخم اور چھل جائے گا۔“
وہ یوں کراہا گویا اس کے زخم کو رگڑا گیا ہو جبکہ لڑکی کوئی جواب دیے بنا چل پڑی اور یہ دیکھ کر تو بازل کے اوسان اڑان بھرنے کو ہوئے کہ وہ بمشکل دو قدم چل پائی تھی پھر کراہتی وہیں کھڑی ہو گئی۔

”اوہ آپ کے تو پاؤں پر بھی چوٹ آئی ہے۔ آپ کیسے جائیں گی کہاں سے آپ کا گھر؟“

اسے تذبذب میں دیکھ کر بازل نے یہی بہتر سمجھا کہ چند لمحے دے دیے جائیں۔ وہ لنگڑا تا بانیک تک آیا جسے سیدھی کرنے پر پتا چلا کہ وہ ان سے بھی زیادہ ”مخربز“ کا شکار ہو چکی تھی۔ اللہ کی رحمت ہی ہوگی جو اگر اب یہ اشارت ہو جائے وہ جائزہ لیتا سوچ رہا تھا۔
”پلیز اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو کسی سواری کا انتظام کر دیں میری ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں ۴ نہیں ہسپتال لے جانا تھا اسی لیے گھر سے نکلی تھی میں اس وقت۔“ وہ بے چاری روہا سی ہوئی اسی سے مدد مانگنے پر مجبور ہو گئی تھی اور بازل نے تو دل و جان ہتھیلی پر رکھ لیے۔ صد شکر یہ کہ بانیک ہوش میں آگئی۔ سولا تیس مارنے کے بعد وہ لپک جھپک چنگ جی پکڑ لایا۔

اتنے عرصے میں وہ جانے کیسے شگفتہ خالہ کے دروازے تک پہنچی تھی اسے آتے دیکھ کر ماما کو لے آئی۔ انتہائی خوب صورت و پروقار خاتون مگر بے حد نیڈھال سی ان کی طبیعت واقعی بہت خراب لگ رہی تھی۔

”بہت شکریہ بیٹا تم تو اس وقت ہمارے لیے فرشتہ

بن کر آئے ہو۔“ وہ ان کو سہارا دینے آگے بڑھا تھا کہ ان کے الفاظ نے شرمندہ کر ڈالا۔ کچھ بولا ہی نہ گیا مارے خجالت اور احسان مندی کے۔ اب تو یہ ہو نہیں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

کی چھت پر ایک رنگین آپٹل چھب دکھلا رہا تھا تو بائیں طرف بھی بہار جلوہ نما تھی۔ اس کے ہونٹ سیٹی کے سے انداز میں سٹر گئے۔ بجائی اس لیے نہیں کہ نقص امن کا خدشہ تھا۔ انگڑائی کے لیے پھلے بازو سمیٹتے ہوئے سامنے والی کو ہاتھ لہرایا پھر ذرا سا رخ موڑ کر تار پر جھولتی چیزیا کو اڑانے کے بہانے بائیں والی کو بھی ”ہائے“ کر ڈالا۔ اب رہ گئی عقب والی تو نظر ملنے پر اس کے لیے آنکھ کا اشارہ ہی بہت جانا اور یہ سب کرتے ہوئے اس نے خاص دھیان رکھا تھا کہ ایک کو کیا گیا اشارہ باقی نہ دیکھ لیں۔ اس کے بعد خود ہی اپنا کندھا تھکا کہ کتنا نیک دل نوجوان تھا، وہ یعنی صبح ہی اتنی نیکیاں کمالیں۔ کتنے خوب صورت چہروں پر خوشی بکھیر دی۔ ساتھ ہی فائدہ یہ ہوا تھا کہ اپنے جیسے یاروں کو سنانے کے لیے ایک تازہ کارنامہ انجام پایا گیا تھا اور یونہی اس کی نظر چاچے بختو کے مکان ساتھ جڑے مکان کی کھڑکی تک گئی جہاں سے شگو خالہ کی موٹی سے ہو بڑا سا سر باہر نکالے گلی میں جھانک رہی تھی۔

آہ اس مکان کو دیکھتے ہی کیا کیا نہ یاد آ گیا تھا۔ کاش اس وقت کھڑکی میں اس تریوز کے بجائے وہ دو جھکی آنکھیں آجائیں، بے اختیار دل نے خواہش کی۔ شگو خالہ کی بہو کی نظریں اس سے چارہ ہوئیں اس نے منہ میں کچھ بڑبڑا کر ”ٹھاہ“ سے کھڑکی بند کر لی۔ یقیناً اس کی شان میں ہی کچھ فرمایا گیا ہو گا۔ لوجی، صبح سویرے اک گناہ بھی پلے پڑ گیا۔ لاجول ولاقوہ وہ بد مزہ سا ہو کر منڈیر پر جھک گیا، برابر والے گھر کا صحن صاف نظر آ رہا تھا۔

چچا ظہیر الدین رزاقی گیٹ پر لگا تالا کھول رہے تھے ساتھ نصیب دشمنان کل سے ان کی طبیعت بھی نا ساز ہے۔ تو یہ منہ اندھیرے کدھر کو چلے؟ ابھی وہ غور کر ہی رہا تھا کہ ایک ہاتھ میں توس پکڑے ایک ہاتھ سے بیگ سنبھالتی لہرائی بل کھائی نازو اندر سے نکلی اس کا رخ بھی گیٹ کی جانب تھا۔ ”اوہ! تو چچا سے کلج چھوڑنے جا رہے ہیں۔“ یہ ان کی ہر روز کی ڈیوٹی تھی۔

سکتا تھا کہ یوں رات کے وقت دو معزز خواتین کو اس پریشانی کے عالم میں اکیلا چھوڑ دیتا۔ آخر اخلاقیات کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں، سو وہ پیچھے ہی ہو لیا۔ وہ انہیں نزدیکی ڈاکٹر کے کلینک پر لے آیا اور جب تک ان کا ٹریٹمنٹ نہ ہو گیا وہیں رہا بلکہ باہر آ کر سواری بھی ڈھونڈ کر دی۔

آج کی شام ہی نہیں رات بھی بہت یادگار رہی تھی۔ اس کی ماما کی بہت سی دعائیں اور اس کی جھکی پلکوں کو صرف ایک بار خود پر اٹھا دیکھنے کی خواہش اور دائیں ٹانگ میں اٹھتا شدید درد لے کر گھر پہنچا تو اباجی، حکیم اظہار الدین رزاقی صاحب پوری طرح مورچہ بند ہو کر اسی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

پھر تو دن بھر میں کی گئی نیکیاں بھی رائیگاں جاتی گئے لگیں کوئی عمل دیوار نہ بن سکا۔ اس کی کوئی بھی صفائی وضاحت، تاویل سے بغیر انہوں نے وہ لے لیے ایسے ایسے گولے دانے کہ اللہ کی پناہ۔ پھر تو اسے اندازہ کرنا مشکل ہو گیا کہ ٹانگ کا درد زیادہ شدید ہے یا اس دکھ کی اذیت جو اسے یہ محسوس کر کے ہو رہی تھی کہ کینے ترین بہن بھائی کھڑکیوں پر دوں کے پیچھے سے جھانکتے اس کی ریکارڈ بے عزتی کا نظارہ کر رہے ہیں۔



دو دن تو ٹانگ کے درد نے ملنے نہیں دیا تھا دو ایٹیاں، سکائیاں حتی کہ داداجی کے قدیم نسخوں کے بعد آج وہ اس قابل ہوا تھا کہ خود اٹھ کر چل سکے اور اب کمرے میں تھوڑی واک کرنے سے اندازہ ہوا کہ سب فٹ ہے تو وہ سبک خرامی سے چلتا چھت پر چلا آیا۔

اف! ایسا لگا دو دن نہیں بلکہ دو سال کی قید کے بعد رہائی نصیب ہوئی ہو، صبح سویرے کی مخصوص تازگی اور فرحت بھری باد نسیم جو مشام جاں میں اتری تو ساری ٹھکن زائل ہونے لگی۔ اک بھر پورا انگڑائی لے کر

صبح کی تمام رنگینی کو اندر اتارا، ساتھ ادھر ادھر بھکتی نظر بھی سرشاریت سے بھر گئی۔ سامنے ہی ماسٹرا جمل

چچا صاحب باہر نکل چکے تھے۔

وہ دوپٹہ پھیلا کر سلیقے سے اوڑھ رہی تھی کہ معا کسی احساس کے تحت سر اوپر کو اٹھ گیا اس پر نگاہ پڑتے ہی نازو کی آنکھوں میں یکبارگی حیرت اتری پھر اس حیرت پر مسرت جگمگاہٹ بن کر غالب آنے لگی اور پھر وہ مسرت بھی بھرپور مسکراہٹ میں بدل گئی اور چند ثانیے میں ہی اس کے چہرے کو اتنے رنگ بدلتے دیکھ کر باذل کا دل فخر و انبساط سے بھر گیا۔

کتنے مزے کی کیفیت ہوتی ہے ناں یہ کہ جب کوئی آپ کو دیکھتے ہی برقی قلم بن جائے۔ وہ تو جلتا بجھتا ہے ہی آپ کے اپنے اندر بھی ایک خاص روشنی رفلیکٹ ہونے لگتی ہے جس سے لگتا ہے سارا عالم روشن ہو گیا۔ وہ کئی بار گزرا تھا ایسی پر کیف کیفیوں سے اور ہر بار اک نیا لطف ملتا تھا اور پھر خاص طور پر نازو جسے وہ ظاہری طور پر ڈرا گھاس نہیں ڈالتا تھا اور پھر وہ ڈالتا بھی کیوں۔ وہ تو بغیر چارے کے ہی دام میں آگئی تھی اور صد شکر اس کی آنکھوں میں ابھی اتنی حیا باقی تھی کہ دیوار پار رہنے والی کزن کو کبھی آنکھ اٹھا کر نہیں

دیکھا تھا (باہر سے فرصت ملتی تو تب ہی ناں) بہر حال اب جب سے اس کی آنکھوں کا بھید جانا تھا اس کے بعد سے تو وہ اور محتاط ہو گیا تھا۔ ارے بھئی آخر لڑکے بھی تو دل و جذبات رکھتے ہیں انہیں کوئی چپکے چپکے دیکھے چاہے 'سرا ہے تو خوشی انہیں بھی تو ہے تو بس۔ وہ یہی مزے لوٹ رہا تھا۔ ایک تو خون کا رشتہ دوسرے بچپن کا ساتھ تیسرے وہ کچھ عرصہ سے اڑتی پڑتی سن رہا تھا کہ ابا حضور اسے متوقع بہو کا درجہ دینے کا تہیہ کیے بیٹھے ہیں۔ اب بے شک ماضی و حال میں اسے ابا سے چاہے کتنے ہی شدید اختلافات کیوں نہ رہے ہوں ان سب میں ایک یہ مقام ایسا تھا جہاں وہ ان کے آگے بے مثال فرمانبرواری کا بھرپور مظاہرہ کرنے کے لیے سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ فریبی مائل 'بے تکا گورا رنگ' اور پھیکے سے نقوش والی۔ کچھ سنجیدہ کچھ شوخ سی بہت پڑھا کو اور پورے خاندان کی وہ واحد لڑکی جو باپ دادا کی

روایت کو لے کر چلتے ہوئے طب کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ ابا کی طرح چچا کا بھی خواب تھا کہ ان کا کوئی بچہ ڈاکٹر بنے۔ خود تو اپنے آباؤ اجداد کی حکمت کا فائدہ اٹھا نہیں سکے تھے کہ جب دادا جی کی وفات ہوئی تو ان کا قدیمی و خاندانی خزانہ یعنی حکمت اور نسخوں کی کتابیں ابا جان اپنے قبضے میں کر چکے تھے تب وہ جوانی کی بے خودی لا پروا کر دینے والی مستیوں میں گم تھے۔ دو بچوں کے والد محترم ہونے کے باوجود انہیں گھر اور گھر کے جھمیلوں سے قطعاً رغبت نہ تھی۔ باپ زندہ تھا تو سب اکٹھے تھے۔ زندگی بے فکر تھی مگر جب وہ گئے تو پتا چلا کہ باپ نہیں رہا۔ تو کوئی بھی اپنا نہیں رہا بھائی نے پرکھوں کی گرسی سنبھال لی تو وہ سڑک پر آگئے۔

مگر اللہ ہے سب کا رب سب کا پالنا رہا وہی ہے دینے والا۔ بس تب ان کے لیے بھی وسیلہ بن گیا۔ ایک دوست کے توسط سے انہوں نے کاسمیٹکس بنانی شروع کیں بجن میں سرفہرست شیمپو اور رنگ گورا کرنے والی کریمیں شامل تھیں۔

شاہ عالمی کی اندرونی تنگ گلیوں میں بننے والی سستی کریم خرید کر اپنے کمپنی کا ٹیک لگا کے ڈبیوں میں بھر کے بیچنا شروع کیں۔

عوام کی بڑی تعداد بخوشی ان کی مصنوعات کو خریدتی تھی۔ ان کا چند سو سے شروع کیا جانے والا کاروبار اب کروڑوں کا منافع دے رہا تھا۔

اور غالباً "بھائی کے ان ہی حالات کو دیکھتے ہوئے حکیم اظہار الدین نے یہ "مخلصانہ" فیصلہ کیا تھا کہ آخر بھائی پر پہلا حق ان ہی کا ہے۔ پھر لڑکی کا مستقبل بھی روشن تھا۔ وہ "ایم بی بی ایس" ڈاکٹر تو نہ بن پائی مگر ہو میو پیٹھک کورس کر کے بھی ڈاکٹر کہلائے گی تو کل کو اپنا کلینک بھی بن جائے گا۔ یعنی گھائے کا سودا نہیں۔

ان کے بیٹے نے تو انہیں ہر جگہ زک ہی پہنچائی تھی۔ کوئی شوق پورا کر کے نہ دیا۔ ان کا بھی خواب تھا کہ بیٹا ڈاکٹر بنے مگر اس نے ڈاکٹر تو کجا حکیم بن کر بھی نہ دیا۔ ایسی ناہنجار تالاق اولاد ان کی ہزار ہا توجہ کے باوجود وہ ایف ایس سی میں ایک پیپر میں رہ گیا جو پھر ان

کے لڑکھا کھا کر رو دھو کر اس نے کلیئر کیا تھا۔

مگر حکیم صاحب تو اس کی اس نوکری سے بھی نالاں تھے مگر کیا کرتے اس کی ڈھٹائی کا جس پر کوئی اثر ہی نہ تھا جبکہ وہ خوب موج میں تھا۔ زندگی کس قدر خوش رنگ ہو گئی تھی کوئی اس کے دل سے پوچھتا۔ ڈور نیل ہوئی تھی ادھر نازو نے اسے اشارہ کیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ میں ادھر ہی آرہی ہوں۔

اور وہ اس کے سواگت کے لیے جلدی سے بیڑھیوں کی جانب لپکا اور ساتھ ہی جی میں آئی کہ وہ اسپائیڈر مین ہوتا تو ایک ہی جست میں نیچے جا پہنچتا۔ بعض خواہشیں کتنی بھونڈی ہوتی ہیں ناں ہم جانتے ہیں کہ یہ پوری نہیں ہونے والی مگر حیرت ہے پھر بھی ہم کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ سبج سبج نیچے اترتا۔

”ہاں میاں! کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“ اس کے سلام کے جواب میں چچا نے مزاج پر سی کی۔ پیچھے ہی وہ کھڑی تھی جس پر اک سرسری نظر ڈال کر وہ یوں بن گیا جیسے دیکھا ہی نہ ہو، مٹو بانہ چچا کو اپنی حالت سے آگاہ کیا۔ ”کہاں ہیں بھائی صاحب“ آج صبح ہی صبح ایک کام آن پڑا ہے ان سے۔ ”امی کچن سے نکلی تھیں وہ ان سے پوچھنے لگے۔ نازو نے لپک کر انہیں سلام کیا۔ ”وہ تو بڑے سور ہے ہیں۔ جانتے تو ہو ان کی عادت کو دس بجے سے پہلے کب بستر چھوڑیں گے وہ۔“ نازو کو گلے لگاتے انہوں نے برے منہ سے بتایا۔ میاں کی اس عادت سے خوب ہی بیزار رہتی تھیں وہ۔

”اے لو۔ یہ اچھے حکیم صاحب ہیں جو خود ہی دس بجے بیدار ہوتے ہیں یعنی وہ عمل جو ساری بیماریوں کی جڑ ہے۔ یہ اپنے مریضوں کو کیا خاک نصیحت کرتے ہوں گے۔ علاج تو پھر دور کی بات ہے۔“ چچا نے بھی موقع سے فائدہ اٹھاتے تاک کر طعنہ دے مارا جو زیادتی ان کے ساتھ ہوئی تھی وہ انہیں بھولتی نہیں تھی کبھی کبھار وہ جلے دل کے پھپھولے پھوڑ ہی لیتے تھے۔

”بس بھیا میں تو خود پریشان ہوں۔ تم سناؤ“ آج سورے سورے خیر تو ہے ناں اور کھڑے کیوں ہو۔ آؤ بیٹھو اے عمارہ چچا اور بہن کے لیے ناشتالے آؤ۔“

امی نے کچن کی جانب منہ کر کے آواز لگائی۔

”ارے نہیں بھابھی آپ لوگ بسم اللہ کیجیے میرے پاس تو بیٹھنے کا ٹائم نہیں۔ نازو کو کالج سے ویر ہو رہی ہے“ آج اس کا بہت ضروری ٹیسٹ ہے۔ گاڑی دو دن سے ورکشاپ پہ کھڑی ہے میں تو اس لیے ادھر آیا تھا کہ بھائی صاحب سے کہوں اسے کالج تک چھوڑ آئیں۔ آپ کو پتا ہے کبھی بچیوں کو اکیلے گھر سے نکلنے نہیں دیا۔ میری اپنی طبیعت بھی کل سے ٹھیک نہیں۔ اب ہمت نہیں پڑ رہی تھی مگر چلیں خیر میں خود ہی چھوڑ آتا ہوں۔ چلو بیٹا۔“ وہ نازو کی طرف مڑے۔

”آئے ہائے تمہاری اپنی طبیعت اچھی نہیں تو کیسے جاؤ گے۔ یہ باذل ہے ناں یہ چھوڑ آتا ہے اپنی بائیک پر۔“ امی نے تو گویا مسئلہ ہی حل کر ڈالا۔ اس نے بھی خوب زور و شور سے سر ہلایا ساتھ ہی نازو کے گول مٹول چہرے پر نگاہ کی جو تائی کے مشورے پر جگمگا اٹھا تھا۔

”جی جی چچا جان میں چھوڑ آتا ہوں۔ آپ اس حالت میں کہاں جائیں گے۔“ اور چچا نے اسے سر تا پیر ایسی جانچتی نظر سے دیکھا گویا ایک سرے کر رہے ہوں۔

”نہیں، نہیں اب ایسی بھی کوئی بات نہیں چنگا بھلا ہوں میں اور تم نے دو دن پہلے ہی اتنی تکلیف مول لی ہے۔ تم آرام کرو، ہم چلتے ہیں۔“ وہ کہتے ساتھ ہی چل پڑے۔ نازو بھی چارو ناچار پیچھے ہوئی۔

”ارے جلال! تم تو بالکل ہی عیروں والی باتیں کرنے لگے۔ باذل بالکل ٹھیک ہے اب۔“ امی نے مروتا ”اک بار اور کہا مگر وہ نہ ٹھہرے۔ پھر وہ تو پلٹ کر کچن میں چلی گئیں۔ مگر وہیں بت بنا جیسے ابھی تک چچا کی اک نظر کے حصار میں تھا۔ آخر کیا تھا اس نگاہ میں میوں گویا اعتبار سے خالی۔ بڑی چبھی تھی اسے ان کی نظر۔ پھر تو اس کا موڈ بے حد بگڑ گیا۔

اپنے پریس شدہ کپڑے لے کر گولہ بنا کے دیوار پر دے مارے۔ اک بے قصور گولے کو ٹھوکر سے اڑایا۔ ناشتے سے واک آؤٹ کیا۔ یعنی صبح صبح ہی گھر میں اس

کی بے عزتی کر دی گئی اور اتنے سلیقے سے اسے تو جتنا بھی غصہ آتا کم تھا۔



”اکیلے ہی اکیلے ناشتا ڈکار رہے ہو۔“ بسورتی ہوئی شکل موصول ہوئی۔

”ہاں تو کیا کروں؟ اسامہ دنیا سے ہی چلا گیا اوباما کو فسادات پھیلانے سے فرصت نہیں۔ خان صاحب کسی کنٹینر میں پھنسے ہوئے ہیں، میاں صاحب دورے پر تو سوچا اکیلے ہی ناشتا کر لیا جائے۔“ تیزی سے انگلیاں چلاتے مسیج ٹائپ کیا اور بھیج دیا ابھی نان چنے کے نوالے کو منہ میں ٹھونس کر لسی کا ایک گھونٹ ہی بھرا تھا کہ پھر ٹوں ٹوں گونج اٹھی۔

”ارے گولی مارو سب کو میں مر گئی ہوں کیا؟“ ادھر سے مکمل استحقاق جتایا گیا۔

”سو بسم اللہ آجاؤ پھر۔“ اس نے بھی کمی نہ کی۔ کھٹ سے دعوت دے ڈالی۔ ساتھ ہی مسکرا کر سامنے سڑک پار نظر ڈالی، جانتا تھا وہ کھڑکی سے دیدے چپکائے کھڑی ہوگی۔ اپنے محلے کی جانان میں یہ تو اس کے لیے وبال جان ہی بنتی جا رہی تھی۔ سارے دن میں اتنے پیغامات کہ وہ اکثر تنگ آجاتا۔ سچ ہے اس کم بخت غضب ناک ایجاد نے بڑے بڑے ان پڑھوں کو لائق فائق کر دیا تھا، وہ تو پھر ٹڈل پاس تھی۔ ہمیشہ رعایتی نمبر لینے والی ستارہ بی بی عرف نارواتی مہارت اور روانی سے جو ابی پیغامات دیتی تھیں کہ وہ حیران رہ جاتا پتا نہیں اس زمانے میں وقت بہت لمبا ہو گیا ہے یا دنیا میں کرنے کے لیے کام نہیں رہ گئے۔ بس یہ فضول کی مصروفیت جو اس جیسے بااخلاق و بامروت بندے کو بھی وق کر دیتی۔ اسکرین پھر روشن ہوئی۔ جہاں نہ صرف دعوت قبول کر لی گئی تھی بلکہ مغموم و مظلوم حسینہ زمانے سے شکوہ کناں بھی تھی۔

”آتو جاؤں مگر ہائے یہ بے درد دنیا والے۔“

”محبت کرنے والے زمانے سے نہیں ڈرا کرتے۔“ اس نے بھی محبوب کو آزمائش کی بھٹی میں

تپانا چاہا۔
”ڈرتی ورتی میں کسی سے نہیں۔“ جی دار محبوبہ نے ایک ٹانگ جہاں کے سینے پر رکھ دی۔

”تھیک ہے پھر چلی آؤ۔“ وہ توجوش میں ہی آگیا تھا مگر ادھر ابھی ہوش باقی تھا۔

”کیا ہو گیا ہے بازی کیا تم مجھے سارے زمانے میں رسوا کرنا چاہو گے۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے گھر آ جاؤ۔“

”نا بابا نا، میں تم اکیلی کو تو ناشتا کروا سکتا ہوں مگر تمہارے اٹھارہ افراد پر مشتمل خاندان کو نہیں۔“ وہ فوراً ہی کٹھور ہوا۔ صفا چٹ جواب ٹائپ کیا۔

”میرا خیال ہے تم پہلے ناشتا کر لو دھیان سے پھر باتیں کرتے رہنا، ایک تو یہ نری مصیبت بھی کسی کے ہاتھ میں نہ ہو۔“ باسط بھائی کافی دیر سے اس پر نظر رکھے ہوئے تھے دو گرما گرم عمدہ خوب پھولے ہوئے نان لے کر خود ہی اس کی میز پر آگئے۔ موبائل ہاتھ میں لے کر جیب میں ڈالا ساتھ ہی اک کینہ تو زنگاہ سڑک پار کھڑکی پر ڈالی اس کی گڈیاں کہاں کہاں اڑی ہوئی ہیں یہ ان سے بہتر اور کون جانتا تھا۔

”ارے بہت شکریہ باسو بھائی میں تو کر چکا ناشتا۔ آپ کی تو لسی ہی بڑی مزیدار ہوتی ہے اس سے ہی پیٹ بھر گیا، میرا یوں کریں یہ نان اور ایک پلیٹ جا جی کی طرف بھجوا دیں۔“

”جا جی تو یہاں ہے ہی نہیں، رات کو ہی بڑا سابیگ لے کر گیا ہے کہیں“ باسط بھائی نے پاس سے گزرتے چھوٹے کونان پکڑائے۔

”ہیں! کب کہاں؟“ ان کی بات نے اسے گڑبڑا ہی دیا (افسوس تارو کی بچی سارے جہاں کی بکو اس کر لے گی مگر، ہم بات پھوٹ کر نہ دے گی۔ اب لے کر شرمندہ کروا دیا لوکی۔)

”پتا نہیں دو چار دن سے کوئی دور پرے کا ماما آیا ہوا تھا۔ وہی اس آوارہ گرد کو لے کر گیا ہے کہیں نوکری دوکری کے لیے۔ ویسے کچھ دنوں سے جا جی کے ساتھ زیادہ دوستی نہیں بڑھ گئی تمہاری۔“ بغور اس کا چہرہ

ساتھ ہی بٹھالیا۔ چھوٹے کو اس کا ناشتا آرڈر کیا۔
”اور سناؤ مہمان چلے گئے۔“ وہ اپنے مطلب کی
بات برآیا۔

”کیسے مہمان ہمارے گھر تو کوئی مہمان نہیں آئے
کافی دن سے؟“ چالاک منے کے چہرے پر حیرت اتری
اور اس سے زیادہ اس کے منہ پر۔

”تو پھر وہ کون کبھی؟“ بازل کا دل دھک سے رہ گیا۔
اسے اچھی طرح یاد تھا انہیں شگوخالہ کے گھر سے ہی
پک اینڈ ڈراپ کیا تھا۔

”یاد کرو ٹھیک سے۔ دو دن پہلے کوئی مہمان آئے
ہوں۔“ جگ سے لسی اینڈیل کر گلاس اس کے سامنے
رکھا۔ ساتھ یادداشت کے پردے کو ہلایا۔ بچہ سوچ
میں بڑ گیا۔ اس نے مزید ہنسی دی۔

”ان کی طبیعت خراب تھی۔ میں ہی انہیں ڈاکٹر
کے پاس لے کر گیا تھا اب کیسی ہیں وہ؟“ ساتھ ہی
ہمدردانہ لہجے میں خیریت بھی پوچھ ڈالی گویا صرف یہی
فکر ہوا۔

”اوہ اچھا اچھا آپ کہیں دادی کی بات تو نہیں کر
رہے۔ پر وہ مہمان کب ہیں۔ وہ تو ہمارے گھر میں ہی
رہتی ہیں۔ اور ہر روز ان کی طبیعت بھی خراب رہتی
ہے امی تو کہتی ہیں وہ نخرے کرتی ہیں۔ اچھی بھلی ہنسی
کٹی ہیں۔ بس انہیں عادت ہے دوسروں کے سامنے
میری امی کو برا بنوانے کی۔“

”اف میں تیری دادی کی نہیں کسی اور کی بات کر
رہا ہوں اور تم مجھے کیا قصے سنانے لگے۔ چلو چپ کر
کے ناشتا کرو۔“ بازل کا جی چاہا اپنے ہی بال نوچ لے
انتہائی نالائق بچہ تھا یہ تو۔ لسی کا گلاس اٹھا کر اس نے
منہ کو لگایا جبکہ بچے کا منہ کھل گیا اتنی بے مروتی۔

”چل بے چھوٹو کاؤنٹر سے جا کر ناشتا لے اور ادھر
نیمبل پر جا کر بیٹھ اور ہاں جاتے ہوئے وہی لیتے جانا
دادی نے منگوایا ہے پنچا دینا ان تک سمجھا۔“ پاسو
بھائی نے اس کا سر ٹھپٹھا کر ادھر دوڑایا اور کرسی کھینچ
کر بیٹھ گئے۔

”تم کیا معلومات لے رہے تھے اس سے؟“

جانچتے وہ پلٹ کر کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئے۔ وہ جو شو پیپر
سے ہونٹ تھپتھپا رہا تھا خواہ مخواہ پورے منہ پر پھیر گیا۔
اف یہ پاسو بھائی بھی ناں کبھی کبھی ”اباجان“ ہی
لگنے لگتے ہیں۔ وہ سر جھٹک کر بقیہ ناشتے کی جانب
متوجہ ہوا۔ مگر براہو اس ٹوں ٹوں کا جوان کی جیب میں
ہو رہی تھی۔ تارونے دیکھا بھی ہو گا کہ اس پر کیا ہتی
ہے مگر پھر بھی۔ وہ سخت بد مزہ ہوا۔

”چاچے پاسو سے میں لے کر آؤں آپ کا موبائل
اگلی میز پر بیٹھا گھلو سامنا اٹھ کر اس کے پاس آ
گیا۔ وہ کھڑکی کو گھورنے میں مشغول تھا۔ چونک کر
اسے دیکھا نیکر شرٹ میں ملبوس گورا چٹا موٹو سا بچہ
جس کی آنکھوں سے ہی سمجھ داری ٹکی پڑ رہی تھی اور
وہ اسے پہچان بھی گیا۔ اس کے دیکھے بھالے نقش
ارے یہ تو شگوخالہ کا پوتا ہے۔

اور اس نسبت نے اسے کچھ اور بھی یاد کروا دیا۔
عمومی طور پر بچوں سے وہ اخلاقیات نبھانے کا عادی
نہیں تھا مگر اب یک لخت ہی ہو گیا اتنا بیٹھا جیسے جلیبی۔
”ارے نہیں یار! وہ ان کے پاس بیلنس نہیں تھا
انہوں نے ایک ضروری کال کرنی تھی بس ابھی واپس
کرویں گے۔“

”اچھا۔“ اور وہ بچہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر یوں ہنسا جیسے
اس کا جھوٹ پکڑ لیا ہو۔ بازل نے بغور اسے دیکھا۔
”اور یہ تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو اسکول
نہیں گئے۔ کس کلاس میں پڑھتے ہو ناشتا کرو گے؟“
اس نے خود پر سے اس کا دھیان ہٹانا چاہا اور کامیاب
رہا۔ بچے نے منہ بسورا۔

”اف۔ اتنے سارے سوال ایک ساتھ۔ آپ تو
مجھے ٹیچر لگ رہے ہو اور آپ کو یہ نہیں پتا کہ ایگزام ہو
چکے ہیں۔ اب جب نیو بکس ملیں گی تو ہی اسکول جاؤں
گاناں اور ہاں ناشتا تو میں ضرور کروں گا۔ مجھے یہاں کی
حلوہ پوری بہت پسند ہے اور ادھر ہی بیٹھ کر اکیلے کھانا
اچھا لگتا ہے گھر لے کر جاؤ تو سارے ہی چپک جاتے
ہیں۔ کچھ بھی حصے میں نہیں آتا۔

اف اس چھٹکو کی باتیں بازل نے ہنستے ہوئے اسے

READING
Section

”چاہے تو آج ہی اٹھالیں، وہ تو بالکل تیار ہے۔ بس ٹھیکے دار تھوڑا ٹائم مانگ رہا ہے پھر میں بھی اس کے پیچھے اس لیے نہیں جا رہا کہ تمہارے رکے ہوئے کام ہو جائیں تو پھر اسے چاہے تو میں کان سے بھی پکڑ کر لے آؤں۔“

”ہوں بس دعا کریں کمیٹی تو پکی اپنی ہے۔ لون بھی ساتھ ہی مل جائے تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہے گا۔ میں نے کہا تھا باس سے متب تو حامی بھری تھی اب یہ ہے کہ ٹال مٹول نہ کرے۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ پاسو بھائی نے اس کا ہاتھ تھپکا۔

مین روڈ پر چوک کے بالکل سامنے کارنر پلاٹ پر واقع یہ چھوٹا سا ہوٹل جسے ڈھابہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا، باسٹ کو باپ سے وراثت میں ملا تھا اور جسے اب برہا کر ایک خوب صورت ریسٹورنٹ کی شکل میں ڈھالنا ان کا اولین خواب تھا اور اب تو ان کے خواب میں بازل بھی حصے دار بن چکا تھا۔ اپنے باپ دادا کی وراثت سے تو وہ کوئی فائدہ اٹھا نہیں سکا تھا اپنی نالا لقی کے ہاتھوں اور کچھ اس کامزاج ہی نہ تھا اس طرف مگر جب سے اس نے ہیرا گیری شروع کی تھی (حالانکہ یہ بھی اس کامزاج نہ تھا) مگر تب سے ہی اس کے دل میں لگن لگ گئی تھی کہ دو سروں کی چاکری کرنے سے بہتر ہے اپنا کاروبار شروع کیا جائے۔

اور اس کی گڈ لک کہ باسٹ کا ساتھ مل گیا۔ انہوں نے خود اسے آفر کی بلکہ اس کا ذہن انہوں نے ہی اس طرف لگایا۔ اکیلے تو وہ بھی اپنے خواب کو شرمندہ تعبیر نہیں کر سکتے تھے اور بغیر کسی تجربے اور بڑے سرمائے کے وہ بھی کوئی بزنس اسٹیبلشمنٹ نہیں کر سکتا تھا۔ سو دونوں نے مل کر کام کرنے کی ٹھانی۔ گھر میں تو وہ اپنی کمائی کا ایک آنہ نہیں دیتا تھا۔ وہ اپنی ٹپ ٹاپ پر خرچ کرتا تھا یا صرف موج مستی پر مگر اب وہ کچھ عرصہ سے سیونگ کر رہا تھا لیکن سب مل ملا کر بھی اتنے نہیں ہو پا رہے تھے کہ اپنے خوابوں جیسا ریسٹورنٹ بن پائے۔ اباجی نے تو ویسے ہی ایک روپیہ بھی دینے سے انکار کر

”کچھ نہیں بس ویسے ہی۔“ بازل نے جھپٹ کر سیل فون قابو کیا جو ابھی انہوں نے ٹیبل پر رکھا تھا اور وہ اتنی تیزی پر چڑھی گئے۔

”توبہ ہے بھئی اتنی فکر تو آج کل کے بچے اپنے ماں باپ یا کسی کتاب کی نہیں کرتے جتنا اس چارپانچ انچ کے آلے کی کرتے ہیں۔ ماں آوازیں دے دے کر ہلکان ہو جائے۔ مگر اس کی ایک ٹوں ٹوں ٹانگوں کے سارے بل کس بل کھول دیتی ہے پوں لیکتے ہیں کہ اگر ایک لمحہ کی بھی دیر ہو گئی تو کہیں کوئی گناہ کبیرہ درج ہو جائے گا۔ کتاب سارا سال بند پڑی رہے یہ بد بخت ایک پل کے لیے بھی بند نہ ہو استغفار ہے بھئی استغفار“ آوے کا آواہی بگڑا ہوا ہے۔ ”پاسو بھائی سخت کبیرہ خاطر نظر آ رہے تھے۔ وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس دیا۔

”اور ایک ہم جیسے بھی شوہر حضرات ہیں جن کی کوشش ہوتی ہے کہ یہ منحوس بند ہی رہے۔ گھر میں تو بیویاں ہر منٹ بعد اک نئی فرمائش کر کے جان کلساتی ہی ہیں اور اگر جو گھر سے نکل آو تو بھی خلاصی نہیں، اس کم بخت کی گھنٹی بج جاتی ہے کوئی نیا فتنہ اٹھانے کو۔ میرا توجی چاہتا ہے اسے تو دیوار پر دے ماروں اس کے موجد سمیت۔“

”اوہو ہو، لگتا ہے بھا بھئی نے پھر کوئی زبردست سی فرمائش کر ڈالی ہے۔ ویسے اب کیا آرڈر کر دیا انہوں نے۔“

”اس کے آرڈر تو چلتے ہی رہتے ہیں ان کو گولی مارو۔ تم یہ بتاؤ تمہاری بات ہوئی اپنے پاس سے مل جائے گا تمہیں لون اور کمیٹی کے لیے اگلے ماہ کا کہا تھا کریم صاحب نے دس دن رہ گئے ہیں مہینہ ختم ہونے میں۔ تمہیں جانا چاہیے یا دوہانی کے لیے ان کے پاس۔“ وہ سب باتیں بھول بھال ایک دم سے سنجیدہ موضوع پر آگئے اس نے سر ہلایا۔

”جی، جی بس آج کل میں جاتا ہوں، اچھا ہوا آپ نے یاد کروا دیا اور آپ اپنے کام کی پروگریس بتائیں۔ آرڈر کٹ سے ملے؟ کب دے رہا ہے ہمیں“ نقشہ

دیا تھا۔ ان کے خیال میں اس کی یہ سب پلاننگ سراسر فضول تھی۔ تنگ آکر اس نے قرض لینے کا سوچا۔ اب امید واثق تھی کہ ہر کام بہتر ہو جائے گا۔

”یار ایک برا بلیم ہو گئی ہے۔“ باسٹ بھائی بولے۔
 ”کیسی برا بلیم“ میل فون پر پھر ٹوں ٹوں ہوئی تھی۔
 وہ دھیان ہٹا کر ان کی جانب متوجہ ہوا۔

”یار! گھر کا حصہ بھی ریستورنٹ میں شامل کرنا ہے تو پہلے اسے گرانا پڑے گا۔ میں نے سوچا تھا کہیں اور جانے سے بہتر ہے اپنے ہی محلے میں شگفتہ خالہ کے دو کمرے کرائے پر لے لیں گے رہائش کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ کل تیری بھابھی کو اسی لیے بھیجا تھا وہاں کہ خالہ سے بات کر آئے مگر وہاں جا کر بتا چلا کہ خالہ نے تو کسی ماں بیٹی کو چپ چپاتے ہی وہ پورشن کرائے پر دے دیا ہے۔ حد ہو گئی نہ محلے میں کسی کو خبر ہوئی نہ کوئی ان کا سامان آیا۔ اللہ جانے اچانک کہاں سے ٹپک پڑی ہیں یہ ماں بیٹی بھی۔“ وہ اپنی جگہ پریشان تھے اور ان کی پریشانی نے اس کی حیرانی حتم کر ڈالی۔ وہ تو تب سے سوچ میں پڑا تھا کہ اگر بقول منے کے ان کے گھر کئی دنوں سے مہمان نہیں آئے تو پھر وہ کون تھیں؟

”یعنی اب وہ یہیں رہے گی ہمارے محلے میں گھر کے سامنے اوہ۔“ سارے حساب کتاب سب پریشانیاں بھول کر اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ باسٹ بھائی کیا کہہ رہے ہیں کیا بتا رہے ہیں اسے اب کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔



اور یہ ٹھیک اس کے تین دن بعد کی بات ہے جب وہ سہ پہر میں ڈیوٹی آف کر کے آ رہا تھا چوک کاموڑ مڑتے اس نے چنگ جی سے خالہ شگو اور ان کے ساتھ پردہ دار حسینہ کی والدہ کو اترتے دیکھا دونوں کے پاس خوب سارے شاربز تھے لگتا تھا ڈھیر ساری شاپنگ کر کے آرہی ہیں۔ چنگ جی والا تو انہیں اتار کر چلا گیا تھا اب آگے گھر تک انہوں نے یقیناً ”پیدل جانا تھا۔ اتنے سامان کے ساتھ وہ دونوں معمر خواتین کیسے جائیں

گی۔
 اب وہ اتنا بھی بر خوردار نہیں تھا کہ ہر بزرگ کو مشکل میں دیکھ کے لپک پڑتا ہو حالانکہ اس وقت اس سڑک پر اور بھی کئی ایسے تھے جنہیں مدد کی ضرورت تھی۔ مگر وہ سیدھا ہائیک ان ہی کے سامنے لے آیا۔
 ”کیسی ہیں خالہ کدھر سے آرہی ہیں۔ لگتا ہے سارا بازار ہی اٹھالائی ہیں۔“ سلام کے بعد وہ بڑے خوش گو اربجے میں بولا۔

”ارے سارا بازار کہاں سے بچے بس مہینہ بھر کا راشن لیا ہے اور کچھ برتن وغیرہ اور یہ بھی سب میں نے نہیں بہن ذکیہ نے خریداری کی ہے۔“ شگو خالہ نے تفصیل سے بتایا جبکہ بہن ذکیہ اسے بغور دیکھتی پہچاننے کی سعی کر رہی تھیں اور آخر کار ان کی یادداشت کام کر ہی گئی۔

”ارے بیٹا آپ وہی ہونا جو اس رات مجھے کلینک تک لے گئے تھے۔ انوہ دیکھو اس روز تو ایسی آفت پڑی تھی تم سے نام بھی نہ پوچھا۔ کیسے ہو بیٹا؟“ اور وہ خوشی سے پھولانہ سما یا یعنی نیکی رائیگاں نہیں گئی تھی۔ اس نے خیریت بتاتے ساتھ ہی سارا سامان اٹھا کر ہائیک پر دھر لیا جبکہ شگو خالہ بہن ذکیہ سے اس کی نیکی اور شرافت کے وہ قصے کہہ رہی تھیں جن کے بارے وہ خود بھی بے خبر تھا اور انہیں خراماں خراماں چلتا چھوڑ کر وہ ہائیک دوڑاتا پل میں مطلوبہ مکان کے آگے آن کھڑا ہوا اس خواہش کے ساتھ کہ یا اللہ دروازہ وہی پردہ نشیں کھولے۔

وہ متحیر سا اس مقبول ساعت کے حصار میں گھر اس سفید کبوتر سے ہاتھ کو دیکھ رہا تھا جس کی مخروطی انگلیوں کی پوروں پر بے شفاف ناخن کسی بھی پالش سے بے نیاز یوں دمک رہے تھے جیسے دھوپ میں رکھا موتی۔
 اور سماعت وہ سحر آفریں لفظوں کے موتی چن رہی تھی جو لگتا تھا کسی مندر کی گھنٹی کے بجنے سے ہر سو بکھرتے چلے جا رہے ہیں۔ چند لمحے تو وہ کسی اور ہی دنیا میں کھو گیا۔ پھر یکدم جو اس بحال ہوئے۔
 ”جی یہ آپ کا سامان شگو خالہ نے بھیجا ہے۔“ وہ

شارپ بائیک سے اتارنے لگا۔

”اور وہ خود کہاں ہیں؟“ پر وہ نشیں محتاط لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

”وہ بھی آرہی ہیں بلکہ وہ لیجے آگئی ہیں۔“

”آئے اللہ بھلا کرے یہ سب اندر بھی پہنچا دو۔ ہم بڑھیوں سے کہاں اٹھایا جائے گا لے آؤ آجاؤ آجاؤ اندر۔“ شگو خالہ نے بڑھ کر پورا دروازہ کھول دیا۔ وہ پری جھٹ غائب ہوئی۔ سبائل کو اس کے دوپٹے کی جھلک دیکھنا ہی نصیب ہوئی جو بائیں دروازے میں غراب سے گم ہوا تھا۔ وہ بے اختیار اک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا۔ سب سامان ٹھکانے لگانے کے بعد وہ نامراد سا پلٹنے کو تھا کہ خالہ نے پکڑ کر بٹھالیا۔ ذکیہ خاتون نماز کے لیے جا چکی تھیں۔

”زمامہ بیٹا! دو کپ اچھی سی چائے تو بنا کر لاؤ۔“ خالہ نے وہیں بیٹھے آرڈر پاس کیا تھا اور بھلا یہاں زمامہ اس کے علاوہ اور کون ہو سکتی تھی۔ زمامہ! واہ کتنا پیارا نام ہے منہ میں شکر سی گھل گئی تھی جیسے۔

شگو خالہ سب کا حال احوال لے رہی تھیں۔ پھر انہوں نے خود ہی تذکرہ چھیڑ دیا اپنی نئی کرایہ دار کا۔

”ارے یہ ذکیہ میری چچیری بہن کی منڈ کی منڈ ہے۔ (اف اتنا جھلک رشتہ) اسے سن کر چکر سا ہی آگیا اور جب پوری داستان سنی تو۔

”آئے ہائے اللہ کسی کی ایسی قسمت نہ بنائے بہت مظلوم ہے بے چاری اتنا روپیہ پیسہ ہونے کے باوجود بے گھر ہونا پڑا غریب کو وہ بھی سکے بیٹوں کے ہاتھوں۔ خدا ایسی نالائق، ناہنجار اولاد کسی دشمن کو بھی نہ دے۔ ایسی دولت جائیداد کو آگ لگے جو زندگی کا سارا سکھ ہی لے لے۔

پہلے تو اس جائیداد نے سر کا سائیں چھینا۔ بیٹے آپس میں لڑ پڑے اور باپ سے تقاضا کرنے لگے کہ ہمیں کاروبار میں سے ہمارا حصہ دو اور ساری جائیداد میں سے بھی بس باپ کو تو یہی صدمہ لے ڈوبا۔ بے چارا بہت نیک نفس انسان تھا جوان بیٹوں کی منہ زوری برداشت ہی نہ کر سکا جان ہار گیا اور وہ دونوں

بد بخت باپ کی جان لے کر بھی نہ ٹلے۔ ساری جائیداد آپس میں بانٹ کر ماں بہن کو گھریا کر دیا۔ ہائے ہائے ایسا ظلم، ایسا قہر، کیسا زمانہ آگیا ہے۔ خون سفید تو کیا کالے بڑگئے ہیں، دیدوں کا پانی مر گیا ہے۔ وہ تو شکر ہے باپ نے زندگی میں ہی بیٹی کے نام بینک میں خاصی رقم رکھوا دی تھی کچھ ذکیہ بہن کی اپنی بچت ہے جو وہ عزت سے زندگی کے چار دن پورے کر لیں گی۔

اللہ ایسے ذلت کے دن بھی کسی کو نہ دکھائے۔ راتوں کی نیند حرام ہے بے چاری کی جوان جہان بچی کی ذمہ داری روتی ہیں کہ کیسے پوری ہوگی۔ پر ایک بات ہے ماشاء اللہ خوب صورت، سکھڑ، سلیقہ شعار بچی ہے ہماری میں نے تو کہا ہے ذکیہ بہن سے بس بیٹی کے ہاتھ پیلے کر دو اور خود سکون سے رہو۔ اللہ نے چاہا تو ضرور اچھا بر مل جائے گا میں تو اب اسی کوشش میں ہوں۔ ایک دو جگہ رشتہ کے لیے کہا ہے۔

بیٹا، تمہاری بھی اتنی اچھی نوکری ہے۔ اچھے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہے۔ کوئی اچھا سا لڑکا نظر میں ہو تو بتانا۔“ وہ اس سے کہہ رہی تھیں اور اس سے تو سر بھی نہ ہلایا گیا۔

اف ایسے پیارے لوگ اور ان پر تقدیر کے کیسے کیسے تم وہ حقیقتاً بہت دکھی ہو اتنا سب سن کر۔ ذکیہ خاتون چائے لے آئی تھیں۔ جو اس نے بہت عقیدت سے نوش جاں کی۔ اس تصور کے ساتھ کہ کتنے خوب صورت ہاتھوں نے خاص اس کے لیے کتنے چاؤ سے چائے بنائی ہے۔ ویسے حد ہوتی ہے ناں خوش قسمی کی بھی۔



”تمہارے ابا اور میں آج گئے تھے جلال کی طرف۔“ وہ بہت انہماک سے ”عزیزی“ کی لن ترانیاں سن رہا تھا کہ امی نے اس کے آگے سے کھانے کے برتن سمیٹتے ہوئے بتایا۔ اور یہ بات تو اسے شام میں نازو نے بھی بتائی تھی۔ کچھ دنوں سے وہ اسے کبھی ”صبح بخیر“ تو کبھی ”شب بخیر“ کے ایس ایم ایس کرنے

گئی تھی اور جب وہ اپنی اتنی ٹف روٹین میں سے وقت نکال کر اسے یاد کرتی تھی تو اس کا بھی فرض بنتا تھا۔ پھر جب اتنے بے شمار دل رکھتا تھا ۴ نہیں خوش کرتا تھا تو جس کو تمام عمر خوش رکھنے کی ذمہ داری اٹھانی تھی اس کو ابھی سے کیوں نہیں۔ سو یہی سوچ کر وہ اس کے ساتھ روار کھی سابقہ روش سے ذرا ہٹ گیا تھا۔

مگر نازو کے بتانے اور اب امی کے اطلاعی انداز میں کچھ فرق تھا۔ پروگرام میں در آتے وقت نے اس کا دھیان ہٹایا۔ امی برتن کچن میں پہنچا کرواپس آرہی تھیں اور ان کے چہرے پر غیر معمولی کیفیت رقم تھی۔ گزشتہ دنوں عمارہ کے لیے بہت اچھا رشتہ آیا تھا جسے ضروری چھان پھٹک کے بعد منظور کر لیا گیا تھا اور اب ان لوگوں کی طرف سے منگنی کا اصرار تھا اور اباجی کی خواہش تھی کہ اس کی اور نازو کی منگنی بھی ساتھ ہی کر دی جائے اور چھ ماہ بعد اکھٹی شادی۔ تب تک کہ نازو کی تعلیم بھی مکمل ہو جاتی۔ آج شام کا چچا کے ہاں جانا خاص اس حوالے سے تھا۔ امی اس کے برابر صوفے پر آکر بیٹھیں تو اس نے استفہامیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”ہیلے تو تمہاری چاچی نے سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا مگر جلال نے تو صاف کہہ دیا اسے تمہاری نوکری پر اعتراض ہے۔ وہ لوگوں کو کیا بتائے گا کیا کرتا ہے اس کا داماد اور نازو کے مقابلے میں تمہاری تعلیم بھی کم ہے۔“

”ہیں۔“ امی کے الفاظ تھے یا جلتی تیلی جو سیدھی اس کی عزت نفس کو آکے لگی تھی۔

”میری تعلیم کم ہے بہت خوب! یہ اب یاد آیا انہیں اور میری نوکری پر کس بات کا اعتراض ٹھیک ٹھاک کماٹی ہے میری اور آپ نے بتایا نہیں کہ یہ نوکری تو بس اب عارضی ہے ان شاء اللہ بہت جلد میرا اپنا ہوٹل ہوگا۔“

”بتایا تھا۔ اسے تو اس بات پر بھی اعتراض ہے کہ تم باسط کے ساتھ مل کے کاروبار کرو۔ وہ حدی پشتی ناٹی۔ باب اس کا پورے محلے کی خوشی ملی پر دیکھیں پکا نارہا۔“

ساری دنیا جانتی ہے۔ اب تم اپنے باپ دادا کا سب چھوڑ کر اس کا اپنا رہے ہو۔ وہ تو اس بات پر بھی خفا ہے کہتا ہے کوئی اور کام کرے بازل۔“

”ارے واہ یہ چچا جلال الدین“ چچا اعتراض الدین “ کب سے ہو گئے اور وہ بھی سارے کے سارے اعتراض مجھ پر کمال ہے بھئی۔ جو کام مجھے آسان لگ رہا ہے۔ سمجھ میں آ رہا ہے جس کا میں تجربہ کر چکا ہوں میں وہی کام کروں گا ناں اور پھر اچھے اور حلال طریقے سے کما رہا ہوں کوئی چوری چکاری نہیں کر رہا نہ کوئی فراڈ اور پھر انہوں نے خود بھی تو باپ دادا کا سب چھوڑ کر دوسرا اپنا لیا اور وہ بھی جس میں نری بے ایمانی کر رہے ہیں۔ اس پر تو کوئی دکھ تکلیف نہیں تو اب میری بار کیوں۔“ وہ بری طرح بھڑکا۔

”ارے بھئی میں کیا جانوں یہ تو جب سال ڈیڑھ سال پہلے تیرے ابا نے پہلی بار یہ بات کی تھی تب ہی مجھے اس کے تیور ٹھیک نہیں لگے تھے مشکل ہی ہے کہ وہ اس بات پر راضی ہو۔ یونہی آنے بہانے کر کے ٹالے گا۔“ امی نے اپنا تجزیہ بیان کیا۔

”اچھا۔ تو کیا انہوں نے بیٹی سے نہیں پوچھا؟“ اس کے لبوں پر استہزائیہ مسکان آٹھری۔

”کیا مطلب؟“ انہوں نے بھنویں اچکا کر اسے دیکھا۔

”بھئی ان کی بیٹی تو بالکل راضی ہے اسے تو کوئی اعتراض نہیں مجھ سے شادی پر۔ وہ تو مجھ سے فون پر باتیں بھی کرتی ہے سارا سارا دن ٹیکسٹ بھی کرتی رہتی ہے۔ اسے تو مجھ میں کوئی کمی نظر نہیں آتی نہ اس نے کبھی ایسی کوئی بات کی۔ چچا پہلے اس سے تو پوچھ لیتے پھر کوئی اعتراض اٹھاتے۔“ پر کا کوایتا ہوئے اس نے صوفے سے ٹیک لگائی۔ انداز میں اتر اٹھ نہلیاں تھی۔

”بہت خوب! اگر وہ تم سے فون پر بات کر لیتی ہے اور سارا دن بقول تمہارے ٹیکسٹ بھی کرتی ہے تو کیا تمہیں زیب دیتا ہے کہ تم بھری محفل میں بیٹھ کر اتنے فخر سے یہ بات کہو۔“ حکیم اظہار الدین جانے کب

تم میں کیا گن ہیں؟ گنواؤ ناؤ آج مجھے بھی۔ ”وہ تو اتنے تیخ پا ہوئے کہ باقاعدہ حساب کتاب پر اتر آئے۔ ”مم میں نے ایسا بھی کیا غلط کہہ دیا اباجی؟ برائی تو مجھ میں بھی کوئی نہیں ہے۔ کسی غلط چیز کو ہاتھ نہیں لگایا آج تک، کسی بری صحبت میں نہیں ہوں۔ نکھٹو نکما نہیں ہوں اپنا کما بھی رہا ہوں۔ پھر بھی آپ کو شکایتیں ہیں مجھ سے۔“ اس نے تو منمننا کر اپنی صفیں بیان کی تھیں اور یہی غضب ہو گیا پھر تو حکیم صاحب نے وہ لے لے لیے کہ اللہ کی پناہ۔ سب اگلے پچھلے کھاتے کھول دیے۔ پورا گھر اس کی عزت افزائی کا تماشا دیکھ رہا تھا اور یہ آج کوئی پہلی بار نہیں تھا مگر ہر بار تو وجہ صرف اسی کی ذات ہوتی تھی اور آج وجوہات کی نوعیت بہت مختلف تھی جو اس سے بھی برداشت نہ ہوئیں۔

”ہاں تو اباجی میں کیا جھوٹ بول رہا ہوں۔ مجھے کیا ضرورت ہے ایسی بڑمارنے کی، آپ چاہیں تو میرا فون چیک کر لیں۔“

ان کی نظروں سے خائف ہوتا خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے وہ ایک انتہائی احمقانہ بات کہہ گیا۔

”بھجھ تو تب آئی جب انہوں نے ہاتھ بڑھایا۔“

”لاؤ دو۔“ مطلب وہ سیل فون مانگ رہے تھے۔

”نہیں۔“ اک پل کو تو جو اس ہی پر پھیلا کر جانے لگے مگر فٹ سے قابو کیا۔

”وہ وہ میرا مطلب ہے پھر چیک کر لیجئے گا ابھی فون کی بیٹری ختم ہے۔“ وہ بری طرح ہکھلایا۔ شکر ہے جلدی سے بہانہ سوچھ گیا وگرنہ آج تو ان کی طرف سے سو جوتے لگے تھے۔

”بیٹری فون کی نہیں تمہارے دماغ کی ختم ہے۔“

نالائق ناہنجار، بے ہدایت انسان، شرم نہیں آئی تمہیں یہ بات کرتے ہوئے۔ وہ لڑکی کون ہے پتا ہے ناں تمہیں؟“ وہ چلائے تھے۔ اس نے تابعدار نہ کیے کی طرح جھٹ سے سر ہلایا۔

”خاک پتا ہے اگر پتا ہوتا تو یہ بات ہرگز نہ کرتے۔“

قرخدا کا پرانی بچیوں کو ورغلا کر اس راہ پر لاتے تم لوگ خود ہو پھر بھرے بازار میں بیٹھ کر قصہ خوانی بھی کرتے ہو۔ تف سے تمہاری اس جوانی پر جس میں غیرت نام کو نہیں اور مجھے پورا یقین ہے کہ تم نے اپنے جیسے آوارہ اور ناخلف لڑکوں میں بیٹھ کر یہ بات اسی زعم سے کہی ہوگی۔ نیکی کا کوئی کام لے لے نہیں تم جیسوں کے، بس آ جا کر یہی ایک بد معاشی رہ گئی ہے جس کا پرچار کرتے پھرتے ہو۔

کل کو وہ لڑکی بیوی بن جائے گی تو کیا پھر بھی یونہی باتیں پھیلاتے پھوگے اس کی۔ اگر آج چار لوگوں کے بیچ بد خوئی کرو گے تو کل کون عزت کرے گا۔ کس کی زبان پکڑو گے تب۔ دنیا کی سدھر جاؤ۔ جلال کے سارے اعتراضات درست ہیں۔ میری نگاہ میں چاند سی بیٹی ہے اس کی ہمہ صفت، نیک، تمیز دار، با علم، با

چچا کے تیور تو اسے شروع سے ہی ٹھیک نہیں لگ رہے تھے جب بھی ملتے ایسی نظروں سے کھو جتے کہ وہ دنوں کھولتا رہتا۔

اسے اس رشتے میں صرف اس لیے دلچسپی تھی کہ نازو سیدھی سادی پڑھا کو قسم کی لڑکی تھی جسے وہ بچپن سے جانتا تھا پھر اس شادی سے اباجی کے تمام گلے شکوے بھی دور ہو جاتے۔ برخوردار، فرمانبرداری کا تمنہ الگ سے ملتا۔ مگر اب اتنی باتوں کے بعد کیا ثابت کرنا چاہ رہے تھے اگر رشتہ ہو بھی جائے تو اس کے دل سے یہ باتیں نہیں جائیں گی تو بہتر ہے کہ یہ فیصلہ کیا ہی نہ جائے اس لیے اس نے اس رشتے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ ایک خوب رو، کماؤ نوجوان تھا اسے بھلا رشتوں کی کیا کمی اور یہ اس کا ذاتی خیال تھا جس سے حکیم صاحب کا متفق ہونا ضروری نہ تھا اور وہ ہوئے بھی نہیں۔ وہ غصے سے کھولتے کف اڑاتے مسلسل اس کی شان میں بیان دیتے رہے۔ پھر تو اس نے بھی بد تمیزی کے گزشتہ تمام ریکارڈ توڑتے ہوئے کہہ ڈالا۔

”اب میں آپ کو چند ہی دنوں میں اپنے لیے نازو سے بہتر لڑکی ڈھونڈ کر دکھاؤں گا۔“ وہ چیلنج تو کر آیا مگر

ہی رات گھٹنے ٹیک دیے جائیں تو وہ سر چڑھ کر اگلے کو اپنی انگلیوں پر نچاتی ہے۔ ”اور وہ نہیں چاہتا تھا کل کو ساری دنیا اسے کاٹھ کا الو کے نام سے یاد کرے اس کا ماننا تھا کہ مرد کو مرد ہی نظر آنا چاہیے۔“

”تمہاری آنکھیں مجھے کچھ دیکھی دیکھی سی لگ رہی ہیں۔ ارے ہاں یاد آیا میری ایک کلوز فرینڈ ہے نتاشا اس سے بہت مل رہی ہیں۔“

”اگر بیوی کو شروع سے ہی قابو میں رکھنا ہو تو کبھی اس کی تعریف ڈائریکٹ مت کرو“ یہ سنہری قول باسط بھائی کا تھا جسے اس نے بہت احتیاط سے جیب میں ڈال لیا تھا اور وہ اب یہی صفحہ کھول کر بیٹھ گیا۔ مدح سرائی تو کی مگر کسی نہ کسی کے لیے ڈال کر۔ ”تمہاری منہ دکھائی، نازو نے پسند کیا تھا ساتھ جا کر اس کی چوائس بہت کمال کی ہے اور وہ خود بھی بڑی جی دار ہے۔ تمہیں پتا ہے کون ہے وہ؟“ اس کے گلے میں لاکٹ (یا پھندہ) ڈالتے ہوئے یہ تذکرہ بھی ضروری سمجھا۔ نہ صرف تذکرہ بلکہ پوری تاریخ بیان کر ڈالی۔ زمامہ بے چاری پوری آنکھیں کھولے کم صم سی بت بنی اپنی گود میں رکھے ہاتھوں کو ہی تکے جا رہی تھی۔ سرخ زرتار کپڑوں پر بڑے سرخ ہی مہندی سے بچے وہ خوب صورت و دل فریب ہاتھ جنہیں بے اختیار چھونے کو دل مچل رہا تھا مگر وہ صبر سے تقریر جھاڑے گیا اور جب کوئی سر نیہوڑائے نہایت عقیدت سے آپ کے ارشادات سنے تو پھر جوش بیان کا برہہ جانا کوئی اچھے کی بات نہیں باذل کو بھی یہی معاملہ درپیش تھا۔ وہ پہلی ہی رات بیوی پر کچھ ایسی دھاک بٹھا دینا چاہتا تھا کہ وہ باقی ساری زندگی اس کے سامنے چوں بھی نہ کر سکے۔



اور پھر زندگی ایک دم سے بہت خوب صورت اور رواں دواں ہو گئی تھی۔ اس کی نوکری سخت تھی۔ ڈیوٹی کے اوقات بدلتے رہتے تھے پھر جو وقت ملتا وہ ریسٹورنٹ کے کام کو دیکھ لیتا۔

صرف ٹھیکے دار پر چھوڑ کر نہیں بیٹھے تھے دونوں،

ساری رات کھڑکی میں کھڑے چاند کو تکتے تکتے گزر گئی۔

’ایسی اچھی لڑکی ملے گی کہاں سے؟ جبکہ وہ تو جتنی بھی لڑکیوں سے واقف تھا وہ تو۔‘

اور پھر جیسے دماغ میں اک کوندا سا پکاسا منے والے مکان کی کھڑکی پر نظر گئی تھی اور اسے اپنے سارے مسئلے حل ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔



اور جب قدرت مہربان ہوتی ہے تو راستے خود بخود صاف ہو جاتے ہیں۔

اباجی نے تو ویسے ہی اس کی ہر بات سے ہاتھ اٹھالیا تھا ان کے اس فیصلے سے منحرف ہو کر گویا اس نے ہر حد پار کر لی تھی۔ امی تو پہلے ہی دل سے راضی نہ تھیں۔ وہ قصہ تمام ہوا تو ہر مشرقی ماں کی طرح ان کے بھی چندے آفتاب مثل ماہتاب ”بہولانے کے ارمان جاگ اٹھے۔ لیکن باذل نے ان کی یہ مشکل یوں آسان کی کہ انہیں زمامہ کے متعلق بتایا اور وہ تو جب پہلی بار ہی اسے دیکھنے گئیں تو وہ اس طرح انہیں بھائی کہ پھر تو انہوں نے شگوار خالہ کی چوکھٹ کی مٹی لی اور من کی مراد لے کر ہی انہیں اور پھر نیک کام میں دیر کرنے کا کوئی جواز ہی نہیں رہ گیا تھا۔ کیونکہ ادھر سے ذکیہ خاتون کی خواہش بھی یہی تھی وہ بھی جلد از جلد اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا چاہتی تھیں۔ یوں حور شامل سا روپ لیے زمامہ بہت جلد ان کے آنگن میں بہار بن کر اتر آئی تھی۔

باذل کا سراٹھا ہوا تھا۔ اس نے جو کہا کر دکھایا تھا۔ نازو سے کہیں زیادہ خوب صورت کہیں زیادہ امیر خاندان کی بیٹی پڑھی لکھی، صوم صلوة کی پابند یا اخلاق با کردار وہ ہر خوبی سے مرصع تھی اور یہ خالص اس کی جو ہر شناس نگاہ کا چنا ہوا ہیرا تھا جس پر وہ بے پناہ مسرور تھا۔

اس کے دوستوں نے اسے سبق پڑھایا کہ اگر خوب صورت عورت کی خوب صورتی کے سامنے پہلی

کبھی باسٹو تو کبھی وہ خود دیکھ رکھ کر مانتا۔ اپنے ریٹورنٹ کا خواب بہت جلد تکمیل پا جائے گا۔ اب پوری امید تھی۔

زامہ سے شادی کا فیصلہ بہترین ثابت ہوا تھا اس کے لیے وہ جی بھر کر اپنے کندھے پھپکتا۔

بھلا نازو سے شادی کر کے کیا ملتا۔ بھئی صرف محبت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی۔ دنیا میں اور بہت سی ضرورتیں ہیں جن کے بغیر جینا کار و شوار ہو جاتا ہے۔ اب اس کی خوش قسمتی بلکہ اس کے خیال میں یہ اس کی دور اندیشی کا پھل تھا کہ زامہ نہ صرف اچھی بیوی کے معیار پر پوری اتری تھی بلکہ وہ مالی لحاظ سے بھی فائدے میں رہا تھا۔ ذکیہ خاتون نے سلامی میں ٹھیک ٹھاک رقم دی تھی اسے جس سے اس کے سارے رکے کام چل پڑے تھے لیکن اس سب کے بعد ایسا ہر گز نہیں تھا کہ وہ زامہ کے زیر احسان آگیا تھا۔ بیوی کی ہر چیز پر حق سمجھتے ہوئے وہ پورے استحقاق سے موج کر رہا تھا۔

زامہ شاید فطرتاً خاموش طبع تھی یا پھر شاید اس کا رویہ ایسا تھا کہ وہ یوں گپ چپ رہتی کہ اگر ذرا سے بھی ہونٹ ہلائے تو کوئی جرمانہ بھرنے پڑ جائے گا اور باذل کے لیے تو یہ بہت خوش آئند بات تھی کہ اس نے اس خوب صورت عورت کو کیسے اپنا تابعدار کر لیا ہے مجال ہے جو بے چاری پر بھی مار سکے۔ اس کے کسی حکم سے سر تابی ناممکن اور اسی خیال سے اس کا سینہ پھول جاتا جبکہ دوسری طرف اس کی یہ حد سے بڑھی ہوئی تابعداری ہی گھر والوں کو کھٹکی تھی۔

”آئے ہائے لڑکی ہے کہ مٹی کا مادھو۔“ اک دن تو امی نے باذل کو پکڑ ہی لیا۔ ابھی وہ تھکا ہارا باہر سے آکر بیٹھا تھا کہ وہ شروع ہو گئیں۔

”ارے اس کے سامنے تو بھینس کے آگے بین بجانے والی بات ہے جو بھی بولتے جاؤ اس کی بلا سے کوئی ہوں ہاں ہی نہیں کرتی۔ ٹھیک ہے ہمیں بھی اس کے حالات پر دکھ ہے پیچھے بہت صدمے دیکھ کر آئی ہے مگر اب ایسا بھی کیا کہ سوگ ہی ختم ہونے میں

نہیں آ رہا۔ نہ بولنا نہ ہنسنے کی ذیلی بیاہتا دلہن تو لگتی ہی نہیں۔ کوئی نہ کوئی آیا گیا ہی رہتا ہے گھر میں اور سب ملنے والوں نے یہ بات نوٹ کی ہے ارے سچ پوچھو تو اس کے یہ انداز دیکھ کر اسے کسی سے ملانے کو دل ہی نہیں کرتا میرا تو۔ نری شرمندگی لوگ سو سو سو کرتے ہیں پھر۔ اب کل کی ہی سن لو۔ عمارہ کی منہ آئی تھی جاتے ہوئے اتنی باتیں کر کے گئی ہے وہ کہ آپ کی بہو تو رو بوٹ لگتی ہے۔ ذرا بھی رونق نہیں اس کے چہرے پر یوں جیسے ڈری ہوئی ہو مسکراتے تو دیکھا نہیں اسے کیا۔ بہت دبا کے رکھا ہوا آپ سب نے باذل اتنا ظالم لگتا تو نہیں مگر اس کی بیوی گود دیکھ کر ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بہت رعب داب رکھتا ہے اس پر۔

اے لو عمت پوچھو اس کی باتیں سن کر کتنی سکی ہوئی۔ ارے بیٹی کی منہ تھی وہ میں تو اسے جھٹلا بھی نہ سکی۔ من من ہی کر سکی میں اس کے آگے۔ ذرا بتاؤ کہاں کہاں تک نہ بدنام ہو گئے ہم۔ وہ تو ہمیں ہی برا بنا گئی ناں اور جانے کہاں کہاں قصے سنائے گی وہ۔ اب اگر خدا نخواستہ کل کلاں کو انہوں نے میری بیٹی کے ساتھ کوئی بد سلوکی کی تو کیا کریں گے ہم لوگ؟ ہم تو ان کا منہ بھی نہیں توڑ سکیں گے۔ ان کی نظر میں چور جو ٹھہرے۔

کوئی کہتا ہے شکر کریں گوئی بہو ملی ہے۔ کسی کو وہ مظلوم لگتی ہے اور ہم ظالم جس کے جو جی میں آئے مزے سے کہہ کر چلنا بنتا ہے۔ ارے کس کس کی سنوں میں؟“ وہ سخت عاجز تھیں اور ماں کی دکھی داستان سن کر وہ کمرے میں آتے ہی پاروڈ بھرے غبارے کی طرح زامہ کے سر پر آکر پھٹا تھا۔

وہ بے چاری پورے انہماک سے اس کے کپڑے پر لیس کر رہی تھی۔ باذل نے ہاتھ پکڑ کر جھٹکے سے پھینچا۔

”کیا بات ہے؟ کیا سمجھتی ہو اپنے آپ کو بہت خوب صورت ہو۔ ارے تم سے زیادہ خوب صورت تو میری جیب میں پڑی رہتی ہیں۔ پتا نہیں کس بات کا

کندھے سے پکڑ کر ہلایا۔ آیا وہ ہے بھی یا نہیں۔ زمامہ نے پلکیں اٹھائیں۔ اف کیا تھا ان بھگی سرخ آنکھوں میں ایسا دکھ ایسی وحشت کہ اس کا دل ہول گیا۔ دیکھ کر بے اختیار اس کے ہاتھ زمامہ کے رخساروں پر ٹھہرے تھے اور وہ جو کب سے ضبط کے کڑے درد سہا رہی تھی اس کے ذرا سے التفات پر یوں بکھر کر روئی کہ باذل سے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

”مجھے معاف کر دیں۔ میں بہت بری ہوں۔ میں نے سب کا دل دکھایا ہے۔ مجھے معاف کر دیں۔ مجھے معاف کر دیں۔“ بلک بلک کر روتے ہوئے جھٹکتے لیتے ہچکیوں کے درمیان وہ ایک ہی گردان کیے جا رہی تھی۔

”اچھاناں بس کر اب چپ کر جاؤ۔“ باذل تو گھبرا گیا۔

وہ اس کی بیوی تھی اور بیوی بھی وہ جو کسی نعمت سے کم نہ ہو۔ اسے تو زمامہ سے اب تک کوئی شکایت نہ ہوئی تھی بلکہ اس کی خاموش طبیعت بے حد اچھی لگی تھی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتی کبھی اس کی ذاتیات میں دخل نہ دیتی۔ کھوج اس کی فطرت میں نہ تھی جیسا کہ عام بیویوں میں ہوتی ہے اور جو کہ اکثر ازواجی زندگی کو تلخ بنا دیتی ہے۔ وہ کب آتا ہے؟ کہاں جاتا ہے؟ کس سے ملتا ہے؟ فون پر بات کرتے اتنا خوش اخلاق کیوں ہو جاتا ہے؟ زمامہ نے ایک بار بھی اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اس کے خواجخواہ کے شوہرانہ رعب کو بھی وہ امرت کی طرح بے جاتی اور اس کی ان ہی خوبیوں نے باذل کے دل میں گھر کر لیا تھا اور صرف اس کی سیرت ہی نہیں اس کی من موہنی صورت بھی اسے پوری طرح اپنا اسیر کر چکی تھی اس لیے تو اب اس کے آنسو اس کے دل پر گر رہے تھے۔ باذل کو اپنا آپ ڈوبتا محسوس ہوا۔ بازوؤں کے گھیرے میں لیے وہ بہت محبت سے اس کی پشت سہلا رہا تھا۔ زمامہ کا دل قدرے ہلکا ہوا تو اپنی پوزیشن کا احساس بھی جاگا۔ جھینپ کر اس کے حصار سے نکلی سوہ اتنی تیزی پر مسکرا دیا۔

نخرہ ہے تمہیں۔ اپنے ان چار پیسوں کا؟ ارے میں اس سے زیادہ کما کر لٹا چکا ہوں۔“ اس نے خود ہی سوال خود ہی جواب کا سلسلہ شروع کیا پھر بے دریغ جو منہ میں آیا بولے چلا گیا۔

”سارے عاجز ہیں تمہارے رویے سے۔ ساری دنیا یتیم ہوتی ہے تم تہلی نہیں ہو دنیا میں۔ سارے دکھ بھول جاؤ۔ اب خدا نے ہر نعمت دے دی ہے، تمہارے مزاج پھر بھی ٹھکانے نہیں۔ گھر میں کوئی مہمان آجائے تو اس کے سامنے جاتے ہوئے نہ تھوڑا درست رکھا کرو۔ سارے لوگ باتیں کرنے لگے ہیں۔ تمہاری اس بارہ بجے والی شکل نے برا بنا دیا ہے ہمیں سارے خاندان میں“ آخر چاہتی کیا ہو تم۔ امی سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہیں۔ سمجھتی کیوں نہیں ہو تم؟

اور زمامہ اسے بولتے ادھر سے ادھر گھومتے ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔ اتنے تہک آمیز الفاظ اس کے سب سے گال سرخا سرخ ہو چکے تھے۔ زمردی آنکھوں میں میرچیں سی بھر رہی تھیں۔ زبان تو اس کے منہ میں بھی تھی مگر جانے کیوں وہ اسے اپنی صفائی کے لیے بھی استعمال کرنے سے گریزاں رہتی سر جھکا کر سنے لگی۔ باذل خوب بلکتا جھکتا اس کے کمزور وجود پر دھونس جمانا دھپ دھپ کرتا ٹیسرس پر جا بیٹھا۔ سیل فون نکال کر کانوں سے جوڑ لیا اور جانے کس سے ہنس ہنس کر باتیں مٹھارنے لگا۔

”کتنے بے حس اور بے درد ہوتے ہیں ناں ایسے مرد بھی جو زندگی کا ہر سکھ ہر آرام تو بیوی کے ہاتھوں پائیں مگر دل کسی اور کا بہلا میں۔ اس کی روح تک کو جھلسانے کے بعد وہ اپنے دل و دماغ کو تروتازہ کر کے واپس کمرے میں آیا تو زمامہ کو وہیں کھڑے پایا“ کسی پتھر لے بت کی طرح نصب“ جس کے منہ پر لگتا تھا کسی نے پانی میں گھول کر لال رنگ پھیر دیا ہو۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں سختی سے جکڑی ہوئی تھیں۔

”ہیں اب تک یہیں کھڑی ہو؟“ باذل حیران ہوا۔

گڈی پر چپٹ لگائی۔
”بہت بولنا آتا ہے تمہیں۔ وہ تارو اول درجے کی
جھوٹی شیخی خوری یونہی نمبر بنا رہی ہوگی سہیلی کے
سامنے۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے اسے ناشتے
بھجوانے کی اور آج کل تو ہوٹل بند پڑا ہے۔ کام ہو رہا
ہے وہاں اب دیکھیں کیا اس کا ابا پکا رہا ہے۔ بکو اس کرتی
ہے خوا مخواہ۔“ وہ تارو کے نیچے ادھیڑ رہا تھا مقصد زمامہ
کو جتانا مقصود تھا کہ وہ بہت سچا ہے۔

منے کو چپٹ ناگوار گزری تھی۔ وہ منہ پھلا کر کمرے
میں گھس گیا۔ ”تو یہ ہے آج کل نیچے فتنے ہیں نرے،
کیسے کیسے فسانے گھڑ لیتے ہیں۔ کتنا چالاک ہے یہ چٹکو
کیسے کہانیاں بنا رہا ہے۔ سب بکو اس کر رہا ہے تم اس
کی باتوں پر نہ جانا۔“ وہ زمامہ کا ہاتھ پکڑے اسے
وضاحتیں دے رہا تھا۔ وہ نری سے ہاتھ چھڑاتی یہ کہتی
اٹھ گئی۔

”میں دیکھوں امی اور کیا کر رہی ہیں۔“ اور وہ ابھی
سیڑھیوں تک بھی نہ پہنچی تھی کہ شکوہ خالہ آتی دکھائی
دیں۔ وہ وہیں ٹھہر گئی۔

”اوائے ماں صدقے۔ میری بچی زمامہ آئی ہے۔
بسم اللہ۔“ وہ جلدی جلدی اتریں گلے لگا کر سر ماتھا
چوما۔

”اور پتر کیسی ہے۔ بڑے دنوں منہ دکھایا۔ خوش تو
ہے نا اپنے گھر میں۔ کیوں باذل نے بچے ہماری بیٹی کا
خیال تو رکھتا ہے نا تو۔“ اس سے حال احوال لیتے وہ
باذل کی طرف بھی گھوم گئیں۔

”جی جی خالہ آپ کی بیٹی آپ کے سامنے ہے پوچھ
لیں اس سے۔“ اس نے دانت نکو سے پورے اعتماد
سے کہا۔ پہلے کی بات اور تھی اب تو وہ واقعی دل سے
زمامہ کو خوش رکھتا تھا اور زمامہ بے چاری تو تھی ہی ان
عورتوں میں سے جو گھرے اندھے کنوس جیسی ہوتی
ہیں جس کے اندر کچھ بھی پھینک دو اندر کوئی شور ہو تو
چاہے ہو مگر کمال حوصلہ ہوتا ہے کہ باہر کوئی آواز تو کیا
کوئی چھینٹ بھی نہیں آنے پائی۔ اور وہ خالہ کے کسی
سوال سے پہلے بول پڑی۔

پہلے کی سرخی کی نسبت اب رخساروں پر پھیلی لالی
اس کے روپ کو بہت نکھر اسارنگ دے رہی تھی۔
نرموی آنکھیں بھی دھل کر کالچ سی شفاف لودینے
لگیں۔ وہ اتنی پیاری لگی کہ باذل نے پھر بے ساختہ
ہاتھ بڑھا کر قریب کر لیا۔

”آج تم میرے سامنے آخری بار روئی ہو۔ آئندہ
میں تمہاری آنکھ میں آنسو نہ دیکھوں، سمجھیں تم۔“
یہ کیا تھا اس کے لہجے میں جس نے زمامہ کو اس قدر متحیر
کیا کہ وہ سراٹھا کر پوری آنکھیں کھولے اسے دیکھے گئی
اور اس کے اتنے مغموم و معصوم انداز نے باذل کو
شرمسار تو کیا مگر وہ ہنس دیا۔ اور اسے مزید تاکید
کرنے لگا جس سے اس کی تازہ تازہ محبت کا شیرہ ٹپک
رہا تھا مگر جس پر زمامہ کے ہونٹ مسکرا نہ سکے۔



”اور سنائیں باذل بھائی کب تک بن جائے گا آپ
کا ہوٹل؟“ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں گول سا چہرہ
رکھے وہ گہلو سامنا اس سے پوچھ رہا تھا۔

”کیوں بھئی تم نے وہاں مفت کے ناشتے اڑانے
ہیں۔“ باذل نے تو اس کا شوق دھیان میں رکھتے ہوئے
یونہی ہنس کر کہہ دیا تھا مگر منے کے جواب نے تو اس
کے توتے اڑا دیے وہ بھی عین زمامہ کے سامنے۔

”لڑکیوں کو تو کروا دیتے ہیں اگلا میں منمت میں کر
لوں گا تو کیا قیامت آجائے گی۔ وہ تارو باجی کو تو روز
کرواتے ہیں ابھی برسوں کی بات ہے سویرے میری
گڈی ان کی چھت پر گر گئی تھی میں نے کیا تو وہ بیٹھی
حلوہ پوری اڑا رہی تھی اور فون پر سہیلی کو بتا رہی تھی
کہ وہ ہوٹل والے بدھو باذل نے بھیجا ہے۔ اب تو
میری موجیں ہیں۔ مزے مزے کے کھانے کھایا
کروں گی۔“ وہ مکمل صوتی تاثرات کے ساتھ بیچ
چوراہے میں بھانڈے پھوڑ رہا تھا اور باذل کا منہ چوک
پر لگا سگنل بن گیا۔ ایک پر ایک رنگ آ رہا تھا چور
نظروں سے زمامہ کا چہرہ جانچا وہ ایسی بن گئی تھی جیسے
کچھ سنا ہی نہ ہو اس نے نجل سا ہوتے ہوئے منے کی

”امی کدھر ہیں، نظر نہیں آرہیں؟“
 ”اچھا تم لوگ یہ بتاؤ، چائے پوگے یا ٹھنڈا۔ اچھا چلو چائے رہنے دیتے ہیں۔ دودھ نہیں ہے اس وقت گھر میں اور یہ ڈیوں کے دودھ کی چائے تو نری زہر لگتی ہے۔ مجھے اونے منے جا بھاگ کے دو بوتلیں لے کر آ۔“ شگو خالہ نے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی شاید۔ وہ کچن میں جا گھسیں۔ لیک جھپک نمکو بمسکٹ، پھل جو دستیاب ہوا لے کر آگئیں۔

”اور پتربازل کیسا جا رہا ہے تیرا کام۔“ پھر وہ جو اس کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو میں تو نہ صرف اس کے کاروبار بلکہ کئی اور بہتوں کے حالات کو بھی ڈسکس کر ڈالا۔ منابو تلیں لے آیا تھا وہ بھی ختم ہو گئیں مگر ان کی باتیں۔ وہ بے چین ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”کدھر ہے؟“ شگو خالہ نے چونک کر دیکھا۔

”کیوں خالہ! ہم کیوں جائیں ملنے جب ان لوگوں کو چاہ نہیں یہ تو بہت زیادتی کی بات ہے۔ اول تو خالہ آپ کو چاہیے تھا امی کو ملنے ہی نہ دیتیں۔ ان سے اتنی زیادتی کے بعد وہ آکر مزے سے ماں کو لے کر چلتے بنے، بہن کیا سوتیلی تھی ان کی؟“

”میں امی کو دیکھوں، اوپر ہیں ناں بھابھی کے پاس؟“ وہ خاص ماں سے ملنے ہی تو آئی تھی اور اتنی دیر ہو چکی تھی امی ابھی تک سامنے نہیں آئی تھیں۔ اس کا دل ہونے لگا تھا اور اس کی ہونق شکل دیکھ کر شگو خالہ نے پکڑ کر بٹھالیا۔

”ارے بیٹا! میں کیسے نہ ملنے دیتی این کو۔ میری کیا مجال تھی۔ یہ تو ذکیہ بہن کی مرضی تھی، وہ چاہتی تو بیٹوں نے جتنا ظلم کیا تھا کچھ وہ بھی بدلہ لیتیں مگر بیٹا یہی تو بات ہے کہ اولاد کتنی بھی بری ہو ماں اس سے بدلہ نہیں لے سکتی۔“

”تو بیٹھ میں ابھی آئی۔“ وہ اٹھ کر کمرے میں چل دیں۔ چند لمحوں بعد واپس آئیں تو ہاتھ میں ایک پوٹلی سی تھی۔ جولا کر انہوں نے اس کی جھولی میں رکھ دی۔ جس پر نظر پڑتے ہی گویا زمامہ کا دل بیٹھ گیا۔

”چلیں ٹھیک سے وہ اس وقت تو چلی گئیں مگر کیا وہاں جا کر بھی بیٹی کو مطلع نہیں کر سکتی تھیں۔“ باذل کا اعتراض بھی درست تھا۔ شگو خالہ نے محض سر ہلا کر اس سے اتفاق کیا۔

”ام، امی، امی۔“ اس کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی تھی۔

”اب تم کس سوچ میں ڈوب گئی ہو۔ جس ماں اور بھائیوں کو تمہارا خیال نہیں ناں تم بھی مت کرو ان کی پرواہ۔“ وہ زمامہ سے کہہ رہا تھا۔ جو اس کی بات پر سر اٹھا کر غائب و ماغی سے اسے دیکھنے لگی۔

”ہفتہ پہلے آئے تھے تیرے بھائی، ماشاء اللہ یہ وڈی ساری گڈی میں انہوں نے تو کچھ سنے گئے ہی نہیں دیا۔ تیری ماں و چاری کو سامان باندھنے کا بھی ٹائم نہیں دیا۔ سب برتن بھانڈے بھی اس کے یہیں رہ گئے۔ بس جاتے جاتے وہ یہ امانت دے گئی تھی تیرے لیے کہہ رہی تھی اس کا سارا زیور ہے اور کوئی پلاٹ کے کاغذ جو وہ تیرے نام کر رہی ہے، بس پتربازل تو سنبھال اپنی امانت اللہ برتنا نصیب کرے۔ دل ہولاناہ کریں بچے شکر کر تیرے بھائیوں کو بھی عقل آئی۔ ماں کے

”ارے اس غریب پر کیوں گرم ہو رہے ہو۔ وہ بے چاری پہلے ہی پریشان ہے۔ چل پترو تو فکر نہ کر، جہاں رب نے اتنے کام آسان کیے وہاں یہ دکھ بھی دور ہو جائے گا۔ گھبرانا نہیں میں ہوں ناں تیری ماں۔“ خالہ نے پہلے باذل کو جھڑکا پھر اسے ساتھ لگا کر سلی دی اور وہ ایسی گرم صم سی کیفیت میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

سے نمبر؟" باذل نے تو فوری عمل کا بھی سوچ لیا جھٹ
 بائٹ سے سیل فون نکالا۔ زمامہ نے سر اٹھایا ۴ بجھی
 بھری لٹوں کے درمیان ستا چہرہ، ملگجے اندھیرے میں
 بھی اس کی بھیگی سرخ آنکھیں بتا رہی تھیں اس کے
 اندر کی کیفیات کو وہ اس کے بولنے کا منظر تھا۔

"میرے پاس ان کا کوئی کانٹیکٹ نمبر نہیں ہے۔
 اور مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ اب وہ کہاں اور کس شہر
 میں ہوں گی۔" بھیکے لہجے میں دی گئی یہ اطلاع یقیناً
 اچھی نہیں تھی باذل بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

"کیوں۔" اور اسے سوال پر پہلے تو زمامہ نے ہونٹ
 بھینچ لیے۔ کئی لمحے لگے اسے پلکوں کی باڑھ پھلانگنے
 کی کوشش کرتے آوارہ آنسوؤں کو اندر دھکیلنے میں۔
 "بابا کے بعد بھائیوں نے گھر بیچ دیا تھا پھر انہوں نے
 کہاں مکان خریدے مجھے کچھ علم نہیں۔" اس نے پھر
 گھٹنوں پر سر رکھ لیا۔ باذل کو انتہائی تاسف نے گھیر لیا
 اگر وہ ایسے حالات میں افسردہ تھی تو کچھ غلط بھی نہ تھی۔
 اسے شدت سے زمامہ کے دکھ کا احساس ہوا۔ بے
 اختیار بازو پھیلا کر اسے ساتھ لگالیا۔

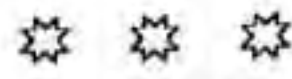
"اچھا چلو تم پریشان نہ ہو۔ یوں فکر مند ہونے سے
 کچھ نہیں ہو گا۔ شکوہ خالہ ہیں ناں ہو سکتا ہے امی
 انہیں کوئی ایڈریس وغیرہ بتا کر گئی ہوں۔ میں کل ہی پتا
 کرتا ہوں۔ تم تیاری رکھنا پھر ہم چلیں گے تم یوں
 غمگین رہتی ہو تو میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے۔ میں
 ہوں نا تمہارے ساتھ کیا۔ تمہیں میری محبت پر یقین
 نہیں؟" باذل نے بڑے پیار سے ہاتھ تھاما تھا۔ مگر زمامہ
 کی سسکی نکل گئی۔

"اوہ کیا ہوا؟" وہ گھبرا ہی گیا۔

"کچھ نہیں، روٹی پکاتے ہاتھ ذرا سا توڑے کو چھو گیا
 تھا۔" زمامہ نے ہتھیلی سامنے پھیلانی۔ گول سا سرخ
 نشان عین وسط میں جہاں ننھے ننھے آبلے پڑنا شروع ہو
 گئے تھے۔

"اوہ گاڈ ڈراسا تم اسے ذرا سا کہہ رہی ہو۔" باذل تو
 دیکھتے ہی تڑپ گیا۔ اسے بری طرح گھورا موبائل کی
 ٹارچ جلا کر اچھی طرح معائنہ کیا۔

پھر خالہ نے بہتیرا روکا پر وہ نہ رکی اور اسے تو کسی
 بات کا ہوش ہی نہ رہا تھا مگر وہاں سے نکلے ہوئے باذل
 وہ بوٹلی اٹھانا نہ بھولا تھا جو کسی بے وقعت شے کی طرح
 نیچے گری پڑی تھی اور جس پر پھر اس نے نظر ڈالنا بھی
 گوارا نہ کیا تھا۔



اور اب باذل کو بھلا کیا فکر آگئے ہی دن وہ جا
 چھوڑ کر آگیا تھا۔ امی کی باز پرس پر اس نے ساری بات
 ان کے گوش گزار دی۔

"ارے واہ بھائی! آپ کے تو مزے آگئے۔ میں تو
 کہتی ہوں بیچ دیں پلاٹ اور سارا زور اور باسٹ بھائی
 سے بات کر کے پورا ہوٹل خود خرید لیں۔" یہ عمارہ کا
 مشورہ تھا جسے تو بے پروئی ڈالتی زمامہ نے بھی سنا اور وہ
 یک لخت ہاتھ جلا جی بھی مگر اس کی سسکاریوں پر کون
 آتا۔ وہ سب تو باہر لاؤنج میں بیٹھے اسے نت نئے
 مشورے دینے میں مشغول تھے۔ امی کہہ رہی تھیں۔

"بہتر ہو گا کہ تم اب اپنے سسرال بھی ہو آؤ۔ زمامہ
 کو ماں سے ملانے لے جاؤ اور جا کر دیکھو اس کے
 بھائیوں کو بھی۔ ارے بھئی وہ آکر ماں کو لے گئے تو
 اس کا مطلب ہے۔ اپنے کیے پر پشیمان ہیں ہو سکتا ہے
 شرم کے مارے بہن کے سامنے نہ آئے ہوں۔ اب جا
 کر خود ملو گے تو تمہاری ہی قدر بڑھے گی۔" اور ان کی یہ
 بات باذل کے دل کو بھی لگی تھی۔ اسی لیے تو جب
 رات کو سب کام سمیٹنے کے بعد زمامہ چھت پر چلی آئی
 تھی تو وہ بھی اسے پکارتا تلاشتا وہیں آگیا۔ وہ فرش پر
 دیوار سے کمر نکائے بیٹھی تھی۔ گھٹنوں پر سر رکھے
 اپنے ہی دھیان میں۔

"ارے ایسے کیوں بیٹھی ہو بخیریت تو ہے۔ کیا بات
 ہے یار! بہت چپ چپ رہنے لگی ہو۔ کھانا بھی تمہارے
 ٹھیک سے نہیں کھایا۔ امی کے لیے او اس ہو تو چلو کسی
 روز مل آتے ہیں انہیں بلکہ یوں کرتے ہیں انہیں فون
 کرتے ہیں وہ بھی خوش ہو جائیں گی اور تمہیں بھی
 تسلی ہو جائے گی ٹھیک ہے ناں۔ اچھا اب بناؤ جلدی

اس کی نظروں کا ارتکاز ہی تھا کہ نازو نے سر اٹھا دیکھا اور نیم اندھیرے میں ایک ساتھ کھڑے دو ہیولوں کو دیکھ کر بے تاثر چہرے کے ساتھ پھر وہ کتاب پر جھک گئی اور بازل جسے اس کے سوال نے حیران کیا تھا نازو کی بجھے چراغ سی نظر نے تو اور متحیر کر دیا۔ اس پر اٹھتی ان نگاہوں میں کبھی کیسے روشن دیوں کی سی لوہوئی تھی اور اب کیسی خالی نظر سے اس نے دیکھا تھا۔ وہ اٹھ کر اندر جا چکی تھی پیچھے خالی کرسی جھول رہی تھی۔ یک لخت جانے ذہن میں کیا آیا اس نے بغور زمامہ کی آنکھوں کو جانچا۔ وہ کئی مہینوں سے اس کے ساتھ تھی اور بہت خوب صورت ہونے کے باوجود نری بے رونق آنکھیں گرد آلود موتی جیسی جن میں دیکھتے پر ویرانی کا سا احساس ملے۔

”پتا میں ناں۔“ وہ اس کے بازو کو ہلاتے پھر پوچھ رہی تھی۔

”پتا نہیں کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو، چلو آؤ۔“ وہ خواہ مخواہ ہی چڑ گیا اور سیڑھیوں کی جانب قدم بڑھائے تب ہی اس نے سنا زمامہ کہہ رہی تھی۔

”آپ بھی مجھ سے خفا ہو گئے ہیں، پلیز آپ تو خفا نہ ہوں۔ آپ کے سوا میرا ہے ہی کون۔“ ایسا درد تھا اس کے لہجے میں جس نے وہیں بازل کے قدموں میں زنجیر ڈال دی۔

”ایک وقت تھا جب میں سمجھتی تھی کہ میرے حصے کی سب خوشیاں جل گئیں ہیں۔ ختم ہو چکی ہیں میرے لیے اب اس دنیا میں سوائے دکھ اور ذلت کے کچھ نہیں بگرا بکھی۔ کبھی دل کو امید سی بندھتی ہے۔ مجھے لگتا ہے میں بھی زندوں میں ہوں۔ میری بھی خطا میں معاف ہو جائیں گی۔ میں بہت بری ہوں اس قابل تو نہیں جتنا مجھے نوازا دیا گیا ہے۔ آپ بہت اچھے ہیں بازل مجھے بے حد اچھا لگتا ہے جب آپ میرا خیال رکھتے ہیں لیکن اس وقت مجھے بہت ڈر لگتا ہے جب آپ غصہ ہوتے ہیں مجھے ہر چیز سے خوف آنے لگتا ہے۔ پلیز مجھے معاف کر دیں۔“ وہ بالکل ایک چھوٹے

”تم بہت ہی لاپرواہ لڑکی ہو۔ ذرا بھی خیال نہیں ہے تمہیں اپنا تم نے مجھے اسی وقت کیوں نہیں بتایا۔ اب یہاں بیٹھی رو رہی تھیں۔ تمہیں فوراً اس پر کچھ لگانا چاہیے تھا۔ حد ہوتی ہے یہ قوفی کی بھی اچھا بھلا زخم ہے اور مزے سے کہہ رہی ہو ذرا سا۔“ اسے تو غصہ ہی آگیا۔

”چلو اٹھو فوراً۔“ اس زخم کو دوا کی ضرورت ہے۔ چلو نیچے چلیں۔“

بہت سارے زخم ہیں سب کو دوا کی ضرورت ہے۔ آپ کس کس کی دوا کریں گے؟“ وہ بھیگی پلکوں سے ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ اسی بے خیالی میں بول گئی اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اس نے دل کا کوئی درد کہا تھا ورنہ تو اس سے پہلے لبوں پر چپ کے تالے ہی پڑے رہتے تھے۔ بازل اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گیا۔

بیوی ہو تم میری تمہارے ہر زخم کی دوا کرنا فرض ہے مجھ پر۔“ گالوں پر لڑھکتے نمکین قطرے اپنی پوروں پر چنے۔

”آپ صرف میرے ہیں ناں؟“ آج جانے زمامہ کو کیا ہوا تھا بڑے آس بھرے لہجے میں سوال کیا۔ آنکھوں میں عجب الجھن بھری کیفیت تیر رہی تھی۔

”صرف اور صرف تمہارا ہوں۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیلی بیٹھ کر بتا نہیں کیا کیا سوچتی رہتی ہو۔ چلو اٹھو۔“ بازل کو اس کی آنکھوں کی غیر یقینی نے ندامت کی سوئی چبھوئی، خائف سا ہوتے اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا تب ہی اس کی نظر برابر والے گھر کے ٹیرس تک گئی۔

”وہ نازو ہے نا؟“ نہایت انہماک سے کتاب میں سر دیے بیٹھی لڑکی کی جانب اس نے اشارہ کیا۔ بازل نے بھی دیکھا اور سر ہلا دیا۔

”میں اکثر اسے یاں سے دیکھتی ہوں۔ یہ ہمیشہ پڑھ رہی ہوتی ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے نازو۔ میں نے سنا ہے اس کی شادی ہو رہی ہے کسی ڈاکٹر سے۔ کل امی بات کر رہی تھیں۔ آپ نے کیوں نہیں کی نازو سے شادی؟“ وہ مسلسل ادھر ہی دیکھتے بول رہی تھی اور یہ

اس کا بھی یہی دل چاہتا تھا زمانے بھر کی نعمتیں اس کے قدموں میں ڈھیر کر دے اور وہ کوئی کسر اٹھا بھی نہیں رکھتا تھا۔

اب تو یوں بھی کئی روز سے اس کی طبیعت خراب تھی۔ صبح تو وہ بہت ہی زیادہ تڑھال نظر آرہی تھی۔ وہ اسے تاکید کر آیا تھا کہ امی کے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں ضرور چلی جائے منتہلی چیک اپ کے لیے اور کافی دیر پہلے اسے زمامہ کی کال بھی آئی تھی کہ وہ جا رہی ہے۔ ایک اطمینان سا ہونے کے باوجود اسے چین نہیں پڑ رہا تھا۔ جانے کیا بات تھی نہ ہی کسی کام میں دل لگ رہا تھا۔ آخر رہا نہیں گیا۔ مزید ارسی مٹن بریانی، چکن بروسٹ ملائی بوٹی، سلاد، رائے پیک کروا کر اور راستے سے کچھ پھل خریدتا ہوا وہ گھر آ گیا۔ زمامہ کھانے کی بہت چور تھی اسے علم تھا۔ بہت اصرار کے بعد بھی وہ ان سب میں سے چند ایک نوالے ہی کھائے گی جبکہ آج کل اسے اچھی خوراک کی ضرورت تھی۔ اسی لیے وہ اس کے کھانے بننے کا خود ہی خیال رکھتا تھا اور ایسا کرنا اسے اچھا بھی لگتا تھا۔

سارے شاپرز اس نے سینٹرل ٹیبل پر رکھے اور وہیں کھڑے کھڑے زمامہ کا برسل نمبر ڈائل کیا۔ مگر یہ کیا بیون تو کمرے میں ہی بجنے لگی تھی۔

”اوہ یہ زمامہ بھی ناں لگتا ہے جاتے ہوئے سیل فون اٹھانا بھول گئی ہے۔ اف یہ اس کی جو اس باختگی جانے کب سدھرے گی۔“ وہ محبت سے مسکرا دیا۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی بازل نے جدید اسٹائلس سا سیل فون اسے گفٹ کیا تھا اور تب زمامہ کی وہ ہونق صورت اسے اچھی طرح یاد تھی۔ سیل فون دیکھ کر وہ یوں چپ ہوئی تھی جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو اور بازل کو اندازہ تھا کہ وہ بہت سخت ماحول میں پلی بڑھی ہے ہو سکتا ہے اس نے کبھی سیل فون استعمال نہ کیا ہو اسی لیے اس نے بڑے کھل اور پیار سے اسے استعمال کرنا سکھایا تھا اور وہ گپ چپ سی سنتی گئی تھی گویا بولنا جانتی ہی نہ ہو۔

اور اب اتنی سیانی ہو گئی تھی کہ اس کی کال پک کر

بچے کی طرح سہمی ہوئی جانے کس بات کی معافی مانگ رہی تھی۔ وہی آنکھیں جو چند لمحے پیشتر بازل کو بری لگی تھیں اب ان ہی میں تیرتے جگنوؤں سے آنسوؤں نے اسے تڑپا دیا۔ دل یک بیک سرشارت سے لبریز ہو گیا ہمیشہ اس کی محبتوں کے جواب میں چپ رہنے والی زمامہ کے ان الفاظ و اقرار نے جیسے اس کے اندر اک نئی روح پھونک دی وہ لپک کر آیا۔

”کس بات کی معافی یار گیا کیا ہے تم نے بالکل پگلی ہو تم بھی میں تم سے ناراض ہو سکتا ہوں بھلا۔ تم نے ایسا سوچا بھی کیسے۔ کیوں فضول کی سوچوں میں گھری خود کو پریشان کرتی رہتی ہو؟“ بے اختیاری میں اس کا وہی زخم خورہ ہاتھ تھام لیا تھا۔ ڈھیروں پیار کے ساتھ غصہ بھی آیا۔

”زخم چاہے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو اگر بروقت علاج نہ کریں تو وہی بہت بڑا ناسور بن جاتا ہے پاگل لڑکی چلو، او پہلے تمہارے اس درد کے دوا کروں پھر پاتی علاج بھی کرنا ہوں تمہارا۔ تم تو اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی پاگل کر دو گی۔“ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا اور زمامہ کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ کھینچتی چلی گئی۔



زندگی کتنی خوب صورت لگنے لگتی ہے ناں۔ جب آپ دل سے کسی کے ہو جاتے ہیں یا کسی کو دل سے اپنا مان لیتے ہیں۔

بازل کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ جب سے زمامہ شریک سفر ہوئی تھی تب سے اندر کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ اب اس کے چہرے کے علاوہ آنکھوں کو اور کوئی صورت بھلی لگتی ہی نہ تھی۔ ہر دو سرا چہرہ اسے کم صورت اور پر فریب لگتا تھا یوں بھی جب سے ہوٹل کی مصروفیات بڑھی تھیں اس نے ادھر ادھر کی ہر سرگرمی ترک کر دی تھی۔ اب وہ پہلے والا لایا بیلی سا بازل کہیں سے بھی نہ دکھتا تھا بلکہ وہ ایک سمجھ دار اور ذمہ دار شخص کا روپ دھار چکا تھا۔ زمامہ نے حقیقی معنوں میں اسے خوشیوں سے ہمکنار کیا تھا بادلے میں

لیتی یا اسے بوقت ضرورت کال کرتی۔

بیڈ کی پائنٹی پر رکھے کبل کے پاس بڑا موبائل باڈل کو نظر آگیا تھا اس نے اٹھایا جس کی روشن اسکرین مزید دس مسد کالز ظاہر کر رہی تھی۔

”اوہ یہ کس کی کالز ہیں۔“ اس نے نمبر دیکھا۔ کوئی انجانا نمبر تھا باڈل نے کبھی ارادتا ”بھی زمامہ کے فون کو چیک نہیں کیا تھا۔ اب یونہی کال لاگ کھول لیا اور دیکھ کر حیران رہ گیا اس نمبر پر زمامہ نے بے شمار کالز کی تھیں جبکہ ان کمنگ میں آج کی ہی مسد کالز تھیں۔

”چلو شکر اس نے بھی کوئی سہیلی بنائی۔ اچھی بات ہے دل بھلا رہے گا۔ اس خیال نے اسے مطمئن کر دیا۔ سیل فون سائیڈ ٹیبل پر رکھا وہ پلٹتے ہی لگا تھا کہ پھر فون بجنے لگا۔

اسکرین پر ایک بار پھر وہی نمبر جگمگا رہا تھا اور اس نے سیل اٹھا کر کال پک کر لی۔ ابھی ”ہیلو“ منہ میں ہی تھا کہ وہاں سے پاشوار آواز میں کہا گیا۔

”ہزار بار کہا ہے اس نمبر پر فون مت کرو۔ تمہیں میری بات کی سمجھ نہیں آتی۔ منحوس بد بخت! سارے خاندان کو اجاڑ کر بھی تیرے کلیجے میں ٹھنڈ نہیں پڑی ابھی اور بھی کچھ کرنا باقی ہے کیا۔“

انتہائی پر تنفر آواز تھی اور الفاظ ایسے تلخ کہ باڈل حیران و ششدر رہ گیا۔ کچھ کہنے کی کوشش میں لب نیم وا ہی رہ گئے۔ جبکہ اگلی جانب سے بولنے والی ہستی نے اک لمحے کا توقف نہیں کیا تھا۔

”تو بھول گئی ہو سب ذلت پر ہمیں اذیت کا ایک ایک پل اچھی طرح یاد ہے۔ اب بھی بھگت رہے ہیں اپنے گھر سے نکلے علاقے سے نکلے در بدر ہونا بڑا سب کو صرف تیری وجہ سے۔ ایسے تنگ خاندان نکلی تو۔ مار پڑے ایسی جوانی پر جو ماں باپ کی عزت رول دے۔ ذرا سی بھی دید لحاظ ہوئی تو خود ہی شرم سے مرجانی۔

پہلے باپ کو کھا گئی اور اب ہماری ماں کے پیچھے پڑی ہے نامراد اب تجھے احساس ہو رہا ہے اب معافیاں مانگ رہی ہے۔ میں پوچھتی ہوں کس بات کی معافی!

جب پاپا نے تیرے لیے ایک اچھا فیصلہ کیا تھا تب تو تجھے اختلاف ہو گیا تھا۔ تجھے تو وہ فون والا لفظ اچھا لگتا تھا جس کے نہ دن کا پتا تھا نہ دنیا کا تب تجھے ہر سمجھانے والا برا لگتا تھا تب کیوں بیچ کھائی تھی عقل۔ عین نکاح کے دن انکار کر کے تو نے باپ کی جان لی۔ ارے تو کیوں نہ مر گئی تھی ان کی جگہ تجھے موت آجاتی کاش تو اب سب سکون سے تو ہوتے۔ اونچی گردن تان کر چلتے تھے بھائی اب کسی سے نظر ملانے جو گے نہیں۔ تو تو شکر کر احسان مان ماں کا جس نے بھائیوں کے پیروں پر اپنا دوپٹہ ڈال کر تیری جان بخشوالی تھی۔ ماں تھی ماں تیری اتنی بھیا تک غلطی کے باوجود اس نے تجھ سے انتقام نہیں لیا بلکہ الٹا اور احسان کر دیا تجھ پر تجھے ایک اچھے گھر بار میں بیاہ کر۔ میں تو حیران ہوں تم جیسے بد ذاتوں پر بھی اللہ مہربان ہو جاتا ہے۔ اماں بتا رہی تھیں بہت اچھے لوگ ہیں اور تمہارا شوہر بھی۔ ارے تم تو ان کے پاؤں دھو دھو کر پیو جنہوں نے تم جیسی عورت کو سنبھال لیا اور خبردار جو اب ہمیں فون کیا۔ تمہارے فون سے اماں بہت ڈسٹرب ہو جاتی ہیں۔ جہاں باپ چلا گیا سمجھو ماں بھی تم نے وہیں بیچ دی۔ اب تو خود ماں بننے والی ہے ماں اب تجھے جی اپنے پیدا کرنے والوں کا درد سمجھ میں آئے گا۔ میری تو دعا ہے اللہ تجھے بٹی دے اور وہ بالکل تیرے جیسی ہو۔ تب تجھے علم ہو گا کہ جب اولاد ماں باپ کا دل چیرتی ہے ماں تو کیسی اذیت ٹوٹی ہے ان پر۔

خود کو عقل کل سمجھنے والی اولاد آخر ایک دن اپنے ہی فیصلوں کی رسی میں الجھ کر منہ کے بل ضرور گرتی ہے اور تب خرد کے دروازے کھلیں بھی تو کیا حاصل تب تک تو بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے گزر چکا ہوتا ہے۔ تو نے بالکل اچھا نہیں کیا زمامہ صرف ہمارے ساتھ ہی نہیں اپنے ساتھ بھی اور ابھی تو اک عمر پڑی ہے۔

گناہ کبھی بھی نہیں مرتے ہمیشہ پیچھا کرتے رہتے ہیں تو بھی بھگتے گی ابھی بہت بھگتے گی۔ وہ عورت مسلسل بولتی چلی جا رہی تھی۔

ہائے آئے انسان۔ تیری خوش فہمیوں، خود غرضیوں کا کوئی انت ہے بھی کہ نہیں۔ جانے کس گمان میں جیسے جاتے ہو۔

یہ عورت جو کئی مہینوں سے تمہارے ساتھ ہے اور جس کے ساتھ نے تمہیں بے شمار خوشیوں سے نوازا۔ اس کی خوب صورتی تو ایک ظاہری وصف ہے اس میں اس کا کوئی کمال نہیں مگر اس کی سلیقہ شعاری اطاعت گزار اور وفاداری یہ تو اس کے اندر کے وصف ہیں اور ایسے اوصاف بزدل اور کم حوصلہ لوگوں کے نہیں ہوتے یہ اس کی اپنی ہمت سے پیدا کردہ خوبیاں ہیں۔

تمہیں ان پر کوئی اعتراض ہے تو بتاؤ۔ یہ دنیا ہے اور یہاں کوئی بھی فرشتہ نہیں۔ جب تم خود بھی نہیں تو پھر کیسے کسی اور سے امید رکھ سکتے ہو۔ کسی اور کا حساب لینے سے پہلے سوچ لینا۔ کیا تم اپنا حساب دے پاؤ گے۔ بولو بتاؤ۔ ہنستا ہوا عکس اب اسی پر چلا رہا تھا۔

جسم سے روح کیسے کھینچی جائے گی اس پل میں اس پر یہ حقیقت کھلی تھی۔ جب عدالت جرم ثابت کر دیتی ہے تو مجرم اس لمحے کیسی شرمساری ولا چاری سے گزرتا ہو گا وہ اچھی طرح جان گیا تھا۔ ایسی بے بسی تمام عمر میں اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ آئینے میں کھڑا وہ دوسرا آدمی کھینچ کھینچ کر اس کی روح پر کوڑے برسار رہا تھا۔ باذل کا ہاتھ اپنے ہی پہلو میں لٹک گیا۔ زمامہ کے چہرے پر ابھی جو نظر تکی تھی وہ غضب ناک سے پر تھی مگر جب وہ اس کے جسم سے پھسلتی پیروں تک آئی تو اس میں کون سا رنگ غالب تھا یہ سمجھنا اور بتانا بہت ہی مشکل تھا۔ اس کے دل غ نے جیسے پھر وہی ٹیپ چلا دی تھی جس میں ایک جملہ بار بار گونج رہا تھا۔

”میری تو دعا ہے اللہ تجھے بھی بیٹی دے اور وہ بالکل تیرے جیسی ہو۔“ باذل کو لگا اس کی ٹانگیں اس کے جسم کا بوجھ سہارنے سے قاصر ہو رہی ہیں۔ پل پل اس کے چہرے کے رنگ بدلتے دیکھ کر زمامہ لپک کر اس تک آئی۔

باذل جہاں کا تھاں کھڑا رہ گیا تھا ایسا لگ رہا تھا کان کے ساتھ فون نہیں کوئی گرم پکھلتا سیسے کا ٹکڑا لگا ہوا ہے۔ ایسی تپش ایسی آگ کی لپٹیں جو ہر طرف پھیلتی جا رہی تھیں۔ دھواں ہی دھواں چہار جانب پھیل رہا تھا اسے اپنا پورا وجود جلتا ہوا محسوس ہوا۔

کھلے دروازے سے اندر آتی زمامہ نے اسے مانند جہاں کھڑے دیکھ لیا تھا اور اس کے کان سے لگا اپنا فون بھی۔ وہ ٹھنک کر وہیں رک گئی۔ کوئی انجانا سا حدشہ پورے جسم و جاں کو لرزایا گیا۔ سر سے پاؤں تک کالے عبا میں چھپی وہ کتنی مقدس کتنی پاکیزہ لگ رہی تھی۔ اس کے بے حد خوب صورت چہرے پر اک الوہی سا روپ سایہ کیے رہتا تھا مگر اس پل عجب سا ہر اس چھانے لگا۔

باذل کو لگا اب وہ کبھی اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر پائے گا وہ کھڑے کھڑے جل کر جسم ہو گیا تھا۔

ایسی بے ایمانی، ایسا صریح دھوکا ایسے تو کوئی راہزن بھی نہ لوئے وہ تو جیسے قزاقوں کے ہاتھوں لٹا تھا سب مال اسباب ختم بیچ بھنور میں وہ ڈوب رہا تھا شدید دکھ و اذیت کا اک بگولہ اٹھا تھا جو اس کے جسم و جاں کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ وہ غم و غصے سے پاگل ہونے کو تھا۔ زمامہ پر نظر پڑتے ہی جی چاہا ہاتھ میں پکڑا موبائل پوری قوت سے اس کے خوش نما چہرے پر دے مارے اور بلا شبہ وہ ایسا کر گزرتا اگر جو سامنے ہی بڑے سے سنگھار میز کے آئینے سے نظر نہ جاملتی۔

”جنے بو کر گندم کی امید! کمال آدمی ہو تم بھی۔“ اس کا عکس اسی پر ہنس رہا تھا۔

”یہ دنیا ہے میاں! یہاں جو کھیتی کاشت کی جاتی ہے وہی کالی جاتی ہے۔ چاندی کے بھاؤ میں کبھی بھی سونا نہیں ملتا پر انسان رہتا اسی بھول میں ہے کہ وہ کنکر دے کر موتی خرید لے گا۔ جبکہ جہاں سارے حساب ہوتے ہیں وہاں تو کوئی بھول ہے ہی نہیں وہاں تو پل پل کا کھرا اور کھوٹا لگ لگ کر لیا جاتا ہے اور پھر سب سودا آپ کے آگے دھریا جاتا ہے چاہے وہ دنیا کے حصے کا ہو چاہے بعد کا۔“

شک نہ رہا کہ اس کی زندگی کے ساتھ بھیانک کھیل کھیلنے والا یہ منحوس آلہ ایک بار پھر اسے زندہ درگور کر گیا ہے۔ کمرے سے نکلتے ہوئے دانستہ بکھرے ٹکڑوں پر وہ شکستہ قدم رکھتی ہوئی گئی تھی۔



بازل کے لیے زندگی میں آنے والا یہ دھچکا بہت اذیت رساں ثابت ہوا تھا۔ سب خوش گمانیاں مان و بھروسے اس بری طرح چکنا چور ہوئے تھے کہ اس کی پور پور زخم زخم ہو گئی تھی۔ نہ وہ اتنا بلند حوصلہ تھا نہ ایسا اعلا طرف کہ سب پل بھر میں بھول جاتا۔

مگر اس سب کو بھلانے کے لیے ارادہ تو کیا جاسکتا ہے نا۔ ایک ننھی سی محبت اس کے آگے آن کھڑے ہوئی تھی۔ اور یہ وہ محبت تھی جو اس کی بیوی اپنے وجود میں سمیٹے اس وقت رب کے حضور سجدہ ریز تھی اور کئی دنوں سے اپنے طرف اور ضبط کو آزما تا آج وہ ارادے کی کرن کے آگے ہار گیا تھا۔ زندگی آپ کی اپنی ہوتی ہے اور کچھ اختیارات آپ کی مٹھی میں جہیں استعمال کرتے ہوئے چاہے تو آپ زندگی مشکل کر لیں یا پھر آسان۔

اور زندگی کو آسان کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ دوسروں کی خطاؤں کو درگزر کرنا سیکھ جائیں۔

”میرے لیے کچھ دعا کیا کرو۔ اللہ میرے دل کو سکون دے۔“ زمامہ دعا کے لیے ہاتھ پھیلائے ہوئے تھی وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور وہ جو اس گھمن گھمیری میں تھی کہ شکوہ کرے یا دعا سے اتنے قریب دیکھ کر سب بھول گئی۔ کئی رتھجگوں کے باعث سوجی آنکھیں بڑھی شیو۔ ملجے سے رف حلیمے میں وہ کتنا بکھرا بکھرا سا لگ رہا تھا۔ زمامہ کی پلکوں سے کچھ اور آنسو لڑھک آئے۔ دل پر کسی احساس نے بڑے زور سے چٹکی کائی تھی۔ زندگی کی بہت سی صعوبتوں سے نمٹنے کے بعد یہ وہ شخص تھا جس کا وجود اس کے لیے گھنیری چھاؤں جیسا تھا مگر اب اک ذرا سی درز سے چھن کر آتی دھوپ نے اسے جھلسا ڈالا تھا۔ اس کی

”بازل کیا ہوا ہے آپ کو۔ کس کا فون تھا۔“ اگلے سوال پر اس کی زبان ہٹکائی بازل نے چیپ چاپ فون اس کی جانب بڑھا دیا جس کا کال لاگ چیک کرتے ہوئے زمامہ کا گلہابی رنگ بالکل سفیدی مائل ہوا تھا دل یوں سکڑا گویا بند ہو جائے گا۔ حواس باختہ ہو کر اس نے بازل کی طرف دیکھا جو اسے دیکھنے کی بجائے نیچے فرش کو گھور رہا تھا۔ دونوں آمنے سامنے کسی بت کی طرح کھڑے تھے۔ کئی لمحوں کی خاموشی کے بعد بازل نے چیپ پر ضرب لگائی تھی۔

”نہیں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا یہ کس کا نمبر ہے لیکن یہ ضرور کہوں گا یہ پھر تمہارے فون میں نہ ہو۔ میں نے کال ریسیو کی تھی لیکن لائن ڈراپ ہو گئی۔ تمہیں نہیں پتا میں کتنا شکی مزاج آدمی ہوں بلکہ ہر مرد ہی ہوتا ہے۔ میں نے تمہیں یہ فون اپنی سہولت کے لیے لے کر دیا ہے ادھر ادھر دوستیاں گانٹھنے کے لیے نہیں۔“ اس نے جھوٹ کیوں بولا تھا اسے خود بھی سمجھ نہیں آیا وہ اسے دیکھے بغیر بات کر رہا تھا۔ زمامہ کی رکی ہوئی سانسیں اور چہرے کا رنگ ایک ساتھ بحال ہوئے۔ اگلے ہی پل وہ اس کے حکم کی تعمیل کر رہی تھی اور اس کے ہاتھوں کی لرزش آنکھیں جھلی ہوئے کے باوجود بازل سے مخفی نہیں رہ پائی تھی۔ وہ وہیں بیڈ پر ڈھے گیا۔ زمامہ کے ہاتھ سے سیل فون چھوٹ کر ایک چھناکے سے نیچے جا گرا وہ گھبرا کر اس پر جھک گئی۔

”بازل بازل آپ ٹھیک ہیں ناں؟ کیا ہوا ہے آپ کو؟ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟“ از حد پریشان ہوتی وہ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر پوچھے گئی۔

”میں ٹھیک ہوں کچھ نہیں ہوا ہے مجھے۔ لیکن کچھ دیر کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دو پلیز۔“ وہ اس کے ہاتھ پرے کرتے ہوئے منہ پھیر گیا۔

”کیوں ایسا کیا ہوا ہے کچھ بتائیں تو سہی۔ میرا دل بند ہو جائے گا۔“

”ہو جائے میری بلا سے“ میں نے کہا ہے ناں کہہ۔“ وہ پوری قوت سے چلایا تھا اور زمامہ کو کوئی

اقرار کرتا ہوں ہی خواہ مخواہ کا غصہ ناک پر چڑھا کر کچھ
تیکھے لہجے میں بولا۔

”پھر تم کہو گی میں بھی تم سے سوری کروں۔“ اور
زامہ نے تیزی سے لٹی میں سر ہلاتے اس کے منہ پر
ہاتھ رکھ دیا۔

”نہیں پلیز ایسی بات کر کے مجھے گناہ گار مت
کریں۔ میرے گناہ تو پہلے ہی بہت زیادہ ہیں اور بوجھ
مت ڈالیں مجھ پر پلیز۔“ اس کے آنسو تھے کہ بستے
چلے آ رہے تھے۔ نیر بہا بہا کے سوجے سرخ ہوئے
پونے زرد کم لایا چہرہ پیٹری جھے ہونٹ وہ اپنا خیال تو
پہلے بھی اتنے اہتمام سے نہیں رکھتی تھی۔ مگر اب تو
لگتا تھا ان گزرے دنوں میں وہ نہایت ہی خود فراموش
رہی ہے۔ اس کے چہرے پر سلیہ کیے حزن و ملال نے

بازل کو احساس ندامت کے شکنجے میں کس لیا۔ اس سے
کیسی لاپرواہی سرزد ہوئی تھی۔ وہ اس کی بیوی تھی اور
جس حال سے تھی وہ کیونکر غفلت برت گیا اگر
خدا نخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو کیا وہ خود کو معاف کر پائے
گا۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا۔
وہ اسے دیکھے جا رہا تھا۔ زامہ نے بو کھلا کر ہاتھ ہٹایا۔ نظر
بھی چرائی جبکہ اس نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ پھر
وہی ہاتھ تھام کر لبوں سے چھو لیا۔ اس کی نظر پھر اٹھی
تھی حیران و سراسیمہ سی ادھر پورا چہرہ دلفریب مسکن
سے سجا جگمگا رہا تھا۔ وہ مزید بحر حیرت میں غوطہ زن ہوئی۔
یہ رویہ یہ روپ یا میرے اللہ کہیں خواب تو نہیں۔
زامہ نے تیزی سے پلکیں جھپکائیں۔

”کتنے دنوں سے ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا تم نے،
بہت ہی ست اور نکمی لڑکی ہو۔ مجھل ہے جو ذرا
بھی خیال رکھ سکو اپنا۔ ہر فکر مجھے ہی ڈالی ہوئی ہے۔
چلو اٹھو فوراً“ جلدی سے فریش اپ ہو جاؤ آج میں
تمہیں تمہارے ہوٹل کے سیکنڈ فلور پر مزیدار سا
کینڈل لائٹ ڈنر کرواتا ہوں۔ آج کی شام اور پورا ہال
تمہارے نام۔ میں ابھی باسٹ بھالی سے کہتا ہوں وہ
کوئی ٹیبل بک مت کریں۔ آج وہاں صرف میں ہوں
گا اور تم اور ہماری پیار بھری باتیں۔ پھر کیا خیال ہے

بے رخی اور بے اعتنائی کسی کھورے سے کی طرح
دل و روح سے کپٹی دم گھونٹ رہی تھی۔ بے اختیار
اس کے شانے سے سر نکا کر وہ سسکا اٹھی۔

”اللہ کے بعد آپ ہی میرا سہارا ہیں بازل۔ مجھ
سے خفا مت ہوں۔ میں آپ کی ہوں صرف آپ کی۔
آپ نے بھی مجھے دھتکار دیا تو میں مرجاؤں گی۔“

”خدا نخواستہ کیسی فضول باتیں کر رہی ہو بیوقوف
ہو تم بھی اور توبہ ہے بھی تم عورتوں سے۔ کیسے اتنا
سارا روکتی ہو۔ کہاں چھپا رکھے ہوتے ہیں اتنے آنسو۔
میں تو ایک دن رویا تھا تو چار دن میرے سر سے درد
نہیں گیا تھا۔“

”آپ آپ روئے تھے کیوں۔“ اس نے گھبرا کر
سراٹھایا۔

”کیوں بھئی میری بار اتنی حیرت کیوں؟ کیا میں
انسان نہیں؟ مجھے بھی درد ہوتا ہے مجھے بھی تکلیف
ہوتی ہے۔ میں بھی رو سکتا ہوں رونے کا ٹھیکہ صرف
تم خواتین کے پاس ہی تو نہیں۔“ وہ مسکرا دیا۔ زامہ کو
اور رونا آیا۔

”کس۔ سوری بازل۔“

”شش بازل نے جھٹ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر
اسے مزید کچھ کہنے سے روکا۔ اس نے کبھی کسی کتاب
میں پڑھا تھا ہر عمل کا رد عمل ہوتا ہے۔ آپ کا عمل
چاہے اچھا ہو یا برا قدرت اسے کبھی کبھی ضائع نہیں
کرتی۔ وہ ایک بیج کی طرح محفوظ کر لیا جاتا ہے اور جب
چاہتی ہے اسے پنپنے دیتی ہے۔ اب جیسا بیج ویسا ہی
پھل ہی اگے گا ناں۔ تب آپ تقدیر کو دوش دے کر
خود بری الذمہ نہیں ہو سکتے مگر آپ ہونا چاہتے ہیں اور
ایسا ہی کرتے ہیں مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو
انجھی گرہوں کو سلجھانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں
لیکن اس حوصلے سے عاری کہ دوسروں کے سامنے اپنی
کو تاہیاں مان لیں۔

وہ بھی ان ہی کم ہمت لوگوں میں سے تھا۔ اسے
اور اک ہو چکا تھا کہ اس کے اعمال کی سیاہی اس کے
دامن پر آئی ہے مگر وہ کس زبان سے زامہ کے سامنے

ہی کئی کئی بار صحن دِل کو اشکوں کے پانی سے دھو دھو کر صاف کرتی رہتی تھی۔ وہاں تو کوئی گرد نہ تھی۔ جب کھلے کواڑوں سے بے پایاں خوشی اور مکمل ايقان نے اندر قدم رکھے تو اس نے جھٹ سے دروازہ بند کر لیا۔ ان مہمانوں کو قید رکھنا اب اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ ضرور رکھے گی وہ جس کے آگے ہاتھ پھیلائے بیٹھی تھی وہ یقیناً اس کی خطاؤں کو بخش دے گا۔ بے شک وہی گرتوں کو سہارا دینے والا ہے اور سچے دل سے توبہ کرنے والوں کو تو وہ خود دس قدم آگے بڑھ کر سنبھال لیتا ہے۔

بازل سیل فون پر نمبر ملاتا کمرے سے نکل گیا تھا۔ وہ باسط بھائی کو اپنا پلان بتا رہا تھا۔ کئی آنسو زماہ کی آنکھوں سے لڑھکتے چلے گئے۔ لبوں پر خوشی سے لبریز ہنسی چل رہی تھی۔ لیکن وہ کھل کر ہنس نہیں پائی۔ کیونکہ کوئی بھی خوشی منانے سے پہلے اس پر سجدہ شکر واجب تھا۔ اسی لیے تو اس نے نفل کی نیت باندھ لی تھی۔

اس کے بعد شاپنگ پر چلیں۔ پتا نہیں کیسے پھیکے پھیکے عجیب سے گلر پہنتی ہو تم تمہاری ساری شاپنگ میری مرضی سے ہوگی۔ اور ہاں اگر میرے لیے تمہیں کچھ پسند آجائے تو نوپرا بلیم وہ بھی خرید لیں گے اور اس کے علاوہ۔۔۔ وہ مگن سا اپنی ہی دھن میں بولتا جا رہا تھا یوں جیسے ان کے درمیان کوئی بات ہو ہی نہ ہوئی ہو۔ وہ گزشتہ بہت سے دن کبھی زندگی میں آئے ہی نہ ہوں۔ اور کئی لمحے تو زندگی میں ایسے آجاتے ہیں جن کے گزر جانے کے بعد ہم ان کے نشانوں کو دیکھتے ہیں سوچتے ہیں کہ کاش یہ زندگی میں کبھی آئے ہی نہ ہوتے۔ اس کی زندگی میں بھی ایسی کئی بری گھڑیاں آگزیں تھیں جن کی نحوست تمام عمر پر چھا گئی تھی۔

جو بیٹیاں والدین کی برسوں کی محبتوں پر جوش جوانی میں آکر چند دنوں کی محبت کو ترجیح دیں ان کے ساتھ تقدیر پھر وہ سلوک کرتی ہے کہ پھر ان کے ہاتھ صرف پچھتاؤں کی خاک رہ جاتی ہے جو وہ اپنے ہی منہ پر مل کر ہزار غم مناتی رہتی ہیں۔ مگر پھر بھی دکھ کا عذاب کم نہیں ہوتا اسے بھی تو اپنی ایک غلطی بہت مہنگی پڑ گئی تھی۔

اب وہ چاہے جتنا ہی روتی، تڑپتی، سلگتی۔ کون تھا زخموں پر پھا ہے رکھتے والا پھر ان کا درد بھی وہ جو کسی سے کہا بھی نہ جائے۔

اور جن سے کہنا چاہا تھا وہ سننے پر راضی نہ تھے۔ اب صرف ایک ہی واحد ہستی رہ گئی تھی جس کے آگے اس نے اپنا مقدمہ رکھ دیا تھا۔ وہ دل سے تائب تھی اور جب کوئی اپنا گناہ مان لے، شرمسار بھی ہو اور کثرت سے عرق ندامت بھی بہائے تو پھر کوئی شک نہیں کہ دامن بر لگے داغ نہ دھلیں۔

وہ گنگ سی اسے بولتے دیکھے جا رہی تھی۔ لیکن حقیقتاً اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا، صرف اس کے لہجے کی کھنک تھی جو کسی دلاویز موسیقی کی طرح سماعتوں میں رس گھول رہی تھی اس کی آنکھوں سے پھوٹی وہ الوہی ان کے جذبوں کی کرنیں جو روح کی ویرانی کو دور کرنے بڑھتی چلی آرہی تھیں۔ اور وہ تو روز

Downloaded From
Paksociety.com
Herbal



سوہنی شیمپو

SOHNI SHAMPOO

اس کے استعمال سے چند دنوں میں خشکی ختم

گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے

بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے

قیمت - 100/- روپے

رجسٹری سے منگوانے پر اور سی آر ڈر سے منگوانے والے

دو بوتلیں - 250/- روپے تین بوتلیں - 350/- روپے

اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

بذریعہ ڈاک سے منگوانے کا پتہ

پوٹی بکس 53 اورنگزیب مارکیٹ، ایم اے جناح روڈ، کراچی۔

دستی خریدنے کے لیے:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار کراچی۔ فون نمبر 32216361

دردِ کارہ

لگے۔ آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔
”اب۔۔۔ مجھے کبھی فون مت کرنا۔۔۔ میں اس محبت
کی کہانی کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ اور نئی زندگی کی طرف
جانا چاہتا ہوں۔“ وہ چپ چاپ سنتی رہی مگر شاید

”ہاں۔۔۔ تم سے محبت تھی۔“
”اچھا۔۔۔! یہ محبت تھی؟“ اس کے ہونٹ کانپنے

Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section

آنسوؤں کے پاس زبان ہوتی تو وہ چیخ چیخ کر پوچھتے۔
”یہ کیسی محبت تھی تمہاری۔؟ جس کو تم خود ختم
کر رہے ہو؟“

”تم سن رہی ہو نا۔؟“ اس نے اس کی طویل
خاموشی کے بعد اونچی آواز میں پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے کانٹے ہونٹوں سے جواب دیا۔
”اچھا۔ اب میں فون رکھتا ہوں۔ خدا حافظ۔“
اس نے مضبوط لہجے میں بات ختم کی۔ اور فون کاٹ
دیا۔ وہ بت بنی میل فون کو صرف دیکھتی رہ گئی۔



”سمعیہ! یہ کلمہ تم پر بہت اچھا لگے گا۔“ اس نے
دکان میں ڈھیر سارے جوڑوں میں سے ایک جوڑا اس
کے لیے پسند کیا۔ وہ جو مختلف ڈیزائن دیکھ رہی تھی
اپنے شوہر کی آواز پر پلٹ کر اس نے دیکھا۔ اس کے
ہاتھ میں گلابی رنگ کا خوب صورت جوڑا تھا۔ جس پر
گلابی رنگ بنی کی نفیس کڑھائی ہوئی تھی۔

”یہ اچھا ہے نا۔؟“ اویس نے محبت سے پوچھا۔
”ہاں۔!“ وہ رنگ۔ جو اسے اس کی یاد دلاتا تھا
اس نے پہننا چھوڑ دیا تھا مگر آج دو سال کے بعد۔ وہ
رنگ پھر سے اس کا شوہر سے پہننا چاہتا تھا۔

”کیا ہوا۔؟ پسند نہیں آیا۔؟“ وہ اس کے ایک
دم بچھے چہرے کو بھانپ گیا۔ وہ اس سے بے پناہ محبت
جو کرتا تھا۔ اس نے سمعیہ کو پہلی بار ایک پارک میں
بیٹھے دیکھا تھا۔ جو اپنی سوچوں میں یوں ڈوبی ہوئی تھی
کہ اسے پارک میں آنے والے کسی شخص کی خبر ہی
نہیں تھی۔

وہ اس پارک میں صبح کی سیر کرنے آتا تھا اور ہمیشہ
سمعیہ کو تنہا بیچ پر بیٹھا دیکھتا اور نہ چاہ کر بھی اسے
دیکھنے پر مجبور ہو جاتا اور پھر ایک دن اس نے سمعیہ
سے بات کر لی۔

”ہیلو۔! میں اویس۔ یہاں روز صبح سیر کرنے آتا
ہوں اور آپ کو ہمیشہ اس بیچ پر دیکھتا ہوں۔ آپ ہمیشہ
کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ کیا میں آپ سے پوچھ

سکتا ہوں۔ کہ آپ یہاں۔۔ تنہا۔؟“
اس نے اویس کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ جو روز اسے
دیکھ رہا تھا اور جانتا تھا کہ وہ دنیا سے بے خبر ہے۔

”جی۔ میں تنہا تو نہیں ہوں۔“ اس نے عجیب
سا جواب دیا۔ اور پھر اپنے ہی جواب پر شرمندہ سی
ہو گئی۔ اس نے اگلے ہی لمحے وہاں ٹھہرنا مناسب
نہیں سمجھا۔

”سنیے۔ سنیے۔ مس۔!“ وہ اس کے پیچھے پیچھے
چلنے لگا، مگر وہ نہ رکی اور پارک سے باہر نکل گئی۔ وہ دیر
تک گھر آکر اس کی بات کو سوچنے لگا۔ ”جی نہیں۔ میں
تنہا تو نہیں ہوں۔“ اس کا یہ ”جملہ“ پھر وہ بھول نہ پایا
اور اس کے بارے میں جاننے کے لیے اپنے دوست
حمزہ سے بات کی۔

”ہاں۔ اس کے والدین نہیں ہیں۔ اور وہ ایک
پرائیویٹ اسکول میں سیکنڈ شفٹ میں بچوں کو پڑھاتی
ہے۔ اپنے بھائی بھابھی کے پاس رہتی ہے۔ اچھی
لڑکی ہے۔“ اس کے دوست نے اس کو ایک ہی دن
میں ساری معلومات دے دیں۔

”حمزہ! میں اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا
ہوں۔“ اس نے فوراً فیصلہ کیا۔

”کیا۔؟ تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟“
”ہاں حمزہ! تم اور صوبہ بھابھی اس کے گھر جا کر
میرے رشتے کی بات کرو۔“

”مگر اویس۔ تم ابھی ابھی پاکستان آئے ہو۔
اچانک ایک لڑکی۔ جس کو تم جانتے نہیں اس سے
شادی کا فیصلہ۔؟“ حمزہ نے اپنے جگری دوست کو
حیرت سے دیکھا جو لندن سے ابھی دو ماہ پہلے بزنس کے
سلسلے میں آیا تھا اور اس کے پاس ہی رہائش پذیر تھا۔

”بس حمزہ! میں نے فیصلہ کر لیا۔ میں اسی لڑکی سے
شادی کروں گا۔ تم بس اور مزید کچھ نہیں بولو گے۔“
اور یوں سمعیہ اویس کی دلہن بن کر اس کی زندگی میں
آگئی۔ وہ دلہن کے روپ میں اس کے سامنے بیٹھی
تھی۔ اس نے بہت محبت کے ساتھ اس کا ہاتھ تھام
لیا۔ اس کی نظریں جھکنے لگیں۔

”وہ فیصلہ کر چکا ہے۔“
 ”وہ اکیلے فیصلہ نہیں کر سکتا۔“ وہ تڑپ کر بولی۔
 ”اس نے ہمیشہ اکیلے ہی فیصلے کیے ہیں۔“ اس کی
 آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

”تم نے اسے روکا نہیں۔؟“ وہ اس کے آنسو
 دیکھ کر پریشانی سے بولی۔

”وہ جا چکا تھا۔ روکتی کیسے۔؟“ اس نے لمبا
 سانس کھینچا میوں جیسے وہ زندہ تو ہے۔

”نہیں۔ مجھے نمبر دو۔ میں بات کرتی ہوں۔
 اس سے۔“ اس نے پریشان ہو کر نمبر مانگا۔

”نمبر! نمبر۔ میں بھول چکی ہوں۔“ اس نے
 نظریں چرا میں اور آنسوؤں پر قابو پایا۔

”تم اتنی بہادر کیسے ہو۔ سمعیہ۔ میں تمہاری
 جگہ ہوتی تو شاید اس کی بات سن کر مرجاتی اور تم اتنا بڑا
 دھوکہ کھا کرتی رہی ہو؟“

”اللہ اس کو کبھی خوش نہیں رہنے دے گا۔ وہ
 سکون مانگے گا مگر اس کو سکون نہیں ملے گا۔
 صرف مادی چیزوں کے لیے اس نے تمہیں ٹھکرا
 دیا۔“

”اس دنیا میں مادی چیزوں کے علاوہ کچھ ہے بھی تو
 نہیں۔ اس نے بھی اپنا مستقبل سوچا۔ اس لیے مجھ
 جیسی سیدھی سادی لڑکی کو چھوڑ کر اس نے اس
 ”ڈاکٹر“ کو اپنا لیا۔“

”میری بددعا ہے۔ وہ کبھی خوش نہ رہے گا۔
 سمعیہ۔“

”مت دو۔ بددعا سے۔ اسے بھی حق ہے کہ وہ
 اپنا مستقبل بہتر بنائے اور اس کا بہتر مستقبل وہ لیڈی
 ڈاکٹر ہی ہے۔ بس اب میں چاہتی ہوں۔ طیبہ۔ کہ
 ہم اس بارے میں بات نہ کریں۔“

”سمعیہ۔! جی بھر کر رولو۔ میرے سامنے۔
 تمہاری آنکھیں آنسوؤں کی جلن کو برداشت نہیں کرپا
 رہیں۔ دیکھو۔ کتنی سرخ آنکھیں ہو گئی ہیں۔“

طیبہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے جب اس نے اپنی

”سمعیہ۔! اب تم تنہا نہیں ہو اور میں تمہیں
 کبھی تنہا ہونے نہیں دوں گا۔“ وہ اویس کو دیکھتی رہ
 گئی۔ جس نے اس کے ایک جملے سے محسوس کر لیا
 کہ وہ کتنی تنہا ہے اور ایک وہ شخص تھا جس سے اس
 نے بے پناہ محبت کی تھی اور پھر بھی وہ اس کو تنہا چھوڑ
 کر چلا گیا۔

کیا محبت وہ تھی جو اس نے نوسال اس شخص سے
 کی تھی یا پھر محبت یہ ہے۔ جس نے ایک ”جملے“ میں
 ہی اس کو سمجھ لیا اور اسے عزت دے کر اپنا نام دیا۔

اپنے گھر لے آیا۔ اویس جیسا شوہر یا کر اسے احساس
 ہوا کہ اس نے محبت کو اب سمجھا ہے۔

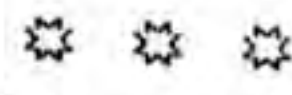
اور وہ اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا جب ہی فوراً
 گلابی جوڑے کو واپس ریک میں لٹکا دیا اور اس کے
 پسندیدہ نیلے رنگ کا سوٹ اٹھالیا۔

”یہ رنگ تمہارا فیورٹ ہے نا۔ یہ کیسا رہے گا۔“
 وہ مسکرائی۔ ”ہاں۔ یہ اچھا رہے گا۔“ اس نے

ایک دم خود کو سنبھالا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کبھی بھی وہ
 ”سعد“ یا اس کے ماضی کو جان پائے۔

”تو پھر شاپنگ ہو گئی ہو تو گھر چلیں۔ مجھے آفس
 سے کالز بھی آرہی ہیں۔“ اس نے اپنے سیل فون کو
 دیکھتے دیکھتے جواب دیا۔

اس نے سر ہلایا اور اس کے ساتھ چل پڑی۔



وہ اسے گھر کے دروازے پر چھوڑ کر آفس چلا گیا۔
 وہ شاپنگ بیگ اٹھا کر گھر میں داخل ہوئی اور ایک لمبا
 سانس اس نے صوفے پہ بیٹھ کر لیا۔ جب تک وہ
 گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھی اس کی سانس رک سی رہی

تھی۔ وہ ”شخص“ اس کی یاد۔ اس کے حلق میں
 پھنستی جا رہی تھی جس سے اس نے بے پناہ محبت کی
 تھی۔ وہ پھر سے اسے ماضی میں کھو گئی۔

”وہ ایسا کیسے کر سکتا ہے۔“ اس کی سہلی طیبہ چیخی،
 جب اس نے بتایا وہ شادی کر رہا ہے۔

بڑا بھائی دیر سے پہنچے گا تو لوگ کیا سوچیں گے؟“ اس نے محبت سے اس کی طرف دیکھ کر خریدی گئی چیزوں کو سمیٹنا شروع کر دیا۔

وہ اپنے جوتے اتار رہا تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے تیزی سے جوتے اتار دیے اور پھر فون پر کسی سے بات کرنے لگا۔

سمعیہ نے محبت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نظر اس کے جوتوں پر پڑی۔ اس نے اولیس کے جوتے اٹھائے اور انہیں کمرے سے باہر رکھ کر دروازہ بند کرنے لگی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے سعد نے جوتے سمجھ کر اسے اپنی زندگی سے باہر نکال دیا تھا۔ مگر وہ شاید یہ جانتا نہیں تھا کہ محبت جو تائیں ہوتی جسے پیروں سے اتار دیا جائے وہ تو خوشی ہوتی ہے جو بغیر دستک دیے زندگی میں داخل ہو جاتی ہے۔ اللہ نے سمعیہ کی زندگی میں بھی خوشیاں بھروی تھیں۔ کیوں کہ اس نے اپنے حصے کی محبت میں کبھی بے ایمانی نہیں کی تھی۔

For More Visit
Paksociety.com

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف
سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

سائلر خواتین ڈائجسٹ

نورجسٹریڈ

قیمت - 300 روپے



منقہ الہی تائید

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

سہیلی کو اندر ہی اندر سلگتے دیکھا۔ اس نے اپنی آنکھیں مسلیں اور مضبوط لہجے میں بولی۔ ”میں ٹھیک ہوں۔“

اس کی بات پر طیبہ زارو قطاریوں نے لگی۔ اور وہ اسے دلاسا دیتے دیتے کہہ رہی تھی۔ ”میں ٹھیک ہوں۔ میں ٹھیک ہوں۔“

اللہ نے اسے بہت ہمت دی تھی اور ہمت بھی ان لوگوں کے حصے میں آتی ہے جو اللہ کے بہت قریب ہوتے ہیں۔

وہ اپنے ماضی سے اولیس کی آواز سے باہر نکلی۔ ”سمعیہ سمعیہ۔“ وہ کرسی پر آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ جب وہ اس کے پاس بیٹھ کر اسے جگانے لگا۔

”ہاں۔ ہاں۔۔۔“ وہ یک دم چونکی۔ ”میں ہوں۔ اولیس۔“ وہ اس کے بوکھلانے پر فوراً بولا۔

”آپ۔۔۔ آپ آگئے۔؟“ اس نے نظریں چرائیں جن میں آنسو تیر رہے تھے۔ ”جی جناب۔۔۔ میں آگیا۔ اور آپ کی زندگی سے کبھی نہیں جانے والا۔“ وہ اس کی بات پر مسکرانے لگی۔

”تمہاری مسکراہٹ میں میری زندگی ہے۔ سوچتا ہوں۔ کہ کبھی میں نے تمہیں روتا دیکھ لیا۔ تو کہیں میں مرنے جاؤں۔۔۔ سچ سمعیہ! میں تم سے بہت محبت کرنے لگا ہوں۔ اللہ سے ہمیشہ یہی دعا مانگتا ہوں کہ ہماری زندگی میں کبھی کوئی پریشانی نہ آئے۔“ اس نے لمبا سانس لے کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ وہ اس کا تھا۔ جو اس کے سامنے تھا۔ اس کا سہارا بن کر۔ اس کا شوہر بن کر۔

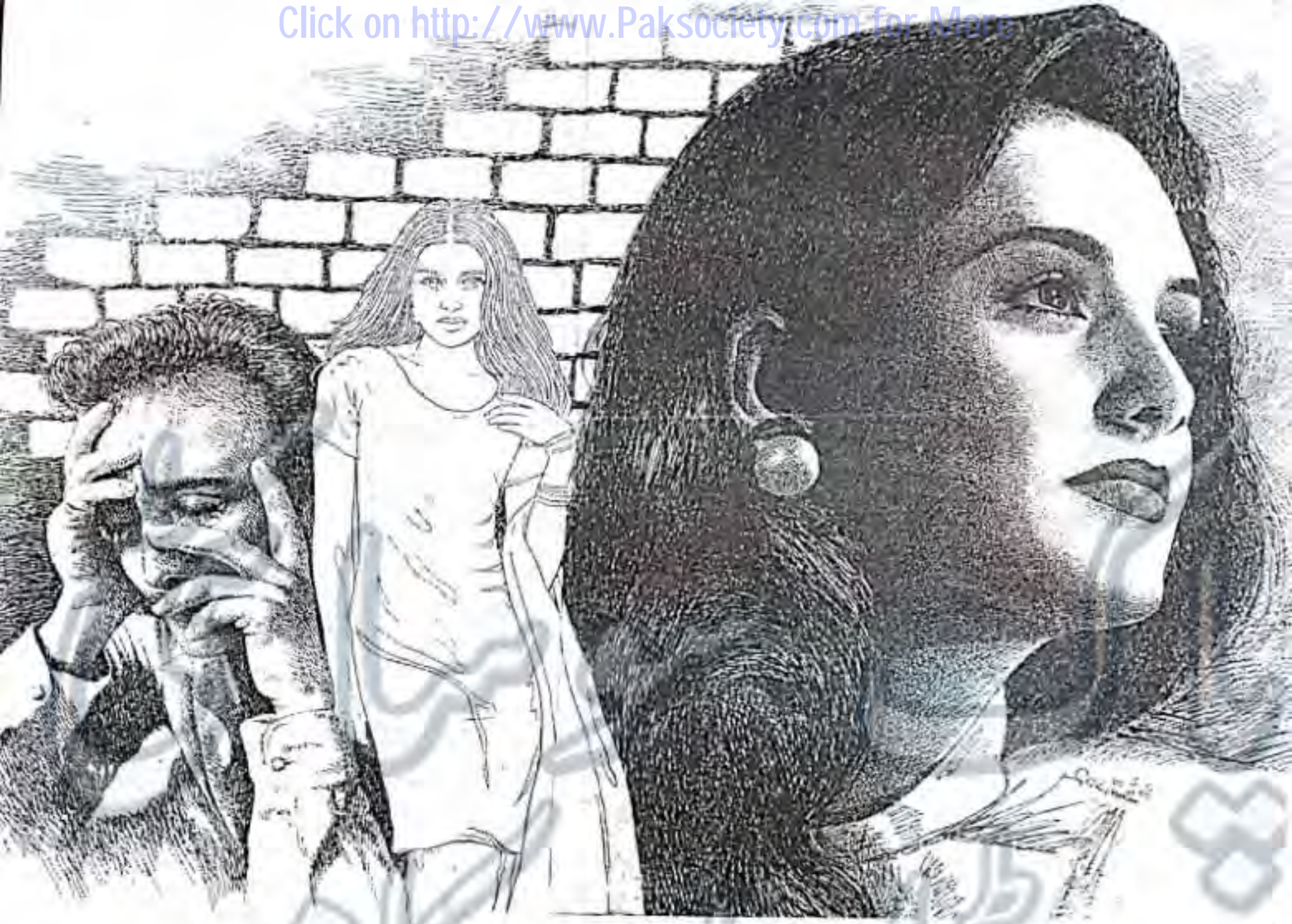
”اللہ نے آپ کو آپ کی محبت دے دی۔ اسی لیے تو میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اور ہمیشہ ساتھ رہوں گی۔ اور اب بس! بہت باتیں ہو گئیں۔ آپ چینیج کر کے آرام کر لیں۔ صبح پھر ہم لوگوں نے اسلام آباد کے لیے نکلنا ہے اور چھوٹے بھائی کی شادی پر اگر

Downloaded From Paksociety.com

نعمتہ احمد

تسللی

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف اس کا بھانجا ہے جو اس سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔ سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ حسین اور اسامہ سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر سعدی کی پھوپھی ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی۔ فائرنگ کے نتیجے میں بیوی مر جاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گروہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسا یا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے جس کی بنا پر زمر اپنے بھتیجے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔



مکھن تانؤن

جو اہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔
ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے۔ ہاشم اور اس کی بیوی شہین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کی ایک بیٹی سونیا ہے۔
جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔
فارس غازی ہاشم کی پھپھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں جس میں اس کا بھی حصہ ہے رہائش پذیر تھا۔ سعدی کی کوششوں سے فارس رہا ہو جاتا ہے۔
والد کے کہنے پر زمر سعدی کی سالگرہ پر اس کے لیے پھول اور ہاشم کی بیٹی سونیا کی سالگرہ کارڈ لے کر جاتی ہے۔ سعدی ہاشم کی بیوی سے ہاشم کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ مانگتا ہے۔ شہین اپنے دیور نوشیرواں سے جو اپنی بھابھی میں دلچسپی رکھتا ہے، بہانے سے پاس ورڈ حاصل کر کے سعدی کو سونیا سالگرہ میں دے دیتی ہے۔
پاس ورڈ ملنے کے بعد سعدی ہاشم کے کمرے میں جا کر اس کے لیپ ٹاپ پہ فلش ڈرائیو لگا کر ڈیٹا کاپی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔
چیف سیکریٹری آفیسر خاور ہاشم کو اس کے کمرے کی فوج دکھاتا ہے جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے، ہاشم خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے، لیکن سعدی اس سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔
ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمرے میں لیپ ٹاپ سے ڈیٹا کاپی کرنے آیا تھا اور شہین نے نوشیرواں کو استعمال کر کے پاس ورڈ سعدی کو دیا تھا۔ دوسری جانب بڑے ابا زمر کو یہ بتا دیتے ہیں کہ زمر کو کسی یورپین خاتون نے نہیں بلکہ سعدی نے گروہ دیا تھا۔ یہ سن کر زمر کو بے حد دکھ ہوتا ہے۔

نو شیرواں ایک بار پھر ڈر گزینے لگتا ہے اس بات پر جو اہرات فکر مند ہے۔

بعد میں سعدی لیب ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیماج ہو جاتی ہیں۔

سعدی حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے بائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے، حنین حیران ہو کر اپنی گیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر ”آئس ایور آفٹر“ لکھا ہوتا ہے۔ وہ علیشا ہے ورجینیا ہے۔ حنین کی علیشا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

اب کہانی ماضی میں آگے بڑھ رہی ہے۔ فارس، زمر سے لاء کی کچھ کلاسز لیتا ہے۔ ندرت اس سے شادی کا پوچھتی ہیں۔ وہ لا پرواہی سے زمر کا نام لے لیتا ہے۔ ندرت خوش ہو کر ابا سے بات کرتی ہیں۔ ان کی ساس فارس کو اجڈ اور بد تمیز سمجھتی ہیں اور اس کے مقابلے میں ندرت سے زمر کی بات طے کر دیتی ہیں۔ وارث غازی، ہاشم کے خلاف منی لانڈرنگ کیس کے پرکام کر رہا ہے۔ اس کے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ اس کا پاس فاطمی ہاشم کو خبردار کر دیتا ہے۔ ہاشم، خاور کی ڈیوٹی لگاتا ہے کہ وہ وارث کے پاس موجود تمام شواہد ضائع کرے۔ وارث کے ہاسٹل کے کمرے میں خاور اپنا کام کر رہا ہے۔ جب وارث ریڈ سگنلز ملنے پر اپنے کمرے میں جاتا ہے۔ پھر کوئی راستہ نہ ہونے کی صورت میں بہت مجبور ہو کر ہاشم، خاور کو وارث کو مار دینے کی اجازت دے دیتا ہے۔ دوسری صورت میں وارث، فارس کو وہ سارے شواہد میل کر دیتا۔ وارث کے قتل کا الزام ہاشم، فارس پہ ڈلو اتا ہے۔

زر تاشہ کو قتل اور زمر کو زخمی کرنا بھی فارس کو وارث کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی ہاشم اور خاور کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ وہ دونوں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ زر تاشہ مر جاتی ہے۔ زمر زخمی حالت میں فارس کے خلاف بیان دیتی ہے۔ فارس جیل چلا جاتا ہے۔ سعدی زمر کو سمجھاتا ہے کہ فارس ایسا نہیں کر سکتا۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ زمر کہتی ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی اور اپنے بیان پر قائم رہتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ زمر کی ناراضی کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی ہے کہ وارث کے قتل کے وقت بھی اس کی شادی لیٹ ہو جاتی ہے اور وہ اپنی شادی روک کر فارس کے لیے مقدمہ لڑتی ہے۔ اب وہی شخص اپنے اس قتل کو چھپانے کے لیے اسے مارنا چاہتا ہے۔ وہ بظاہر اتفاقاً ”بیچ جاتی ہے مگر اس کے دونوں گردے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور اس حادثے کی صورت اس کی شادی ٹوٹ جاتی ہے۔ حنین کی نیٹ فرینڈ علیشا دراصل اورنگ زیب کی بیٹی ہے جسے وہ اور ہاشم تسلیم نہیں کرتے۔ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے حنین سے دوستی کرتی ہے اور پڑھائی کے لیے کاردار سے پیسے کے لیے غریب قانونی پاکستان آتی ہے۔ مگر ہاشم اس سے بہت برے طریقے سے پیش آتا ہے اور کوئی مدد نہیں کرتا۔ زر تاشہ اور زمر کے قتل کے وقت فارس اور حنین وارث کیس کی ایلی بائی کے سلسلے میں علیشا کے پاس ہی ہوتے ہیں مگر علیشا ہاشم کی وجہ سے کھل کر ان کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

زمر فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ فارس کے خلاف بیان دے گی۔ گھر میں اس فیصلے سے کوئی بھی خوش نہیں، جس کی بنا پر زمر کو دکھ ہوتا ہے۔

جواہرات، زمر سے ملنے آتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ فارس کے خلاف بیان دے۔ وہ زمر کے ساتھ ہے اسی وقت زمر کا منگیتر اس کو دیکھنے آتا ہے۔ اس کی ہونے والی ساس یہ رشتہ حتم کرنا چاہتی ہے۔ جواہرات اس کے منگیتر کو اپنی گاڑی میں بٹھالیتی ہے اور اسے آسٹریلیا بھجوانے کی آفر کرتی ہے۔

سعدی، فارس سے ملنے جاتا ہے تو وہ کہتا ہے ہاشم اس قسم کا آدمی ہے جو قتل بھی کر سکتا ہے اور وہ فارس سے مخلص نہیں ہے۔

سعدی کو پتا چلتا ہے کہ اسے اسکا لرشپ نہیں ملا تھا۔ زمر نے اپنا پلاٹ بیچ کر اس کو باہر رہنے کے لیے رقم دی تھی۔ اسے بہت دکھ ہوتا ہے۔

زمر کو کوئی گروہ دینے والا نہیں ملتا تو سعدی اسے اپنا گروہ دے دیتا ہے۔ وہ یہ بات زمر کو نہیں بتاتا۔ زمر بدگمان ہو جاتی ہے کہ سعدی اس کو اس حال میں چھوڑ کر اپنا امتحان دینے ملک سے باہر چلا گیا۔

سعدی، علیشا کو راضی کر لیتا ہے کہ وہ یہ کہے گی کہ وہ اپنا گردہ زمر کو دے رہی ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر زمر کو پتا چل گیا کہ گردہ سعدی نے دیا ہے تو وہ کبھی سعدی سے گردہ لینے پر رضامند نہیں ہوگی۔
ہاشم حنین کو بتا دیتا ہے کہ علیشا نے اورنگ زیب کا ردوار تک پہنچنے کے لیے حنین کو ذریعہ بنایا ہے۔ حنین اس بات پر علیشا سے ناراض ہو جاتی ہے۔

ہاشم، علیشا کو دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس کی ماں کا ایک سیڈنٹ کروا چکا ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔ وہ علیشا کو بھی مروا سکتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ اور اس کی ماں بھی امریکن شہری ہیں۔
جواہرات، زمر کو بتاتی ہے کہ زمر کا منگیتر حماد شادی کر رہا ہے۔

فارس کہتا ہے کہ وہ ایک بار زمر سے مل کر اس کو بتانا چاہتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ اسے پھنسا یا جا رہا ہے۔ وہ ہاشم پر بھی شبہ ظاہر کرتا ہے، لیکن زمر اس سے نہیں ملتی۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمپیوٹر سے ڈیٹا چرا کر لے جا چکا ہے۔ وہ جواہرات سے کہتا ہے کہ زمر کی شادی فارس سے کرانے میں خطرہ ہے، کہیں وہ جان نہ جائے کہ فارس بے گناہ ہے، لیکن وہ مطمئن ہے۔ جواہرات، زمر کو بتاتی ہے کہ فارس نے اس کے لیے رشتہ بھجوایا تھا، جسے انکار کر دیا گیا تھا۔ زمر کو یقین ہو جاتا ہے کہ فارس نے اسی بات کا بدلہ لیا ہے۔ زمر، جواہرات کے اکسانے پر صرف فارس سے بدلہ لینے کے لیے اس سے شادی پر رضامند ہو جاتی ہے۔

ڈیڑھ ماہ قبل ایک واقعہ ہوا تھا جس سے سعدی کو پتا چلا کہ ہاشم مجرم ہے۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ نوشیرواں نے ایک ڈراما کیا تھا کہ وہ کوریا میں ہے اور اغوا ہو چکا ہے۔ تاوان نہ دیا گیا تو وہ لوگ اس کو مار دیں گے۔

ہاشم، حنین اور سعدی کو آدھی رات کو گھر بلا تا ہے اور ساری پچویشن بتا کر اس سے پوچھتا ہے، کیا اس میں علیشا کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

وہ حنین سے کہتا ہے کہ تم اس کے بارے میں پتا کرو۔ حنین کمپیوٹر سنبھال لیتی ہے۔ سعدی اس کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے۔ تب ہی ہاشم آکر اپنا سیف کھولتا ہے تو سعدی کی نظر پڑتی ہے۔ اس کو جو کچھ نظر آتا ہے۔ اس سے اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔

اس میں وارث کی بیٹیوں کی تصویر ہوتی ہے۔ جو وارث، ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ ہاشم کے سیف کے کوڈ آئینے میں دیکھ لیتا ہے اور کمرے سے اس کے جانے کے بعد سیف کھولتا ہے۔ اس سے ایک لقافہ ملتا ہے جس میں اس ریسٹورنٹ میں فائرنگ کے فوراً بعد کی تصویر ہوتی ہے، جس میں زمر خون میں لت پت نظر آتی ہے اور ایک فلیش ڈراما بھی ملتی ہے۔

تب اسے پتا چلتا ہے کہ ہاشم مخلص نہیں تھا۔ یہ قتل اسی نے کرایا تھا۔

حنین، نوشیرواں کی پول کھول دیتی ہے، وہ کہتی ہے کہ نوشیرواں پاکستان میں ہی ہے اور اس نے پیسے اینٹھنے کے لیے اغوا کا ڈراما چلایا۔

سعدی وہ فلیش سنتا ہے تو سن رہ جاتا ہے۔ وہ فارس کی آواز کی ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ جس میں وہ زمر کو دھمکی دیتا ہے۔ سعدی بار بار سنتا ہے تو اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ جعلی ہے۔ وہ فارس کے وکیل کو فارغ کر دیتا ہے۔ جو ہاشم کا آدمی تھا۔ سعدی، زمر کے پاس ایک بار پھر جاتا ہے اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فارس بے گناہ ہے۔ وہ کہتا ہے اس میں کوئی تیسرا آدمی بھی ملوث ہو سکتا ہے۔

”مثلاً کون؟“ زمر نے پوچھا۔

”مثلاً۔۔۔ مثلاً“ ہاشم کا ردوار۔۔۔ سعدی نے ہمت کر کے کہہ ڈالا۔ زمر سن سی ہو گئی۔

زمر کو ہاشم کا ردوار کے ملوث ہونے پر یقین نہیں آتا سعدی زمر سے کسی اچھے وکیل کے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ ریجان خلیجی کا نام لیتی ہے۔ سعدی فارس کا وکیل بدل دیتا ہے۔

حنین علیشا کو فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ جیل میں ہے کیونکہ اس نے چوری کی کوشش کی تھی۔ ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی نے وہ آڈیو حاصل کر لی ہے جس میں فارس کا جعلی فون ٹیپ ہے لیکن وہ مطمئن ہے کہ حج تو ان کا ہے۔

ہاشم کی بیوی شہین ایک کلب میں جو اکیلتی ہے اس کی سی سی ٹی وی فوٹیج ان کے کیمروں میں ہے۔ اسے غائب کرانے کے لیے سعدی کی مدد دیتی ہے۔

ریحان خلیجی عدالت میں زمر کو لا جواب کر دیتا ہے۔ یہ بات فارس کو اچھی نہیں لگتی۔ فارس جیل سے نکلنا چاہتا ہے لیکن اس کا ساتھی غلطی سے زمر کو اس میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زمر کا غصہ فارس کے خلاف مزید بڑھ جاتا ہے۔

زمر فارس سے ملتی ہے تو فارس کہتا ہے کہ ایک بار وہ اس کے کیس کو خود دیکھے۔ فارس کہتی ہے کہ وہ زمر سے معافی نہیں مانگے گا۔

جیل سے علیشا حنین کو خط لکھتی ہے وہ حنین سے کہتی ہے تم میں اور مجھ میں ذہانت کی علاوہ ایک اور چیز مشترک ہے وہ ہے ہماری برائی کی طرف مائل ہونے والی فطرت۔ اس لیے کسی کی کمزوری کو شکار مت کرنا۔ گناہ مت کرنا ورنہ کفارے دیتے عمر بیت جائے گی۔

حنین کو اپنا ماضی یاد آجاتا ہے جب اس نے کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا اور وہ شخص صدمہ سے دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ وہ کفارہ کے لیے آگے پڑھنے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ سعدی کو یہ ساری بات بتاتی ہے تو سعدی کو شدید صدمہ ہوتا ہے۔

اورنگ زیب نوشیرواں کو عاق کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جان کر جواہرات غصہ سے پاگل ہو جاتی ہے۔ وہ اورنگ زیب کو قتل کر دیتی ہے اور ڈاکٹر سے مل کر اسے بلیک میل کر کے پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اپنی مرضی کی حاصل کر لیتی ہے۔ زمر فارس کی طرف سے مشکوک ہے۔ وہ اسے خانے میں بنے کمرے میں جانے سے منع کرتا ہے لیکن زمر نہیں مانتی وہ کمرے میں جاتی ہے تو وہ دیوار پر کچھ تصویریں لگی دیکھتی ہے یہ وہ لوگ ہیں جو فارس کے مجرم ہیں۔ جسٹس سکندر (فارس کے کیس کے حج) وارث غازی کا باس الیاس فاطمی ڈاکٹر توقیر بخاری ڈاکٹر ایمین بخاری (فارس کی سائیکالوجسٹ) اور دوسرے لوگ۔۔۔ فارس کہتا ہے کہ وہ ان سب سے اپنے ساتھ کی گئی نائنصافی کا انتقام لے گا۔ سعدی جب نوشیرواں سے ملنے جاتا ہے تو ڈاکٹر سارہ کو ساتھ لے جاتا ہے۔ سعدی کو امید ہے کہ ڈاکٹر سارہ نے سب کو بتا دیا ہوگا۔

ہاشم نے حنین سے وہ یو ایس بی مانگی جو سعدی نے اس کے لیپ ٹاپ سے چرائی تھی۔ حنین نے دے دی تو زمر اور فارس کو بہت غصہ آتا ہے لیکن حنین بتاتی ہے کہ اس نے اصلی یو ایس بی نہیں دی تھی۔ ہارون عبید مشہور سیاست دان جو اہرات کے حسن کے اسیر ہیں۔ وہ ایک اسے ہیرا تحفہ میں دیتے ہیں۔ زمر احمر کو اپنا کوئی کام کرنے کے لیے کہتی ہے۔ احمر ہارون عبید کی الیکشن کمپین چلا رہا ہے۔ اب دار ہارون عبید کی بیٹی ہے جو سعد کے ساتھ پڑھتی رہی ہے۔

فارس زمر سے کہتا ہے کہ اس نے تین وجوہات کی بنا پر زمر سے شادی کی ہے۔ (1) زمر کے والد کے احسانات (2) شادی کر کے وہ سب کو یہ تاثر دینا چاہتا ہے وہ سب کچھ بھول کر نئی زندگی شروع کر چکا ہے۔

میسری وجہ وہ زمر کے اصرار کے باوجود نہیں بتاتا۔ حنین ہاشم کے بارے میں زمر کو بتا دیتی ہے۔ زمر کسی تاثر کا اظہار نہیں کرتی لیکن اسے ہاشم پر بہت غصہ ہے۔ زمر اسے اپنے جرم کے بارے میں بتاتی ہے تو زمر کہتی ہے کہ ایک اوسی پی ایک معمولی سی لڑکی کو دھمکی سے بلیک میل نہیں ہو سکتا۔ اس کی موت کسی اور وجہ سے ہوئی ہے۔

سعدی کی یاد میں ایک تقریب منعقد کی گئی ہے، جہاں احمر شفیق، ڈاکٹر ایمن بخاری اور ڈاکٹر توقیر بخاری بھی شریک ہیں۔ زمر اور فارس، حنین کو تقریر کرنے کا کہہ کر باہر نکل آتے ہیں۔ ڈاکٹر ایمن بخاری اور ڈاکٹر توقیر بخاری کا نیا تعمیر شدہ شان دار اسپتال جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ فارس اور زمر واپس تقریب میں آجاتے ہیں۔

حنین اور زمر ہاشم کی سیکرٹری حلیمہ کا نام سن کر چونک جاتی ہیں۔

ہاشم، سعدی سے کہتا ہے کہ حنین اس کے کہنے پر اس سے ملنے ہوٹل آرہی ہے۔ سعدی پریشان ہو جاتا ہے، پھر ہاشم اس کو فون پر حنین کا پروفائل دکھاتا ہے، تب وہ جان لیتا ہے کہ حنین چھ منٹ پہلے قرآن پاک کی وہ آیت پڑھ چکی ہے جو اس نے اپنے کمپیوٹر میں لوڈ کی تھی۔ سعدی پورے یقین سے کہتا ہے کہ ”حنین ہاشم سے ملنے نہیں آئے گی۔“ اور واقعی ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہاشم تلملا کر رہ جاتا ہے۔

جسٹس سکندر کی ایک ویڈیو جس میں وہ اوسی پی کو قتل کر رہے ہیں۔ ٹی وی چینلز پر چل جاتی ہے۔ یہ وہی ویڈیو ہے جو سعدی نے اوسی پی کے گھر سے حاصل کی تھی۔ زمر ڈاکٹر کے پاس جاتی ہے تو اس کو پتا چلتا ہے کہ اس کا واحد گروہ جو سعدی نے دیا تھا۔ ناکارہ ہو چکا ہے۔

سولہویں قسط

”میرا مرض مستمرا“

میں نے ایک سمرکیمپ اٹینڈ کیا تھا۔ اس چھتری جیسی لڑکی ٹوانلا اسٹینڈ بری کے ساتھ۔

وہ بہترین ایٹھلیٹ تھی۔

اسے فٹنس کا جنون تھا۔

جتنی دہلی ہو جائے، کم تھا۔

ایک پاؤنڈ ہاں سے ایک پاؤنڈ ہاں سے

ہرنی کی طرح بھاگتی تھی۔

مگر پھر وہ چلنے کے قابل بھی نہ رہی،

تب میں نے جانا کہ وہ ایوریکسکس (نفسیاتی بیمار) تھی۔

اس بیماری نے اس کی بصارت چھین لی تھی۔

میں نے نہیں دیکھا ٹوانلا سے زیادہ کسی کو

اپنے جسم کے بارے میں اتنا جنونی۔

ساری زندگی اس نے جس چیز کے پیچھے بھاگتے

گزارے،

اس نے اسے تباہ کر دیا۔

تم کہتے ہو برلن، انتقام تمہارا جنون ہے۔

میں تمہیں بتاؤں، انتقام جنون نہیں ہوتا۔

یہ تو ایک بیماری ہے۔

جو دل کو کھاتی ہے،

اور روح کو زہریلا کر دیتی ہے۔

(دی بلیک لسٹ کے کردار ”رحمنہ ریڈنگ ٹیم“ کا

مکالمہ)

ستمبر کے آخری ایام میں گرمی کم تھی، مگر جس اب

بھی تھا۔ ایسے میں اس اسپتال کی اوپن بلڈنگ کی ایک

کھڑکی سے جھانکو تو اندر ڈاکٹر قاسم بشارت کے کمرے

میں زمر بالکل خاموش بیٹھی تھی اور ڈاکٹر قاسم اس کو

تاسف سے دیکھ رہے تھے۔

”آپ کو اپنے ہرینڈ کو اعتماد میں لینا چاہیے تھا۔“

زمر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے۔“

آپ مجھے میری کٹنی کا بتائیں۔ کیا وہ مکمل طور پر ختم

ہو چکی ہے؟“ بظاہر مضبوط انداز سے پوچھا۔

”زمر! آپ نے چار سال اس ڈیفینڈ کٹنی پہ

گزارے ہیں۔“

”مگر یہ پرفیکٹ میچ تھا، آپ نے کہا تھا، میری

قسمت اچھی ہوئی تو بیس سال بھی گزار سکتی ہوں۔“

اسی جس زندان جب پرندے اکتائے اکتائے اڑ رہے تھے، ایک اور اسپتال کے پرائیویٹ روم میں اب وار عید ایک کرسی پہ بیٹھی تھی اور سامنے بستر پہ لیٹے مریض کی باتیں توجہ سے سن رہی تھی۔ وہ ایک درمیانی عمر کے صاحب تھے ابھی مکمل طور پہ صحت یاب نہیں ہوئے تھے۔ نالیاں وغیرہ ہنوز لگی تھیں۔ چہرے پہ بھی نقاہت تھی۔

”پچھلی ملاقات میں آپ مجھ سے اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں۔“ وہ نرمی اور رسلان سے کہہ رہی تھی۔ ”ویسے تو میں پہنچو ٹھہرا پٹ ہوں، مگر ایک رسرچ کے سلسلے میں مجھے آپ کا کیس سننا ہے۔ کیا آپ کمفو ٹیبل ہیں؟“

”جی! آپ پوچھتے۔“ انہوں نے نقاہت سے اسے دیکھتے سر ہلایا۔

”اوکے۔“ اب دار نے گہری سانس لی۔ ”آپ کی سرجری کے دوران جو اد صاحب! ایک وقت ایسا آیا تھا جب آپ کا دل بند ہو گیا تھا اور آپ کو واپس لانے میں ڈاکٹرز کو پچاس سیکنڈ لگے تھے۔ ان پچاس سیکنڈز کے لیے آپ کلینکلی مر رہے ہو چکے تھے۔“ وہ غور سے ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے ایک ایک لفظ کہہ رہی تھی۔ انہوں نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ ”ان پچاس سیکنڈز میں۔ کیا ہوا تھا؟ کیا دیکھا آپ نے؟“

جو اد صاحب کے چہرے پہ تکلیف ابھری۔ ذرا اسے شانے اچکائے۔ ”آپ یقین نہیں کریں گی۔“

”ڑائی ہی!“ وہ مسکرائی۔

انہوں نے گہری سانس لی۔ آنکھیں بند کر کے یاد کیا۔ ”اس وقت میری سرجری جاری تھی۔ نشے کے باوجود مجھے تکلیف ہو رہی تھی، کچھ آوازیں بھی کانوں میں بڑتی تھیں، ڈاکٹرز وغیرہ کی پھر میں نے سنا کہ وہ لوگ مجھے لوز کر رہے ہیں، ذرا سی افراتفری پھیلی۔“

وہ غور سے ان کو دیکھ رہی تھی۔ ”پھر؟“

”پھر جیسے اچانک سے میری ساری تکلیف ختم

ڈاکٹر۔ جی آنکھوں میں کرب سا ابھرا۔

”آئی ایم سوری زمر، مگر پچھلے تین ماہ سے نہ آپ دوا ٹھیک سے لے رہی ہیں، نہ چیک اپ کے لیے آتی ہیں، پچھلے ہفتے ٹیسٹس کے لیے بھی میں نے زبردستی آپ کو بلایا تھا۔“ دور کے گہری سانس لی۔ ”آپ کی کٹنی تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ مکمل نہیں، تقریباً۔“

”کتنے عرصے بعد مجھے نئی کٹنی کی ضرورت پڑے گی؟“

”جلد از جلد۔ جتنی دیر کریں گی۔ اتنا مسئلہ ہوگا۔ کیا آپ نے کسی اور ڈاکٹر کی رائے لی؟“

”جی، میں ڈاکٹر فاروق احسان کے پاس گئی تھی۔ ٹیسٹس بھی دوبارہ کروائے۔ ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ مجھے جلد از جلد ٹرانسپلانٹ کروانا ہوگا۔“ کمرے میں ایک آزرہ سی خاموشی آٹھری۔

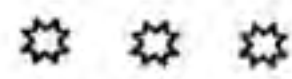
”کیا آپ کی فیملی میں کوئی ایسا ہے جو آپ کو کٹنی ڈونٹ کر سکے؟“ قدرے توقف سے انہوں نے پوچھا۔

”میں کوئی گیم تو نہیں کھیل رہی کہ ایک چیز ضائع ہو جائے تو دوسرے سے مانگ لوں۔ کٹنی ڈونیشن بہت بڑی بات ہے اور میں اپنی فیملی سے کچھ بھی نہیں مانگنا چاہتی مزید۔“ وہ اس سوال پہ ناخوش ہوئی۔

”اوکے ریلیکس!“ انہوں نے اسے تسلی دی۔

”میں ڈونر کا بندوبست کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جتنی جلدی اور گن ملے، اتنی جلدی ہم ٹرانسپلانٹ کریں گے، لیکن آپ نے پہلے کی طرح اب بد احتیاطی نہیں کرنی۔ میں پھر کہوں گا، آپ اپنی فیملی میں کسی کو راضی کرنے کی۔“

وہ مزید باتیں نہیں سن سکتی تھی۔ فضا میں موجود جس اور ٹھن بڑھ گئی تھی اس لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔



اپنی تلاش کا سفر ختم بھی کیجیے کبھی خواب میں چل رہے ہیں آپ

تھی، مگر ٹوب لائٹ یا سورج یا چاند کے جیسی روشنی نہیں۔ وہ مختلف قسم کی تھی۔ شاید اسی کو نور کہتے ہیں، مگر وہ صرف نور نہیں تھا، وہ نور کا وجود تھا۔ light A being of آپ سمجھ رہی ہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟

”میں سمجھ رہی ہوں۔ کیا اس نے آپ سے بات کی؟“ وہ بغور ان کے چہرے کی اذیت دیکھ رہی تھی۔ ”جی۔ مگر ایسے نہیں جیسے انسان کرتے ہیں، الفاظ سے نہیں، پھر بھی میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ مجھے کیا سمجھانا چاہ رہا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ ابھی میرا وقت نہیں آیا، اور یہ کہ مجھے واپس جانا ہوگا۔“ انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ ”پھر ہر شے ریوائنڈ ہوگئی۔ میں واپس ہوتا ہوا اپنے جسم میں داخل ہو گیا۔ بھاری اور وزنی۔“

”اس وجود کے قریب کیا محسوس کیا آپ نے؟“
”غیر مشروط محبت۔ احساس قبولیت۔ علم کی تڑپ۔ وہ سراپا محبت تھا۔ وہ کون تھا؟ اور کیا یہ صرف ایک خواب تھا؟“

”نہیں، یہ NDE تھا Experiance Near Death (موت کی قربت کا تجربہ) آپ سمیت دنیا میں ہزاروں لوگ اس سے گزر چکے ہیں۔ چونکہ آپ کی موت کا مقررہ وقت ابھی نہیں پہنچا تھا۔ اس لیے آپ مر کر بھی زندہ ہو گئے۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”رہی بات کہ وہ کون تھا، تو آج تک کوئی انسان نہیں بتا سکا کہ وہ کون تھا۔ اس تجربے سے گزرنے والے یہود کہتے ہیں کہ وہ جبریل علیہ السلام تھے، عیسائی کہتے ہیں وہ مسیح ابن مریم تھے، مسلمان کہتے ہیں کہ وہ ملک الموت عزرائیل علیہ السلام تھے، لیکن مجھ سے پوچھو تو اس سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ نورانی وجود جو مر کر زندہ ہونے والوں کو ملتا ہے، وہ کون ہے۔ فرق اس سے پڑتا ہے کہ وہ آپ کو کیا سکھاتا ہے؟“ اپنی چیزیں سمیٹ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”مجھے اب چلنا چاہیے۔“

ہوگئی، میں نے خود کو بہت ہلکا محسوس کیا۔ میں اس بارے میں کسی سے بات کرنا نہیں چاہتا، لیکن آپ پوچھ رہی ہیں تو۔“ سر جھٹکا۔ ”ایسے جیسے میں کسی بوجھ سے آزاد ہو گیا ہوں۔“
”اس کے بعد کیا ہوا؟“

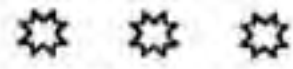
”میں نے۔ محسوس کیا کہ وہ آنکھیں موندے وقت سے بول رہے تھے۔“ کہ جیسے کوئی مجھے کھینچ رہا ہے۔ میں آپریشن ٹیبل پہ لیٹا تھا۔ میں نے خود کو اس کے نیچے سے نکلتا محسوس کیا، ہلکا اور آزاد، اور اس کے آگے۔ ایک تاریک جگہ تھی، جیسے کوئی غار یا سرنگ ہوتی ہے، میں اس میں سے گزر کر دوسری طرف نکلتا گیا۔“ اب دار نے نوٹ بک پہ کچھ لکھتے ہوئے پوچھا۔ ”پھر؟“

”اس غار نما تاریکی سے نکل کر میں نے دیکھا کہ۔ میں اسی آپریشن ٹیبل پر ہوں، مگر اوپر۔ فضا میں تیر رہا ہوں۔ آپ یقین نہیں کریں گی، مگر میں نے اوپر سے دیکھا کہ نیچے ٹیبل پہ میرا جسم لیٹا ہے، اور ڈاکٹرز مجھے مسلسل ریوائنڈ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“
اس دفعہ اب دار نے کانڈ کو دیکھے بنا چند الفاظ گھسیٹے۔ ”اس کے بعد کیا ہوا؟“

”اس کے بعد۔“ انہوں نے یاد کیا۔ ”میں نے اوپر فضا میں دیکھا، اپنے والد کو، اور ایک بچی کو جو میرے بچپن میں اسکول میں کرنٹ لگنے سے مر گئی تھی اور ابھی چند فوٹ شدہ رشتہ داروں کو۔ وہ مجھے دیکھ رہے تھے لیکن میرے اور ان کے درمیان ایک سرحد تھی، مادی سرحد نہیں، نہ ہی کوئی لکیر، وہ ایک ایسی ان دیویدھی باؤنڈری تھی جسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا، میں اس طرف تھا اور وہ لوگ دوسری طرف، وہ مجھے مسلسل واپس جانے کا کہہ رہے تھے، اور میں نہ آگے جاسکتا تھا نہ پیچھے مڑ سکتا تھا۔“
”کیا آپ نے وہاں کسی اور کو دیکھا؟“

کتنے ہی لمحے وہ کچھ نہ بولے۔ پھر اسی طرح بند آنکھوں سے اثبات میں سر ہلایا۔ ”روشنی۔ وہ روشنی

”آپ خوش نہیں لگ رہیں جیسے آپ کو جس چیز کی تلاش تھی وہ آپ کو نہیں ملی۔“
 آپ وار کی گردن میں گلٹی سی ابھر کر معدوم ہوئی۔
 وہ جبراً مسکرائی۔ ”کوئی بات نہیں۔ آپ آرام کیجیے۔“ اب وہ مسکرا کر الوداعی کلمات کہہ رہی تھی۔



کہ جس ہاتھ میں پتھر کماں میں تیر نہ ہو کوئی بھی ایسا مرے شہر مہراں میں نہ تھا قصر کاردار کے لاؤنج میں اس صبح کھلی کھڑکیوں سے روشنی چھن چھن کر آرہی تھی۔ شہرین بیڑھیاں چڑھتی اوپر آئی اور ہاشم کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اندر وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا تھا۔ شرٹ کے کالر کھڑے تھے اور میز پر رکھی تین عدد ٹائیز میں سے ایک اٹھا رہا تھا۔ آہٹ پہ نظر اٹھا کر آئینے میں دیکھا۔ سفید شرٹ اور خاکی پینٹ میں بلبوس، سنہرے پالوں کی اوپچی پونی بنائے شہری، مسکراتی ہوئی آرہی تھی۔

”سونی، ہم دونوں کو اپنے اسکول فنکشن میں ساتھ ساتھ دیکھ کر بہت خوش ہوگی۔ اونہہ گھرے ٹائی نہیں چلے گی اس کے ساتھ۔“ وہ آگے آئی اور ہاشم کے ہاتھ سے نرمی سے گھرے لے کر رکھی اور بلیو اٹھائی۔ ہاشم نے بس مسکرا کر اسے دیکھا بولا کچھ نہیں۔ شہری اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”شیرو کی کمپنی کیسی جارہی ہے؟ میں نے سنا ہے تم دونوں ہارون عبید کے ساتھ شراکت داری کر رہے ہو اس کمپنی میں؟“ اس کے کالر مزید کھڑے کیے اور ٹائی گردن میں ڈالی پھر گرہ لگانے لگی۔

”تم نے صحیح سنا ہے۔“
 وہ ہاشم کی آنکھوں میں دیکھ کر گرہ کو اوپر تک لائی۔
 ”ہاشم! مٹھاس سے بکارا۔“ سعدی کہاں ہے؟“
 ”یہ سوال تو مجھے تم سے پوچھنا چاہیے۔ تمہاری

بہت دوستی تھی اس سے۔“ وہ بھی اسی انداز میں

مسکرایا۔
 ”جس گن سے اسے مارا گیا ہے وہ گلا کس جی فورتی ون تھی۔ شیرو کے پاس ہے ایسی گن۔ انکار مت کرنا۔“ مسکرا کر اس کے کھڑے کالر سیدھے کے پھر ٹائی کی ٹاٹ پکی کی۔ ”کہیں یہ نہ ہو کہ میں فارس کو کل کر دوں۔“ اب وہ ڈریسنگ ٹیبل سے ٹائی پن اٹھانے مڑی تو ہاشم نے اپنا موبائل اٹھایا۔ شہری واپس ہوئی، اس کی ٹائی کو شرٹ کے ساتھ پن کے ذریعے نتھی کیا، تو ہاشم نے نمبر ملا کر اسپیکر آن کیا۔ تیسری گھنٹی پہ فارس کا ”ہیلو؟“ کمرے میں گونجا۔ ٹائی پن لگاتی شہری نے چونک کر ہاشم کو دیکھا۔ وہ اسی طرح مسکرا رہا تھا۔

”فارس یار! شہری کو تم سے ضروری بات کرنی ہے، اس کے فون کی بٹنری ختم تھی۔ اس کی بات سن لو ذرا!“ اعتماد سے موبائل اس کی طرف بڑھایا۔ شہری کے ہاتھ اس کی ٹائی پن پہ ہی جم گئے۔ دم بخود ساکت۔ فارس ”ہیلو؟“ کہہ رہا تھا اس نے بدقت تھوک نکلا۔

”ہاں فارس، کیسے ہو؟“ زخمی آنکھوں سے ہاشم کو دیکھتے جبراً ”مسکرا کر بولی۔“ ”کتور کے پہلے ویک اینڈ پہ ہماری ہاؤس وارمنگ ہے۔ تم آسکو گے؟“
 ”نہیں۔ بڑی ہوں۔“ ذرا توقف سے بولا۔ ”اور کچھ؟“

”نہیں۔ تھینک یو۔“ جلدی سے بولی۔ ہاشم نے فون بند کر کے میز پر ڈالا۔ ہر فوم اٹھا کر خود کو آئینے میں دیکھتے گردن پہ چھڑکا۔ فضا ایک دم معطر ہو گئی۔

”تمہارے تو العناظ ہی غائب ہو گئے شہری یقیناً اس لیے کہ تمہارے باپ کا سارا کاروبار میرے اوپر تمہارے سنا میرے اوپر انحصار کرتا ہے۔ رہی سعدی کی بات تو اس کو غائب کرنے میں میرا نہیں، تمہارا ہاتھ ہو سکتا ہے اور اگر تم نے فارس کو کچھ کہنا ہوتا تو بہت پہلے کہہ دیتیں۔ کوٹ؟“ کوٹ کی طرف اشارہ کیا۔ شہری نے مرے مرے ہاتھوں سے کوٹ کو سامنے کیا۔ ہاشم نے اس میں اپنے بازو ڈالے اور پھر اسے کندھوں پہ برابر

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- ✽ کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- ✽ بے ہال آگاتا ہے۔
- ✽ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- ✽ مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- ✽ یکساں مفید۔
- ✽ ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت - 120/- روپے

سوہنی ہیرائل 12 جزی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریداجا سکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف - 120/- روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے منی آڈر بھیج کر جسرڈ پارسل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے ----- 300/- روپے
- 3 بوتلوں کے لئے ----- 400/- روپے
- 6 بوتلوں کے لئے ----- 800/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل ان جگہوں

سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔

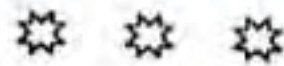
فون نمبر: 32735021

کرتے اسی طرح بولتا گیا۔

”اور جو گن میں نے شیرو کو گفٹ کی تھی، وہ جی فونٹی فائیو تھی۔ اس کا تمام پیپر ورک میرے لا کر میں موجود ہے۔ سوائگلی دفعہ مجھے بلیک میل کرنے کے لیے کوئی بہتر طریقہ ڈھونڈنا بجائے۔“ کوٹ کو بٹن بند کرتے ہوئے اس کی طرف گھوما اور مسکرا کر اس کے کندھے پہ لٹکا برس اتارا۔ مجھے چہرے والی شہری حرکت بھی نہ کر سکی۔ ”بجائے میرا اعتراف ریکارڈ کرنے کے۔“ پرس سے ریکارڈنگ پہ رکھا سیل فون نکال کر اس کے سامنے لہرایا، اور دروازے تک آیا۔ فیٹونا کو بلایا۔

”اس کو چولہے میں پھینک دو۔“ سیل فون اس کو تھماتے درستی سے بولا۔ پھر مڑ کر بت بنی شہری کو دیکھا۔

”تم آرہی ہو یا میں اکیلا جاؤں؟“
”مجھے تمہاری نئی کمپنی میں شیئر زچا، نہیں۔ تینتیس فیصد۔“ بمشکل گردن اکڑا کر بولی۔ ہاسم مسکرایا۔
”شہری۔“ چہرہ اس کے کان کے قریب کیا۔ ”میں تمہیں اپنی کمپنی سے ایک پائی بھی نہیں دینے والا۔“
وہ باہر نکل گیا تو شہری نے تلملا کر پیر پٹھا۔



ہم پھر بھی اپنے چہرے نہ دیکھیں تو کیا علاج؟
آنکھیں بھی ہیں، چراغ بھی ہے، آئینہ بھی ہے
اس صبح حنین اسٹڈی ٹیبل پہ اپنی پسندیدہ کتاب
”درمیان“ کھولے بیٹھی تھی۔ کچھ دن سے وہ اسے
باقاعدگی سے پڑھ رہی تھی اور اٹھاسی فصلیں پڑھنے
کے بعد دل پہ گناہوں سے لگنے والے زنگ کو سمجھنے
کے بعد وہ اس فصل پہ پہنچ گئی تھی جس کا اسے انتظار
تھا۔

”باب 89 - مرض عشق کی دوا!“

ایک عمری سانس لیتے ہوئے اس نے پوری توجہ
سے وہ دروازہ ڈھونڈا جو قدیم زمانوں میں لے جاتا تھا،
اور پھر گتے زمانوں میں خود کو غرق

کرتے ہوئے پٹ کھول دیے۔
 دوسری جانب ایک روشن دھوپ واضح ہوئی۔
 چلچلاتی ہوئی دھوپ ایک چراگاہ پر بکھری تھی۔ سبز
 ہر سو سبز۔ اور اس زمری گھاس پر سفید پھولے
 پھولے سے بھڑجا بجا گھاس چرتے دکھائی دے رہے
 تھے۔ کیا واقعی دمشق میں اتنا سبز تھا؟ مگر کوئی بات
 نہیں۔ یہ حند کی دنیا تھی۔ وہ قدم قدم چلتی آئی اور
 ایک پتھر بیٹھے شیخ کے دائیں جانب آئی تھی۔ جھکے
 کندھوں کے ساتھ اس نے محض اتنا کہا۔
 ”میں آگئی ہوں۔ مجھے بتائیے کیا ہے میرا
 علاج؟“

اس کا دل پھر سے شکوک و شبہات کا شکار ہونے
 لگا۔ سات سو سال پرانے شیخ کو کیا معلوم موبائل،
 انٹرنیٹ، آئل کارٹیلز، پاکستان کے مرڈر ٹرائلز اور ان
 سارے مسئلوں کا جو اسے درپیش تھے، مگر پھر بھی اس
 نے سنا چاہا۔ شیخ کا پہلا توڑ۔
 ”غض بصر۔“

”آ۔ مطلب؟“ اسے عربی بھول بھال گئی تھی۔
 ”اپنی نگاہ کو پست رکھو، نگاہ کی حفاظت کرو۔ اس کو
 نہ دیکھو جس کی وجہ سے دل کھویا ہے۔“ حسین نے
 حیرت سے ان کو دیکھا جن کی نگاہیں سامنے تھیں۔
 بھیڑ چراگاہ میں چر رہے تھے۔ ہوا چل رہی تھی، مگر حند
 کا دل غ الجھ گیا۔

”نگاہ پست کرنے سے کیا ہو گا؟“
 ”وہ فائدے ہیں۔ سنو گی؟“ شیخ نے مسکرا کر چہرہ
 اس کی طرف موڑا۔ حند نے اثبات میں سر ہلایا۔
 ”پہلا۔ یہ اللہ کا حکم ہے اور جو بھی انسان فلاح پاتا
 ہے، وہ حکم الہی مان کر ہی فلاح پاتا ہے اور جو ناکام ہوتا
 ہے، وہ حکم نہ ماننے کی وجہ سے ناکام ہوتا ہے۔“
 حسین مزید توجہ سے سننے لگی۔

”دوسرا فائدہ۔ اس کی نظر جو زہر آلود تیر تمہارے
 دل تک پہنچا کر تمہارا دل ہلاک کرتی ہے، آنکھ کی
 حفاظت سے وہ تیر تمہارے دل تک نہیں پہنچے گا۔“ وہ
 انگلیوں پر گنوار ہے تھے۔

”سوم، نظر کی حفاظت سے دل میں پوری توجہ سے
 اللہ کے لیے محبت پیدا ہوتی ہے، ورنہ جن لوگوں کی نگاہ
 آزاد اور آوار رہتی ہے ان کا دل منتشر رہتا ہے۔ آزاد
 نگاہی بندے اور اللہ کے درمیان حائل ہو جاتی
 ہے۔“

شیخ اپنے سفید سرمئی لباس میں بیٹھے تھے۔ نگاہیں
 دور چرتے، ٹھیکڑوں پر تھیں۔ دھیرے سے بولے
 ”وقف الہوی بی حیث انت فلس لی۔ متاخر عنہ
 ولا متقدم“

(تیری محبت نے مجھے وہاں لاکھڑا کیا ہے جہاں تو
 ہے۔
 اب یہاں سے مجھے نہ کوئی پیچھے ہٹا سکتا ہے نہ
 آگے بڑھا سکتا ہے۔)

”درست۔ میں بھی ایسے ہی نقطے پر کھڑی ہوں۔“
 وہ بھی سامنے دیکھنے لگی۔ ”میرا دل جل رہا ہے، میں
 بے چین ہوں، مضطرب ہوں۔ کیا اس قابل جلو کے
 اتار کا کوئی منتر ہے؟ میرے دل میں یہ مرض مستمر پراتا
 مسلسل چلے آنے والا مرض) اپنی جگہ بنا چکا ہے اور
 میں اپنا دل کھو چکی ہوں۔ کیا میں پھر سے اپنے دل کی
 مالکن بن سکتی ہوں؟ وہ گناہگار ہے، قابل ہے، پھر بھی
 میں اس سے نفرت نہیں کر پارتی۔“

”مریض محبت کو سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینا
 چاہیے لڑکی! کہ کسی شخص کے قبضے سے اپنا دل
 چھڑانے کے لیے اس کو ”بھولنا“ یا اس سے نفرت کرنا
 ضروری نہیں۔“

”بھولے بغیر سو آن کیسے کیا جائے پھر؟“
 ”اس کا علاج کر کے انسان کو چاہیے کہ اس
 مرض کو یا تو پیدا نہ ہونے دو، لیکن اگر پیدا ہو چکا ہے تو

”صحیح!“ وہ منہمک ہو کر سن رہی تھی۔

”چہارم۔ آنکھ کی حفاظت سے دل مضبوط اور پرسکون رہتا ہے اور آزاد نگاہی یعنی ہر غلط چیز یا شخص کو دیکھ لینے سے دل مغموم رہتا ہے۔“

”تہجم۔ نگاہ پست رکھنے سے دل میں ”تور“ پیدا ہوتا ہے۔ کیا تم نے غور نہیں کیا کہ سورہ نور میں اللہ نے غصہ بصر کی آیت کے بعد ہی آیت نور پیش کی؟ کیونکہ دل میں نور نظروں کی حفاظت سے داخل ہوتا ہے اور جب دل نورانی ہو جائے تو ہر طرف سے خیر اور برکت اس انسان کی طرف دوڑتی ہے۔ اور جن کے دل اندھیر ہوں ان کو شر اور تکالیف کے بادل گھیرے رکھتے ہیں۔“

چراغہ اور اس کے اجلے اجلے بھیسڑ ہر چیز حسین کے ذہن سے محو ہو چکی تھی اور وہ کھل یکسوئی سے سن رہی تھی۔ بوڑھا استاد کہہ رہا تھا۔

”ششم۔ تم اللہ کا اصول جانتی ہو۔ اس کے لیے جو چھوڑو گے وہ اس سے بہتر عطا کرے گا۔ تم ”نگاہ“ چھوڑو، وہ بدلے میں ”نگاہ“ عطا کرے گا۔ وہ تمہیں بصیرت دے گا، فہم و فراست کی نگاہ عطا کرے گا اور تمہاری فراست کبھی خطا نہیں ہوگی۔ مومن اسی نگاہ کی وجہ سے ایک سوراخ سے دوسری بار نہیں ڈسا جاتا۔“

حسین کے دل کی گرہیں کھل رہی تھیں۔

”ساتویں چیز۔ آزاد نگاہی سے انسان ذلیل ہوتا ہے اپنے نفس کے قدموں میں خود کو رول کو بے توقیر کر دیتا ہے، مگر جو نگاہ کی حفاظت کرتا ہے اللہ اس کو عزت دیتا ہے، لوگوں میں بھی فرشتوں میں بھی۔“ وہ سانس لینے کو رکے۔

”آٹھویں بات۔ نگاہ کے ذریعے شیطان اتنی تیزی سے دل میں جا پہنچتا ہے جتنی تیزی سے کسی خلی جگہ میں خواہشات بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ وہ امیدیں دلاتا ہے گناہوں کی توجیہات پیش کرتا ہے اور انسان گناہ کی آگ میں یوں جلتا ہے جیسے کسی بکری کو تھور میں ڈال کر بھونا جائے۔ اسی لیے شہوت پرستوں کو قیامت

کے دن آگ کے تھوروں میں ڈالا جائے گا۔“

”گور۔“ وہ چونکی۔ ”یہ جو جنم کی سزائیں اللہ تعالیٰ نے بتائی ہیں، یہ گناہوں کو Symbilize کرتی ہیں، جیسا گناہ اسی شکل کی سزا؟“

”تو میں چیخے۔ غصہ بصر سے دل کو قرآن پہ غور و فکر کرنے کو موقع ملتا ہے۔ ورنہ جن کی نگاہیں آوارہ ہوں ان کے دل اتنے پھنسے اور الجھے ہوتے ہیں کہ یہ فراغت ان کا مقدر نہیں بن سکتی۔“

”آخری یعنی دسویں چیز!“ انہوں نے گہری سانس لی۔ ”انسان کے دل اور آنکھ کے درمیان ایک سوراخ ہے، ایک راستہ ہے۔ جس کلم میں آنکھ مشغول اسی میں دل مشغول ہوتا ہے۔ ایک کی اصلاح سے دوسرے کی اصلاح ہوتی ہے، ایک کے فساد سے دوسرے کا فساد ہوتا ہے۔ اس لیے اپنی نگاہ کو صاف رکھو اس شخص کو نہ دیکھو جس کی طرف دل ہمکتا ہے، کیونکہ یہ تمہارے لیے حرام ہے۔ اگر حلال ہوتا تو ٹھیک تھا، لیکن حلال نہیں ہے۔ سو جب اپنی نگاہ کی مالک بن جاؤ گی تو دل کو بھی واپس حاصل کر لو گی۔ یہ پہلا طریقہ کرو۔“

حسین نے کتاب بند کی تو قدیم زمانوں کا فسوں، سبز چراغہ اور اجلے بھیسڑ سب عائب ہو گئے، آنکھیں موند کر اس نے کتاب پر سر رکھ لیا۔ وہ صبح شام کھڑکی سے ہاشم کی بالکونی دیکھا کرتی تھی، وہ کب آتا ہے، کب جاتا ہے اسے ساری خبر تھی۔ کیونکہ نگاہ وہیں لگی تھی۔ یہ نظر ہوتی ہے جو اونٹ کو ہانڈی اور انسان کو قبر تک پہنچاتی ہے۔ کیا نظریہ والی حدیث کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے؟ وہ کسی اور دنیا میں گم سوچے جا رہی تھی۔



میں اپنے باپ کا یوسف تھا اس لیے محسن سکوں سے سونہ سکا، بھائیوں سے ڈرتا رہا سعدی یوسف کے زنداں خلتے میں خاموشی تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ کھڑا کلم سے ایک لیکر لگا رہا

میں نے تمہیں وہ نیکلس والی بات بتائی ہے، وہ سب یاد آنے لگا ہے۔ جب مسز کاردار نے علاج کی رقم دینے سے انکار کیا تو کیسے فہنوٹا میری ہمدردی کر مجھے اکسائی تھی کہ ان کا نیکلس چرالوں۔ اس کو ان کے جیولری باکس کا کوڈ بھی معلوم تھا۔

”اسے کیسے پتا تھا؟“ وہ چونکا۔

”صاف بات ہے، مسز کاردار مجھے نوکری سے نکالنا چاہتی تھیں، مگر کانٹریکٹ کے تحت میرا دورانیہ رہتا تھا ابھی، سو فہنوٹا نے ان کے ایما پہ سارا کھیل ترتیب دیا۔ میں نے چوری کر ڈالی اور ڈی پورٹ ہونے کے قریب تھی کہ تمہاری وجہ سے ہاشم مجھے یہاں لے آیا۔“

”مسز کاردار کو کانٹریکٹ سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”ہاشم بلا وجہ ان کو اپنے باپ کی ملازمہ کو نہ نکالنے

Downloaded From
Paksociety.com

رتا۔“ وہ الجھا۔

”ان میاں بیوی کے تعلقات کبھی اچھے نہیں رہے۔ اورنگ زیب کاردار مجھ سے جواہرات یہ نظر رکھواتے تھے، وہ اسی لیے مجھ سے بدظن رہتی تھیں۔ حالانکہ ان کی پسند کی شادی تھی۔ جواہرات نے اپنے ایک بے حد چاہنے والے کو ٹھکرا کر اورنگ زیب سے شادی کی، اور اورنگ زیب کی پہلی شادی بھی تڑوائی، اس سے اورنگ زیب کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ جواہرات نے اورنگ زیب کو دو بیٹے دیے۔ دولت دی۔ مگر اب وہ ایک دوسرے سے بے زار ہو چکے تھے۔“

”تمہیں یہ سب کیسے پتا ہے؟“

میری مسکرائی۔ ”بے وقوف لڑکے، میں اس گھر کی ملازمہ رہی ہوں، مالک سمجھتے ہیں جیسے ہماری زبان نہیں، ویسے ہمارے کان بھی نہیں ہیں مگر ہم ہر کھانے پہ ہر چائے پر موجود ہوتے ہیں۔ گھر کے سارے راز ہمارے سینوں میں دفن ہوتے ہیں۔“

”واؤ۔ خیر اب کیا چیز تمہیں ڈسٹرب کرتی ہے؟“

”وہ رات، جب اورنگ زیب کاردار کی موت

تھا۔ نیلی جینز پہ سبزی شرت بنے تھی وہ اب پہلے سے دبلا لگتا تھا۔ میری نے میز پہ کھانے کی ٹرے رکھتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہاں کونے میں کئی اور لیکریں بھی لگی تھیں۔ چار ماہ اور دو دن۔ وہ قید کے دنوں کا یوں حساب رکھتا تھا۔

”کیا آج ہماری عید ہے، میری؟“ میز کی طرف آتے اس نے اداسی سے پوچھا۔

”نہیں، کل ہے۔“

(مجھے یہاں شاید چار ماہ ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک کوئی میرے لیے نہیں آیا۔ کیا واقعی میرے گھر والے میرے لیے کوشش کر رہے ہوں گے) سوچتے ہوئے وہ بے دلی سے کھانا شروع کرنے لگا۔ پھر رک کر اسے دیکھا۔

”میری اینجیو۔ رات کو کیا ہوا تھا؟ تم پڑھتے پڑھتے اس کاؤچ پہ سو گئی تھیں، پھر نیند میں ایک دم سے اٹھیں اور باہر چلی گئیں۔ دیکھو مجھے تمہارے اہر آنے پہ اعتراض نہیں۔ اگر تو میں تمہیں پسند آگیا ہوں تو میرے جیسے ہینڈ سم لڑکے۔“

”بکومت۔ تم میرے بیٹے سے چند سال ہی بڑے ہو گے۔“ خفگی سے اسے جھڑکا۔ پھر ایک ہاتھ سے کپٹی سہلائی۔ ”میں سونے جا رہی ہوں، گارڈ برتن لے جائے گا۔ مایا تو اب دلے بھی نہیں آتی۔“ اسے پتا تھا کہ میری کے سوا وہ کسی کو اپنے کمرے میں برداشت نہیں کرتا۔

”اگر تم نے رات کو کوئی برا خواب دیکھا ہے تو بتاؤ، میں تمہیں اس کی تعبیر بتاتا ہوں، یا صاحب السعین!“

”خود کو جوزف سمجھنا چھوڑو اور کھانا کھاؤ۔“ درشتی سے ٹوکتی وہ سامنے بیٹھ گئی۔ مگر سحری نے کھانا ڈھک دیا۔

”کون سا خواب ہے جو تمہیں اکثر رات کو نیند سے جگا رہتا ہے؟“

میری کچھ لمحے خاموش رہی، پھر بولی تو لہجہ ذرا نرم تھا۔ ”پہلے نہیں۔ پہلے تو میرے بیٹے کا ہی خیال آتا

تھا۔ اس کا علاج ہاشم کروا رہا ہے۔ مگر جب سے

ہوئے وہ ناخوش لگ رہی تھی۔ شاید کچھ اور تھا جو اسے ہمیشہ سے الجھاتا تھا۔



میں اپنے ڈوبنے کی علامت کے طور پر دریا میں ایک آدھ بھنور چھوڑ جاؤں گا جسٹس سکندر کے ڈرائنگ روم میں زرد تیاں جلی تھیں۔ لی وی اسکرین پر مسلسل وہی خبر چل رہی تھی۔ سامنے ٹہلتے جسٹس صاحب نے غصے سے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کیا۔ پھر ہاشم کو دیکھا جو ٹانگہ ٹانگہ جھا کر بیٹھا تھا بازو صوفے کی پشت پر پھیلا رکھا تھا اور ناخوشی کے باوجود خود کو پرسکون رکھے ہوئے تھا۔

”میرا گھر سے نکلنا تک عذاب کر دیا ہے رپورٹرز نے آپ کو تو کسی نے یہاں آتے نہیں دیکھا؟“

”نہیں۔ خاور نے کالونی خالی کروالی تھی پولیس سے۔“ ہاشم نے ناک سے مکھی اڑائی۔ تب ہی خاور اندر داخل ہوا۔ دروازہ بند کیا اور جسٹس صاحب کے مقابل آکھڑا ہوا۔

”یہ سب نہ ہوا ہوتا سر اگر آپ ہیں مئی کو مجھے پوری بات بتاتے۔ آپ نے بتایا کہ سعدی آپ کو آپ کے بینک اکاؤنٹس کی تفصیلات اور آپ کے الفیئر کی تصاویر کے ساتھ بلیک میل کر رہا ہے جو اسے آپ کے کمپیوٹر سے ملی تھیں۔“

”یہ سچ ہے۔ اس نے میرے کمپیوٹر کے ری سائیکل بن سے منٹائی ہوئی چیزیں نکال لی تھیں۔“ وہ سچ کہہ رہے تھے۔

”اور ویڈیو؟ اس ویڈیو کا کیوں نہیں بتایا آپ نے؟“

جسٹس سکندر نے سر جھٹکا اور آگے پیچھے ٹھلنے لگے وہ سخت کبیدہ خاطر نظر آ رہے تھے۔

ہاشم نے قدرے ٹھنڈے انداز میں پکارا۔ ”وہ ویڈیو سعدی کو کہاں سے ملی تھی۔“

”میں نہیں جانتا۔“

”کیا آپ یہ جانتے ہیں کہ وہ اب کس کس کے پاس

ہوئی۔“ اس نے جھرجھری سی لی۔ ”شاید اندر سے میں خود اتنے برس مسز کاردار کی محبت بھری ایک پکار کی منتظر رہی ہوں۔ اس رات زندگی میں پہلی اور آخری دفعہ انہوں نے مجھ سے مسکرا کر بات کی تھی۔ میں اوپر ہاشم کی بالکونی میں پودے دیکھ رہی تھی ساتھ فون پر اپنے بیٹے سے بات کر رہی تھی۔“ وہ یاد کر کے جتا رہی تھی۔ ”وہ نیچے اپنے ہاتھ روم کے دروازے سے جو پچھلے برآمدے میں کھلتا تھا باہر نکل رہی تھیں۔ ان کو سردی میں دیکھ کر مجھے فکر ہوئی میں نے ان کو کچھ گرم اوڑھنے کا مشورہ دیا۔ وہ مسکرائی تھیں۔ پھر مجھے اور رنگ زیب کے لیے کافی لانے کا کہا۔ سب اچھا تھا۔ مگر کچھ وقت بعد اور رنگ زیب صاحب کی موت۔“ جھرجھری لی۔ ”اس کے بعد سعدی! وہ کبھی بھی میرے ساتھ اچھی نہیں رہیں۔ ہر وقت ترش اور خفا۔ سعدی! میں نے گیارہ سال ان لوگوں کی خدمت کی۔ مگر ان میں سے کسی نے گیارہ منٹ انٹرنیٹ پر میرے بیٹے کے کیس کو سرچ نہیں کیا۔ صرف تم نے احساس کیا تھا میرا۔ کاش میں نے تمہارے لیے اس قعر کا دروازہ کبھی نہ کھولا ہوتا۔“

”میری! وہ ہمدردی سے آگے ہوا۔“ تم اس رات کو اس لیے بار بار دیکھتی ہو کیونکہ تم نے اور رنگ زیب کاردار جیسے اپنے ایک حمایتی کو کھویا تھا۔ تم دل سے چاہتی ہو کہ وہ واپس آجائیں۔ اور کچھ نہیں۔“

”کیا میرے خواب کا کوئی مطلب نہیں نکلتا؟“ جوزف؟“ اسے مایوسی ہوئی۔

”اگر ہم قدیم مصر کے قید خانے میں ہوتے اور میرے ساتھ فرعون کی کنیر قید ہوتی تو تمہارا خواب بہت قیمتی ہوتا“ اس کے بدلے میں یا تو تمہیں سزائے موت دی جاتی اور پرندے تمہارا سر نوچ کھاتے یا تم ایک دفعہ پھر سے شاہی محل جا کر ملکہ اور اس کے بیٹوں کی خدمت کرتیں۔ مگر نہ میں جوزف ہوں نہ مجھے خواب کی تعبیر بتانی آتی ہے میں تو تمہارا دل ہلکا کرنا چاہتا تھا۔“

میری نے غیر مطمئن انداز میں سر ہلایا مگر اٹھتے

”جو بھی پوچھنا منہ زبانی پوچھنا۔ اس پر کسی قسم کا
ٹارچر مت کرنا۔“ خاور اس بات سے شدید کوفت کا
شکار ہوا مگر خاموش رہا۔ اسے فارس سے زیادہ وکیل پہ
شبہ تھا۔



”میں جب بھی عالم حیرت میں آئینہ دیکھوں؟
ہزار نیزوں پہ اپنا ہی سر نظر آئے
انیکسی پہ دم توڑتے سمبر کی وہ قدرے جس آلود
رات اتر رہی تھی۔ نیچے تہہ خانے میں زمر چند
کانڈزات کھول کھول کر دیکھ رہی تھی اور فارس ادھر
ادھر ٹپکتے ہوئے فون پہ بات کر رہا تھا۔ حسین انگلی سے
میز پہ لیکریں بتا رہی تھی۔“

”خلجی صاحب نے بھی لا علمی ظاہر کی ہے۔ کسی
کو نہیں معلوم کہ سعدی کا وکیل کون تھا۔“ فارس نے
فون رکھا تو زمر نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ بلیک پیئٹ پہ
گرے شرٹ بنے، وہ چھوٹے کٹے بالوں پہ ہاتھ
پھیرتے الجھا الجھا لگ رہا تھا۔

”ہو سکتا ہے فارس، سعدی نے جھوٹ بولا ہو اس
کا کوئی وکیل نہ ہو۔“
”نہیں، اس نے کسی کو تو بتایا ہو گا۔“ وہ مطمئن
نہیں تھا۔

”حالانکہ بھائی کو یہ سب ہمیں بتانا چاہیے تھا۔“
حسین نے صرف سوچا، مگر شاید اس کا ذمہ دار سعدی
نہیں، وہ اور زمر تھیں۔

”ویڈیو کی فائرنگ جلد آجائے گی۔ جج مستعفی
ہو جائے گا مگر وہ کبھی گرفتار نہیں ہو گا، ویڈیو جعلی اور
اوسی پی کی موت طبعی قرار دے دی جائے گی۔ کچھ دن
بعد میڈیا نیا ای شو پکڑ لے گا اور اس کو سب بھول جائیں
گے ویلکم ٹو پاکستان!“

”۳ بھی تک سوائے پولیس کے، کوئی کھل کر جج کی
حمایت میں سامنے نہیں آیا۔ دیکھتے ہیں۔“ ان دونوں
کی باتوں سے حسین کو بورت ہونے لگی تو اوپر چلی
آئی۔

ہوگی؟ کیونکہ میرے خیال میں یہ فارس غازی کا کام
ہو سکتا ہے۔“ ہاشم پر یقین تھا۔
”اونہوں۔“ ججس سکندر نفی میں سر ہلاتے
سامنے صوفے پہ بیٹھے۔ ”وہ دلخ سے نہیں ہاتھوں
سے سوچتا ہے، اپنی تہی پلاننگ سے نہیں کر سکتا۔“

ہاشم اور خاور نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ہاشم
نے گہری سانس لی۔ ”وہ میرا کزن ہے، میں برسوں سے
اس کو جانتا ہوں، یہ اسی کا کام ہے۔“

”اس لڑکے نے کہا تھا کہ یہ ویڈیو صرف اس کے
وکیل کے پاس ہوگی، اگر سعدی کو کچھ ہوا تو وکیل اس کو
ریلیز کر دے گا۔“ خاور نے چونک کر انہیں دیکھا۔
ہاشم کے بھی ابرو بھنچے۔

”کون ہے اس کا وکیل؟“

”زمر یوسف نہیں ہے، کوئی اور ہے۔“

”تو سر اس نے چار ماہ انتظار کیوں کیا؟“ خاور کو
الجھن ہوئی۔ ”گلے ہی دن ویڈیو کیوں نہ ریلیز
کر دی؟“

”وہ (گالی) میرے ہائی کورٹ جج بننے کا انتظار کر رہا
ہو گا۔ میں کوئی عام جج نہیں ہوں، میرا بھائی سیکرٹری
ہے، سیاسی خاندان ہے میرا۔ اور اب (گالی) کی وجہ
سے مجھے استعفیٰ دینا پڑ رہا ہے۔ مجھے نہیں پتا ہاشم، لیکن
لڑکا تمہارے پاس ہے، اس سے پوچھو کہ ویڈیو کس
نے ریلیز کی ہے، اس سے پوچھو ورنہ اگر میں ڈوبتا تو یاد
رکھنا، تم سب کو لے ڈوبوں گا۔“ وہ غصے سے انگلی اٹھا
کر کہہ رہے تھے۔ ہاشم نے ہاتھ اٹھا کر دھیرج کا اشارہ
کیا۔

”آرام سے یور آنر۔ ہارون عبید اور ہاشم کاردار
جیسے دوستوں کی موجودگی میں آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔“
مگر واپس کار میں بیٹھے ہوئے اس نے خاور سے کہا
تھا۔

”سعدی سے اس وکیل کے بارے میں پوچھنا
ہو گا۔“

”آپ کو نہیں سر، مجھے پوچھنا ہو گا۔“ خاور سختی
سے بولا تو ہاشم نے ایک گہری نظر اس پہ ڈالی۔

داری سے کہنے لگی۔ ”آپ کہہ دیں ماموں سے کہ آپ کے گھنٹوں میں درد ہے اور آپ نہیں جاسکتیں سو وہ چلے جائیں۔ آگے سے وہ کہیں گے، اچھا میں حنین اور سیم کو ساتھ لے جاتا ہوں۔ آپ کہنا کوئی ضرورت نہیں، اپنی بیوی کو لے کر جاؤ۔ وہ کچھ نہیں کہیں گے، بلکہ صرف زمر پھپھو کو دیکھیں گے، وہ خود ہی کہہ دیں گی کہ میرا تو کورٹ میں فلاں کام ہے، آپ کہنا ہفتہ کی شام کون سا کورٹ ہوتا ہے؟ پھر وہ تین جذباتی ڈانٹا لگ بولنا کہ میرا سعدی ہوتا تو وہی چلا جاتا، ساتھ آنکھوں میں آنسو بھی لے آتا، جیسے دادی کے سامنے ایکٹنگ کرتی تھیں ویسے ہی، بس پھر دونوں مان جائیں گے۔“

چٹکی میں مسئلہ ہی حل کر دیا حنین نے۔ ندرت کا بس جوتے پہ ہاتھ جاتے جاتے رہ گیا۔ بڑے ابا مسکرا کر کتاب پڑھنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد کھانے کی میز کے گرد سب بیٹھے تھے اور خاموشی سے کھانا کھایا جا رہا تھا۔ تب ہی ندرت نے بات چھیڑی۔

”فارس! شبنم باجی کے بیٹے کا ولیمہ ہے اگلے ہفتے تمہارا الگ کارڈ بھیجا ہے۔“

اس نے لقمہ لیتے ہوئے محض سر ہلا دیا۔

”میرے گھنٹوں میں بہت درد ہے آج کل، ایسا کرو تم چلے جاؤ، صرف چند گھنٹوں کی ہی تو بات ہے۔“

فارس نے رک کر انہیں دیکھا۔ بڑے ابا نے مسکرا کر سر جھکایا۔

”میں؟“

”میں نہ کہتی مگر جانا ضروری ہے، اچھا نہیں لگتا۔“

”اچھا۔“ فارس کی نظریں حنین کی طرف اٹھیں۔

”حننا اور سیم کو ساتھ بیچ دیں پھر۔“

بے خبر سیم کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”ہیں؟ سچی؟ کب جانا ہے؟“ حنین نے زور سے اس کے پاؤں پہ اپنا جوتا مارا، اس کی بولتی بند ہوئی، پھر بے چارگی سے فارس کو دیکھا۔ ”سوری ماموں، میرے ایگزامز ہیں۔“

”ان دونوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے، انہوں نے

کل عید تھی۔ اس دفعہ حنین نے نئے کپڑے نہیں لیے تھے۔ امی سعدی کے لیے بھی نئے کپڑے نہیں لائی تھیں۔ پتا نہیں کیوں۔

وہ کچن کی گول میز پہ آ بیٹھی۔ لاؤنج میں ٹی وی چل رہا تھا اور بڑے ابا قریب بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ ندرت اس کے ساتھ آ بیٹھیں۔

”شبنم باجی کے ہاں سے کارڈ آ گیا ہے۔ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ان کے بیٹے کی شادی ہے۔ سوچ رہی ہوں ولیمہ بھگتا آوں، ذکیہ خالہ اور سارہ کے ساتھ۔“

”امی! آپ کا جانا ضروری ہے کیا؟“ وہ سوچ میں ڈوبی ہوئی۔ بڑے ابا نے چونک کر کتاب سے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

”اے لو۔ ضروری کیوں نہیں؟ خاندان کا معاملہ ہے پھر کچھ دینا دلانا بھی پڑتا ہے۔“

”اف امی، پوری بات تو سنیں۔“ وہ جھلائی۔ ”آپ کا بھی شائستہ خالہ سے وہی رشتہ ہے نا جو فارس ماموں کا ہے؟“

”ہاں تو؟“

”تو ماموں سے کہیں نا کہ وہ چلے جائیں۔“ لیا اسے دیکھتے زیر لب مسکرائے۔ مگر ندرت نہیں سمجھی تھیں۔

”اس کو کیوں تنگ کروں حنین؟ وہ بے چارہ پہلے ہی کام میں مصروف رہتا ہے، اس کے پاس وقت کہاں ہوتا ہے۔“

”نہی تو میں کہہ رہی ہوں امی۔ ان کے پاس وقت نہیں ہوتا کیونکہ وہ پچھلے چار ماہ سے سعدی بھائی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ امی، وہ لوگ اپنی شادی کے بعد سے ایک دفعہ لمبی باہر کھانا کھانے نہیں گئے۔ کبھی ساتھ گھومنے نہیں گئے۔ سعدی بھائی کے ساتھ یہ سب انہوں نے نہیں کیا۔ پھر ہم کیوں سارا بوجھ ان دونوں پہ ڈال دیں۔ اور ان کو کوئی امپرسیس ہی نہ دیں۔“

ندرت چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔ ”مجھے تو خیال ہی نہیں آیا۔“

”مگر مجھے تو آگیا۔ اب سنیں۔“ پر جوش سی راز

پائے گا؟ مایوسی اس کے رگڑے میں پھیلنے لگی۔
 پاکستان میں عید کی دوسری شام قصر کاروار میں باربی
 کیونگی مہک پھیلی تھی۔ طویل ڈاننگ ٹیبل پہ ڈنر سجا
 تھا اور تینوں کاروارز کے ہمراہ ان کے انیکسی والے
 رشتے دار موجود تھے۔ یہ ڈنر ہاشم کی طرف سے تھا اور
 وہ پرانی کرسی پہ براجمان تھا۔ دوسری سربراہی کسی پہ
 فارس بیٹھا تھا۔ ہاشم کی سیدھ میں۔

ڈنر سرو کیا جا رہا تھا، موم بتیاں جل رہی تھیں۔
 ملازم بار بار تازہ اشیاء لارہے تھے۔ سیم کا دھیان صرف
 کھانے پہ تھا۔ ندرت جواہرات سے نارمل بات چیت
 کر رہی تھیں۔ بڑے ابا بھی نارمل تھے۔ نوشیرواں انہی
 بے زار، سر جھکائے کھانا زہر مار کر رہا تھا۔ فارس اپنی
 کرسی پہ بیٹھا بے نیاز، مگر آکتایا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ سب
 نارمل تھے۔ سوائے دو لوگوں کے۔

ندرت کے دائیں بائیں بیٹھی زمر اور حنین۔

زمر تنے نقوش اور سنجیدہ چہرے کے ساتھ بیٹھی
 تھی۔ گود میں رکھی دوسری مٹھی بار بار بھینچ لیتی لیکن
 حتی الامکان کوشش تھی کہ آنکھوں میں وہ غصہ نہ نظر
 آئے جو اندر ابل رہا تھا۔ ذہن میں وہ سارے ماہ و سال
 چل رہے تھے جب وہ ہاشم کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی رہی،
 کیسے جواہرات اسے اسپتال میں دیکھنے آئی تھی، اور وہ
 کبھی نہ جان سکی کہ یہ لوگ، آف زمر یہ ابھی مت
 سوچو۔

حنین بالکل سر جھکائے آہستہ آہستہ کھا رہی تھی۔
 وہ غصے میں نہیں تھی۔ وہ تکلیف میں تھی۔ ہاشم نے
 اسے ایک دفعہ بھی مخاطب نہیں کیا تھا، اس کا دل جل
 رہا تھا، لیکن اداکاری جاری تھی۔ (وہ کتنے سکون سے
 فون پہ سعدی کے سامنے اس امتحانی مرکز والے وکیل
 کو کال کر کے کہہ رہا تھا کہ وہ حنین کا کیس کھلو اسکا
 ہے؟ حنین اس کے لیے کیا تھی؟ ایک بے وقوف
 لڑکی؟ کاش وہ اس سے نفرت کر سکے، مگر نفرت بھی
 نہیں ہو پارہی تھی۔ مگر یہ تو طے تھا کہ وہ اس کو دیکھے گی
 نہیں۔) (نگاہ کی مالک بنے گی تو دل کی مالک بنے گی۔)
 ”جسٹس سکندر کے ساتھ بہت برانداز کیا گیا ہے“

تمہیں زمر کے ساتھ بلایا ہے، تو تم دونوں میاں بیوی
 چلے جاؤ نا۔“

زمر نے نوالہ منہ میں رکھتے چونک کر انہیں دیکھا۔
 پھر فارس کو۔ اس نے بھی زمر کو دیکھا۔ پھر وہ سب بھل کر
 بولی۔

”بھابھی میں ضرور جاتی، مگر کورٹ میں میری ایک
 ضروری سماعت ہے اور۔“

”ارے ہفتے کی رات کون سا کورٹ ہوتا ہے؟
 ویسے بھی اگر میرا سعدی ہوتا تو میں تمہیں کبھی نہ کہتی،
 مگر۔“

”ٹھیک ہے، ہم چلے جائیں گے۔“ فارس نے
 سنجیدگی سے بات ختم کی۔ زمر بھی چپ ہو گئی۔ بڑے
 ابا تسلسل زیر لب مسکراتے ہوئے کھانا کھا رہے
 تھے۔ حنین نے ابا کو ”میں نہ ہوتی تو اس گھر کا کیا بنتا؟“
 والی نظروں سے دیکھ کر خریہ شانے اچکائے۔



قاتل نے کس صفائی سے دھوئی ہے آستیں
 اس کو خبر نہیں کہ لہو بولتا بھی ہے
 عید قربان بہت سی قربانیوں کی داستان اپنے اندر
 سموئے آئی۔ تو اس موسم میں خوشی سی کھل گئی۔
 سعدی یوسف نے اپنے کمرے کی دیوار پہ آج ایک لکیر
 کا مزید اضافہ کرتے ہوئے ان کو گنا تو معلوم ہوا اس قید
 میں اسے چار ماہ اور دو دن بیت چکے تھے۔ دل کے نہاں
 خانے میں شکوہ پھر سے اٹھا تھا۔ گیا ان چار ماہ میں کسی
 نے اس کے لیے کچھ نہیں کیا؟ مگر پھر سر جھٹک دیا۔
 اور ہاتھ روم میں آیا۔ کموڈ کے اوپری ٹینک کا ڈھکن
 کھولا۔ اندر کلنگ فلم (جو سینڈویچ کے اوپر سے وہ اتار
 کر سنبھال لیتا تھا) میں لپٹی چند چیزیں رکھی تھیں جو
 اس نے گزرے دنوں میں جمع کی تھیں۔ گارڈ کالاسٹر۔
 ایک اسٹیل کا کائنا۔ کانٹے کے دانٹوں کو اس نے لاسٹر
 سے پگھلا پگھلا کر ایک Pick بنانے کی کوشش کی
 تھی، مگر وہ پوری طرح سے نہ بن پائی تھی۔ اس کو یاد تھا
 کہ لاک کیسے کھولتے ہیں۔ مگر کیا یہ لاکس وہ کھول

سائنس لے کر دوبارہ سے کھانے لگی۔ وہ نارمل نہیں تھی۔ وہ نارمل رہی بھی نہیں تھی۔
 ”زمر کیا آپ نے جسٹس صاحب کی خیریت پتا کی؟
 ہو سکتا ہے ان کو آپ کی کسی مدد کی ضرورت ہو۔“ ہاشم نے اسے پھر مخاطب کیا۔ فارس نے گلاس لبوں سے لگاتے ہاشم کی آنکھوں پر نظریں جمائیں۔
 ”تمہیں اس جج کی اپنی فکر کیوں ہے ہاشم؟“
 ایک دم سے سب نے چونک کر اسے دیکھا۔ مگر ہاشم کھلے دل سے مسکرایا۔

”تمہاری وجہ سے تمہیں بری کرنے والے جج کی کریڈیٹ بیلٹی پہ حرف آئے گا تو اصل پریشانی تو تمہیں ہوگی نا۔“ فارس بس خاموشی سے اسے دیکھتا رہا تب ہی فینونا کیمرو لے چلی آئی۔
 ”میں فیملی فوٹوز اتار لوں سر؟“ اس نے ہاشم سے پوچھا تو زمر نے چونک کر اسے دیکھا پھر اشارہ کیا۔
 ”بھی نہیں کھانے کے بعد“ فینونا نے تابع داری سے کیمرو رکھ دیا۔

”اب ڈیزرٹ یہ توجہ دینی چاہیے۔“ جواہرات نے مسکرا کر ماحول کا تناؤ کم کرنا چاہا۔ ندرت اور ابا سعدی کے ذکر کے بعد خاموش ہو گئے تھے ملازم برتن بدلنے لگے۔ زمر نے موبائل پہ حسین کو ایک ٹیکسٹ کیا۔ وہ ذرا چونکی، لیکن پھر معذرت کر کے صداقت کو کوئی کام یاد کروانے کا کہہ کر چلی گئی۔ تین چار منٹ بعد واپس آکر خاموشی سے بیٹھ بھی گئی۔
 کھانا ختم ہوا اور سب لاؤنج میں جانے لگے تو زمر نے فینونا سے تصاویر اتارنے کا کہہ دیا۔ اس نے خاموشی سے چند تصاویر اتریں اور ہر دفعہ کی طرح ان کو ایک کاپی دینے کا وعدہ کیا۔

چائے بھی اسی رسمی تناؤ سے بھرے ماحول میں پی گئی۔ نوشیرواں ڈسٹرب سا پہلے ہی اٹھ کر جا چکا تھا۔ ہاشم اور جواہرات آخری پل تک میزبانی نبھاتے رہے۔ جاتے سے زمر سے ملتے ہوئے جواہرات نے سرگوشی کی۔ ”ہنی! مجھے لگتا ہے تم نے اپنا انتقام کا ارادہ بدل دیا ہے۔“

یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے زمر! ہاشم نے جتنے سکون سے اسے مخاطب کیا، زمر نے اتنے ہی اطمینان سے چہرہ اٹھایا۔ فارس بالکل آرام سے کھانا کھاتے ہوئے ان دونوں کو دیکھتا رہا۔
 ”ظاہر ہے ان کے کسی دشمن کی ہوگی لیکن نہ وہ گرفتار ہوں گے نہ کسی مشکل میں پڑیں گے۔“
 ”مگر ان کو اپنی کرسی چھوڑنی پڑے گی زمر!“
 ”تو کیا ہوا؟“ وکالت شروع کر دیں گے۔ الیکشن لڑیں گے، بار چلائیں گے۔ ایک قتل ہی کیا ہے نا۔“
 اس نے شانے اچکائے۔

”اف!!“ جواہرات نے نزاکت سے جھرجھری لی۔ ”کوئی انسان اتنی سفاکی سے کیسے کسی کی جان لے سکتا ہے؟ پتا نہیں اس کو رات کو نیند کیسے آتی ہوگی؟“
 بہت ہی حیرت اور افسوس سے تبصرہ کیا۔ زمر نے گود میں رکھی مٹھی مزید زور سے بھینچ لی۔ ایک کاٹ دار نظر صرف جواہرات پہ ڈالی مگر خاموش رہی۔

”پھپھو! کس نے کیا ہوگا ان کے ساتھ ایسا؟“
 سامنے بیٹھے سیم نے پوچھا تو زمر نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ چودھویں سالگرہ کے بعد بڑا بڑا لگنے لگا تھا۔ قد بھی نکال رہا تھا۔ آواز بھی بھاری ہو رہی تھی۔
 ”یہ تو جج صاحب کو ہی معلوم ہوگا کہ ان کا دشمن کون ہے۔ مجھ سے پوچھو تو یہ گناہ ہیں جو انسان کا تعاقب کرتے ہیں۔ اب دیکھو۔“ زمر لا پرواہی سے بولی۔ ”ہمارے سعدی کو کسی نے گولیوں سے بھون کر رکھ دیا ہم نے سعدی کو ڈھونڈ سکے نہ ان لوگوں کو لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ لوگ چین سے رہیں گے۔ کوئی بھی قتل کر کے بچ نہیں سکتا۔ جرم کی اذیت ہی انسان کی جان کو آجاتی ہے۔“

نوشیرواں کا پلیٹ میں چلتا کاٹناست ہو گیا۔ جھکے چہرے پہ ایک دم اکتاہٹ اور اذیت نمودار ہوئی۔ ہاشم نے البتہ سر ہلا کر شربت کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔
 ”بالکل۔ ایسا ہی ہے۔ ڈونٹ ویری سیم سعدی جلد مل جائے گا۔“ مسکرا کر نرمی سے تسلی دی۔
 حسین نے ضبط سے آنکھیں میچ لیں۔ پھر گہری

ہیں۔ تاکہ سعدی کو مہنٹلی ٹارچہ کر سکیں کہ دیکھو، تمہاری فیملی تم سے بے فکر ہو کر اپنی دنیا میں گم ہے۔“
 ”اوہ!“ اس کے لب سکڑے، پھر آنکھیں یکدم چمکیں۔ ”یعنی ہمیں ان کے فونز ہیک کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ہم ان کے ہاتھوں سے ان ہی کے ذریعے بھائی کو پیغام بھیج سکتے ہیں، پھپھو!“
 زمر نے نرمی سے مسکرا کر اسے دیکھا۔
 ”تم مجھے صرف زمر بھی کہہ سکتی ہو۔“

حسین یک دم بالکل ٹھہر گئی۔ منظر دھندلا ہو گیا۔ وہ ایک چھ سالہ بچی کے روپ میں ڈھل گئی جو شرمیلی آواز میں ندرت سے کہہ رہی تھی۔ ”بھائی پھپھو کو پھپھو نہیں کہتا امی۔ میں بھی زمر کہہ لیا کروں؟“
 ”بیٹا بھائی بڑا ہے، اس کی اور بات ہے مگر تم تمیز سے پھپھو کہا کرو۔“ شرمیلی آنکھوں کی جوت ایک دم بچھ گئی۔ دھندلا منظر گم ہو گیا، وہ واپس سبزہ زار پہ گھڑی تھی اور زمر اس کے آگے چلتی دور جا رہی تھی۔ اس کے آدھے بندھے گھونٹھریا لے بال ہلکے ہلکے جھول رہے تھے۔
 حسین نم آنکھوں سے مسکرائی۔ ”او کے زمر!“ اور اس کے عقب میں ہوئی۔



عجیب پیشہ وری کے عجیب تر ہیں معیار جو سنگ زن ہے وہ آئینہ گر نظر آئے ہارون عبید کے اونٹے قصر کو گھیرے، سبزہ زار سے شام کی ٹھنڈی ہوا سرسراتی ہوئی گزر رہی تھی۔ گھاس نم تھی اور اس پر مور ٹہل رہے تھے۔ آب و ہوا بھی سوچ میں گم، ننگے پاؤں چل رہی تھی۔ چہرہ سرخ اسکارف میں لپٹا تھا۔

دلعتا وہ رکی۔ آنکھوں کی پتلیوں کو سکیڑا۔ دور سے ایک ملازم ایک گھوڑا لے چلا آ رہا تھا۔ سفید براق سانٹھا گھوڑا۔ ساتھ ہاشم کاردار چلا آ رہا تھا۔ بلیک سوٹ، جیل سے پیچھے کو سیٹ بال، وجیہہ چہرے کی مسکراہٹ۔ دور سے اس کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ وہ نہیں

زمر نے زخمی مسکراہٹ کے ساتھ اس ملکہ کی خوب صورت آنکھوں میں دیکھا۔ ”میں کچھ بھی نہیں بھولی۔ فی الحال صحیح موقع کے انتظار میں اپنے دشمن کے ساتھ ایک چھت تلے رہنے کی پریکٹس کر رہی ہوں۔“

جواہرات نے مسکرا کر اس کا شانہ تھکا۔ ندرت اور ایسا بھی ہاشم کا شکریہ ہی ادا کر رہے تھے، وہ دونوں پہلے ہی نکل آئیں۔ اب برداشت ختم ہو چکی تھی۔

تاریک سبزہ زار پہ چلتے ہوئے حسین دبے دبے غصے سے بول رہی تھی۔
 ”یہ کس طرح کے لوگ ہیں؟ ان کو خود رات کو نیند کیسے آجاتی ہے؟“

زمر سر اٹھا کر تاریک آسمان دیکھنے لگی۔ پتا نہیں وہ کدھر ہوگا (اسے کو عید کا معلوم بھی ہو گیا نہیں۔)
 ”پھپھو!“ وہ گھوم کر اس کے سامنے آئی۔ ”میں ان کے کمپیوٹرز کو ہیک کرنے کی کوشش کروں؟ کہیں تو کوئی کانٹیکٹ نمبر ملے گا اس جگہ کا جہاں بھائی کو رکھا ہوگا۔“

”حسین، ہم ابھی کوئی غلطی افورڈ نہیں کر سکتے۔ خاور پکڑ لے گا اور سارا کھیل خراب ہو جائے گا۔ ابھی ہم خاموشی سے فارس کو اس کا کام کرنے دیتے ہیں۔ ہاشم کے ساتھ ساتھ تمام ملوث افراد کا سامنے آنا ضروری ہے۔“

”مگر مجھے بھائی سے بات کرنی ہے۔“
 ”تم نے ابھی اس سے بات کر لی ہے۔“
 وہ چونکی۔ پھر مٹھی میں دبی شے کو دیکھا۔
 ”مطلب؟“

”یہ ہر تہوار یا پارٹی پہ ہماری تصویریں کیوں بناتے ہیں؟ پہلے تو اتنا خاص طور پر نہیں پوچھا کرتے تھے یہ تصویریں وہ سعدی کو دکھاتے ہوں گے۔“
 حسین یک دم سن رہ گئی۔

”وہ چاہیں تو خفیہ طور پر بھی اتروا سکتے ہیں، لیکن وہ اپنے ساتھ اچھے پوز میں تصویریں بنوانے پہ زور دیتے

مسکرائی۔ صرف سوچتی رہ گئی۔

لمحے بھر میں اس کا ذہن چھ سال پیچھے چلا گیا تھا۔ وہ اٹھارہ انیس برس کی تھی تب۔ چہرے کے گرد تب بھی سرخ اسکارف لپٹا ہوتا تھا۔ اور وہ قدم قدم مہمانی میں چل رہی تھی۔ مڑ کر اس نے ساحل پہ بیٹھے بابا کو دیکھا جو موبائل پہ کسی سے بات کر رہے تھے۔ ہیرے ان کی ڈزرنیبل سیٹ کر رہے تھے۔ سوٹ میں ملبوس دو افراد اور ایک عورت جسے وہ جواہرات کاردار کے نام سے پہچانتی تھی، نیبل پہ بابا سے مل رہے ہیں۔ وہ نظر انداز کیے جانے کا دکھ لے چلتی رہی۔ پانی اس کے گھٹنوں برابر پہنچ گیا۔ وہ چلتی رہی۔ پھر اس نے پیچھے سے آوازیں سنیں۔ مگر وہ نہیں رکی۔ لیوں پہ شرارتی مسکراہٹ در آئی۔ ستانے کا شوق۔ وہ چلتی رہی۔ پانی کمر تک تھا جب اس کا پاؤں رپٹا۔ وہ اوندھے منہ گری پانی۔ سرمئی پانی۔ اندر سے سب نیلا۔ سیاہ۔ ہر جگہ پانی۔ بمشکل چہرہ باہر نکالا۔ دھندلا سا نظر آیا کہ گارڈ اس طرف بھاگے آ رہے ہیں۔ اس نے ایک شخص کو دیکھا۔ بابا کا مہمان۔ وہ کوٹ اتار کر پرے پھینکتا پانی میں کودا تھا۔ پھر ہر سو پانی تھا۔ اگلے مناظر فلش بک کی طرح آئی کی آنکھوں میں جھکے تھے وہ اسے نکال کر لایا تھا۔ وہ خود بھی بھگ چکا تھا۔ مگر جب آئی کی آنکھ کھلی تو اس نے خود پہ جھکے شخص کو دیکھا تو اسے معلوم تھا کہ اس شخص کی پشت پہ سفید شرٹ پہ ایک ننھی سی چپکی تھی۔

اس کے لیوں سے پہلے الفاظ ہی نکلے تھے ”گریم ریپر!“ (موت کا فرشتہ) وہ گیلے چہرے کے ساتھ ہلکا سا ہنسا۔ ”گریم ریپر اتنے قیمتی سوٹ نہیں پہنتے۔“ اس نے بابا اور دوسرے چہرے بھی خود پہ جھکے دیکھے۔ مگر وہ اس شخص کو ”ملک الموت“ نہیں کہہ رہی تھی۔ پھر بھی گزرے ماہ و سال میں وہ جب بھی آتا اس سے جب بھی ملاقات ہوتی وہ اسے گریم ریپر ہی کہتی تھی۔ یہ نام اس ایک شخص کے ساتھ ننھی ہو چکا تھا۔ کوئی عجیب ساموت کا احساس بھی اس کے ساتھ ننھی ہو گیا تھا۔

اور آج بھی وہ اس کی سالگرہ نہیں بھولا تھا۔ مسکراتے ہوئے قریب آیا۔

”ابھی برتھ ڈے ریڈ!“ آئی مسکرائی۔ گھوڑے کے سفید نرم بالوں کو چھوا۔ اعلا نسل کا قیمتی گھوڑا۔ ”تھینک یو گریم ریپر! کیسے ہو تم؟“ وہ اس سے ہمیشہ بہت تکلف سے ملتی تھی اس کی کالز کا جواب دینا بھول جاتی، سالوں فون نہ کرتی، مگر پھر بھی وہ اسے ”تم“ کہہ کر پکارتی تھی۔

”میں اچھا ہوں۔ پسند آیا۔“ گھوڑے کی طرف اشارہ کیا۔ آئی نے مسکرا کر سر ہلایا۔ ”بہت زیادہ۔“ چند لمحے خاموشی میں کٹے۔ ہاشم نے اسی احتیاط پسندی سے سر کو خم دیا۔ ”میں تمہارے بابا کے پاس جا رہا ہوں۔“

”میں بھی آتی ہوں۔“ وہ مڑتے مڑتے رکتا ذرا چونکا۔ آئی اس طرح کبھی اس کے ساتھ نہیں بیٹھا کرتی تھی۔ اس کے پاس ہاشم سے کرنے کے لیے کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ اگر وہ اس کا برتھ ڈے یاد رکھتا تھا تو وہ اس کی بیماری میں ضرور حال احوال پوچھنے آتی تھی۔ احسان کا بدلہ احسان۔ اور کچھ نہیں۔ ہاشم کاردار کے لیے یہ رشتہ ایک ایسا شیشہ تھا جس کو وہ اپنے سانس کی دھند سے بھی میلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر آج کچھ مختلف تھا۔

وہ اندر ہارون کی اسٹڈی میں آکر بیٹھا تو خاور ہارون کو سعدی کے بارے میں اپ ڈیٹ کر رہا تھا۔ ہاشم خاموشی سے سنتا رہا۔

دلعتنا دروازہ رکتا ہوا۔ خاور خاموش ہو گیا۔ آب دار نرمی سے مسکراتی اندر آئی اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ میز کے پیچھے کنٹرول چیر پہ بیٹھے ہارون قریب کھڑا خاور اور سامنے بیٹھا ہاشم۔ سب اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ معصومیت سے مسکرائی۔ ابھی تک ننگے پیر تھی۔

”مجھے کچھ پوچھنا تھا آپ لوگوں سے۔“ سادگی سے گویا ہوئی۔ ہاشم نے ”شیور پوچھو۔“ کہہ کر حوصلہ افزائی کی۔

”آپ لوگوں نے اسے کہاں رکھا ہے؟“

”کسے؟“ ہارون کو تعجب ہوا۔

”وہ لڑکا جو مسنگ ہے۔“ باری باری سب کے چہرے دیکھے۔ خاور صرف چونکا، لیکن ہارون مطمئن نظر آئے اور ہاشم پر سکون۔

”کون سا لڑکا آبدار؟“ ہاشم نا سمجھی سے بولا۔

”ہاشم!“ اس نے آگے ہو کر پر یقین نظروں سے اسے دیکھا۔ ”مجھے پتا ہے آپ لوگوں نے اسے کہاں رکھا ہوا ہے، آپ کو اس سے اہم معلومات چاہئیں مگر یہ غلط ہے ہاشم بابا!“

”آئی تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے بیٹا۔ ہم نے کسی کو نہیں نہیں رکھا ہوا۔“

”اور ہم کیوں کسی کو رکھیں گے ریڈ؟“ وہ تعجب سے مسکرایا۔ جیسے اس کی کم علمی پر تاسف ہوا ہو۔

”بس مجھے آپ لوگوں کی باتوں سے شک ہو رہا تھا۔ پلیز اگر ایسا ہے تو اس کو اس کی فیملی کے پاس بھیج دیں پلیز یہ وہ لوگ کتنا ریشٹن ہوں گے۔“

ہاشم پورے یقین سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”کیا تم ہمیں ایسا سمجھتی ہو کہ ہم یوں کسی کو اس کی فیملی سے الگ کر کے رکھیں گے؟ آئی کیا اتنے سالوں میں بھی تم مجھے نہیں سمجھ سکی؟ کیا تم اپنے باپ پر بھی شک کر رہی ہو؟“

آئی کے چہرے پر تذبذب نظر آیا۔ ”آئی ایم سوری، میرا یہ مطلب تمہیں تھا، مگر مجھے لگتا ہے وہ آپ لوگوں کے پاس ہے۔ میں اس کے ماموں سے بھی ملی تھی، وہ کہہ رہا تھا کہ وہ لڑکا ایسے ہی نہیں کھویا بلکہ یہ کسی کرسنل کا کام ہے جس نے اسے گولیاں مار کر اغوا کر لیا ہے، وہ انٹا ڈیسمنٹ آدمی جھوٹ تو نہیں بول رہا تھا۔“ ہاشم کے اندر ایک دم غصہ ابلا تھا۔

”اور وہ خود کیا ہے؟ وہ قتل کر کے جیل جانے والا؟ اس کی باتیں سن کر تم ہم پر شک کر رہی ہو؟ آنکھیں کھولو آبدار، فارس غازی خود ایک خطرناک مجرم ہے۔“ وہ غصے سے بولا۔

آب دار اداسی سے مسکرائی۔ پھر آگے ہوئی۔ ہاشم

کی آنکھوں میں دیکھا۔

”ہاشم کاردار۔ پاکستان میں ڈیڑھ ہزار سے زیادہ لوگ مسنگ ہیں، میں نے تو کسی کا نام نہیں لیا، پھر تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں فارس غازی کے بھانجے کی بات کر رہی ہوں؟“

ہاشم کے منہ پر کسی نے کھولتا ہوا تیل پھینک دیا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے بالکل گنگ ہو گیا۔ وہ شہری کے ہاتھوں مات نہیں کھا سکتا تھا، وہ صرف ان ہی کے ہاتھوں مات کھاتا تھا جن سے اسے محبت ہوتی تھی۔ آب دار کے تاثرات بدل گئے۔ معصومیت معدوم ہوئی۔ وہ مسکرا کر پیچھے ہو بیٹھی، ٹانگہ ٹانگہ جمالی اور باری باری ان تینوں کے چہرے دیکھے۔

”سو ثابت ہو گیا کہ سعدی یوسف نیک کام کا گمشدہ سائنس دان آپ لوگوں کے پاس ہی ہے۔ ویسے میں اس کے ماموں سے نہیں ملی، احمر سے ان کا ذکر سنا تھا صرف۔“ کندھے اچکا کر بولی۔ ہارون ایک دم غصے سے بولے۔

”جو تمہارا مسئلہ نہیں ہے، اس میں تم نہ بولو، آئی۔“

”اچھا ٹھیک ہے ہارون!“ ہاشم نے سختی سے ہاتھ اٹھا کر ان کو چپ کر دیا۔ پھر آئی کو دیکھا۔ اس کی نظریں بھی بدل چکی تھیں۔ ”مجھے معلوم ہے تم فارس کو کچھ نہیں بتاؤ گی کیوں کہ تم ایک قاتل کو اپنے باپ کا دشمن نہیں بنانا چاہو گی۔ اب دھیان سے سنو۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ ”ہاں، وہ ہمارے پاس ہے، لیکن ہم اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔ وہ سائنس دان ہے، اس کی جان کو خطرہ ہے، چند ماہ کے لیے اس کو منظر عام سے عائب کرنا ضروری تھا۔ اور وہ میرا دوست بھی ہے۔ اب بولو، اس میں کیا غلط ہے؟“ اس کا لہجہ خشک ہو گیا تھا۔

”مجھے غلط صحیح سے سروکار نہیں ہے۔“

”تو کیا چاہتی ہو تم؟“

”میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”ناممکن!“ ہارون نے سختی سے اسے جھڑکا۔

ایفسر۔

سیاہ کوٹ، بالوں کا کریو کٹ اور سیاہ موچھوں والا اونچا لمبا بھرے جسم والا خاور، اس کو دیوار سے لگائے، غصیلی نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

”تمہارا وکیل کون ہے؟“ سعدی نے اس کے ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی مگر خاور ”کو صبیٹ“ میں اعلا درجے کی تربیت رکھتا تھا، ذرا سا بھی نہ ہلا۔

”سیدھی طرح بتاؤ، حج والی ویڈیو کس کو دی تھی تم نے؟ کس نے لیک کی وہ؟“

سعدی کے ابرو حیرت سے اٹھے۔ ”وہ لیک ہو گئی ہے؟ گڈ!“

خاور اسے گردن سے دوپچے آگے لایا اور بڑے سے پانی کے برتن میں اس کا چہرہ جھکایا۔ سعدی نے خود کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔

”بولو۔ نام بولو وکیل کا۔“

”تم ایکس ملٹری مین ہونا، خاور۔ کیا رینک تھا تمہارا؟“

خاور نے اس کا چہرہ پانی میں ڈبو دیا۔ چند لمحے رکھا پھر کھینچ کر باہر نکالا۔ اس کا چہرہ بھیگ چکا تھا۔ منہ کھول کر وہ گہرے سانس لے رہا تھا۔

”کون ہے تمہارا وکیل؟“

”تم ہاشم کے جتنے وفادار بن جاؤ، تم کا روار نہیں بن سکتے۔ تم ہمیشہ ان کے غلام رہو گے۔“ خاور نے زور سے اسے دوبارہ ڈبکی دی۔ ساتھ ہی چلایا۔ ”نام بتاؤ مجھے اس کا۔“ پھر باہر نکالا۔ ”ہا“ منہ کھول کر سانس لیتا چہرہ سیدھا کیا۔ آنکھیں بند کیے وہ ہانپ رہا تھا۔

”تم ان کے ساتھ ہوتے ہو، لیکن تم ان کی ڈائنگ ٹیبل پر بیٹھ نہیں سکتے۔ وہ تمہیں اپنے ساتھ نہیں بٹھائے خاور! تم ہمیشہ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہو۔“

”ہاں بولو، ورنہ میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔“ اس نے چند مزید ڈبکیاں سعدی کو دیں۔ پھر اس کا رخ اپنے سامنے کیا۔ سعدی کا پورا سر اور چہرہ ٹپٹپ پانی ٹپکار رہا تھا۔ شرٹ بھیگ چکی تھی۔ ایسے کیلے چہرے

”تم اس سے کیوں ملنا چاہتی ہو؟“ ہاشم نے پوچھا۔ ”کیوں کہ میں نے اس کے میموریل ڈنر کی ویڈیو سوشل میڈیا پر دیکھی ہے، اس میں اس کے ڈاکٹر نے تقریر کے دوران کہا تھا کہ وہ لڑکا آپریشن ٹیبل پر چند لمحے کے لیے مر گیا تھا، مگر پھر اس کو ری کور کر لیا گیا۔ میں NDE سے گزرنے والے مریضوں کا انٹرویو کرتی ہوں، آپ سب کو پتا ہے۔ مجھے صرف اس کا انٹرویو کرنا ہے۔ آپ کے بقول وہ آپ کا مہمان ہے، قیدی نہیں۔ سو یہ آپ کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔“

”میں تمہیں اس کی جگہ دس اور کمپوز لادوں گا! وہ کسی سے بات نہیں کرتا۔“

”میں سینو تھراپسٹ ہوں ہاشم، میں اپنے جواب نکلاؤ لیتی ہوں۔“ خاور نے ذرا چونک کر اسے دیکھا، مگر خاموش رہا۔

”ٹائیک کلوز، آپ دار۔ تم اس سے نہیں مل رہیں، اور نہ تم کسی کو کچھ بتا کر اس کی اور ہماری جان خطرے میں ڈالو گی، سمجھیں؟“ ہاشم نے کبھی اس سے اتنی درستی سے بات نہیں کی تھی۔ آبی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ناراضی سے اٹھ گئی۔

ہارون خفا نظر آ رہے تھے اور ہاشم شدید ناخوش تھا۔ یہ دن اس کے لیے قیمتی تھا اور یہ آج سعدی کی وجہ سے برباد ہو گیا تھا۔



ستارے گرتا دیتے، سفر کتنا کٹھن ہوگا پالے شہد کے پیتے، تلخ ایام سے پہلے اکتوبر کی پہلی دوپہر، سعدی یوسف اپنے کمرے کے ہاتھ روم میں کھڑا تھا اور آئینے میں کندھے پہ گولی کا نشان دیکھ رہا تھا، گول سا سرخ بھورا نشان، جواب ساری عمر اس کے ساتھ رہے گا۔ اسی وقت دروازہ زور سے پیا گیا۔ اس کے ابرو کھینچے۔ باہر نکلا تو ایک دم کسی نے گریبان سے پکڑ کر دیوار سے لگایا۔ سعدی بمسکلی سنبھلا تو دیکھا، وہ خاور تھا۔ ہاشم کا پر ہیل سیکورٹی

زمر نے پرس سے ایک پکٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ وہ رک کر اسے دیکھنے لگا۔

”یہ آپ کی ویڈیو ہے اور فیس بھی۔“
 ”ارے!“ اس کو تعجب ہوا۔ پکٹ کھول کر اندر جھانکا۔ پھر مسکرایا۔ ”اس تکلف کی کیا ضرورت تھی میں نے کچھ مانگا تو ڈیڑی تھا؟“

”نہیں رکھنی تو واپس کر دیں۔“ فوراً ہاتھ پھیلایا۔ احمر نے جلدی سے پکٹ اپنے پیچھے کیا۔ منہ بگڑا۔

”کیا آپ کی امی نے آپ کو رسمی انکار کرنا نہیں سکھایا؟“ پھر دوبارہ لفٹ کی طرف دیکھا۔ ”ویسے کام تو ابھی ختم نہیں ہوا۔ آپ ٹرائی کلیکٹو کے بارے میں مزید نہیں جانتا چاہتے کیا؟“

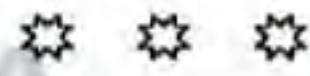
”آپ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں۔“
 ”تفصیح کیجئے احمر میں آپ سے بہت کچھ چھپا رہی ہوں۔“ وہ آگے چلنے لگی تھی۔ احمر گہری سانس لے کر اس کے ساتھ ہولیا۔
 ”آپ کے خاندان میں کوئی ایک بندہ ہے جو مجھے عزت دے؟“

”احمر!“ وہ سنجیدگی سے اس کی طرف گھومی۔ ”کیا ہارون عبید نے آپ کو کوئی ہدایت دی ہے؟ حج صاحب کی مدد کے لیے؟ کیوں کہ جس ٹی وی چینل میں ہارون صاحب کے اکثریتی شیئرز ہیں وہ آج کل حج صاحب کی بہت حمایت کر رہا ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔ احمر چپ ہوا۔ پھر شانے اچکائے۔
 ”کنسلٹنٹ کلائنٹ پر یونج کے تحت میں اس بات کا جواب نہیں دے سکتا۔“

”حج صاحب کیا انہوں نے آپ سے کہا ہے کہ کسی اور مشہور شخص کا کوئی اسکینڈل لیک کیا جائے تاکہ یہ اسکینڈل دب جائے؟“

”میں پر یونج کے تحت جواب نہیں دے سکتا۔“
 ”وہ مجھے یاد آیا کیا ہارون صاحب نے بتایا وہ میری بھتیجی کی سالگرہ پر ہمارے گھر آ رہے ہیں؟“

کے ساتھ وہ ہولے سے ہنسا۔
 ”تم نے مجھے ایک تھپڑ تک نہیں مارا۔ ہاشم کاردار نے تمہارے ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔ سارے لوگوں سے کچھ نہیں اگلا سکتے۔ میں وکیل کا نام نہیں بتاؤں گا۔“
 خاور کا چہرہ سرخ ہوا اس نے جھٹکے سے سعدی کو بیڈیہ دھکیلا۔ وہ مسلسل۔ ”تم کاردار نہیں بن سکتے۔ تمہیں کبھی اپنے ساتھ نہیں بٹھاتے۔“ چلا رہا تھا۔
 خاور کوٹ درست کرتا، منہ میں کچھ بڑبڑاتا یا ہر نکل آیا۔ ہاشم کی طرف سے بھجوائی گئی اس کی قبیلی کی تصویریں اس نے آتے ساتھ ہی بیڈیہ ڈال دی تھیں اور وہ اب بھی وہیں پڑی تھیں۔



کھنے سے پیڑوں میں بھی سایہ ہمیں نصیب نہیں

میرے سورج کی بھی سب سمیتیں تمہاری ہیں یہ ہوٹل کا وہ فلور تھا جہاں چار سال قبل زمر کو گولی ماری گئی تھی۔ صبح کے اس وقت وہ خاموش اور سنسان پڑا تھا۔ احمر کے کہنے پر زمر ادھر آگئی تھی اور اب وہ دونوں لفٹ کے پاس کھڑے تھے۔ احمر بولے جا رہا تھا اور زمر بے توجہی سے سن رہی تھی۔

”گواہوں کے مطابق فارس غازی اس لفٹ سے آیا تھا“ لیکن جب میں نے تحقیق کی یعنی اپنے قیمتی وقت سے چند گھنٹے نکالے جن کے میے میں آپ سے روز قیامت مانگوں گا تو دیکھا کہ ایک گواہ کے بیان میں تضاد ہے۔ اس نے ایک دفعہ کہا کہ غازی اس کے ”ساتھ“ لفٹ سے اترتا تھا۔ مگر ایک دفعہ کہا کہ غازی اس کے ”سامنے“ لفٹ سے اترتا۔ اب سامنے دیکھیے۔“ احمر نے جوش سے اشارہ کیا۔ زمر نے بہت صبر سے ادھر دیکھا۔ وہاں ایک اور لفٹ تھی ”یہ پرائیویٹ لفٹ ہے۔ ہوٹل کے مالکان کے لیے یا بہت خاص شخصیات کے لیے۔ سو ہمارا ٹرائی کلیکٹو بھی کوئی ایسی آسامی ہے جس کے ہوٹل مالکان سے روابط ہیں“ یقیناً ”ادھر سے ہی آیا ہوگا۔ اور۔“

چہرے پہ تناؤ دور آیا۔ شکر یہ کر کے فون رکھا اور پھر مسبح کھولا۔

تصویر پہ نظر پڑتے ہی اس کے ابرو تعجب سے بھینچے۔ کار آہستہ کر کے روکی۔ اچھٹے سے اسکرین کو زوم ان کر کے وہ تصویر دیکھی۔ بار بار (یہ دونوں میرا کیس ری اوپن۔؟) ایک دم سے تفکرات نے اسے آن گھیرا تھا۔ اس نے کار کا رخ موڑ لیا۔



یہ جانتا ہوں جاننے ہو مرا حال دل
یہ دیکھتا ہوں دیکھتے ہو کس نگاہ سے
سہ پہر میں احمد واپس ہارون عبید کی رہائش گاہ پہ آکر
اپنے کیمپن آفس میں مصروف ہو گیا تھا۔ آپ دار
اپنے کلینک میں تھی۔ کسی کام سے وہ باہر نکلی تو دیکھا
ملازم ایک شخص کولان میں لا رہا تھا۔ وہ اسمارٹ اور
دراز قد تھا، جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلا آ رہا تھا۔ ملازم
نے اسے لان چیئر پیش کی، وہ بیٹھ گیا تو ملازم آبی کی
طرف آیا۔

”یہ کون ہے؟“ وہ پوچھے بنانہ نہ سکی۔

”احمر صاحب کے دوست آئے ہیں۔ فارس
غازی۔“

آب دار نے ایک دم چونک کر اس کی طرف
دیکھا۔ ”سنو، کچن میں چائے کے لیے بولو۔ اور اگلے
آدھے گھنٹے تک احمر صاحب کو خبر کرنے کی ضرورت
نہیں ہے۔“ آہستہ سے کہتی وہ آگے چلتی آئی۔

وہ کرسی پہ ٹانگ پہ ٹانگ، جمائے بے نیاز سا بیٹھا پار
بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ وہ قریب آئی تو فارس نے نگاہ اٹھا
کر اسے دیکھا۔

”اسٹیمپ۔ احمر؟“ ابرو اچکائے۔

”جی، وہ آتے ہی ہوں گے۔“ آبی نے اپنے چہرے
پہ اپنی انہی معصومیت طاری کر لی اور مسکرائی۔ ”آپ
کا بھانجا ہے نا جو مسنگ ہے؟ احمر نے ذکر کیا تھا۔
سعدی یوسف کی یونیورسٹی میں، میں چند ماہ کے لیے گئی
تھی، ایکس چینج پروگرام کے تحت۔ وہیں ایک دفعہ

”نہیں تو۔“ وہ حیران سا ایک دم بولا، پھر فوراً ”چپ
ہو۔ زمر مسکرائی۔“

”مطلب کہ پہلے تین جواب ہاں میں تھے
تھینک یو احمر!“

”میں نے کچھ بھی نہیں بتایا، اچھا!“ وہ تملایا تھا۔
(یہ ہوئے پورے ایک ہزار چھ سو ننانوے درے!)
”ویسے ہارون عبید کا کاروبار کتنے ممالک میں
ہے؟“ وہ چلتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”مسز زمر!“ وہ سنجیدہ ہوا۔ ”وہ میرے پاس ہیں اگر
آپ کا یہ خیال ہے کہ میں ان کی معلومات آپ کو لیک
کروں گا تو آپ غلط ہیں۔“

”اور اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ جو سعدی کے ساتھ
ہوا، وہ آپ کے ساتھ نہیں ہو سکتا تو آپ بھی غلط
ہیں۔ جج صاحب کی ایکسٹورشن میں آپ بھی ملوث
تھے، آپ ہمارے ساتھ اس سارے میس میں برابر
کے حصے دار ہیں۔ اس لیے مجھے شام تک وہ لسٹ
چاہیے۔“ ٹھنڈے اور نرم سے انداز میں وہ بولی۔ احمر
ناخوش نظر آنے لگا۔

دور راہداری سے گزرتے ویٹرنے اوٹ میں
کھڑے، موبائل سے ان دونوں کی تصویر لی اور پھر
سر جھکائے آگے بڑھتا گیا۔ سیڑھیوں تک پہنچ کر اس
نے وہ تصویر ایک نمبر پہ بھیجی اور پھر فون ملایا۔ تیسری
گھنٹی پہ ”ہیلو“ سنائی دیا۔
”غازی بھائی، آپ نے مجھے کہا تھا کہ کوئی کام کی
بات ہو تو بتاؤں۔“ وہ دبی آواز میں زینے اترتے بول رہا
تھا۔

”ہاں بولو۔“ فارس ڈرا سہو کر رہا تھا۔

”ایک نوجوان دو تین دفعہ یہاں آیا ہے، آج پھر نظر
آیا، ساتھ میں لڑکی بھی ہے۔ اس نے سب کو یہی بتایا
ہے کہ وہ جسٹس ڈپارٹمنٹ سے ہے اور آپ کے کیس
کوری اوپن کرنے کے لیے چھان بین کر رہا ہے۔ کچھ
گواہ اب بھی ہوٹل میں تھے، ان کے انٹرویو بھی کیے
ہیں۔ میں نے سوچا آپ کو بتا دوں۔ ان کی تصویر بھی
لے کر بھیج رہا ہوں۔“ اور دوسری طرف فارس کے

کیا۔ ”وہ جو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے گھڑی لہرا کر ان کو ہنٹائز کر کے کہتے ہیں کہ اٹے لٹک جاؤ۔“
 ”احمر صاحب، آپ کی hypnosis کے بارے میں معلومات کافی کمزور ہیں۔“ وہ خفگی سے بولی۔ ”کوئی بھی کسی کو ہنٹائز کر کے اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کروا سکتا۔ یہ صرف فوکس کرنے کے لیے، بری عادتوں کو چھڑوانے کے لیے یا بھولی یادوں کو واپس لانے کے لیے ہوتا ہے۔ ہم سب دن میں کئی بار تنویمی کیفیت کا شکار ہوتے ہیں جب کوئی مووی دیکھتے ہوئے، کوئی کتاب پڑھتے ہوئے، ہم بے ارادہ اس میں کھو جاتے ہیں۔ یہ تنویم کی ایک ہلکی شکل ہے۔ اور میں گھڑی دیکھا کر لوگوں کو ہنٹائز نہیں کرتی۔“ وہ ناراضی سے بولتی پلٹ گئی۔ احمر نے سر جھٹکا۔
 ’جانے دو۔ یہ بھی نارمل نہیں ہے۔ تمہارے خاندان کی طرح۔ آخر چار الفاظ بس دل میں کہے اور متوجہ ہوا۔“ کیا کام تھا؟“

”بہت دن پہلے تمہیں الیاس فاطمی کو ڈھونڈنے کے لیے کہا تھا۔“
 ”پہلے میں سستی کر رہا تھا، لیکن اب کچھ کرتا ہوں کیوں کہ مجھے بس یوں ہی لگنے لگا ہے کہ تم بے گناہ ہو۔“ وہ مسکرا کر بولتا جا رہا تھا اور فارس متضاد کیفیات میں گھرا اس کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ آسمان پہ سیاہ بادل اکٹھے ہو رہے تھے۔



ہم نے مدت سے الٹ رکھا ہے کاسہ اپنا دست زر دار! ترے درہم و دینار پہ خاک!
 ان سب سے دور، سعدی یوسف اپنے قید خانے میں اسٹڈی ٹیبل پہ بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے قرآن کھلا تھا اور ارد گرد سے بے نیاز، ایک ٹھنڈی میٹھی سی چھایا کے زیر اثر تھا۔

”میں پناہ مانگتا ہوں اللہ کی دھتکارے ہوئے شیطان سے۔“ وہ تعویذ پڑھ کر انمل اس جگہ سے کھول رہا تھا جہاں سے اس نے ایک روز چھوڑی

دیکھا تھا اسے۔ ”فارس خاموشی سے اس لڑکی کی سرمئی آنکھیں دیکھا رہا۔ زمر نے بتایا تھا کہ ٹھیکیدار کے بقول سعدی کی، کی چین لینے آنے والی لڑکی کی آنکھیں ہلکے رنگ کی تھیں۔ سرمئی نیلی۔ (سارہ اس کے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ اس نے ہمیشہ سمجھا تھا کہ وہ گواہ لڑکی سعدی کی عمر کی اس کی کوئی دوست، کوئی کلاس فیلو ہو سکتی ہے۔)

”مجھے اس کے بارے میں بتائیں، کیسے ہوا یہ حادثہ؟“ اس کی خاموشی کے باعث وہ چپ ہوئی، پھر دوبارہ ہمت کی۔

”سوشل میڈیا پہ دیکھ لیں، ساری تفصیل مل جائے گی۔“ لاپرواہی سے کہہ کر اس نے پھر سے گھڑی دیکھی۔ اور ذرا آگتا کر ادھر ادھر دیکھا۔ ملازم ٹرالی دھکیلتا آ رہا تھا۔

”چائے لیجئے۔“ اب دار نے شائستگی سے پیش کش کی۔

”میں اپنی جیب سے چائے پیتا ہوں صرف۔“ اور اٹھ کھڑا ہوا۔ تب ہی احمر ادھر آنا دکھائی دیا۔ اسے فارس کا مسیج مل گیا تھا۔ وہ ذرا حیران تھا۔
 ”تم ادھر؟“

”مجھے کام تھا، تم کہہ رہے تھے؟ صبح سے کل کر رہا تھا۔“ فارس نے بغور اس کے چہرے کو دیکھتے پوچھا۔
 احمر ذرا رک۔

”ایک کلائنٹ کے ساتھ تھا۔“ احتیاط سے بولا۔
 ”تمہارے کلائنٹ ہارون عبید نہیں ہیں؟“

”وہ کسی دوسری نوعیت کا کلائنٹ ہے۔ لوگ مجھے بہت سے کاموں کے لیے ہائر کرتے ہیں، غازی!“ سادگی سے مسکرایا، البتہ ذرا تشویش بھی ہوئی مگر جب فارس نے محض سر ہلا دیا تو اسے ذرا سکون ہوا۔ پھر خاموش بیٹھی آبی کا تعارف کروانے لگا۔

”یہ آپ دار عبید ہیں، ہارون صاحب کی صاحبزادی۔ یہ گریم ریپرز سے obsessed ہیں۔ کلینکل ڈیپریسین۔ ریسرچ کر رہی ہیں، لیکن پروفیشنلی یہ ایک ایسٹیمو ٹھراپسٹ ہیں۔“ ذرا ہلکی آواز میں اضافہ

تھی۔ آج کل بے ترتیب زندگی کی طرح تلاوت بھی بے ترتیب ہوتی جا رہی تھی۔ ہاتھ نے سوائے نئے کپڑوں اور کتابوں کے اس کی کوئی ڈیمانڈ پوری نہیں کی تھی، سعدی کی طرف سے بھی اس کے ہر درہم، ہر دینار پہ خاک! قرآن بھی کبھی کبھی سے بڑھتا، کبھی کبھی سے۔ آج نمل میں ہد ہد والے واقعے کو وہیں سے جوڑا۔

”سلیمان علیہ السلام نے کہا۔ اب ہم دیکھیں گے (اے ہد ہد) کہ تم نے سچ کہا یا ہو تم جھوٹوں میں سے؟ میرے اس خط کو لے جا کر اس کے پاس ڈال دے، پھر ان کے پاس سے ہٹ آ، پھر دیکھ کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔“

”اوہ پیارا ہد ہد!“ سعدی نے گہری سانس لی۔

”میں سوچتا ہوں اللہ تعالیٰ کہ پہلے سلیمان علیہ السلام نے اس ہد ہد کی غیر حاضری پہ معقول وجہ نہ پیش کر سکنے کی صورت میں اس کو فوج کرنے کی دھمکی دے دی، اب وہ بے چارہ خبر لے آیا، اتنی لمبی تقریر بھی کر دی، پھر بھی سلیمان علیہ السلام نے کہا دیکھتے ہیں کہ تم سچے ہو بھی یا نہیں۔ کتنے عرصے سے وہ سلیمان علیہ السلام کا وفادار جاسوس رہا ہو گا، پھر بھی انہوں نے ایک دم سے اس کا یقین نہیں کر لیا اور اگر کبھی لیا تو جتایا ضرور کہ تمہاری تحقیق ضرور کروں گا۔ میں نے بہت سوچا کہ کیوں؟ شاید اس لیے کہ انسان جتنے اہم عہدے پہ ہوتے ہیں، اتنے اس کے دشمن ہوتے ہیں، اتنا اس کو محتاط ہونا چاہیے اور آنکھیں کان بند کر کے کسی کی بات پہ اعتبار نہیں کر لینا چاہیے۔ اور شاید ایک بادشاہ کی بارعب شخصیت کے بھی منافی تھا کہ ایک دم سے اس ہد ہد کی تعریف کر دیتے، جیسا کہ میں نے پہلے کہا۔ ڈسپن ہر ادارے، ہر فوج اور ہر گھر کے لیے ضروری ہے۔“

پھر اگلی آیت کی طرف متوجہ ہوا۔

”وہ (ملکہ سبا) سلیمان کا خط پانے کے بعد کہنے لگی، اے سردارو! میری طرف ایک بلا وقعت خط ڈالا گیا ہے۔ (خط کا مسوہ یہ تھا) ”یہ ہے سلیمان کی طرف

سے اور یہ شروع ہوتا ہے بخشش کرنے والے مہمان اللہ کے نام سے۔ (بس اتنا کہ) تم سرکشی نہ کرو میرے سامنے اور مسلمان بن کر میرے پاس چلی آؤ۔“

سعدی نے فلم سے اس آیت کو انڈر لائن کیا۔ ”ملکہ بھی کیا ملکہ تھی۔ خط کی مہر سے پہچان لیا کہ یہ کسی عام آدمی کی طرف سے نہیں ہے، کنگ سلیمان کی طرف سے ہے۔ سو غرور سے اسے رو نہیں کر دیا، بلکہ اپنے سرداروں کے پاس اسے لے کر گئی اور ان کو پڑھ کر سنایا۔ اس زمانے میں خط بھیجنے والے کا نام پہلے لکھا جاتا تھا۔ مجھے یاد آیا اللہ تعالیٰ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بادشاہوں کو خط لکھے تھے، کسی کو صفحے جتنا لبا، کسی کو صرف دو الفاظ (اسلام قبول کر لو، سلامت رہو گے) اور سلیمان علیہ السلام نے بھی محض دو فقرے لکھے۔ صرف دو فقرے۔ عجب بات ہے، آپ ایک اتنی بڑی ملکہ کو دعوت دے رہے ہیں، تو صرف دو فقرے کیوں لکھے؟ مگر اللہ تعالیٰ یہ دیکھیں۔ ملکہ نے کہا کہ اس کی طرف باعزت خط ڈالا گیا ہے۔ خط پہ شہنہی مہر تھی۔ اور وہ باقاعدہ قاصد کے ذریعے نہیں ڈالا گیا تھا۔ اسے ایک برندہ روشن دان سے گرا جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے تبلیغ کے لیے الفاظ سے زیادہ طریقہ اہم ہوتا ہے۔ سلیمان علیہ السلام کو معلوم تھا، کس کو کس طرح ہینڈل کرنا ہے۔ مگر ہم آج کے مسلمان ہم کیا کرتے ہیں؟“

اس کے چہرے پہ افسوس اترا۔ کمرے میں بھی اداسی بکھر گئی۔

”میرے جیسے لوگ جن کے عقائد قرآن اور صحیح حدیث کے مطابق ہوتے ہیں اور ہم بدعت سے بچنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں اور بدعت کو پہچانتے بھی ہیں، ہم جیسے لوگ اپنے ملک میں دن رات ہونے والی بدعتوں کے خلاف کیا کرتے ہیں؟ فیس بک جہادی بن کر لے لے کھنٹ کرتے ہیں۔ یہ حرام و حرام۔ کسی محفل میں بدعت دیکھ لیں تو وہیں شور مچا دیا اور پھر دو فریق بنا کر لڑائی شروع۔ کوئی بدعتی ایس ایس بھیجے تو جواب میں گما کر مہسج بھیج دیا۔ میں بتاؤں اللہ

تعالیٰ کہ میرے ملک کا ایک بڑا طبقہ بدعتی کیوں ہے؟ وہ بدعتی ہے میرے جیسے قرآن و سنت کے پیروکاروں کی وجہ سے۔“

قطعیّت سے کہتے وہ بھول گیا تھا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔

”ان بدعتی مسلمانوں کو اگر کسی چیز کا علم نہ تھا، وہ اگر اپنے ماں باپ کے طریقے پہ چل رہے ہیں تو ہمیں تو اس کا علم تھا، ہم نے ان کو کیوں راہ راست نہ لانے کی کوشش نہ کی؟ اور اگر کوشش کی تو کیسے؟ ٹوگ کر، غصہ کر کے؟ تنقید کر کے؟ خود کو درست ثابت کرنے کی ضد میں بحث کر کے؟ ہم وہ لوگ ہیں جو اندھیرے میں بھٹکتے لوگوں کو چلا چلا کر اندھی کھائیوں سے خبردار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چلانے سے صرف اتنا ہو گا کہ وہ لوگ ذرا ٹھہریں گے، انہیں گے، مگر پھر جتنا ان کی آنکھیں دیکھنے کی عادی ہو چکی ہیں اتنے کو بہت سمجھ کر چلتے جائیں گے۔ اندھیروں میں چیخا چلایا تھوڑی جانا ہے؟ اندھیرے میں تو دیے جلائے جاتے ہیں۔ روشنی آئے گی تو تاریکی خود چھٹ جائے گی، حق آئے گا تو باطل خود بخود چلا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ! ہم مسلمان یہ بات کیوں نہیں سمجھتے کہ بحث، ضد اور لڑائی سے کوئی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ علوم الحدیث دیکھنے میں، صحیح، حسن، ضعیف، موضوع، حدیث کا فرق جاننے میں، حدیث کی سند، راوی کی شرائط، یہ سب باتیں سمجھنے میں ایک عرصہ لگتا ہے، ہم قرآن و حدیث کا علم رکھنے والے خود تو کوئی مہینے اور کئی سال لگا کر دینی کورس کرتے ہیں، ڈپلوے یا سند لیتے ہیں، مگر دوسرے سے یہ امید کرتے ہیں کہ جو بات ہمیں خود کئی برس لگا کر سمجھ آئی ہے، وہ دوسرا شخص چار لائن کے ایک ایس ایم ایس میں سمجھ جائے؟ چلانا آسان ہے، لیکن دیئے جانا مشکل ہے۔ امر بالمعروف پہلے آتا ہے، نہی عن المنکر کا دوسرا نمبر ہے۔ آہستہ آہستہ نرمی سے، پیار سے، تحمل سے لوگوں کو تعلیم دی جائے تو وہ ہم سے اچھے سنت کے پیروکار بن سکتے ہیں، لیکن ہم مسلمان یہ تحمل کہاں سے لائیں؟ اللہ کی جنت بہت

بڑی ہے، مگر ہم یہ ماننے کو تیار ہی نہیں کہ ہمارے فرقے کے علاوہ کوئی دوسرا فرقہ بھی جنتی ہو سکتا ہے؟ یہ الفاظ نہیں ہوتے، یہ طریقہ ہوتا ہے تبلیغ کا جو دلوں پہ اثر کرتا ہے۔ اسی لیے سلیمان علیہ السلام نے الفاظ کے بجائے طریقے کو سحر انگیز رکھا تھا۔ سوری اللہ تعالیٰ! میں بھی کچھ زیادہ ہی ایموشنل ہو گیا۔“

تاسف سے سر جھٹکتے اس نے قرآن بند کیا۔ پھر دل سے دعا کی کہ کاش اس کے پاس بھی کوئی ہد ہد ہوتا جو اس کے گھروالوں کا پیغام جو حج میں دبائے اس کی کھڑکی میں آگراتا، لیکن سعدی کے اس کمرے میں تو کھڑکی تک نہ تھی۔ وہ بھی کس چیز کی امید کر رہا تھا۔ دعا کرتے کرتے اس نے چھوڑ دی۔ اور وہ پکیٹ کھولا جو خاور دے کر گیا تھا۔ اندر عید ڈنر کی تصاویر تھیں۔ وہ ان کو چند دن میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ سعدی کا دل پھر سے ایک دم خراب ہونے لگا۔

”سارہ نے کسی کو نہیں بتایا۔ وہ لوگ مجھے مس بھی نہیں کرتے کیا؟ یہ کیسے ہاسم کے ساتھ ایک میز پر بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں؟ اور وہ ان لوگوں کے لیے پیامبر پرندے کی دعا کر رہا تھا۔؟“ ان سے گلہ کرتے کرتے وہ ٹھہرا۔

یہ حنین اور زمر کی سیٹھی تھی، دونوں مسکراتے ہوئے کیمرے میں دیکھ رہی تھیں۔ یہ تصویر اس نے کتنی دفعہ دیکھی تھی، لیکن جو آج نظر آیا، وہ پہلے نظر نہیں آیا تھا۔

حنہ کے ہاتھ میں اس کے سیل کے ساتھ وہی سلور پن تھا۔ اوسی پی کا پن کیمرے (زمر نے یہی اسے لانے بھیجا تھا تاکہ وہ اس کیمرے کے ساتھ تصاویر بنوائیں) سعدی کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔ وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔ پھر سے حنہ کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس نے سیٹھی کے لیے دو انگلیوں کی وی بنا رکھی تھی۔ پہلی دفعہ سعدی کو لگا وہ دکھڑی کی ”وی“ ہے۔

وہ پن حنین کے پاس ہے۔ وکیل نے نہیں حنین نے حج کی ویڈیو لیک کی ہے۔ سارہ نے اس کو اکیلا

نہیں چھوڑا، اس نے وہ پین حنین کو دے دیا۔ اس کا دل نور نور سے دھڑکنے لگا۔ اس کی گردن کے بل تک کھڑے ہو گئے تھے۔
(کوئی ناممکن سمجھ کر یوں دعا مانگنا چھوڑا کرتا ہے
سعدی؟)



وہ دل کہ تیرے لیے بے قرار اب بھی ہے
وہ آنکھ جس کو تیرا انتظار اب بھی ہے
موسم کی بتدریج تبدیلی کے باعث انیکسی کا تہہ
خانہ اب اتنا گرم اور پر جس نہیں تھا۔ زمر ابھی ابھی
تھکی باری گھر آئی تھی اور اب لپ ٹاپ کے سامنے
بیٹھی حنین رازداری سے اسے بتا رہی تھی۔

”میں نے ہاشم کی سیکرٹری کے ای میل پہ چند
لنکس بھیجے تھے، ایک پہ اس نے کلک کر دیا تو اس سے
میں نے اس کا سیل فون اپنے کمپیوٹر پہ مرر کر لیا ہے،
یعنی وہ جو دیکھے گی وہ مجھے بھی نظر آئے گا اور ہاشم کا پچھلے
چار ماہ کا سارا شیڈول بھی میں نے حاصل کر لیا ہے۔
اب بتائیں، آپ نے یہ کیوں مانگا تھا؟“ اوپرٹی وی
لاؤنچ میں سب بیٹھے تھے، سوائے فارس کے، وہ ابھی
تک نہیں لوٹا تھا۔

”ہم رات کو ڈسکس کر رہے تھے تاکہ ہاشم نے
سعدی کو کس جگہ رکھا ہوگا۔“ وہ دبی آواز میں کہنے
لگی۔ گزشتہ رات دیر تک وہ یہی بات کرتی رہی
تھیں۔ ”اور ہم نے ہر وہ شہر سوچا جس میں وہ اسے لے
جاسکتے ہیں، لیکن سوچو حنین، وہ لوگ کتنے امیر، کتنے
ری سورسز کے مالک ہیں، پرائیویٹ جیٹ میسکوریٹی
گارڈز کی نفری، کیا کچھ نہیں ہے ان کے پاس؟ وہ وقت
کے فرعون ہیں۔ وہ لوگ سعدی کو اس ملک میں کیوں
رکھیں گے؟ جیسے آج کل کراچی سے لوگ اغواء
کر کے افریقی ممالک میں لے جائے جا رہے ہیں،
ویسے ہی ہو سکتا ہے کہ وہ سعدی کو بھی کسی دوسرے
ملک میں لے گئے ہوں۔“

”اور ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ وہ کون سا ملک ہے؟“

حنین سنی ہی پریشان ہو گئی۔

زمر میز کے کنارے بیٹھی اور مزید سرگوشی کی۔
”جج کو بچانے کے لیے آنے والے بھی سعدی کے
اغوا کار شمار ہوں گے نا، آج مجھے معلوم ہوا ہے کہ
ہارون عبید بھی چاہتے ہیں کہ جج کا اسکیڈل دب جائے
اور ہارون عبید کاردارز کے فیملی فرینڈ ہیں۔“

”نہ صرف فیملی فرینڈ، بلکہ وہ ان کے کارٹیل کے
رکن بھی ہیں اور ایک آئی پی پی (خود مختار بجلی بنانے
والے ادارے کے مالک) بھی۔“ حنین نے اسکرین
دکھائی۔ اس پہ وہ تمام معلومات کھلی تھیں جو اس نے
انٹرنیٹ سے اٹھائی تھیں۔ ان کی ویب سائٹس اور
سوشل میڈیا وغیرہ سے۔

”بالکل۔ اور سعدی ٹھہرا تھرکول کا سائٹس دان۔
آئی پی پی ہذا اور تھرکول والوں کا پرانا کلیش ہے۔“

حنین اداسی سے مسکرائی۔ اسے یاد آیا وہ دن جب
زمر سعدی کی سالگرہ پہ سولی کی پارٹی کا کارڈ لے کر ان
کے گھر چار سال کے وقفے بعد آئی تھی۔ (مجھے اتنا
عرصہ پتا ہی نہیں تھا کہ کاردارز کا روبرو کیا ہے، یہ بھی
نہیں پتا تھا کہ کارٹیل کیا ہوتا ہے۔ سب کچھ تب کتنا
مختلف تھا۔)

”فرض کرو ہاشم اور ہارون عبید شریک جرم ہیں تو وہ
دونوں بہت آسانی سے سعدی کو کسی بھی ملک لے
جاسکتے ہیں۔“

”مگر کون سے ملک زمر؟“

”اس کے لیے احمر ہے نا!“ اس نے مسکرا کر
موبائل کی اسکرین حنین کو دکھائی۔ اس پہ احمر کی ای
میل کھلی تھی۔ اس میں ممالک کی فہرست تھی، جس
کے اوپر لکھا تھا۔ ”یہ لسٹ میں نے آپ کو نہیں دی۔
یہ جو بھی آپ دیکھ رہی ہیں، یہ آپ کا تخیل اور تصور
ہے، قوی امکان ہے کہ آپ ایک سیزو فرینک ہیشنٹ
بن چکی ہیں جو غیر مرئی چیزیں تصور کرتے رہتے ہیں،
اس لیے بڑھنے کے بعد اسے مناد بھیجے گا۔“

”اس لسٹ کا ہم کیا کریں گے؟“

”دیکھو، ہاشم کی رجسٹرڈ اکھتر سے زائد کمپنیز پوری دنیا

تصویریں گوگل کر کے اس کے سامنے کیں۔ وہاں
سری لنکا پھیلا تھا۔

پر خم ہواؤں کا ملک۔ سری لنکا۔

”بالکل، سری لنکا۔“ زمر نے میز پر ہاتھ مارا۔
”انسانی اسمگلنگ کے لیے بے حد مشہور ملک۔ نوے
فیصد امکان ہے کہ وہ اسے نہیں لے کر گئے ہوں
گے۔“

”مجھے تو سو فیصد لگ رہا ہے۔“ حنین ایک دم بے
قرار ہو گئی۔ ”زمر، چلیں ماموں کو بتائیں۔“

”حنین! وہ اداسی سے مسکرائی۔ ”ہم فارس کو
ہارون عبید والی بات بتائیں گے، سوائے ہاشم کے، ہم ہر
بات اسے بتائیں گے تاکہ وہ ہاشم کے ساتھ باقی سب کو
بھی ڈھونڈ نکالے، مگر ہم کوئی ایسی حرکت نہیں کریں
گے جس سے وہ لوگ گھبرا کر سعدی کو مار دیں۔“

”مگر ہم سری لنکا کیوں نہیں جاسکتے؟“

”تمہیں یاد ہے بچپن میں بڑھی وہ کہانیاں جن میں
ایک ظالم دیو شہزادی کو اغوا کر کے کالے پہاڑوں پہ لے
جا کر قید کر دیتا ہے؟ اور ایک شہزادہ اس کو ڈھونڈنے لگتا
ہے؟ وہ شہزادہ، حنین! کالے پہاڑ پہ نہیں جاتا، وہ ایک
جنگل میں جاتا ہے جہاں ایک طوطا ہے، وہ طوطا جس
میں اس دیو کی جان ہے سو جب وہ طوطے کی گردن
موڑے گا تو دیو بھی اس کے قدموں میں آگرے گا۔“
کالے پہاڑ بھی تباہ ہو جائیں گے اور شہزادی خود بخود
آزاد ہو جائے گی۔ سو فارس کو اپنا کام کرنے دو، تم ان
فائلز کو کھولنے کی کوشش کرو۔ ہاشم کی جان ان ہی میں
ہے۔“

اوپر سے فارس کی آواز آئی تو وہ دونوں خاموش
ہو گئیں۔ وہ گہرا آگیا تھا اور زمر کا پوچھ رہا تھا۔ چند لمحے
بعد وہ نیچے اترتا دکھائی دیا۔

اس کے بیٹھنے کے بعد زمر اس کو ”مجھے احمر نے
بتایا۔“ کہہ کر ہارون عبید کے بارے میں بتانے لگی
اور یہ بھی کہ وہ سعدی کو کسی دوسرے ملک لے جاسکتے
ہیں۔ سری لنکا ایک مشکوک ملک تھا۔ فارس بغور
اسے دیکھتے مستنار رہا۔

میں پھیلی ہیں، مگر کہاں کہاں؟ ان ممالک کی فہرست
ہمارے پاس نہیں، لیکن ہارون عبید کے چوہ ممالک
ہمیں معلوم ہیں۔ وہ سعدی کو کسی ایسے ملک میں
رکھیں گے جہاں ان دونوں کا آنا جانا ہو۔“

”تو مجھے یہ بتاؤ حنہ، کہ ہاشم پچھلے چار ماہ میں کتنے
ممالک میں گیا ہے؟“

حنین کی آنکھیں چمکیں۔ آگے ہوئی۔ چند کیز
دیائیں۔ ہاشم کا شیڈول دیکھا۔ ”چھ ممالک۔“ ذرا
مایوسی ہوئی۔ ”چھ ملک بہت زیادہ ہیں۔“

”ہارون عبید کی فہرست کے چوہ ممالک اور ہاشم
کے چھ ممالک میں کتنے ملک مشترک ہیں؟“
”تین!“ حنین بھی قدرے پر جوش ہوئی۔ فہرست
چھوٹی ہو گئی تھی۔

”گڈ۔“ زمر بال جوڑے میں لیٹتے ہوئی۔ ”وہ سعدی
کو ان ہی تین ملکوں میں سے کہیں لے کر گئے ہوں
گے۔ پہلا ملک کون سا ہے؟“

”او نسوں۔“ زمر نے بالوں میں اسٹک لگاتے نفی
میں سر ہلایا۔ ”۲ مریکا لے جانا ان کے لیے مشکل نہیں،
مگر وہ اتنا رسک افورڈ نہیں کر سکتے۔ کوئی ایسا ملک ہونا
چاہیے جس میں رسک کم ہو۔ دو سر املک؟“

”۳ انڈیا۔ مگر یہاں۔“ احمر کی لسٹ سے پڑھا۔
”یہاں ہارون عبید کا کاروبار واجبی سا ہے۔ اور ہاشم
صرف ایک دن کے لیے کسی سیمینار میں گیا تھا۔“

”نہیں، انڈیا بھی نہیں۔ بہت خطرناک ہے تیسرا
ملک بتاؤ۔“

حنین ذرا غور سے اسکرین کو دیکھنے لگی۔
”اس تیسرے ملک میں ہاشم پچھلے چار ماہ میں کئی
دفعہ گیا ہے، یہاں ہارون عبید کا کاروبار بھی کافی زیادہ
ہے بلکہ اس ملک کے دارالحکومت میں سمندر کے
ساتھ ان کا ایک ہوٹل بھی واقع ہے۔“

”کہاں؟“ زمر دلچسپی سے آگے ہوئی۔
”سری لنکا کا شہر کولمبو۔“ حنین نے یونہی چند

گا میں صرف اس کی بریادی دیکھنے جا رہا ہوں۔ ہر ٹیبل موجود ایک زائڈ ڈش کا ڈسکن جب مہمان اٹھا میں تھگے تو اندر سے ان کاغذات کا ایک ایک پکٹ نکلے گا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے پکٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور جب اس کے سر آئی جی صاحب یہ کاغذ دیکھیں گے، تو اے ایس پی اپنی سب سے بڑی سپورٹ کھو دے گا۔ ایک وہی ہے جو کھل کر جج کی حمایت کر رہا ہے، اسکی تباہی کے بعد ان لوگوں کو خود سامنے آنا پڑے گا۔“

”آپ کا نام تو نہیں آئے گا نا؟“ وہ متفکر ہوئی۔
 ”حنین اگر تم یہ نہ کہتیں تو مجھے یہ خیال ہی نہ آتا۔ میں تمہارا کیسے شکریہ ادا کروں؟“ وہ خفا ہوا۔ حنہ کے ابرو ناراضی سے بھنچے۔

”اچھا نہ بتائیں۔ مجھے بتا ہے آپ نے الزام کسی اور کے سر ڈالنے کا انتظام کر لیا ہوگا۔“ فارس نے محض شانے اچکائے اور باہر نکل گیا۔ حنہ نے گہری سانس بھری۔ پھر اوپر آئی۔ زمر کا دروازہ کھٹکھٹا کر دھکیلا۔

وہ اسٹڈی ٹیبل پہ بیٹھی، ہتھیلی پہ گال جمائے سوچ میں گم تھی۔ حنہ میز کے ساتھ اکھڑی ہوئی تو وہ چونکی۔

”آپ ٹھیک ہیں؟ آپ کی رحمت آج کل بہت زور بنے لگی ہے۔“

زمر نے گہری سانس لی۔ کندھے اچکائے۔

”ہاں یونہی بدلتے موسم کا اثر ہوگا۔“

”آپ میری طرح ہوتی جا رہی ہیں۔ ست اور بے کار۔“

”چھوڑو۔ مجھے بتاؤ فلیش کہاں تک پہنچی۔“

”اس چین والی ویڈیو میں دیکھا تھا، کیسے خاور نے فلیش کے ذکر پہ گردن تن لی تھی۔ اسی نے وہ فائلز encrypt کی ہیں۔ اور وہ ایک بے حد ماہر اور قابل آدمی ہے۔ اس کا فیکٹر کیا گیا Algorithm توڑنا میرے لیے ناممکن ہے۔“

زمر کے چہرے پہ بے چینی پھیلی۔ ”یعنی اب ہم وہ

”آپ آج احمر سے ملی تھیں؟“ نارمل سے انداز

میں سوال پوچھا۔

”نہیں۔ فون پہ بات ہوئی تھی۔“ اس نے جی کڑا

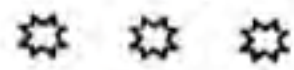
کر کے کہا اور سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا۔ وہ چپ رہا، مگر جب اٹھنے لگا تو صرف اتنا کہا۔ ”میں ہارون عبید کو چیک کر لوں گا۔ شاید اس کا کوئی تعلق ہونج سے۔“

”شاید نہیں یقیناً“ ہے ٹرسٹ می!“ وہ زور دے کر بولی۔ فارس نے چند لمحے غور سے اسے دیکھا۔

”ڈونٹ وری! میں آپ پہ ٹرسٹ کرتا ہوں، اسی لیے زیادہ سوال جواب نہیں کر رہا۔“ گوریہ کہہ کر وہ خود بھی ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

زمر کا ذہن ابھی تک سری لنکا میں الجھا تھا۔ فارس اب کل کے لیے اپنی چیزیں تیار کر رہا تھا۔ کل اسے اے ایس پی سرود شاہ سے اپنا حساب چکانا تھا۔ اذان کی آواز آئی تو زمر سر جھٹک کر عشاء پڑھنے اٹھی۔ پھر ان دونوں کو دیکھا جو اپنے اپنے کمپیوٹرز پہ مصروف تھے۔ ”کیا تم لوگوں پہ نماز فرض نہیں؟“

”بڑھتا ہوں ابھی۔“ وہ کچھ سپر زپرٹ کر رہا تھا، وہی کرتا رہا۔ حنہ نے ان سنا کرتے ہوئے چہرہ مٹل جھکا لیا۔ زمر کو پتا تھا کہ ان دونوں نے نہیں پڑھنی نماز۔ وہ گہری سانس لے کر اوپر چلی گئی۔



یہ حسن اتفاق ہے یا حسن اہتمام ہے جس جگہ فرات وہیں کر بلا بھی ہے۔ اگلی شام جب شہر پہ جلوہ گر ہوئی تو اس میں اکتوبر کی خزاں آلود ادا سی تھی۔ سیاہ بادل آسمان پہ جمع ہو رہے تھے اور گویا مہنہ برسنے کو بے تاب تھا۔ ایسے میں جب وہ گھر سے نکلنے لگا تو حنین نے پوچھا۔

”کیا آپ کا جانا ضروری ہے؟“ وہ دونوں داخلی دروازے کے اندر کھڑے تھے۔ فارس نے سنجیدگی سے سر کو خم دیا۔

”وہ ہو مل جہاں سرود شاہ کی خاندانی تقریب ہے، وہاں کیٹونگ میں میرا بندہ ہے، وہ سب سنبھال لے

آلی نے باری باری دونوں کو دیکھا۔ ”اتنی مہربانی کی وجہ؟“ جواب میں خاور سمجھانے لگا۔

”ہمارے ایک دوست کے بارے میں اس لڑکے نے کچھ معلومات کسی وکیل کو دی ہیں۔ وہ شخص ان کا غلط استعمال کر رہا ہے۔ ہم اس لڑکے پہ ہاتھ نہیں اٹھا سکتے اور پیار سے وہ اس وکیل کا نام نہیں بتا رہا۔ میں نے کاردار صاحب سے بات کی تھی کہ کسی عامل تنویم (ایمپلائمنٹ) کے ذریعے نام اگلوالوں، انہوں نے اجازت دی دی ہے۔ پھر مجھے آپ کا خیال آیا۔ آپ نے کچھ عرصہ فرانزک Hypnotist کے طور پہ بھی انگلینڈ میں کام کیا ہے۔ آپ سے زیادہ قابل اعتماد عامل تنویم میرے پاس کوئی نہیں۔ بدلے میں آپ کو اس کا تجربہ سننے کا موقع مل جائے گا اور ہمیں ہماری معلومات کیا ہم یہ ڈیل کر سکتے ہیں؟“

آلی نے ایک دفعہ پھر دونوں کو دیکھا۔ یہ پہلی دفعہ نہیں تھا کہ ہارون نے اسے اپنے کسی کاروباری کام کے لیے استعمال کرنا چاہا تھا۔ ”کیا ہاشم کو معلوم ہے کہ آپ مجھے وہاں لے جانا چاہتے ہیں؟“

”نہیں، لیکن آپ راضی ہو جائیں میں ان کو بتا دوں گا۔“

”میں راضی ہوں۔“ اس نے گردن اگرائی۔ یہ پہلی دفعہ تھا جب وہ ہارون کے کام کے لیے راضی ہوئی تھی۔ ”لیکن آپ ہاشم کو میرے واپس آنے کے بعد بتائیں گے، ورنہ وہ مجھے نہیں جانے دے گا۔“ خاور لمحے بھر کو چپ ہوا۔ ”لیکن ان کو بتائے بغیر۔“

”جیسے تم اس کو بتائے بغیر ادھر آئے ہو اسی طرح تم اس کو بتائے بغیر یہ سارا کام کرو گے۔ وہ میرا قیدی ہے، ہاشم کا نہیں!“ ہارون نے سختی سے کہا۔ آبدار نے اس بات پہ بے اختیار ہارون کو دیکھا۔ انہوں نے قیدی کو مہمان سے بدلنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ لمحے بھر کے تامل کے بعد شاہ کاؤ فلوار راضی ہو گیا۔

”شیور۔ مجھے صرف معلومات سے غرض ہے۔“ اور آبدار کو دیکھا۔ ”ہمیں اگلے ہفتے جانا ہوگا۔“

”میں صرف فصیح کے ساتھ جاؤں گی۔“ اس نے

فائلز نہیں دیکھ سکتے؟“

حنین مسکرائی۔ ”میں نے یہ نہیں کہا۔ بے شک میں اسے نہیں کھول سکتی۔ لیکن ایک شخص ہے جو اسے کھول سکتا ہے۔ سعدی بھائی کے پاس میرے جیسا داغ نہیں تھا، اسی لیے وہ اس شخص کے پاس نہیں گئے۔“

”تمہیں یقین ہے کہ وہ یہ کھول سکتا ہے؟“

”بالکل۔ کیونکہ وہ ماہر ہے اور وہ بہترین ہے۔“

اس بات پر زمر ابھی۔

”مگر وہ کون ہے؟“ حنا نے مسکراتے ہوئے چہرہ اس کے قریب کیا۔

”آپ کو سعدی بھائی کو سب کو مجھ سے امید تھی کہ میں اسے کھول لوں گی، مگر نہیں زمر یہ فلیش۔ یہ سارے فساد کی جڑ۔ اس کو وہی شخص کھولے گا جس نے اسے مقفل کیا ہے۔ کرنل خاور! میں اس فلیش کو خاور سے کھلواؤں گی۔“ اور یہ کہتے ہوئے وہ اپنے مخصوص نارمل نہیں حنین والے انداز میں مسکرائی تھی۔ زمر نے بے حد تعجب سے اسے دیکھا تھا۔

باہر ہلکی ہلکی بوند پانڈی ہو رہی تھی۔



جس گل نے کئی بار بلایا لیکن لے گئی راہ سے زنجیر کی جھنکار مجھے اکتوبر کی وہ بارش ہارون عبید کی رہائش گاہ پہ بھی برس رہی تھی۔ ایسے میں جب آبدار نے اسٹڈی روم کا دروازہ کھولا تو ہارون عبید کے سامنے کرسی پہ کرنل خاور براجمان نظر آیا۔

”بابا آپ نے بلایا؟“ خاور کو نظر انداز کر کے اس نے کرسی کھینچی۔

ہارون قدرے ناخوش نظر آرہے تھے مگر پھر بھی خاور کو اشارہ کیا۔ وہ آبدار کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”میں نے آپ کے والد صاحب سے بات کر لی ہے، وہ راضی ہیں۔ آپ ہمارے سائنس دان سے ملنا چاہتی تھیں میں آپ کو اس سے ملوا سکتا ہوں۔“

اپنے باپ کے پرستل سیکورٹی آفیسر کا نام لیا۔ ”میری رہائش اور روانگی کا بندوبست وہی کرے گا۔“
خاور نے بہت تحمل سے کڑوا گھونٹ پی لیا۔
”شیور۔ لیکن سعدی کے ساتھ جو بھی بات ہوگی وہ آپ صرف مجھے بتائیں گی۔“

”بالکل۔ میں یہ بہت دفعہ کر چکی ہوں۔“ پھر اسی سنجیدگی سے ہارون کو دیکھا۔ ”پھر کہاں جانا ہے مجھے بابا؟ کس جگہ رکھا ہے آپ نے اپنے قیدی کو؟“
آواز میں طنز اور آنکھوں میں گلہ۔ یہی چیز ہارون کا ناخوش کر رہی تھی مگر وہ معلومات زیادہ اہم تھیں۔ سو تحمل سے بولے۔

”کولبو۔“ انہوں نے سری لنکا کے کمرشل دار الحکومت کا نام لیا۔ آیدار سرہلا کراٹھ کھڑی ہوئی۔
”بیٹے! ہم ابھی تفصیل سے اس بارے میں بات کرتے ہیں، ہم صرف اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔“
انہوں نے قدرے نرمی سے پکارا۔

”یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بابا۔“ اور اسی خفگی سے باہر نکل گئی۔ ہارون گہری سانس لے کر رہ گئے۔



میں اس شان سے ہارا تھا
کہ دشمن جیت کے رویا تھا
ہوٹل کی کھڑکیوں پہ بھی بارش تڑ تڑ برس رہی
تھی۔ سرمد شاہ کے بک شدہ ہال میں گہما گہمی تھی۔
تقریب کے لیے پہنچنے والے مہمان لابی سے گزر کر ہال
کی طرف جا رہے تھے۔ سامنے ریستورنٹ میں بیٹھے
فارس غازی کو وہ مہمان صاف نظر آ رہے تھے۔ اس
نے ہاتھ سے تھپتھپا کر اندرونی شرٹ میں موجود پیکٹ
کو محسوس کیا، جس میں اے ایس پی سرمد شاہ کی اپنی
دوسری بیوی جو کہ ایک بدنام زمانہ ٹائیکہ کی بیٹی تھی
کے ساتھ تصاویر موجود تھیں۔ نکاح نامے کی کاپی
تھی۔ اور اس گھر کے کاغذات تھے جو سرمد شاہ نے اس
لڑکی کے نام سے خریدے تھے۔

فارس کو چند ماہ لگے تھے یہ سب حاصل کرنے

میں۔ اسے یہ سب کس نے دیا، اس شخص کا قصہ تم
بعد میں سنو گے، ابھی اتنا جان لو کہ سرمد شاہ کی ماں
متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ مگر اس کا ماموں جو
آئی جی کے عہدے پر فائز تھا، وہ امیر بھی تھا اور بار سوخ
بھی۔ نہ صرف اس نے اپنی بیٹی (شہزادہ کی بیٹی
بہن عاتزہ) سے سرمد شاہ کی شادی کی بلکہ اس کا کیریئر
بھی بنوایا۔ اس کو اپنے طبقے میں پیر جمائے دیے۔ سرمد
شاہ نے ان سب کو شیشے میں اتارا ہوا تھا۔ وہ شیشہ
ٹوڑنے کے لیے کنکر فارس کی جیب میں تھا۔

پی کیپ والا سر جھکا کر بیٹھا وہ گزرے سالوں کو سوچ
رہا تھا۔ پھر ایک لمحہ ہر یاد پر حاوی ہونے لگا۔ ارد گرد
موجود ”حال“ تحلیل ہو کر ماضی میں بدلنے لگا۔

وہ سفید کرتے میں ملبوس اس کال کو ٹھہری میں تھا۔
اس کے ہاتھ دیوار کے ساتھ اونچے بندھے تھے۔
آنکھیں بند کیے سختی سے دانت پہ دانت جمائے وہ یوں
کھڑا تھا کہ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ چہرے پہ
اذیت کے آثار تھے۔ ایک سپاہی کیے بعد دیگرے اس
کی کمر پہ ہنر ساما رہا تھا۔ سرمد شاہ بھی وہیں کھڑا تھا۔
یونیفارم کی بجائے سفید ٹی شرٹ پہنے وہ پسینے میں تر
تھا۔ ایک دم لپک کر فارس کی گردن دیوچی۔

”مجھے تمہارا اقبالی بیان چاہیے۔ غازی!“
”میں نے قتل نہیں کیا۔“ وہ بند آنکھوں سے
بڑھال ہو کر بولا۔ جواب میں سرمد شاہ نور نور سے
چیننے لگا۔

ویٹرنے پہالی میز پر رکھی تو فارس چونکا۔ ماضی تحلیل
ہوا۔ وہ ریستورنٹ میں بیٹھا تھا۔ کھڑکیوں پہ بوندیں
ہنوز گر رہی تھیں۔ ماحول نم اور ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ ایسے
میں اس نے بھاب اڑاتی کافی کی پہالی لبوں سے لگائی۔
لابی میں سے گزرتے لوگ اب بھی دکھائی دے
رہے تھے۔ وہ بل بے کر کے اٹھا اور سر جھکائے
جیبوں میں ہاتھ ڈالے آگے چلنا گیا۔ ذہن میں ہر وہ لمحہ
گزر رہا تھا۔ وہ جیل کے اذیت ناک ماہ و سال اور وہ
اس رات اسپتال میں گزرے چند گھنٹے۔ جب ان کے
ہاتھوں سے اس اے ایس پی نے سعدی کو عاتب

جس وقت وہ گھر میں داخل ہوا، بارش مسلسل برس رہی تھی۔ حنین اور زمر لاؤنج کے صوفے پہ بیٹھی تھیں۔ وہ دروازہ لاک کر کے آگے آیا تو پانی میں بھیگا ہوا لگتا تھا۔ جانے کتنی دیر سڑک کنارے بارش میں چلتا رہا تھا۔

حنین اسے دیکھ کر بے قراری سے اٹھی۔ ”کیا بنا اس آدمی کا جس نے میرے بھائی کو ہماری نظروں کے سامنے اسپتال سے غائب کروایا تھا؟“

فارس نے بس ایک خاموش نظر اس پہ ڈالی اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ حنین نے نا سمجھی سے زمر کو دیکھا۔ وہ خود بھی چونکی تھی۔ پھر فوراً ”بیچھے گئی۔“

وہ کمرے میں کھڑا گھڑی اتار رہا تھا۔ زمر سامنے آئی۔

”میں نے“ وہ چپ ہوا۔ گھڑی اتار کر میز پہ رکھی۔ پھر پیکٹ نکال کر ساتھ رکھا۔ ”میں نے نہیں کیا۔“

”کیا مطلب نہیں کیا؟“ وہ حیران رہ گئی۔

”وہ اس کے بچے کی سالگرہ تھی۔ اس کا بیٹا وہاں موجود تھا۔“ وہ اب صوفے پہ بیٹھا سر جھکائے جو گرز کے کسے کھول رہا تھا۔

”تو یہ کہ وہ ایک سات سال کا بچہ تھا۔“ اس نے جو گرز اتارے۔

”تمہیں اس پر رحم آگیا؟“ زمر کو آگ لگ گئی۔

”کیا تم وہ سب بھول گئے جو اس نے ہمارے خاندان کے ساتھ کیا؟“

”زمر بی بی۔ میرا دلغ اس وقت خراب مت کریں۔ میں اس بچے کے سامنے اس کے باپ کا کردار نہیں کھول سکتا تھا۔“ وہ ایک دم غصے سے اس کے سامنے آیا۔ ”تقریب میں سارے لوگ اس کے باپ پہ پل پڑتے وہاں ایسی ایسی باتیں کی جاتیں جن کو وہ بچہ کبھی نہ بھولتا۔ اس کا باپ اس کی ماں سے بے وفائی کر رہا ہے، اس سے جھوٹ بولتا رہا ہے، وہ کبھی نہ

کروایا تھا۔ نفرت، غصہ، انتقام، وہ ہر جذبے میں گہرا آگے بڑھتا گیا۔

متعلقہ ہال کے داخلی حصے سے اندر کی رنگارنگ تقریب نظر آرہی تھی۔ کونے میں رک کر فارس نے دور گھڑے آئی جی صاحب کے ساتھ بات کرتے سرود شاہ کو دیکھا۔ وہ سوٹ میں ملبوس تھا اور مسکرا کر خوش باش سا اپنے سر کے ساتھ مگن تھا۔ فارس کی سرود نظریں اس سے ہوتیں، مرکزی دیوار تک جا رہیں۔

”ابھی برتھ ڈے ار صم شاہ۔“ وہاں لکھا تھا۔

ایک دم فارس کی نظروں میں الجھن ابھری۔ اس نے آگے پیچھے دیکھا۔ غبارے، پھول، اور اوپن سی کیک ٹیبل۔ مہمانوں میں جا بجا نظر آتے بچے اور سب سے نمایاں، وہ سیاہ ٹوپیں اور ٹائی میں کھڑا پیاراسا سات سالہ بچہ۔ جو سرود شاہ کی بیوی عاترہ کے ساتھ کھڑا تھا۔

(تو وہ خاندانی تقریب سالگرہ کی تھی؟)

فارس بالکل سن سا ہو کر اس بچے کو دیکھے گیا۔ بچہ بہت سیار تھا۔ اس کے ہونٹ گلابی اور آنکھیں کالچ جیسی تھیں۔ شہزادہ، مسکرا کر وہ اپنے جیسے کم عمر بچوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ کسی ننھے شہزادے کی طرح۔ اس کی کالچ سی آنکھوں کی معصومیت ایک دم ہر شے ہر جذبے پہ حاوی ہونے لگی۔

فارس کے تاثرات بدل چکے تھے۔ سرودین عاترہ ہوا۔ آنکھوں میں تکلیف سی ابھری۔ پھر ایک دم وہ مڑا۔

ہوٹل کے کچن کی پشت پہ جب وہ پہنچا تو ایک کھٹور اس کا نظر تھا۔

”لائیں پیکٹ دیں، میں اریج کروں گا۔“ ادھر ادھر دیکھتے رازداری سے بولا۔

”نہیں۔ ابھی نہیں۔“ وہ پریشان لگ رہا تھا۔

کھٹور نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”آپ نے ایک مہینہ مجھے تنخواہی اس کام کے لیے اور اب؟“

”میں نے کہا نا ابھی نہیں۔ تم جاؤ کام کرو۔“ اور واپس پلٹ گیا۔

اسٹریٹنگ وہیل کے پیچھے موجود تھا۔ آنکھوں پہ براؤڈ گلاسز لگے تھے، کلائی میں قیمتی گھڑی۔ چیونٹم چباتا وہ ڈرائیو کر رہا تھا۔

ڈیش بورڈ پہ پڑے فون کی اسکرین دفعتاً "چمکی۔ اس نے اسے اٹھایا۔ اسید کا پیغام تھا۔ سب دوست کشمیر پہنچ چکے تھے، اسی کا انتظار ہو رہا تھا۔ "میں دوپہر تک پہنچ جاؤں گا۔" لکھ کر پیغام بھیجا اور پھر سے ڈرائیو کرنے لگا۔

یکدم اس نے کار کو بریک لگائی۔ ٹائر چرچرائے خون کی بوندیں وینڈا اسکرین تک اڑ کر آئیں۔ لمحے بھر کو وہ دم بخود رہ گیا تھا۔ لیکن پھر تیزی سے باہر نکلا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ مرنے والا کوئی کتا تھا اور اس نے اسے بچانے کی کوشش بھی کی تھی مگر۔

باہر آکر وہ رکا۔ اگلے ٹائروں تلے آیا۔ وہ کتا نہیں تھا۔

وہ کتے کا بچہ تھا۔ ایک معصوم سنہری لیسبراڈار۔ وہ کھلا گیا تھا۔ خون جا بجا بکھرا تھا۔ نوشیرواں بچوں کے بل اس کے قریب بیٹھا۔ پریشانی سے اس کو دیکھا۔ پلے کی گرون میں کالر تھا۔ "آریو" اور مالک کا نام "اینڈرس۔" وہ سرفاظ خون میں ڈوبنے کی وجہ سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ کسی فارن سیاح کا کتا تھا۔ شاید ہسپانوی۔

نوشیرواں کی سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ پھر اس نے آواز سنی۔ اوپر پہاڑ پہ درختوں سے کوئی عورت پکار رہی تھی۔ "آریو۔ آریو۔"

نوشیرواں نے بجلی کی تیزی سے اپنی ڈیزائنر جیکٹ اتاری، کتے کو اس میں لپیٹا اور بھاگتا ہوا کار کے اندر جا بیٹھا۔ جیکٹ کی گھنٹری فرنٹ سیٹ پر ڈالی اور تیزی سے کار آگے بڑھائی۔ چند کوس آگے جا کر رفتار آہستہ کی۔ اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ وہ خون سے بھرے تھے۔

شیرو کو اک دم ٹھنڈے سینے آنے لگے۔ اس نے کار روکی۔ اور جیکٹ کی گھنٹری لیے باہر نکلا۔ سڑک کے دہانے پر کھڑے اس نے سوچا کہ کتے کی لاش نیچے

بھولتا۔ وہ ساری زندگی کسی محبت، کسی رشتے کا اعتبار نہ کرتا۔ ہر انسان کا باپ اس کے لیے آئیڈیل ہوتا ہے، آئیڈیل ٹوٹنے سے اس کی شخصیت بھی ٹوٹ جاتی ہے۔

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ کھڑکی پہ بارش تڑتڑ برس رہی تھی۔ زمر نے افسوس سے اسے دیکھا۔

"تمہاری سوتیلی ماں نے بھی ایسا ہی کیا تھا نا!" کوئی برف کا اولہ سازور سے کھڑکی پہ گرا تھا۔

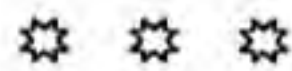
"مجھے درمیان میں مت لائیں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر روکا۔ آنکھیں سرخ ہوئیں۔

"تم خود اپنے آپ کو درمیان میں لائے ہو۔ جو سرود شاہ نے کیا، وہ اس کے ذمے ہے۔ اس کے بچے کو کبھی نہ کبھی پتا چل جائے گا۔ یا تم اسے معاف کر رہے ہو؟"

"میں کسی کو معاف نہیں کر رہا۔ صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ یہ چیز کسی اور طریقے سے کسی اور وقت کی جاسکتی ہے۔ بعد میں وہ اپنے بچے کو کیسے ڈبل کرے یہ میرا مسئلہ نہیں ہے، لیکن آج کی اہانت کی وجہ میں نہیں بنتا چاہتا۔ میرا انتقام میری بیماری نہیں ہے، نہ اس نے مجھ سے میری انسانیت چھینی ہے۔" وہ مڑا اور خشک کپڑوں کے لیے الماری کھول لی۔

زمر گہری سانس بھر کر رہ گئی۔ "تم غلطی کر رہے ہو اور تم اس کے لیے بہت بچھتاؤ گے۔"

وہ نظر انداز کر کے کپڑے نکالنے لگا۔ بارش کی تڑتڑاہٹ مزید تیز ہو گئی تھی۔



قاتل مران شان مٹانے پہ ہے بھند
میں بھی سینا کی نوک پہ سر چھوڑ جاؤں گا
موسم اگلے چند دن ویسا ہی ٹھنڈا رہا، مگر پھر آہستہ آہستہ بارش کا اثر ختم ہو گیا، جس اور گرمی واپس آگئی۔ البتہ آزاد کشمیر کی طرف جاتی اس پہاڑی بل کھاتی سڑک پہ اب بھی ٹھنڈی چھایا سی تھی۔ ایک چمکتی کار وہاں دوڑ رہی تھی۔ نوشیرواں کاردار

لڑ کر آئے ہو؟“ وہ فکر مندی سے اس کے سامنے آئی۔
 ”فکر نہ کریں، کسی انسان کو قتل نہیں کیا۔“
 ”مجھے سچ بتاؤ شیرو، کسی سے جھگڑا کیا ہے؟“ اس
 نے اسے کہنی سے تھام کر اپنے سامنے کیا۔ نو شیروں
 بالکل ٹھہر کر اسے دیکھنے لگا۔

”آپ کو لگتا ہے میں جھوٹ بول رہا ہوں؟“
 ”تمہاری حالت جو بتا رہی ہے وہ تمہارے الفاظ
 نہیں کہہ رہے۔“ اب کے وہ سختی سے بولی۔ شیرو نے
 افسوس سے اسے دیکھا۔

”کتے کا بچہ تھا وہ می، کتے کا بچہ۔“ وہ ایک دم بلند
 آواز میں بولا۔ ”میں نے غلطی سے اسے مار دیا، مگر میں
 اس کا خون آلود وجود نہیں دیکھ سکا۔ میں اس کو دفنا بھی
 نہیں سکا۔ مجھے ہر جگہ اس کا خون نظر آ رہا تھا۔ اس کی
 مالکن اس کو پکار رہی تھی۔ وہ می، کتے کا بچہ۔“ وہ ایک
 دم بلند آواز میں بولا۔ ”میں نے غلطی سے اسے مار دیا“
 مگر میں اس کا خون آلود وجود نہیں دیکھ سکا۔ میں اس کو
 دفنا بھی نہیں سکا۔ مجھے ہر جگہ اس کا خون نظر آ رہا تھا۔
 اس کی مالکن اس کو پکار رہی تھی۔ آریو، آریو۔ وہ
 آوازیں مجھے پاگل کر رہی ہیں“ وہ وحشت سے چلایا۔
 ”او کے او کے!“ جو اہرات نے نرمی سے اس کو
 شانوں سے تھاما۔ ”ریلیکس، کوئی بات نہیں، یہ صرف
 ایک حادثہ تھا۔ تم ان چیزوں سے بہت اوپر بہت
 مضبوط ہو۔ تم ایک کاردار ہو اور۔“

”اور میں ایک بڑے خاندان کا بڑا آدمی ہوں“
 عظمت میرا مقدر ہے، یہی نا؟“ یہی بتاتی آئی ہیں نا آپ
 مجھے ساری عمر؟“ غصے سے کہنی چھڑائی۔ ”بس کرویں،
 نہیں سننی مجھے یہ باتیں اس وقت۔ کیونکہ می۔ اب
 مجھے ان سے یقین نہیں آتا۔“ برہم سا صدے سے
 اسے دیکھا، کپڑے لیے ہاتھ روم میں چلا گیا اور دروازہ
 جواہرات کے منہ پہ بند کر دیا۔

وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ (خیر، وہ نازل ہو جائے
 گا۔) اور واپس نیچے چلی آئی۔ اس کی ابھی تیاری رہتی
 تھی۔



کھائی میں پھینک دے، مگر وہ اسے نہیں پھینک سکا۔
 ٹھنڈی ہوا کے باوجود اس کا جسم سینے سے تر تھا۔
 وہ سڑک کنارے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور خون
 آلود ہاتھوں سے مٹی کھودنے لگا۔ نرم مٹی بھی نہیں
 کھودی جا رہی تھی۔ سانس چڑھنے لگا تھا۔ بمشکل،
 بدقت وہ ایک چھوٹا سا گڑھا کھود پایا پھر جیکٹ کھولی تو
 اندر ننھا معصوم پلا خون میں ڈوبا مر رہا تھا۔
 نو شیرواں کی حالت غیر ہونے لگی۔ اس نے چہرہ اٹھا
 کر اپنے چار سو دیکھا۔

ویران پہاڑ اونچے درخت۔ کھائی۔ کھلا آسمان۔
 وہ لاش کو وہیں چھوڑ کر کار میں آ بیٹھا۔ خون آلود
 ہاتھ، خون آلود فرنٹ سیٹ۔ کپکپاتے ہاتھوں سے
 دوبارہ کار اشارت کی۔ اسے گھر جانا تھا۔
 (کوئی جانور کو بھی ایسے نہیں مارتا، شیرو! وہ تو پھر
 انسان کا بچہ تھا۔)

شیرو نے سر جھٹکا اور ایک سیٹی پڑے، ہاڈ بڑھا دیا۔ وہ ہر
 جگہ تھا، وہ ہر منظر میں تھا، اس سے فرار ناممکن تھا۔ اور
 اب گلٹ کا یہ مرض بڑھتا جا رہا تھا۔
 چند گھنٹوں بعد قصر کاردار میں جھانکو تو نو شیرواں کار
 گھر کے اندرونی کیراج میں لے آیا تھا اور اب گارڈ کو
 ہدایات دے رہا تھا۔ ”اس کو اچھی طرح صاف کرواؤ۔
 ایک دھبہ بھی نہ باقی رہے۔“

لاؤنج میں جواہرات تیار بیٹھی تھی۔ بالوں کا جوڑا
 بنائے، گردن میں دکتے، ہیرے۔ ہاتھ لہنوٹا کے
 سامنے بچھا رکھا تھا جس پر وہ کیونکس لگا رہی تھی۔
 شیرو کو اس طرح آتے دیکھ کر حیرت ہوئی۔
 ”تم تو دو ستوں کے ساتھ گئے تھے؟ اور یہ کپڑوں کو
 کیا ہوا ہے؟“ وہ جواب دیے بنا اوپر چلا گیا۔ جواہرات
 نے چٹون کے اشارے سے لہنوٹا کو روکا، ہاتھ نکالا
 اور اس کے پیچھے اوپر گئی۔

شیرو اپنے کمرے کے ڈرینگ روم میں، الماریوں
 کے پٹ کھولے کھڑا تھا۔ چہرے پہ عجیب بے زاری اور
 بے چینی تھی۔

”تمہارے کپڑوں پہ خون کیوں لگا ہے؟ کیا کسی سے

مس کرتی ہوں۔ اس نے اپنے منہ ہاتھ کو فارس کے گال اور ٹھوڑی پہ پھیرا جسے فارس نے دونوں ہاتھوں میں تھام کر جوا۔

لمحے بھر کے لیے ان کے ارد گرد ولیمہ کالمنکشن غائب ہو گیا۔ وہ چار ساڑھے چار سال پیچھے چلے گئے، جہاں قبرستان سے لوگ لوٹ رہے تھے اور ایک تانہ کچی قبر یہ وہ کھڑا ہنوز مٹی ڈال رہا تھا۔ اس کا چہرہ ویران تھا اور آنکھوں میں گلابی سا پانی تھا۔ قبر کھل طور پر ڈھک چکی تھی۔ ساتھ پانچ سالہ اہل خاموش اور اس بیٹھی تھی۔ لوگ دور جا رہے تھے۔ نور گھر تھی وہ الگ مزاج کی تھی اس کو سارہ نے نہیں آنے دیا تھا مگر اہل کو وہ زبردستی اس کے باپ کے جنازے پہ لے آیا تھا۔ قبرستان تقریباً سنسان ہو چلا تھا۔ سورج اوپر تپ رہا تھا۔ وہ بھی تکان زدہ سا مٹی پہ آ بیٹھا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے آنکھیں مسلیں۔

”آپ رو رہے ہیں، چاچو؟“ اہل نے اس کے چہرے پہ ہاتھ پھیرا۔ فارس نے نفی میں چہرہ ہلایا، زکام زدہ سی سانس اندر کو کھینچی، آنکھوں میں گلابی پانی تھا مگر اس نے ان کو رگڑ لیا، پھر اہل کو دیکھا۔

”اپنے باپ کی قبر مت بھولنا کبھی اہل۔ اس کو اس لیے مارا گیا کیونکہ وہ ایک سچا آدمی تھا، ایک ایسا آدمی جو ظلم کے خلاف اٹھ گیا ہو۔ وہ بہادر تھا۔ میں بھی اسی کا بھائی ہوں۔ اللہ کی قسم میں ان لوگوں کو نہیں چھوڑوں گا۔ وہ سمجھتے ہیں ہم غریب ہیں، کمزور ہیں، تو ان کا ہاتھ نہیں روک سکتے؟ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ کبھی یہ نہیں سمجھو گی کہ تمہارے باپ نے خود کشی کی تھی اور میرا وعدہ ہے، میں اس کے ایک ایک قابل کا سر تمہارے ہاتھ میں لا کر دوں گا۔“ اسے پتا تھا اہل کو اس کی باتیں سمجھ نہیں آئیں گی مگر وہ جواب میں کچھ کہہ رہی تھی۔ قبرستان تحلیل ہو گیا، وہ روشنیوں سے مزین اس ہال میں موجود تھے۔ فارس بیٹھا ہوا تھا اور اس نے اہل کے ہاتھ تھام رکھے تھے۔

”آپ اتنے بڑی کیوں ہوتے ہیں؟ جب بھی ماما سے سے کہوں آپ سے ملتا ہے، وہ کہتی ہیں، چاچو

میں ریگ زار تھا، مجھ میں بے تھے سناٹے اسی لیے تو میں شہنائیوں سے ڈرتا رہا۔ ان سے دور چلے آؤ تو شام کے اس پہر ایک اعلا درجے کے ہوٹل کے بینکوائٹ ہال میں ولیمہ کالمنکشن منعقد تھا۔ روشنیاں جگمگ رہی تھیں۔ دلہا دلہن پھولوں سے سجے اسٹیج پہ بیٹھے، مسکرا کر تصویریں بنوارے تھے۔ نیچے ایک میز کے گرد مزہبی غیر دلچسپی سے اسٹیج کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے زرد لمبی قمیض پہن رکھی تھی، ہال جوڑے میں تھے اور کانوں میں آؤرنے تھے، موقع کی مناسبت سے ہلکی پھلکی سی تیار وہ اچھی لگ رہی تھی۔ فارس ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ ٹانگہ ٹانگہ جمائے، مسلسل سیل کے بٹن دبا رہا تھا۔ ایک دوسرے سے کٹے اور بے نیاز۔

تب ہی سارہ ادھر آئی دکھائی دی۔ وہ سادہ سی تیار ہوئی تھی۔ ایک بیٹی اہل ساتھ تھی، دوسری کونہ جانے کس وجہ سے ساتھ نہیں لائی تھی۔ ان کو دیکھ کر پھیکا سا مسکرائی۔ زمزم بھی مسکرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ فارس نے نہیں دیکھا تھا، سر جھکائے سیل لگا تھا، مگر اہل نے جیسے ہی اسے دیکھا، ایک دم ماں کی انگلی چھڑا کر آگے لپکی اور اس کے گلے سے لگ گئی۔ وہ چونکا، مگر پھر نگاہ پچی پہ پڑی تو نرمی سے اس کے گرد بازو جمائے کیے اور اسے خود سے لگائے رکھا۔ سارہ جو زمزم سے رسی کلمات کہہ رہی تھی، ایک دم رک کر دیکھنے لگی۔ آنکھیں گلابی ہوئیں۔

وہ تو بس ایک دفعہ ملنے آیا تھا۔ رہائی کے بعد اور سارہ نے اسے رکھائی سے خود سے دور رہنے کو کہا تھا، پھر وہ صرف دو دفعہ آئی ان کے گھر (انیکسی میں) مگر تب جب وہ گھر پہ نہیں تھا کہ فارس غازی کا مطلب تھا ”مصیبت“۔ اور اہل تو اس سے پتا نہیں کتنے عرصے بعد مل رہی تھی، پھر بھی اسے وہ یاد تھا؟ اہل اب فارس سے الگ ہوئی تو وہ اسے دونوں کہنیوں سے تھامے، مسکرا کر اپنے سامنے کھڑا کیے، پوچھ رہا تھا۔

”تم کیسی ہو اہل؟“
”میں ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟ میں آپ کو بہت

مگراتنے دن میں اس کی ایک بھی قابل گرفت چیز نہیں مل سکی۔ ”وہ کچھ الجھا ہوا تھا۔ ”میں جج ہارون عبید اور اے ایس پی کالنگ جوڑنا چاہتا ہوں، الیاس فاطمی کے ساتھ۔ مگر ان تینوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں بن رہا۔“

”یعنی درمیان میں کچھ مسنگ ہے؟“

درمیان میں ”کوئی“ مسنگ ہے۔ کوئی ایک شخص ہے ان سب کے درمیان۔ نفی میں سرہلاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ زمر نے تھوک نگلا۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔

”کھانا لگ رہا ہے۔“ وہ اٹھنے لگی تو ایک دم اسے چکر سا آیا۔ میز کا سہارا لے کر واپس بیٹھی۔ فارس اپنے فون پہ مبن دبا رہا تھا اس نے نہیں دیکھا۔ چند گہرے سانس لے کر اس نے خود پہ قابو پایا۔

”ہم باہر کہیں اور ڈنر کر سکتے ہیں فارس؟“ اسے اتنے لوگوں میں ایک دم گھٹن ہونے لگی تھی۔ اتنی دور ٹیبل تک جائے گی کھانا ڈالنے تو کہیں گر جائے گی۔ فارس نے اس بات پہ بے اختیار اسے دیکھا اور پھر ہمیشہ کی طرح اس کی بات مان لی۔ ایک دم سے زمر کو احساس ہوا کہ اسے فارس کو تھاننا چاہیے۔ اپنی خرابی طبیعت کٹنی وہ سب پرس میں ایک رپورٹ بھی تھی اسے وہ فارس کو دکھا دینی چاہیے۔



جن پتھروں کو ہم نے عطا کی تھیں دھڑکنیں

جب ان کو زباں ملی تو ہم بھی برس پڑے

کچھ دیر بعد وہ اسی ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں ایک میز کے گرد بیٹھے تھے۔ وہاں زرد بتیاں تھیں۔ میز پہ تازہ پھول رکھے تھے۔ موم بتی جل رہی تھی۔ وہ ٹیک لگائے، مسلسل کان کی نو مستلا، ویٹر کو آرڈر دے رہا تھا اور زمر کے ہاتھ گود میں رکھے برس پہ تھے۔ فارس کے ساتھ پہلی دفعہ ایسی جگہ پہ ڈنر کرنا۔ بہت آکورد تھا۔ تب ہی زمر کا فون بجا۔ اس نے فوراً اٹھالیا۔

”جی صداقت؟ جی ظاہر ہے وہ کپڑے استری کرنے

پڑی ہیں۔“ وہ اس کے کان کے قریب شکوہ کر رہی تھی۔

فارس نے زخمی نظر اٹھا کر سارہ کو دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہوں یہ میرا خون ہے، تم خون میں لیکر نہیں کھینچ سکتیں؟ سارہ کا گلارندھا۔

”تم چاچو کو اتنا مس کر رہی تھیں تو کہتیں میں تمہیں گوالا آتی۔“ بیٹی کو مخاطب کیا۔ شرمندگی اور خفت کے ساتھ۔ وہ اتنے سال انگلینڈ رہے فارس کے ساتھ ایک شہر میں تو صرف چند ماہ رہے، پھر وہ جیل چلا گیا، لیکن ایسے وہ دوڑ کر اس کے پاس آئی تھی جیسے برسوں کا ساتھ ہو۔ یہ خون کیا چیز تھی؟ اس کارگوں میں بہنا کیسے سب کو جوڑ کر رکھتا تھا۔ اس کا ناحق بہائے جانا کیسے سب کو توڑتا تھا۔

زمر بس خاموشی سے ان کو دیکھ رہی تھی۔

”سعدی کا کچھ پتا چلا فارس؟“ اس نے پوچھا تو آواز میں آس بھی تھی، خفت بھی۔ وہ ان ہی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اہل کو کسی نے بلا لیا تھا سو وہ بھاگ گئی۔

”میں اسے ڈھونڈ لوں گا۔“ خشک انداز میں کہہ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ میز پہ عجیب سا تاور آیا۔ اسے سارہ کا آنے ساتھ رو بہ یاد تھا۔

”تمہیں آئل کمپنیز۔ یعنی آئی پی ایڈ کو چیک کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے ان کا اس میں کوئی ہاتھ ہو۔“ سارہ نے خود کو کہتے سنا۔ فارس نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر سر ہلایا۔

”کر رہا ہوں۔“ سارہ اٹھ گئی۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے پاس پرائیویٹ نمبر تھا، چاہتی تو خفیہ ایسی ایم ایس بھی بھیج دیتی، لیکن وہ جانتی تھی وہ اس کو ڈھونڈ لے گا اور زمر اسے کورٹ میں دھکیل دے گی۔

”ہارون عبید والا معاملہ کہاں تک پہنچا؟“ وہ تہاہ گئے تو زمر نے سرگوشی کی۔ اے ایس پی کو وہ اب ڈسکس نہیں کرتے تھے، وہ ماننا تھا لیکن وہ اس کو معاف کر چکا تھا۔

”ہوں۔ میں ہارون عبید کے پیچھے ہی لگا ہوا ہوں“

"I Fell in Love

وہ آرام سے کہہ گیا۔ اس کے لبوں پہ مسکراہٹ تھی، مگر وہ اس مسکراہٹ کو پہچانتی تھی۔ دو انگلیاں اب بھی رپورٹ پہ تھیں۔

"میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ تیسری وجہ بھی بتائے دیتا ہوں۔" اس نے لمحے بھر کے لیے بھی زمر کی آنکھوں سے نظریں نہیں ہٹائیں۔ "میں سات سال پہلے جب اس شہر میں پوسٹڈ ہو کر آیا تھا تو میں نے آپ کی کلاس میں داخلہ لیا تھا۔ مجھے آپ سے محبت ہو گئی تھی۔" وہ زمر سے کہہ رہا تھا مگر یہ زمر کی آنکھوں میں نہیں تھی۔ "میں آپ کے قریب رہنے کے لیے بہانے ڈھونڈنے لگا تھا۔ آپ کے بارے میں ہر چیز جاننے لگا تھا۔ آپ سعدی کی فیس دے رہی ہیں، آپ حندہ کے لیے اپنی چابیاں جان بوجھ کر اٹھانا بھول جاتی ہیں۔ آپ کو کب سے استہما ہے۔ مجھے بہت کچھ معلوم تھا۔ میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا کہ مجھے نوٹس نہیں ملے۔ مجھے ملے تھے۔ میں نے پھاڑ کر پھینک دیے تاکہ آپ مجھے زیادہ وقت دے سکیں۔ مجھے تب احساس ہوا کہ میں مریض عشق بننا جا رہا ہوں۔"

وہ سانس لینے کو رکا۔ وہ بالکل دم سا دھے اسے سن رہی تھی۔

"پانچ سال پیچھے چلتے ہیں زمر۔ میں نے آپ کو وہ نوزدین بھیجی، مجھے لگا تھا آپ میری لکھائی پہچان جائیں گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ اسی لیے جب آپ کی والدہ نے رشتے سے انکار کیا تو میں نے دوبارہ کوشش نہیں کی۔ میں "آپ" کے لیے نہیں لڑا۔ میرے نزدیک ایک ایسی عورت کے لیے لڑنا بے سود تھا۔ جو میری لکھائی بھی نہ پہچان سکے۔ میں نے آپ کو چھوڑ دیا۔ شادی بھی کر لی، لیکن میرا ایک حصہ پہلے بھی اور آئندہ بھی آپ سے محبت کرتا رہے گا۔ اس ایک حصے کی وجہ سے میں اپنی پوی سے ویسی محبت نہیں کر سکا جیسی کرنی چاہیے تھی۔ شروع شروع میں میں اس کے نام کو اپنے بھائی کے نام سے جوڑنے پہ لڑتا تھا، مجھے لگتا تھا یہ صرف اس سے محبت نہ کرنے کا گھٹ ہے ورنہ اس

تھے۔ میں نے نہیں بتایا تو آپ کو خود سمجھنا چاہیے تھا۔" رک کر خفگی سے سنا۔ "میں نے وہاں کپڑے نہیں رکھے تھے تو کیا کسی چیز میں نے آکر رکھے تھے؟ روز اسٹینڈ پہ کپڑے کون رکھتا ہے؟ حد کرتے ہو آپ بھی۔" بڑبڑا کر فون رکھا تو دیکھا فارس ذرا چونک کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ نے خود کو "چیز" کیوں کہا؟"

"مثال دی تھی۔ کیوں؟ کیا ہوا؟" اس نے نا کبھی سے اسے دیکھا۔ "تم مسکرا رہے ہو؟"

فارس نے مسکراہٹ دہائے چہرہ جھکا کر نفی میں سر ہلایا۔ "میں بالکل بھی نہیں مسکرا رہا۔"

وہ فوراً آگے ہوئی۔ "نہیں سچ سچ بتاؤ۔ تم ایسے صرف تب مسکراتے ہو جب تمہیں کوئی بات معلوم ہوتی ہے اور مجھے نہیں۔" پھر رک کر اپنی بات پر غور کیا۔ "کیا کسی نے تمہارے سامنے مجھے چیز کہا ہے؟"

"میرے سامنے کوئی آپ کو چیز کہنے کی ہمت کر سکتا ہے کیا؟" فارس نے سنجیدگی سے اسے تسلی دی۔ زمر کے تھے اعصاب قدرے ڈھیلے پڑے۔ اس کے انداز میں اتنا مان، اتنا اعتماد تھا۔ برس میں ہاتھ ڈال کر رپورٹ دو انگلیوں سے پکڑی۔ پھر سرسری انداز میں بولی۔

"اس بات کا کیا مطلب تھا جو اس رات تم نے کسی؟" اسے یقین تھا کہ فارس کو معلوم ہے وہ کسی بات کا ذکر کر رہی ہے۔

وہ اسے دیکھتے ہوئے ہولے سے مسکرایا۔ "اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ نے مجھے سات سال پہلے قید میں ڈالا تھا۔"

وقت ایک لمحے کے لیے تھم گیا، موم جتی کا شعلہ دھیرے سے ٹمٹمایا۔ پھولوں کی خوشبو آس پاس پھیلی۔ زمر تک اس کی آنکھوں میں دیکھے گئی۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

(مجھے سات سال پہلے آپ سے محبت ہو گئی تھی)
with you Seven Years Ago!"

”میں آپ کی آنکھوں میں گلٹ (پشیمانی) دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ تب کیا کریں گی جب آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ فارس غازی بے گناہ تھا۔ میں صرف اسی دن کے انتظار میں ہوں اس دن جب آپ کو سچائی معلوم ہوگی۔ میں اپنی بے گناہی ثابت کروں گا اور آپ ٹوئیں گی۔“

موم بتی کا شعلہ ایک دم بجھ گیا۔ زممر کی انگلیوں نے رپورٹ کو چھوڑ دیا۔ نگاہیں ہنوز فارس پر جمی تھیں۔

”یہ جو آپ کو بہت غرور ہے نا خود یہ کہ آپ بہت قابل ہیں، میں یہ غرور ٹوٹتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

میں آپ کی آنکھوں میں گلٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔ کوئی انتقام، کوئی انصاف نہیں چاہیے مجھے آپ سے۔

صرف احساس ندامت اسی لیے میں نے آپ سے کوئی تعلق جوڑنے کی کوشش نہیں کی، کوئی حق نہیں مانگا، کیوں کہ مجھے آپ کے ساتھ رشتہ بنانے میں دلچسپی نہیں رہی۔ وہ وقت کب کا گزر گیا۔ اب ہم

صرف پارٹنرز ہیں، ساتھ کام کر رہے ہیں، میں آپ سے کبھی نفرت نہیں کر سکتا اور محبت کرنا چھوڑ بھی نہیں سکتا، لیکن آپ جیسی عورت کے ساتھ میرے

جیسا بندہ کبھی بھی ساری زندگی نہیں گزار سکتا۔ میں آپ سے محبت کرتا ہوں، لیکن میں آپ کو پسند نہیں کرتا۔ مجھے صرف اس دن کا انتظار ہے جب آپ

میرے سامنے ٹوئیں گی اور اس دن زممر بی بی! میں آپ کو آزاد کروں گا، عزت سے طلاق کے کاغذات

تھما دوں گا، مگر اس سے پہلے میں آپ کی ہر کڑوی بات برداشت کرتا رہوں گا، محبت یا شرافت کی وجہ سے

نہیں بلکہ اس لیے کہ میں آپ کو آزما رہا ہوں۔ یہی آپ کی سزا ہے۔ کیوں کہ میرے نزدیک آپ ایک بےوقوف عورت اور بہت بری وکیل ہیں۔“

موم بتی سرد ہو چکی تھی۔ پھولوں میں ریکا کے ساتھ کانور کی بو بھی رچ بس گئی تھی۔ موم بتیاں

پراسرار اور خوف ناک لگ رہی تھیں۔ وہ بہت سکون سے سرد لہجے میں کہہ کر پیچھے ہوا۔ ویٹر کھانا سرو کرنے

آکھڑا ہوا تھا۔ سیزر ہیلٹو پہ گرم اسٹیک سٹو سٹو

کے حقوق و فرائض تو میں نے سب پورے کیے تھے۔ ڈانٹا تھا مگر بلا وجہ نہیں۔ وہ میری بہت اچھی دوست تھی۔ لیکن جیل کے چار سال میں یہ نہیں سمجھ سکا، اگر میرا اور اس کا تعلق صرف دوستی یا گلٹ کا تھا میں اسے اتنا مس کیوں کرتا ہوں؟ محبت تو مجھے آپ سے تھی مگر آپ کے لیے میں کبھی نہیں لڑا، اس کے لیے پھر بھی لڑ رہا ہوں۔“ فضا میں ایک دم Winters

Rebecca De کی مہک پھیل گئی۔ وہ اب بھی سانس روکے ہوئے تھی۔

”مجھ سے شادی کرنے کی تیسری وجہ کیا تھی؟“

”وہ مسکرایا۔“ محبت نہیں تھی۔ اگر محبت کے لیے آپ سے شادی کرنی ہوتی تو ساڑھے پانچ سال پہلے کر لیتا۔ مگر نہیں۔ میں نے آپ سے شادی بھی کی اور

آپ کی ہریات برداشت کی۔“ کہتے ہوئے وہ آگے کو ہوا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”اس لیے نہیں کہ

میں کمزور تھا، محبت میں خاموش تھا، یا یہ میری شرافت تھی۔ ٹرسٹ می زممر، میرا ایک حصہ ساری زندگی آپ

کی قید سے نہیں نکل سکے گا، میں آپ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا، اور میں آپ کو ایک ہزار دفعہ بھی

معاف کر سکتا ہوں، مجھے یہ بھی احساس ہے کہ آپ کے ساتھ جو بھی ہوا میری وجہ سے ہوا لیکن۔“

وہ رکاوٹ بھی رک گیا۔

وہ نمک کا مجسمہ بنی، ٹیک ٹیک اس کو دیکھ رہی تھی۔

”لیکن میرا اور آپ کا تعلق، میری برداشت، میری خاموشی، میرا آپ کی پرواہ کرنا، آپ کے زخموں پر مرہم

رکھنا، محبت اس میں کبھی بھی شامل نہیں تھی۔ میں نے آپ سے غلط کہا تھا کہ میں آخر میں آپ سے اپنا

حساب لوں گا، مجھے آپ سے نہ انتقام لینا ہے نہ کوئی حساب لیکن۔“

وہ پھر رکاوٹ زممر کا سانس بھی رک گیا۔

”لیکن جو آپ نے میرے ساتھ کیا، میں ایک بات بھی نہیں بھولا۔ آپ سے شادی کی تیسری وجہ یہ ہے کہ۔“ چہ مزید آگے کیا۔ موم بتی کے غمگناہ شعلے کے پیچھے اس کی پریش آنکھیں نظر آرہی تھیں۔

جواہرات، مکمل تیار، باہر کے لیے چلتی آرہی تھی۔
حنین مسکرا کر قریب آئی۔

”مسز کاردار! مانی گاڈ، آپ کتنی خوب صورت لگ رہی ہیں۔“ سادگی اور معصومیت سے تعریف کی۔
جواہرات مسکرائی، نرمی سے اس کا کال چھوا۔
”مجھے معلوم ہے تم کیسے آئیں؟“

”مجھے خاور سے کام تھا۔ کیا وہ اندر ہیں؟“ پھر جلدی سے اضافہ کیا۔ ”پلیز آپ ان سے میری سفارش کرویں کہ وہ میرا کام لازمی کریں۔“

”جواہرات عجلت میں تھی، پھر بھی اس کے ساتھ کنٹرول روم تک آئی اور چوکھٹ سے حکم جاری کیا،
”خاور، حنا کو اسسٹ کرو۔“ اور چلی گئی۔

اندر چند اسکرینز لگی تھیں۔ ایک لیپ ٹاپ کے سامنے خاور بیٹھا تھا، کام کرتے ہوئے اس نے سر اٹھایا اور قدرے ناراضی سے حنا کو دیکھا۔

”ہیلو کرنل خاور!“ وہ دوڑ کر آئی اور سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھی۔ ٹانگہ پہ ٹانگہ جمائی۔

”ہیلو حنین! کیا کام ہے؟“
”بہت اہم کام ہے۔“ ایک فلیش اس کی طرف بڑھائی۔ ”اس میں میرے دو کورین ڈرامے ہیں۔ ان کو encrypt کرو۔“

خاور نے گہری سانس لی۔ ”حنین، تم یہ کام خود بھی کر سکتی ہو پاس ورڈ لگانا کوئی مشکل نہیں ہے۔“

”مجھے پاس ورڈ چھوڑیں، اسٹینڈرڈ RSA تک کا معلوم ہے، مگر یہ سب میری اس دوست کو بھی معلوم ہے جس کو میں ٹریپ کرنے جا رہی ہوں۔ سو مجھے ان فائلز کو ایسے encrypt کر کے دیں خاور کہ وہ اسے نہ کھول سکے۔“

”میرے پاس اس وقت بہت کام ہے حنین۔ کسی اور وقت آنا۔“ آکٹا کر کتاہوا پس ٹاپ کرنے لگا۔
”پلیز کرنل خاور!“ منت کرتے ہوئے پلکیں جھپکائیں۔

خاور جواب دے بیٹا کام کرتا رہا۔ حنا نے ادھر ادھر دیکھا۔ ”ارے یہ ڈیجیٹل فریم ہے نا، اچک کر ایک فوٹو

کر رہی تھی، یوں لگتا تھا زمر کے اندر تک کوئلے دہک رہے ہوں۔ کوئی آس سی ٹوٹ گئی تھی۔

وشرہٹا تو وہ بیرے سے بولا۔ ”کھانا کھائیے۔ وہ وقت گزر چکا جب آپ کو مجھے سنا تھا۔ تب آپ کو اپنی صحت عزیز تھی۔ حالانکہ مری تو میری بیوی تھی، آپ کو تو ڈونٹڈ کڈنی بھی مل گیا۔“

تختی سے کہہ کر وہ جو بے خبر تھا، کھانا شروع کرنے لگا، مگر یہ آخری بات۔ یہ آخری باتیں زمر کا دل ایسے ہی توڑ دیا کرتی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں سرخی در آئی۔ زور سے پرس کی زپ بند کی اور آگے کو ہوئی۔

”فارس غازی!“ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”ہزار سال بھی انتظار کرو تو وہ دن نہیں آئے گا۔ میں زمر یوسف ہوں اور اپنی نظروں میں میری بہت عزت ہے۔ زمر تمہارے سامنے نہیں ٹوٹے گی۔ کبھی بھی نہیں۔“ پھر اسی تنی گردن کے ساتھ کھڑی ہوئی اور پرس اٹھالیا۔

”کہاں جا رہی ہیں آپ؟“ اس نے بند لیوں سے لقمہ چباتے ہوئے محل سے پوچھا۔ وہ ویسا ہی مدہم، خیال رکھنے والا فارس غازی بن گیا تھا۔

”کھر۔“
”۳ تنی رات کو آپ کیب سے نہیں جائیں گی۔ تھوڑی دیر رک جائیں، میں ڈراپ کر دیتا ہوں آپ کو۔“

زمر نے بغیر جانے کو مڑی تو وہ کھڑا ہوا اور اس کے سامنے آیا۔

”اچھا آپ کار لے جائیں، میں کیب سے آجاؤں گا۔“ چالی بڑھائی۔ زمر نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا، پھر چالی چھٹی اور باہر کی طرف بڑھ گئی۔ وہ اسی سکون سے واپس بیٹھ گیا۔



کھانے لگے قفلوں کے ہانے

پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن

حنین نے قصر کاردار کی چوکھٹ عبور کی تو

کر دو گی۔ ” مگر تیسری دفعہ جب پاس ورڈ نہ لگا تو۔ فائلز کرہنٹ۔ لکھا آنے لگا۔

”اف حنین۔“ خاور نے بے زاری سے فلیش کھینچی اور اسے تھمائی۔ ”اب اسے جا کر آگ میں جھونکو اور مجھے کام کرنے دو۔“

”کیا مطلب؟ میں نے ایک ہفتہ لگا کر ان کو ڈاؤن لوڈ کیا ہے، میری فرینڈ سے شرط لگی ہے، پلیز کر تل خاور! مجھے یہ کھول کر دیں۔“ وہ بدحواس ہو گئی تھی۔

”حنین مجھے ایک سیمینار کے لیے سیکورٹی پلان تیار کرنا ہے، میرے پاس بہت کام ہے، تمہاری مین ایج حرکتوں کے لیے وقت نہیں ہے میرے پاس۔ جاؤ۔“

رکھائی سے کہہ کر وہ واپس اپنی کرسی پہ آیا۔

”پلیز کر تل خاور۔“

”جاؤ حنین!“ وہ سنجیدگی سے ٹائپ کر رہا تھا۔ چند لمحے وہ خاموش رہی تو خاور نے نگاہ اٹھائی۔

سامنے کھڑی حنین چہرہ جھکائے رو رہی تھی۔ موٹے موٹے آنسو گالوں پہ لڑھک رہے تھے۔ خاور نے کراہ کر کپٹی مسلی۔ ”اب کیا ہے؟“

”مگر میری جگہ آپ کا بیٹا ہوتا تو بھی ایسے ہی کرتے؟“ اس نے جھکے چہرے کے ساتھ آنسو رگڑے اور فلیش پکڑ کر ست روی سے جانے کو مڑی۔ ساتھ ہی ہنسی لینے کی بھی آواز آئی۔

خاور نے آنکھیں میچ کر خود کو جیسے ڈھیروں صبر دلایا اور پھر اسے آواز دی۔

”میں صرف decrypt کر کے دوں گا، لیکن دوبارہ encrypt نہیں کروں گا۔“

وہ لٹے قدموں بھاگ کر واپس آئی۔ آنسوؤں والے چہرے کے ساتھ مسکرائی۔ ”سچ؟“

”کتنی ڈرامہ ہو تم۔“ ناگواری سے بولا۔ حنہ نے پلکیں جھپکاتے فلیش اس کو تھمائی۔ پھر اس کی کرسی کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ وہ شدید کوفت زدہ سا فلیش اڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”یہ لمبا کام ہے اور تم اس دوران خاموش رہو گی۔ مجھے زائد باتیں پسند نہیں۔ تمہارے پہلے لفظ پہ میں

فریم اٹھائی۔“ ان میں ہیری پوٹر کی طرح تصاویر چلتی پھرتی ہیں۔ یہ آپ کے بیٹے کی تصویر ہے؟“

”ہاں۔ اسے واپس رکھ دو۔“ اس نے فریم حنہ کے ہاتھ سے لے کر واپس رکھا تو اس نے اچک کر لب ٹاپ کے ساتھ رکھے گلاسز اٹھائے۔ ”ان میں کیمرہ لگا ہے نا، واؤ یہ میں ایک دن کے لیے اپنی کزنز کو دکھا سکتی ہوں؟“ خاور نے جلدی سے وہ اس سے واپس لی۔

”پلیز حنین کسی چیز کو ہاتھ مت لگاؤ۔“ پھر بمشکل ضبط کرتے ہوئے ایک نظر اپنے سامنے پھلے کام کو دیکھا اور دوسری اس پہ ڈالی جو محصومیت سے آنکھیں جھپکاتے اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر قدرے خفگی سے فلیش اس سے لی اور ایک دوسرے کیسیوٹر کی طرف آیا۔ حنہ بھی جلدی سے اس کے ساتھ آکھڑی ہوئی۔ اب وہ خاموشی سے اس کا کام کر کے دے رہا تھا۔

”پاس ورڈ ٹائپ کرو۔“ تھوڑی دیر بعد اس نے کی بورڈ اس کے سامنے کیا۔ اور کسی مہذب انسان کی طرح دوسری طرف دیکھنے لگا۔ حنہ نے ٹائپ کیا اور سیدھی ہوئی۔ چند منٹ مزید ضائع کیے خاور نے پھر اس کی طرف کھوا۔

”ہو گیا تمہارا کام۔ اب جاؤ۔“

”مگر میں اسے کھولوں گی کیسے؟“

”اف۔“ اس نے اکثر چند مٹن دیائے اور کی بورڈ اس کے سامنے کیا۔ ”پاس ورڈ ٹائپ کرو، کھل جائے گا۔“

”تھینک یو سوچیج۔ کر تل خاور۔“ خوشی سے کہتے ہوئے اس نے ٹائپ کیا۔ پھر مسکراہٹ ابھرن میں بدلی۔

”یہ کیوں نہیں کھل رہا؟“

”کیوں کہ تم غلط پاس ورڈ لکھ رہی ہو گی۔ تمہیں یقین ہے کہ یہی پاس ورڈ تھا۔“ تحمل سے بولا۔

”کیا مطلب یقین ہے؟ میں پاگل تو نہیں ہوں نا۔ اتنا سا پاس ورڈ تھا میرا۔ افسیہ کیوں نہیں کھل رہا۔“

وہ پریشانی سے بار بار پاس ورڈ ٹائپ کرنے لگی۔ خاور نے قدرے غصے سے ٹوکا۔ ”ممت کرو، تم فائلز کرہٹ

اس کے پیچھے گیا۔ وہ سیڑھیوں پہ بیٹھی تھی۔ اور اس اور اکیلی۔

”آپ اکیلی کیوں آئی ہیں؟ ماموں کہاں ہیں؟“

”تمہارے ماموں کو خود نہیں ہا کہ وہ کہاں ہیں۔“

”آپ اپ سیٹ ہیں؟“ اس نے سمجھتے ہوئے

پوچھا۔ زممر نے جواب دیے بنا سر گھٹنوں پہ رکھ لیا۔

سیم نے اس کے ساتھ زینے پہ کچھ رکھا۔ اور پھر اسی

طرح واپس چلا گیا۔ زممر نے گردن موڑ کر دیکھا وہ

چاکلیٹس کا ڈبہ تھا۔ زممر زخمی سا مسکرائی۔

”ضروری نہیں کہ جو چیز ایک دفعہ اچھی لگے وہ

ہمیشہ اچھی لگتی رہے۔ جیسے وہ اپنے آپ کو اتنا نہیں

جانتا، جتنا آج میں نے اسے جان لیا ہے۔“

”اسے خود بھی نہیں معلوم کہ اسے زرتاشہ سے

اپنی سوچ سے زیادہ محبت تھی اور مجھ سے اپنی سوچ سے

بہت کم۔“

اندھیرے تہہ خانے کی سیڑھیوں پہ رہنے میں لپٹی

چاکلیٹس کی مہک کے اندر پھر سے ”ریکا“ کی خوشبو

بھی بس گئی تھی۔

Downloaded From Paksociety.com

جنوں میں شوق کی گہرائیوں سے ڈرتا رہا

میں اپنی ذات کی سچائیوں سے ڈرتا رہا

زممر یوسف نے زندگی میں پہلی دفعہ فارس کے

بارے میں اتنی بڑی بات بالکل درست کہی تھی، لیکن

اگر وہ سن لیتا تو تعجب اور حیرت سے تروید کر دیتا۔ وہ جلد

ہی گھر آ گیا تھا۔ پہلے وقت دیکھا۔ نماز کا خیال آیا پھر

”کچھ دیر بعد“ سوچ کر ٹل دیا۔ جیل سے آنے کے

بعد وہ بہت کم نماز پڑھ پاتا تھا۔ کمرے میں صوفے پہ

بیٹھتے ہوئے جوتے اتارے۔ دلچسپا ”سیل بجنے کی آواز

آئی۔ زممر شاید ہاتھ روم میں تھی، سیل بیڈ پہ پڑا تھا۔

فارس کسی خیال کے تحت اٹھا اور اس کا موبائل

اٹھایا۔ احمر شفیع کا پیغام آیا تھا۔ اس کے ابو سینیچے سیل

اٹھایا اور زممر کا پیٹرن ملا کر اسے کھولا۔

”مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے“ کل می جب

کام روک دوں گا۔“ تیزی سے ٹائپ کرتی انگلیاں مسلسل چل رہی تھی۔ اس کی کرسی کے ساتھ کھڑی حنا ہتھیلی ٹھوڑی تلے جمائے، دلچسپی سے اسے دیکھتی رہی۔

”سو آپ نے۔۔۔ ElGamal کے ذریعے

”کی“ کو۔“ خاور نے پلٹ کر گھور کر اسے دیکھا، اس

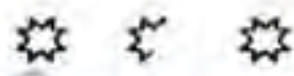
نے فوراً اپنے لبوں پہ انگلی رکھی۔ ”اچھا سوری میں

چپ!“ وہ شدید کوفت زدہ سا کمانڈ زونے لگا۔ حنین

لب و انتوں سے دبائے، ایک سائنڈ سی دیکھ رہی تھی۔

جس کو اتنا ماہر استاد ملے، وہ اس سے نہ سیکھے، یہ کیسے

ہو سکتا تھا؟



غرور حسن سرپا نیاز ہو تیرا

طویل راتوں میں تو بھی قرار کو تر سے

اسامہ لی وی کے سامنے بیٹھا تھا اور ندرت فون پہ

بات کر رہی تھی۔ ابا اپنے کمرے میں سونے جا چکے

تھے۔

”اچھا ذکیہ خالہ۔ اللہ حافظ۔“ ندرت سارہ کی امی

سے فون پہ بات ختم کر کے سیم کی طرف مڑیں۔ وہ

ناخوش لگ رہی تھیں۔ ”فارس اور زممر کو دیکھو۔ ولیمہ

کافنکشن چھوڑ کر باہر ڈنر کرنے چلے گئے۔ اب اس

کی کیا تک بنتی ہے؟ اگر وہاں کھانا نہیں کھانا تھا تو گھر

آجاتے، فضول پیسے ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

فارس بھی جہاں بیوی کے چل پڑتا ہے۔“

سیم نے مڑ کر ان کو سنجیدگی سے دیکھا۔ ”امی! بچن

میں دیکھیں۔ چولہا بند ہے نا؟ کیوں کہ مجھے جلنے کی

شدید بو آرہی ہے۔“

”ہاں ہاں بند ہے۔ دودھ کڑھ گیا تھا تو میں نے اتار

لیا۔“ وہ اپنے ہی خیال میں گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے اٹھ

گئیں۔ سیم نے سر جھٹکا اور واپس لی وی دیکھنے لگا۔

کافی دیر بعد دروازہ کھلا اور اس نے تھکی تھکی سی زممر

کو آتے دیکھا۔ وہ بچھی بے رونق لگ رہی تھی۔

سیم نے نیچے تہہ خانے میں چلی گئی۔ سیم آہستہ سے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

مرد تھا۔ مضبوط اور بہادر۔ ہرنجے کے لیے اس کا باپ ایسا ہی ہوتا ہے۔ کوئی ایسا جس کو کوئی نہیں ہرا سکتا جو ہر مسئلے کو حل کر سکتا ہے، ہر پریشانی میں ان کی ڈھال بن سکتا ہے۔

پھر ایک دن آئیڈیل کا یہ مجسمہ بھی زمین بوس ہو گیا۔

اس روز کس بات کی دعوت کی گئی تھی؟ بالکونی میں بیٹھے فارس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ ہاں، اس کے پاس ہونے کی خوشی میں۔ شاید کوئی پوزیشن ملی تھی اس نے۔ اس کا باپ، اس کی ماں اور چھ سالہ فارس، وہ بہت مسرت اور فخر سے اس دعوت کا حصہ بنے تھے۔ سب کچھ بہت اچھا تھا۔ تحفے، رنگ، خوشبو۔ روشنیاں۔ دعوت اور رنگ زیب نے دی تھی۔ کسی زمانے میں ان کو اپنی بہن اور بھانجے سے بہت لگاؤ ہوتا تھا۔

لیکن پھر۔ جو اہرات کاردار نے اپنے کسی ملازم کے ہاتھوں طہرہ غازی کی پہلی بیوی کے گھر پیغام بھجووا دیا۔ وہ اپنے دو بچوں، ایک بڑی لڑکی اور ایک فارس سے کچھ بڑے لڑکے کے ساتھ اس دعوت پہ آؤں گی۔ ندرت اور وارث کی ماں ولایت بیگم۔ وہ سخت گیر، قریبی مائل اور اوسط تعلیم یافتہ عورت تھی۔ اگر وہ کسی اونچی ڈگری کی حامل ہوتی تب بھی شاید وہ یہی کرتی جو اس نے کیا۔ علیہ کے سوشل سرکل، اورنگ زیب کے رشتے داروں اور دوستوں کے سامنے اس نے چلا چلا کر سب کو بتایا کہ وہ اس دھوکے باز انسان کی پہلی بیوی ہے۔ یہ تو دو بچوں کا باپ ہے، اور اب یہاں کھڑا ہے ایک خوب صورت اور جوان عورت کے ساتھ؟ جو اہرات اپنے بیٹے کے ساتھ سکون سے بیٹھی تماشہ دیکھتی رہی۔ علیہ، حق وق سی کھڑی رہی، اورنگ زیب اور طہرہ اسے سمجھاتے رہے کہ علیہ، اورنگ زیب سب جانتے ہیں کہ وہ پہلے سے شادی شدہ تھا، اس نے نکاح کیا ہے، گناہ نہیں کیا مگر سارا مسئلہ یہی تھا کہ ولایت تو نہیں جانتی تھی۔ اسے تو آج علم ہوا تھا۔ اس نے اپنی زبان اور اپنے آنسوؤں

میرا مسج دیکھیں۔“ فارس کے ابرو مزید تن گئے۔ انگوٹھے سے اسکرین اوپر کی۔ پرانے مسجوز۔ باہر ملنے کے کسی کام کی طرف اشارہ۔ فیس کی بات۔ احمر کافیس کے لیے شکریہ کرنا۔ سب مبہم تھا، مگر تے ابرو اور بھینچے لبوں کے ساتھ اس نے فون واپس اپنی جگہ پہ رکھا اور باہر بالکونی میں آ گیا۔

وہاں تاریکی تھی۔ فارس کرسی پہ پاؤں لہجے کر کے نیم دراز ہوا اور آنکھیں بند کر لیں۔ دل و دماغ دو حصوں میں بٹے تھے۔ (وہ اس کو کبھی دھوکا نہیں دے گی، وہ ایک بے وقوف عورت اور بدترین وکیل سہی، مگر وہ پیٹھے پیچھے حملہ کرنے والوں میں سے نہیں ہے، مگر پھر بھی وہ اتنا بے چین کیوں تھا؟ شک برہتا کیوں جا رہا تھا؟) اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ تاریکی میں اس کی ساری زندگی کسی فلم کی طرح چلنے لگی۔

فارس غازی نے ایک ایسے گھر میں جنم لیا تھا جہاں ایک ”بیمار“ شخص پہلے سے موجود تھا۔ اس کی ماں، جو مرض عشق میں مبتلا تھی۔

وہ ایک کاردار تھی۔ علیہ، کاردار۔ بے حد خوب صورت۔ ہاشم جیسے نقش اور نوشیرواں جیسا مزاج۔ نخرہ، غرور، غصہ، سب کسی کاردار جیسا تھا۔ کسی زمانے میں یہ سب اپنے جوہن پہ ہوتا ہو گا، مگر جس عمر میں اس کے ذہن نے شعور کی منزل پہ قدم رکھا، وہ بہت حد تک ڈھے چکی تھی۔ اسے ایک شادی شدہ آدمی سے محبت ہوئی تھی۔ گو کہ وہ اورنگ زیب کاردار کی بہن تھی، امیر بھی، خوب صورت تھی، لیکن پھر بھی محبوب کو خرید نہیں سکی تو خود کو اس کے قدموں میں رول دیا۔ ہر قیمت پہ اسے اپنانا چاہا، اور اپنا بھی لیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے باپ کو بھی اس کی ماں سے محبت تھی، مگر یہ متوازن محبت تھی، اس میں ”مرض“ کا عنصر نہ تھا۔

علیہ کے لیے طہرہ نے سب کچھ کیا، اس کو اپنا نام دیا، اولاد دی، مگر ایک الگ گھر نہ لے کر دے سکا۔ علیہ کو الگ گھر کی تمنا بھی نہیں تھی۔ وہ جہاں تھی خوش تھی تب تک جب تک وہ ان ماں بیٹے سے ملنے آتا رہے اور وہ اکثر آتا تھا۔ فارس کے لیے وہ آئیڈیل

سے جو کچھ کہا وہ کو نے میں کھڑے فارس کے ذہن کو تا
عمر اپنے باپ کے لیے داغدار کر گیا۔

یہ نہیں تھا کہ اس کی باپ کے لیے محبت میں کمی
آئی یا وہ ان سے نفرت کرنے لگا۔ بس اتنا تھا کہ اس نے
اپنے باپ کا مان اور اعتماد کھو دیا۔ اگر ولایت نہیں جانتی
تھی تو وہ بھی نہیں جانتا تھا مگر اس وقت اس کا خیال
کسی کو نہیں تھا۔ سب تقریب کی شرمندگی اور اہانت
کو تحلیل کرنے کی سعی کر رہے تھے وہ وہیں اس
کو نے میں کھڑا رہا۔ ساکت۔ خوف زدہ۔ بے یقین۔
فکر مند۔ اس کو ایک دم اپنا آپ کمزور اور بے سہارا لگا
تھا۔ اس کے سامنے کھڑا اس کا باپ ولایت بیگم کو
صفائی پیش کر رہا تھا وہ پریشان تھا اور بے چین بھی سوہ
سب کچھ لگ رہا تھا سوائے ایک بہادر مرد کے۔ اور یہ
سب کرتے ہوئے اس نے علیحدہ کاردار کو قطعاً "نظر
انداز کر دیا تھا۔ وہ خوب صورت لڑکی بے بس اور بے
سہارا کھڑی تھی۔ طہیور عازی ان دونوں کا سہارا نہیں
بن سکا تھا۔ گھر کا سربراہ ایسا نہیں ہوتا۔ گھر کے سربراہ
کو ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ وہ خاموشی سے اپنی ماں کے
ساتھ آکھڑا ہوا۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ علیحدہ
کی انگوٹھی کا نگینہ اسے چبھاتا تھا۔ اس چہن میں بھی
احساس تحفظ تھا۔

ان دونوں میں کون کس کو تحفظ دے رہا تھا؟ دونوں
کو نہیں معلوم تھا مگر اس دن سے فارس کو لگنے لگا تھا کہ
ہر رشتہ یا تو ختم ہو جاتا ہے یا دھوکا دے جاتا ہے۔ اس
نے باپ سے محبت کرنا کم نہیں کی، لیکن یہ احساس
ہو گیا کہ وہ ایک ایسا مرد ہے جو کچھن وقت میں ان ماں
بٹے کے سر کی چھت نہیں بن سکتا۔ طہیور عازی اپنی
پہلی بیوی اور خاندان کے ہاتھوں آہستہ آہستہ شکست
تسلیم کرتے گئے۔ مہینوں بعد اوھر چکر لگاتے یا بالکل
نہ آتے۔ فارس کو نہیں معلوم کہ یہ فیصلہ کس نے کیا
تھا، لیکن ایک دن وہ ان دونوں کو اپنے خاندانی گھر لے
ہی آئے۔

یہاں سے زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا تھا۔
تکلیفیں فلم جیسے بلیک اینڈ وائٹ اور mute ہو گئی

تھی۔ ولایت بیگم کے گھر میں وہ دو قیدی عجیب انداز
میں لائے گئے تھے۔ نہ ان کے کوئی حقوق تھے نہ ماں
تھا۔ ان سے بات کرنا گناہ ان کی پروا کرنا جرم تھا۔ گھر
میں واضح لیکر کھینچ گئی تھی۔ ایک طرف ایک کمرے
میں وہ نازوں میں اپنی مرض عشق میں مبتلا ہر حال میں
طہیور کے ساتھ رہنے کی خواہاں لڑکی اپنے کم عمر بیٹے
کے ساتھ تھی۔ اور دوسری طرف طہیور کی خاندانی
بیوی اور اس کے دو بچے جن کو پورے خاندان کی
سپورٹ حاصل تھی۔

اور اس کا کمزور باپ دریا کے دو کناروں کو ملائے کی
کوشش میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کو اس سے
نکالنا چاہتا تھا، مگر ایک دن اسے احساس ہوا کہ وہ شخص
کبھی اس پانی سے نہیں نکل پائے گا۔ اس دن فارس
گھر چھوڑ کر واپس بھاگ آیا تھا۔
زمر کمرے میں آچکی تھی۔ آہٹ نے فارس کا
ارتکاز توڑ دیا۔ وہ پرانی یادوں کو جھٹک کر موبائل نکال
کر بے مقصد ٹیٹن دبانے لگا۔



یہ الگ بات تھی کہ اس سہ پہرا یون عبید کی
رہائش گاہ کا سبزہ اداس تھا۔ آب دار کی کھڑکی سے
دکھائی دیتے لان میں مور خاموش بیٹھے تھے۔ بطخیں
اداسی سے کو نے میں دہکی تھیں۔ ملی جانے کہاں گم
تھی۔ اور وہ خوف۔ کمپیوٹر اسکرین کے سامنے بیٹھی
تھی۔ "سیو سعدی یوسف" کا صفحہ کھول رکھا تھا اور
آنکھوں میں شدید اداسی لیے اس لڑکے کی مسکرائی
تصویر دیکھ رہی تھی۔ ذہن کے نہاں خانوں میں ایک
منظر سا اٹھ رہا تھا۔ آئی نے آنکھیں بند کر لیں اور اس یاد
کے جھرنے کو بننے دیا اتنا کہ اس کے پانی میں وہ خود بہتی
چلی گئی۔

وہ یونور شی کے کیفے ٹیریا میں بیٹھی تھی۔ وہ سروس
دہ رہ گئی۔ سربا کی اداسی ہر جگہ گھلی ہوئی تھی۔ وہ سر
جھکائے، جرنل سے چند اہم نکات لکھے جا رہی تھی۔
جب اس نے وہ آواز سنی۔ کسی کو مارنے کی آواز۔

”آپ کا ڈاکٹر ٹھیک کہہ رہا ہے، آپ infertile ہیں۔ آپ کو یہ حقیقت تسلیم کرنی چاہیے۔“

لکھتے ہوئے آلی رکی۔ اس کی آنکھوں میں ناگواری ابھری۔ اسے برا لگا تھا۔ ”ایسے کہتے ہیں کسی کو بھلا؟“

مڑ کر شاکی نظروں سے دیکھا۔
دور کونے میں لوگ شیرو کو اٹھا رہے تھے، وہ لڑکا بھاگ چکا تھا۔

”آپ بانجھ کہلانے پہ اتنی اپ سیٹ کیوں ہیں؟“
”سعدی!“ مسز مرجان نے شکایت آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔

”آپ قرآن پڑھتی ہیں، مسز مرجان؟“
(اچھا اب وہ ابراہیم علیہ السلام یا ذکریا علیہ السلام والا واقعہ دہرائے گا۔) آلی نے دوبارہ سے کام کی طرف متوجہ ہوتے سوچا۔

”کبھی کبھی۔“
”یہی کبھی کبھی اس دنیا کے کروڑوں لوگوں کا مسئلہ ہے۔ خیر۔ آپ نے اس میں ذکریا علیہ السلام والا واقعہ تو پڑھا ہوگا، انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ ان کو اکیلانہ چھوڑیں۔ تو۔“
”تو اللہ نے انہیں یحییٰ عطا کیے، مگر وہ پیغمبر تھے سعدی۔“

سعدی نے گہری سانس لی۔ ”میم! خوب صورت لڑکوں کی بات کاٹنا نہیں کرتے۔ اس لیے محل سے مجھے سنیں۔ جب ذکریا علیہ السلام نے دعا کی تو اللہ نے ان کو ایک دم سے اولاد نہیں دے دی، بلکہ پہلے بشارت دی، کہ ان کے ہاں بیٹا ہوگا، مگر جب یہ بشارت دی تو ذکریا علیہ السلام حیرت سے پوچھنے لگے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تو اللہ نے فرمایا، ہم نے اس سے پہلے آپ کو بھی تو تخلیق کیا تھا اور آپ بھی تو کچھ نہیں تھے۔ آپ مجھے بتائیں مسز مرجان، کیا آپ نے غور کیا اس پہ؟“

”دیکھو سعدی! میں سمجھ رہی ہوں کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ ذکریا علیہ السلام کو یہ بتا رہے تھے

چونک کر سر اٹھایا تو کفنے کے ایک کونے میں، جہاں دیوار سی بنی تھی، پتلی گلی کی طرح، وہاں ایک لڑکا دوسرے کو پیٹ رہا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ حیران پریشان سی اٹھتی، مار کھانے والے لڑکے کے چہرے پہ نظر پڑی۔ وہ نوشیرواں کا روادار تھا۔ آلی نے ناک سکیڑی اور واپس بیٹھ گئی۔ (گڈ فار، ہم!)

اس کے ساتھ والی میز پہ ایک قدرے درمیانی عمر کی ویسی عورت بیٹھی تھی۔ سر بالکل گرائے، چپ، خاموش۔ کن اکیوں سے آلی کو نظر آیا، ایک گھنگھریالے بالوں والا لڑکا دوکانی کے مگ لیے ادھر آکر بیٹھا ہے۔ اس کی آلی کی طرف پشت تھی، وہ بھی توجہ دینے بنا کام کرتی رہی۔ البتہ ان کی باتیں کان میں پڑ رہی تھیں۔ وہ لڑکا شاید اس عورت کا اسٹوڈنٹ تھا اور عورت کو تو وہ ٹیچر کی حیثیت سے پہچانتی بھی تھی۔

”یہ تمہارا دوست ہے نا جو مار کھا رہا ہے۔“ کیفے میں اس وقت لوگ بہت کلم تھے، پھر بھی وہ اٹھ کر اس طرف دوڑے تھے، مگر وہ لڑکا کچھ بھی سنے سمجھے بغیر شیرو کو مارے جا رہا تھا۔ ”تم بھی اس کی مدد کے لیے جاؤ۔“
”اس کی مدد کے لیے بہت سے لوگ ہیں، ابھی پولیس بلا لیں گے، مگر آپ کی مدد کے لیے اس وقت صرف میں ہی ہوں۔“

آلی خاموشی سے گردن ترچھی کیے لکھتی رہی۔
”تم میری کیا مدد کر سکو گے؟ تم خود ایک نئے ہو۔ میرا تیسرا مس کیج ہوا ہے، آج تو ڈاکٹر نے بھی ناامیدی کی باتیں کی ہیں۔ میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔“ آلی نے یونہی سراٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ لڑکے کی پشت تھی، مگر عورت کا نیم رخ واضح تھا اور وہ سر جھکائے، آنسو پونچھ رہی تھی۔

”مسز مرجان، تھوڑے محل سے میری بات سنیں۔“ وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔ اب دار پھر سے کام کرنے لگی۔ اسے معلوم تھا اب وہ اسے تسلی دے گا۔ علاج کے طریقے یا پھر ایڈاپشن یا اس حقیقت کو قبول کر کے مثبت سوچ کے ساتھ رہنے کی نصیحت۔

کہ آپ کچھ بھی نہ تھے، یعنی ہر انسان پانی کا ایک قطرہ ہوتا ہے اور یہ اتنا امیزنگ ہے کہ وہ چھ فٹ کا انسان بن جاتا ہے، ہم سب کی پیدائش امیزنگ ہے۔“
”لیکن میرا کیس مختلف ہے۔“

”نہیں۔ یہیں پہ ہم دونوں مختلف ہیں، کیوں کہ قرآن پڑھنے اور قرآن پہ غور و فکر کرنے میں فرق ہوتا ہے۔ اب اسی آیت کو دیکھ لیں۔ اللہ نے ذکر یا کو مخاطب کیا کہ ”آپ بھی تو کچھ نہ تھے“ آپ نے اس سے مراد ہر انسان کی پیدائش لی، لیکن میرے خیال میں اس کا ایک اور مطلب بھی ہے۔“

آئی بے اختیار گردن موڑ کر دیکھنے لگی۔ مسزمرجان نے بھی قدرے متذبذب ہو کر اس لڑکے کو دیکھا۔
”میرے خیال میں مسزمرجان اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہم ”ہر انسان“ کی پیدائش نہیں صرف ”ذکر یا کی پیدائش“ پہ غور کریں۔“
”مطلب؟“

”ذکر یا علیہ السلام بنی اسرائیل تھے اور بنی اسرائیل، اسرائیل یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہوتے ہیں۔ آپ بتائیں، یعقوب کس کے بیٹے تھے؟“
”اسحاق علیہ السلام کے۔“
”اور اسحاق علیہ السلام کس کے بیٹے تھے؟“
”ابراہیم علیہ السلام کے!“

”ابراہیم اور سارہ کے، علیہما السلام!“ اس نے اضافہ کیا۔ پشت ہونے کے باوجود آبی کولگا تھا وہ مسکرایا۔

”آپ کو پتا ہے بنی اسرائیل اس وقت دنیا کی سب سے بڑی قوموں میں سے ایک ہے۔ ہم پٹھان ہوں یا گورے لوگ یا فلسطینی یا ملک اسرائیل کے یہودی؟ ہم بنی اسرائیل ہیں۔ اسی لیے پٹھانوں اور گوروں جن کو ہم انگریز کہتے ہیں، ان کی شکلیں ملتی ہیں، کیونکہ ہم سب پیچھے سے اسرائیل علیہ السلام کی اولاد ہیں، ذکر یا علیہ السلام بھی اسرائیلی تھے۔ میں بھی اسرائیلی ہوں اور ہم سب کی ماں تھیں حضرت سارہ۔ آپ کو معلوم

ہے سارہ کون تھیں؟“
”دنیا کی سب سے خوب صورت خاتون تھیں وہ۔“ مسزمرجان کو یاد آیا۔

”بالکل۔ وہ دنیا کی سب سے خوب صورت خاتون تھیں اور وہ بانجھ تھیں۔“

ایک لمحے کے لیے آبدار کاسائنس رک گیا۔ ارد گرد ہر شے تھم گئی۔ مسزمرجان بھی بالکل ٹھہر کر سعدی کو دیکھ رہی تھیں۔

”تو اللہ تعالیٰ نے ذکر یا علیہ السلام سے جو فرمایا شاید اس کا مطلب یہ بھی تھا مسزمرجان کہ آپ اپنی پیدائش پہ غور کریں، ذکر یا آپ بھی تو ایک بانجھ عورت کی اولاد ہیں۔ آج دنیا کی آبادی کا ایک بڑا حصہ اسی بانجھ عورت کی اولاد ہے۔ اگر سارہ کے اولاد ہو سکتی ہے تو دنیا کے ہر مرد اور عورت کے ہاں اولاد ہو سکتی ہے۔“ مسزمرجان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”مگر وہ پنجمبر کی زوج تھیں۔ اس لیے ان کی اولاد ہوئی۔“

”نہیں۔ ان کی اولاد اس لیے ہوئی کیونکہ انہوں نے دعا کی تھی۔ جب ابراہیم السلام نے دعا کی، جب ذکر یا علیہ السلام نے دعا کی، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ہم نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ اللہ تعالیٰ دعا رد نہیں کرتا لیکن اس میں یقین ہونا چاہیے۔ آپ کسی قبر، کسی مزار، کسی تعویذ کو وسیلہ بنا میں کی تو اللہ آپ کو ان ہی کے حوالے کر دے گا۔ آپ ایسا مت کیجئے گا۔ اگر آپ تہجد نہیں پڑھتے کسی دعا کے لیے تو اس کا مطلب ہے آپ اس کو پانے کے لیے خود بھی سیریس نہیں ہیں۔ شدید پریشانی کے حالات میں دعائیں بھی شدید مانگنی ہوتی ہیں۔ یہ پانچ وقت کی نماز کے بعد روئین کی طرح دعا مانگنا کافی نہیں ہوتا۔ جتنی بڑی آزمائش ہے، اتنا زیادہ اپنی دعا کو بڑھا میں۔ یہ وہی اللہ ہے جو حضرت سارہ کا اللہ تھا۔ کیا آپ کی دعا بھی ویسی ہے جیسی سارہ کے شوہر کی تھی؟“

اولادی، اولاد کی معذوری یا بیماری یا اولاد کا ہو کر مر جانا، یہ سب کوئی Cures نہیں ہے۔ یہ تو انبیاء کی آزمائش تھی۔ بڑے لوگوں کی آزمائش ہوتی ہے۔ آپ خوش قسمت ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ روز قیامت آپ کو کشادگی کے انتظار میں گزارے یہ ماہ و سال بہت قیمتی لگیں کیونکہ یہ وقت آپ کو وہ دے جائے گا جو اور کوئی نہیں دے سکتا۔ میں پھر کہتا ہوں یہ Cures نہیں ہے کیونکہ اللہ ہمیشہ ان لوگوں کی سائیڈ پہ ہوگا جن کو وہ آزمانے کے لیے اتنے بڑے بڑے دکھ دیتا ہے۔“

آبدار عبید کو ایسا کوئی مسئلہ درپیش نہ تھا، پھر بھی اس کو لگا، اس کی آنکھ سے آنسو گرا تھا۔ کوئی اتنا نرم، اتنا پیارا کیسے بول سکتا ہے؟ اس نے ایک دفعہ پھر گھوم کر اس لڑکے کو دیکھنا چاہا۔ اس کی پشت تھی مگر سامنے گلاس ڈور فریج میں اس کا چہرہ منعکس ہو رہا تھا۔ چھوٹے کھٹکھریالے پل، خوب صورت چہرہ، صاف رنگت بھوری آنکھیں۔

”سعدی۔ تم نے میری امید پھر سے زندہ کر دی ہے۔ میں اس احسان کا بدلہ بھی نہیں چکا سکوں گی۔“ مسز مرجان آنسو رگڑتے ہوئے اسے ممنونیت سے دیکھتی کہہ رہی تھی۔ ”کیا میں تمہارے لیے کچھ کر سکتی ہوں؟“

”بالکل۔“ وہ ذرا جوش سے آگے کو ہوا۔ ”اگر گلاس میں کبھی کوئی ایسا مقابلہ ہو جس میں سب سے ہینڈ سم لڑکے کو منتخب کیے جانا ہو تو وعدہ کریں آپ مجھے دوش دیں گی!“ اور وہ روتے روتے ہنس دی تھیں۔

اور اس۔ اتنے سال بعد آبدار عبید اواسی سے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ ساتھ میز پہ اس کا سفری بیگ تیار رکھا تھا۔ وہ قیدی تھا یا صرف مہمان، یہ فیصلہ اسے اس سفر کے بعد ہی کرنا تھا۔ لیکن اس فیصلے کے بعد وہ کیا کرے گی؟ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ قسمت بھی کیسے عجیب انداز میں اسے اس سے ملانے لے جا رہی تھی۔

مسز مرجان کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کر رہے تھے۔ آبدار بالکل ٹھہر کر سن رہی تھی۔

”مگر سعدی۔ یہ میری آزمائش ہے یا گناہوں کی سزا؟ یہ فرق کیسے معلوم کروں؟“

”معلوم کر کے کیا کریں گی؟ سزا ہوئی تو معافی مانگیں گی، آزمائش ہوئی تو دعا کریں گی کہ اللہ اس میں کامیاب کرے؟ مسز مرجان، مجھ سے پوچھیں تو یہ معلوم کرنا لا یعنی ہے۔ اس بحث کو چھوڑ دیں اور یہ دونوں کام کرتی رہیں۔ آپ کو پتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پہ آزمائش کیوں ڈالتا ہے؟“

بھیلے چہرے کے ساتھ مسز مرجان نے نفی میں سر ہلایا۔

”بعض دفعہ کسی انسان کو اللہ تعالیٰ کوئی اونچا درجہ دے دیتا ہے مگر اس کے اعمال اتنے نہیں ہوتے کہ وہ اس درجے تک پہنچ جائے۔ یعنی وہ اچھا آدمی ہوتا ہے مگر بہت زیادہ نیکیاں نہیں کر پاتا اور اللہ تعالیٰ نا انصافی تو نہیں کر سکتا، سو اس شخص کو اس درجے تک پہنچانے کے لیے۔ سمجھیں پہلی سیڑھی پہ کھڑے شخص کو دسویں سیڑھی تک پہنچانے کے لیے اللہ اس پہ پریشانیاں ڈالتا ہے، تاکہ اس کے گناہ جھڑیں۔ ظاہر ہے گناہ کم ہوں گے تو وہ اوپر اٹھتا جائے گا۔ جس دن وہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کی آزمائش کھول دی جاتی ہے۔ یہ میری خود سے گھڑی بات نہیں ہے، یہ صحیح حدیث کا مفہوم ہے۔“

”مطلب کس۔ یہ سب ہمیں کسی مقام تک پہنچانے کے لیے ہوتا ہے؟“

”جی۔ اب یہ آپ پہ ہے کہ آپ اس مقام تک کتنی جلدی پہنچتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ نیکیاں کریں تو جلدی زینے عبور کریں گی، حدیث میں آتا ہے کہ انسان کو کوئی چیز ملنے والی ہوتی ہے کہ اس کے گناہ آڑے آجاتے ہیں۔ اس لیے گناہوں سے بچیں اور زیادہ سے زیادہ اچھے اعمال کریں۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کشادگی کا انتظار بہترین عبادت ہے۔ اس لیے اپنی کشادگی کا انتظار کیجیے۔ بے



طرف جاتے دکھائی دیے تو وہ اٹھے قدموں واپس اندر آیا، دروازہ بند کیا اور تیزی سے ان کے کمپیوٹر کے پیچھے آکھڑا ہوا۔ بیٹھنے کے بجائے جھک کر کھڑا وہ کی بورڈ پہ ہن دیا تا رہا۔ سسٹم آن تھا۔ چند لمحے لگے اسے مطلوبہ معلومات تک پہنچنے میں۔ (کورٹ آرڈر کی ایسی کی تھی۔) وہ صفحے پر نٹ کیے، انہیں تہ کر کے جیب میں اڑسا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔

دوپہر شام میں ڈھلی اور شام ایک سو گوار رات میں تبدیل ہو گئی۔ انیکسی کے باہر سبزہ زار تاریک تھا مگر اندر بتیاں جلی تھیں۔ حنین آج گل خان کے اسٹال سے بہت سے تازہ پھول لے آئی تھی۔ (اور اس نے زمر کی وجہ سے قیمت صرف دگنی بتائی تھی، چار گنا نہیں۔) ورا ب ان کو لاؤنج کی گول میز پر رکھ رہی تھی۔ اسلامہ اور حنین نے مل کر چائیںز بنایا تھا۔ (اور سارا پن بے ترتیب کر کے رکھ دیا تھا۔) اب بس گرام گرم کھانا ڈش میں نکالنا تھا۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے آواز دی۔

”ماموں۔ زمر۔ نیچے آجائیں۔ کھانا لگ گیا ہے۔“

اور کمرے میں فارس صوفے پہ بیٹھا وہی کاغذات دیکھ رہا تھا۔

”الیاس فاطمی کے بیٹے کی کار کی کسٹم ڈیوٹی وارث کے قتل سے ایک روز پہلے ادا کی گئی۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن کچھ بھی ایسا نہیں مل سکا جو ڈیوٹی ادا کرنے والے کی طرف اشارہ کرے۔ وہ شخص جس نے پیسے ادا کیے ہیں، اسی نے وارث کو قتل کروایا ہوگا۔“

ڈرننگ ٹیبل کے سامنے کھڑی زمر ہل برش کر رہی تھی، آگتا کر بولی۔ ”تمہارا مطلب ہے تمہارے ذریعے اس نے وارث کو قتل کروایا ہوگا؟“

فارس نے نظر اٹھا کر رہی سے اسے دیکھا۔ ”جی بالکل، بس مجھے وہ شخص یاد نہیں آ رہا جس کے کہنے پہ میں نے یہ کیا تھا۔“ اور کاغذ رکھ کر باہر نکل گیا۔ اس نے تھکے تھکے انداز میں کپٹی مسلی۔ کچھ روز

وہ اپنے زعم میں تھا، بے خبر رہا مجھ سے اسے گماں بھی نہیں، میں نہیں رہا اس کا اس صبح مطلع صاف تھا۔ سورج بھی مکمل روشن تھا۔ بڑے ابا کے آبائی قصبے میں ان کے چچیرے بھائی کی وفات کی اطلاع فجر کے قریب آئی تھی۔ ندرت فوراً جلنے کی تیاری پکڑنے لگیں۔ ابا بہت آزرہ تھے مگر ان کا جانا بھی ضروری تھا۔ سوناٹے کے بعد ندرت آیا اور صداقت سفر پہ نکل گئے اور دو تین دن کے لیے ریستورنٹ بند کرنے کا کہہ دیا۔

وہ گئے تو گھر میں خودخواہ کا سناٹا چھا گیا۔ سیم اسکول جانے سے انکار کر کے سونے چلا گیا۔ فارس اور زمر کی اس رات سے بات چیت بند تھی۔ (گو کہ فارس کے لیے یہ نئی بات نہیں تھی، سو وہ نارمل تھا مگر زمر کا دل بری طرح ٹوٹا تھا کہ وہ اس کو دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔) صبح باسی ہو کر ایک روشن دوپہر میں ڈھلی تو ایک سرکاری دفاتر کی عمارت کے اندر ایک آفس میں فارس غازی بیٹھا تھا اور مسلسل کان کی لو مسلتے ہوئے سامنے براجمان آفیسر سے بات کر رہا تھا۔

”آپ نے اس کار کی تفصیلات چیک کیں؟“

”مجھے افسوس ہے، یہ حساس معلومات ہیں اور میں آپ کو نہیں دے سکتا۔“ وہ صاحب نہایت افسوس سے کہہ رہے تھے۔ ”آپ کو اس کے لیے کورٹ آرڈر لانا ہوگا۔“ فارس ”نور اہلم“ کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔ تب ہی ملازم نے اندر جھانکا۔ ”سر آپ کو وارثی صاحب بلا رہے ہیں۔“

آفیسر نے پہلے فارس کو دیکھا، پھر ملازم کو۔

”کیوں؟“

”سروہ بہت غصے میں ہیں، ان کے کمرے میں کسی نے بارودی مواد کا بیگ رکھ دیا ہے۔ ان سے پہلے صرف آپ گئے تھے ادھر، وہ آپ کو فوری طلب کر رہے ہیں۔“

وہ صاحب تیزی سے اٹھے، فارس کو باہر بیٹھنے کو کہا تو فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور ان کے ساتھ ہی باہر نکلا مگر پریشانی سے آگے بڑھتے گئے اور دوسرے لوگ بھی اسی

evidence ہو جانے والا وارنٹ ہے۔ آپ Circumastancial کی بنا پر کسی کو گرفتار نہیں۔“ الفاظ اس کے لبوں میں رہ گئے جب فارس نے کہنی سے پکڑ کر اسے پیچھے کھینچا اور دوسری دیوار سے لگایا۔ پھر کانڈ اس کے سامنے لہرا کر سرخ غصیلی آنکھوں سے بولا۔

Downloaded From Paksociety.com

”یہ کیا ہے؟“
”ڈونٹ ڈری یہ صرف۔“

”زمر بی، یہ کیا ہے؟“ دستخط کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ زمر بالکل ٹھہر گئی۔ دستخط کو نہیں دیکھا۔ وہ صرف فارس کی آنکھیں دیکھ رہی تھی۔

”یہ زمر، جسٹس مکرم کے سائن ہیں، رائٹ؟ آپ کے ٹیچر کے انہوں نے میرا وارنٹ جاری کیا اور آپ کو خیر بھی نہ ہوئی؟“

اس نے اچھے سے فارس کو دیکھا۔ ”فارس تم۔“

”میں نے آپ پر اعتبار کیا، کیونکہ ہم ایک ٹیم تھے مگر آپ نے اتنی جلدی کی مجھے دھوکا دینے میں؟“ وہ صدمے اور غصے سے بولا تھا، زمر کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلیں۔

”فارس! یہ میں نے نہیں کیا۔“

”مجھ سے انتقام لینے کے لیے شادی کی تھی نا، تھوڑا صبر کرتیں، میں اپنے خاندان کو تو واپس جوڑ لیتا۔ پھر بھیج دیتیں مجھے جیل۔“ کانڈ غصے سے نچے مارا تھا۔

”فارس! یہ میں نے نہیں کیا۔“ وہ بالکل سن تھی۔

”صرف آپ جانتی تھیں 28 اگست کے

بارے میں۔ جسٹس مکرم آپ کے ٹیچر ہیں۔ احمر کو

آپ نے ہائر کیا میرے خلاف ثبوت ڈھونڈنے کے

لئے کیوں؟ کیا نہیں کیا تھا؟“ اس کی آنکھوں میں دیکھ

کر وہ پوچھ رہا تھا۔ زمر کے سارے الفاظ ہی ختم

ہو گئے۔ ”فارس! وہ اور معاملہ تھا، میں۔“

”یہ جو اتنے دن سے آپ بار بار ڈاکٹر کی طرف

جانے کا کہہ کر گھر سے نکلتی تھیں، یہ سب مجھے

پھسانے کے لیے کر رہی تھیں؟“ وہ شدید ہرٹ ہوا

سے خرابی طبیعت میں اضافہ ہو گیا تھا مگر کیا فرق پڑتا تھا۔ سر جھٹکتے وہ باہر نکل آئی۔

اسامہ برتن لگا رہا تھا اور حنین، چاول ڈش میں نکال رہی تھی۔ فارس میز کے گرد بیٹھا تھا۔ زمر نے اتر رہی تھی جب دروازے کی گھنٹی بجی۔

اس گھنٹی کی آواز صور جیسی تھی۔ عجیب وحشت ناک سی۔ وہ قریب تھی، سولاؤنچ سے گزر کر راہ داری میں آئی۔ فارس بھی پیچھے آیا۔

راہ داری اندھیری تھی۔ دروازے کے ساتھ کھڑکی پر پردہ پڑا تھا مگر اس سے روشنی چھلک رہی تھی۔ تیز لائٹس۔ زمر نے قدرے اچھے سے پردہ سرکایا۔

یوں لگتا تھا رات میں دن کا سماں ہو۔ گاڑیاں، روشنی، پولیس موبائلز، اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ مڑ کر دیکھا۔ فارس بھی اتنے ہی اچھے سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر زمر نے بند دروازے سے پکارا۔ ”کون؟“

”مسز زمر، فارس غازی گھر پہ ہے؟“ اے ایس بی سرود شاہ کی آواز سنائی دی۔ پیچھے پولیس کی گاڑیوں کا سائن۔ فارس چونک کر دو قدم پیچھے ہٹا۔

”آپ کو کیا کام ہے؟“ اس نے دھڑکتے دل سے پکارا۔

”ہمارے پاس فارس غازی کی گرفتاری کے وارنٹ ہیں۔ اس سے کہیے کہ پرامن طریقے سے خود کو قانون کے حوالے کر دے۔“

کسی نے زمر کے دل پہ پیر رکھ دیا تھا۔ اس نے بے اختیار لبوں پہ ہاتھ رکھا، پھر آگے ہوئی۔ ”لیٹر ہول سے مجھے وارنٹ پاس کریں۔ میں وارنٹ دیکھے بغیر دروازہ نہیں کھولوں گی۔“

اگلے ہی لمحے کانڈ دروازے کی درز سے اندر داخل کیا گیا۔ زمر نے کپکپاتے ہاتھوں سے اسے پکڑ کر کھولا۔ چند الفاظ بڑھے۔ 28 اگست کی رات، قمر

الدین چوہدری کا قتل، فارس غازی نامزد ملزم۔ تب ہی فارس نے پیچھے سے کانڈ اس کے ہاتھ سے کھینچا۔ زمر نہیں مڑی، وہ بے بسی بھرے غصے سے پکار کر بولی تھی۔

”اے ایس بی صاحب، یہ پہلی پیشی پہ معطل

تھا۔

”فارس! میں۔ میں کیوں تمہیں دوبارہ جیل بھیجنا چاہوں گی؟“

”پہلی دفعہ بھی تو آپ نے ہی بھیجا تھا۔“ دکھی ملامت سے بھری نظروں سے اسے دیکھتے اس نے زمر کی کہنی چھوڑی اور دروازے کی طرف آیا جو مسلسل بج رہا تھا۔ زمر سن سی کھڑی تھی۔ بالکل پتھر ہوئی۔

فارس نے دروازہ کھولا۔ اے ایس پی اور اس کی نفی باہر جو کس کھڑی تھی۔ بہت سی گنز کا رخ اس کی طرف تھا۔

اور اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑے ہاشم نے مشروب کا گھونٹ بھرتے فخر سے جواہرات کو دیکھا۔ ”میں نے کہا تھا تا سب سنبھال لوں گا۔“ جواہرات اتنی خوش نہیں تھی۔

”تمہیں کیسے یقین ہے کہ وہ پراپھنسا ہے۔“

”مہی۔۔۔“ وہ مسکرایا۔ ”وہ قتل اٹھا میں اگست کی رات کو ہوا ہے۔ فارس غازی کے پاس اس رات کے لیے alibi نہیں ہے۔“

”کیوں؟“ وہ چونکی۔
”اس رات ڈاکٹر ایمین کا اسپتال جلایا گیا تھا۔ اب عدالت اس سے پوچھے گی کہ اس رات وہ کہاں تھا۔ اگر نہیں بتائے گا تو قاتل سمجھا جائے گا اور اگرچہ بتائے گا تو arsonist (آگ لگانے والا) ثابت ہوگا۔ فارس غازی پراپھنسا ہے۔ پچھلے پانچ مہینے سے زندگی عذاب کی ہوئی تھی اس نے۔ بالآخر میں نے اس سے سارے انتقام لے لیے ہیں۔ کیونکہ انتقام۔“ اپنا گلاس جواہرات کے گلاس سے ٹکرایا۔ ”میرا جنون ہے!“

نیچے انیکسی کا دروازہ کھول کر فارس سامنے آیا اور دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ روشنی بندوقس سب اس پہ تنی تھیں۔ اے ایس پی سرحد شاہ نے ایک اہلکار سے ہتھکڑی لی اور فارس کے پیچھے آکھڑا ہوا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے کلائیوں کو جکڑا۔

”فارس طہیر غازی تمہیں قمرالدین چوہدری

کے قتل کے الزام میں حراست میں لیا جاتا ہے۔“ فارس نے سختی سے آنکھیں میچ کر بہت کچھ اندر اتارا۔ ایک آخری ملامت زدہ نظر جو کھٹ میں پتھر ہوئی زمر پہ ڈالی اور پھر ایک سلگتی نگاہ اس اے ایس پی پہ ڈالی جو اس کے ہاتھ پیچھے باندھے اسے ایک وین کی طرف لے جا رہے تھے۔

زمر ان ہی بے یقین نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ زندگی میں پہلی دفعہ اسے احساس ہوا تھا کہ بے قصور ہوتے ہوئے ناکرہ جرم کا الزام لگے تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

For Next Episode Visit
Paksociety.com

کتاب کا نام	مصنف	قیمت
بساط دل	آمنہ ریاض	500/-
ذرد موسم	راحت جمیں	750/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چودھری	500/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چودھری	250/-
دل ایک شہر جوں	آسیہ مرزا	450/-
آئینوں کا شہر	قائزہ انصار	500/-
بھول بھلیاں تیری گلیاں	قائزہ انصار	600/-
پھلاں دے رنگ کالے	قائزہ انصار	250/-
یہ گلیاں یہ چہ پارے	قائزہ انصار	300/-
عین سے عورت	غزالہ عزیز	200/-
دل اُسے ڈھونڈ لایا	آسیہ رزاقی	350/-
بکھرنا جائیں خواب	آسیہ رزاقی	200/-
زخم کو ضد تھی سیمائی سے	فوزیہ یاسین	250/-

ماہل سکھانے کے لئے فی کتاب ڈاک چارج - 30/- روپے

سکھانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ - 37 اردو بازار کراچی۔

فون نمبر: 32216361

صاف گو

بیماری نہیں ہوتی، ظاہر ہے سب کو بیماری ہوتی ہے۔
تیلن کلثوم سے ٹاکرے کا مطلب ہے عزت کا فالو وہ
ہوتا۔

ہم لوگ اس کو سمجھا سمجھا کر تھک گئے زبان پہ
قابو رکھو سلی بی ضروری نہیں سب باتیں منہ پہ بولی
جائیں، کچھ لحاظ مروت نام کے الفاظ بھی موجود ہیں بے
چارے دنیا میں جس پہ عمل کرنا پڑتا ہے، مگر نہ جی نہ وہ
کلثوم ہی کیا جو اپنی اس خامی کو خامی تصور کر لے۔

مجھے یاد ہے جب اس کی شادی کے دن قریب تھے تو
بس وہ ہی کچھ دن تھے کہ اس کے منہ سے گلاب
جھڑتے تھے۔ یعنی وہ بس اپنے میں مگن تھی اور ہم
لوگ بھی سکھ چین کی بانسری بجاتے تھے۔ امی بھی بلا
جھجک دنیا کے مرے ہوئے رنگ کے کپڑے پہنتی
تھیں۔ باجی لال کالا، براؤن جو دل کرتا اس رنگ سے
بال رنگا کرتیں۔ بھابھی دن ہی کیا رات میں بھی سر پہ
دوپٹا باندھ کے پھرتیں اور بھابھی آزادی سے ان کے
پچھے پھرتے۔

خیر قصہ مختصر ہمارا یہ سہانا دور کلثوم کی شادی تک چلا
اور اس کی شادی کے بعد ہم نے اس کو بہت مس کیا۔
کیوں کہ جیسی بھی تھی گھر کی رونق اسی کے دم سے
تھی۔ سب سے ہننگے لیتا، سب سے شرارتیں کرتا
فقرے کسنا اسی کا کام تھا۔ اب تو گھر بھائیں بھائیں کرتا
تھا۔ مانو ایک دم ویران سا ہو گیا گھر۔

شادی کے ایک ہفتے بعد اس کی اور اس کے سسرال
والوں کی دعوت رکھی، ہم لوگوں نے۔ کلثوم کی بیہتائند
روہینہ، ایک کنواری مند ثریا، دیوز خرم اور سسر بس

”باجی آپ نے یہ کس کھر کا ڈائی کر لیا۔ کچھ عجیب
سی ہی لگ رہی ہیں۔“
”اف امی، کبھی تو ڈل کھر کے کپڑوں کا پیچھا
چھوڑیں۔“

”بھیا آپ کو کوئی کام نہیں سوائے بھابھی کے آگے
پچھے پھرنے کے۔“
”بھابھی کا سر درد بھی بس آپ کو دیکھ کر صحیح ہوتا
ہے ورنہ صبح سے جو سر پہ دوپٹا باندھتا ہے وہ آپ کے
آنے ہی کھلتا ہے۔“

یہ جملے اکثر و بیشتر ہمارے گھر میں گونجتے رہتے تھے۔
کیوں کہ ہمارے گھر کے ایک فرد کو یہ فخر حاصل تھا وہ
صاف گو ہے۔

ہر خاندان میں ایک نمونہ ضرور ایسا ہوتا ہے جس کو
یہ بیماری ہوتی ہے کہ وہ خود کو سچائی کا علمبردار سمجھتا
ہے۔ اسٹریٹ فاروڈیا آوٹ اسپوکن اپنے لیے یہ الفاظ
بہت فخر سے استعمال کرتا ہے وہ بندہ اس کے خیال
میں وہ کسی کا دل نہیں دکھاتا بلکہ بغیر کسی لگی لپٹی کے سچ
بولتا ہے تو کسی کو برا کیوں لگتا ہے۔ اب اگر سچ سے
کسی کو تکلیف ہے تو بھی یہ سراسر اس کا ذاتی معاملہ
ہے، ہم تو سچ ہی بولیں گے کسی کو برا لگتا ہے لگے۔

میری لبتی سکی بسن اس نمونے پن پہ پوری
اترتی ہے۔ کلثوم کے خیال میں وہ پیدا ہی اس لیے ہوئی
ہے کہ لوگوں کو آئینہ دکھاسکے۔ اللہ نے دنیا میں اس کو
اسی کام کے لیے بھیجا ہے۔

اب قصہ کچھ یوں ہے کہ سارے رشتے دار اس
سے دور دور رہنا پسند کرتے ہیں۔ اپنی عزت کس کو

شرمیلی مسکراہٹ نے بتا دیا فی الحال تجربہ اچھا ہی ہے۔
”کب جا رہی ہو بی بی، ہنسی میون پہ۔“ میں نے مزید
شرارت کی۔ ایک ہلکے سے تبسم سے وہ بولی۔
”بس اگلے ہفتے ہی۔“

اس کے چہرے پہ پھیلی دھیمی مسکان مجھے اتنی
پہاری لگ رہی تھی کہ پرانے سب گلے شکوے کہیں
ختم سے ہو گئے۔ ان ہی دو چار باتوں میں چائے بن گئی
اور میں لاؤنج میں لے آئی۔ چائے سرو کر کے میں نے
اور کلثوم نے بھی لاؤنج کا ایک کونہ پکڑ لیا۔

”ارے ثریا! تم کیوں ایسی بیٹھی ہو۔ ہمارے ساتھ
آ جاؤ تاکہ میری نظر کلثوم کی چھوٹی نند پہ پڑی جو ایسی
ایک فلور کشن پہ بیٹھی تھی۔“

”شکر ہے آپ کو میں نظر آگئی ورنہ ہماری بھابھی کو
تو اپنے گھر آ کر یاد ہی نہیں رہا کہ ان کی ایک چھوٹی نند
بھی ہے۔“

اور مجھے کلثوم کی خاموشی کا مطلب سمجھ آ گیا کہ
اب اس کا پالا ایک صاف گو سے پڑ گیا ہے۔



ان لوگوں پہ مشتمل تھا اس کا سسرال، میاں بھی بظاہر
اچھا دکھتا تھا۔

امی اور بھابھی نے مل کر سب پکوان کلثوم کی پسند
کے بنائے اور باجی نے بیٹھا بنایا۔ بس اب انتظار تھا تو
ہمارے گھر کی چڑیا کا کہ وہ آئے اور ہمارے آنگن کی
رونق کچھ دیر کو بڑھا جائے۔ خیر وہ لوگ آگئے۔ کلثوم
کے گلے لگ کر معلوم نہیں کیسے ہم سب نے اپنا رونا
روکا لیکن مجھے کلثوم ذرا چپ چپ لگی۔ ظاہر ہے اتنی
جلدی سسرال میں دل لگنا اور میسے کی یادیں ختم کرنا
آسان کہاں۔ خدا خدا کر کے کھانا ختم ہوا تو چائے کی
پہاری آئی۔ سب ٹولیاں بنا کے الگ الگ بیٹھ گئے۔

کلثوم کی نند روینہ، ہماری بھابھی، باجی اور امی نے
ٹوٹکے اور بچوں کے ٹاپک میں خود کو مصروف کر لیا۔
سر صاحب اور ابو اپنے کاروبار کی باتیں کرنے لگے۔
کلثوم کا دیور، میاں اور ہمارے بھالی صاحب سیاست
جیسے بورنگ ترین ٹاپک پہ گفتگو کرنے لگے۔ میں نے

موقع کا فائدہ اٹھایا اور کلثوم کو اپنے ساتھ کچن میں لے
آئی۔ ”اور سناؤ کلثوم کیسا رہا شادی کا تجربہ۔“ ایک

Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section

عفت بحر طاہر

بیتا کی دُعا

”کتنی شرم کی بات ہے عون۔“ ثانیہ کو اس پہ سخت غصہ تھا۔ اب بھی بہت بے زاری اور شرم دلانے والے انداز میں بولی تو عون نے سر دھتا۔

”واقعی۔۔۔ بہت شرم کی بات ہے۔ شوہر تھکا ہارا گھر آئے تو بیوی کو چاہیے کہ وہ اس کی دل بستگی کا سامان کرے اور تم کلا شکوف بنی برسٹ مارنا شروع کر دیتی ہو۔“ ٹی وی کے چینلز سرچ کرتا وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا تو سالن کا ڈونگا لیے کچن سے نکلتی بھابھی نے زور وار تہمت لگایا۔

ثانیہ نے خفیف سی ہو کر دانت پیسے۔ پھر پاؤں پٹختی کچن میں چلی گئی۔ برتن پٹخ پٹخ کے غصہ نکالا۔ پھر بھابھی کے ساتھ مل کے کھانا لگانے لگی۔

”پیار سے کہو گی تو مان جائے گا۔“ وہ منہ پھلائے کھانا کھا رہی تھی جب سرگوشی میں بھابھی نے مشورہ دیا بلکہ تسلی دی۔

”ہنس۔۔۔“ ثانیہ نے محض سر جھٹکا۔ دل بہت جلا تھا۔ ”کب سے پیار سے ہی کہہ رہی ہوں۔ اب بتاؤں گی اسے“ اور کمرے میں آتے ہی اس نے ”بتانے“ کی شروعات کی۔ اپنا تکیہ اٹھایا اور قالین پہ یوں پھینکا جیسے وہیں سونے کا ارادہ ہو۔

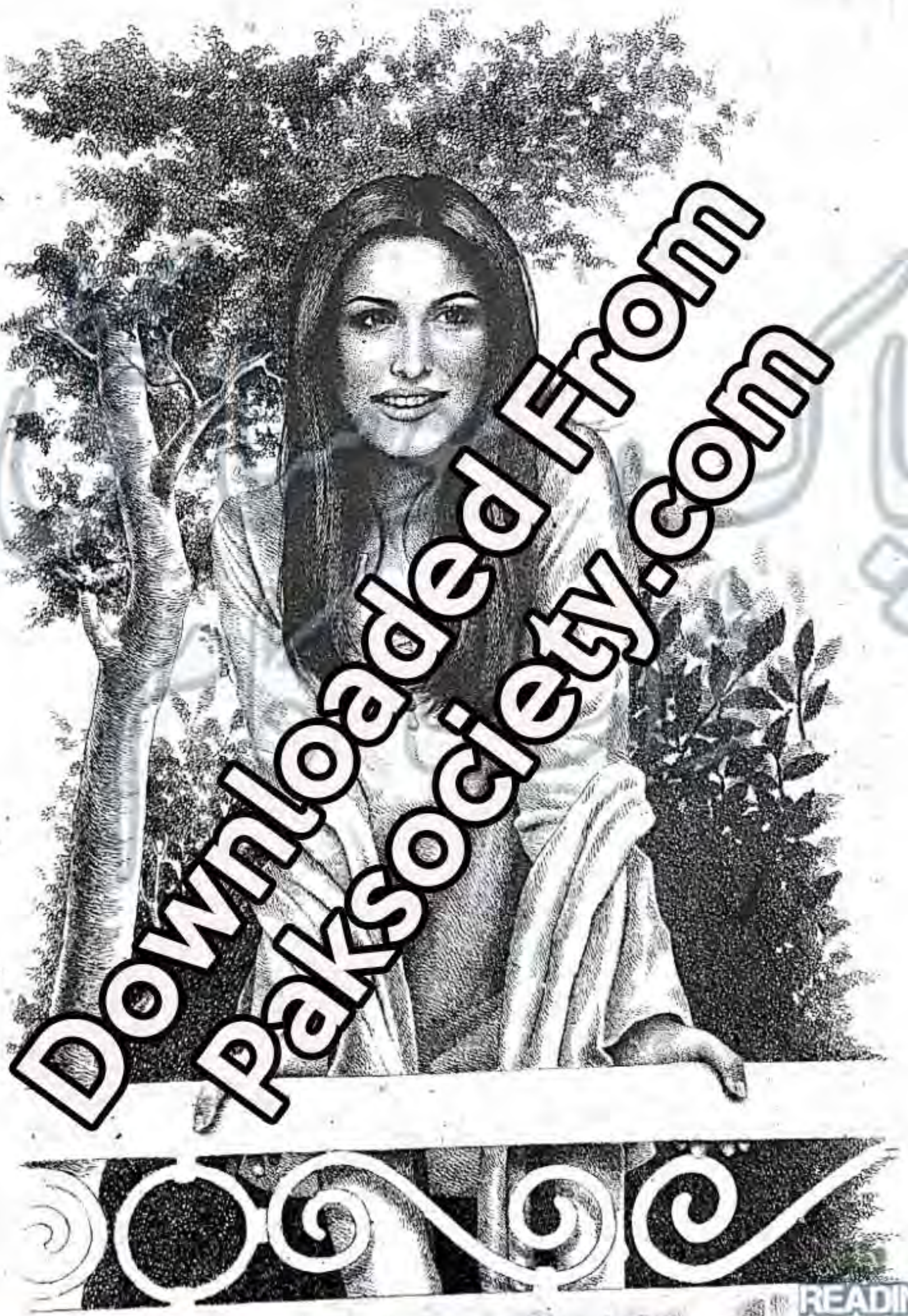
پکسیوں اور آخری قیڑی

Downloaded From
Paksociety.com



READING
Section

Downloaded From
Paksociety.com



READING
Section



واش روم سے نکلتا عون ٹھٹکا پھر اسے ہنسی آگئی۔

”ایک تو تم لڑکیاں بھی تائے۔“

”کیا۔ ہم لڑکیاں؟“

وہ تھل لڑائی کے موڈ میں تھی۔ تیوری چڑھا کے عون کو دیکھا۔ تو وہ اسے پرانی والی ٹانیہ لگی۔ لڑتی جھگڑتی رعب جمائی۔

”بس ایسے ہی۔ شادی ہوتے ہی ایک نیا بھکچ نکل آتا ہے اندر سے۔“

وہ یقیناً ”اسے غصہ دلا رہا تھا۔ چاہے مذاقاً“ چھیڑ کر ہی سمی۔

”بدل تو تم گئے ہو، پہلے ہر بات مانتے تھے میری۔“ ٹانیہ نے خفگی سے اسے دیکھا۔

”اچھا۔ پہلے تکرہ اٹھا کے بڈیہ رکھو۔“

”نہیں۔ میں نیچے ہی سوؤں گی۔“ وہ بھنڈ رہی۔

”افوہ اتنی دور سے تو میں تمہاری بات بھی ٹھیک سے سمجھ نہیں پاؤں گا۔“

عون نے اسے پچکارا۔

”تو قریب سے کون سا سن رہے ہو۔“

وہ روہا لسی ہونے لگی۔ تو وہ برحسہ بولا۔

”تم نے قریب آکر کہا ہی نہیں۔ ذرا پاس آؤ۔ کوئی رشوت دو۔ پھر میں سوچوں گا۔“

”رشوت دے کے بھی تم نے سوچنا ہی ہے تو پھر میں دور ہی بھلی۔“

وہ چڑ کر بولی تو عون نے آگے بڑھ کے تکرہ اٹھا کر بیڈیہ پھینکا اور ٹانیہ کو دھمکایا۔

”اب تم شرافت سے لیٹ جاؤ ورنہ تمہیں بھی ایسے ہی اٹھا کے پھینکوں گا۔“

وہ فون خاں کرتی بستر پہ آگئی۔

”ایک تو تم مجھے زبردستی وہاں سے لے آئے یہ بھی نہیں سوچا کہ ایسہا کی طبیعت مکمل طور پہ ٹھیک نہیں

تھی۔ اب لے جانے کا کہتی ہوں تو تمہارے پاس وقت ہی نہیں ہونا۔“

اسے رہ کے خیال آتا۔ پتا نہیں ایسہا نے کیا سوچا ہو گا۔ شرمندگی کے مارے ٹانیہ نے تب سے اسے کال

بھی نہیں کی تھی۔ عون جو اسے دھڑلے سے واپس لے آیا تھا۔

”ٹھیک ہے وہ۔ بلکہ معیذ کی خوشی دیکھ کے حالات کی بہتری کا اچھے سے اندازہ ہو جاتا ہے۔“

عون نے پاس بیٹھتے ہوئے اسے لسلی دی۔ تو وہ جل کر بولی۔

”وہ تو تب بھی خوش ہی رہتے تھے جب ایسہا برے حالات میں تھی۔“

”اونہوں۔ اس نے بھی بہت کڑا وقت گزارا ہے۔ اگر ایسہا نے تکلیفیں سہی ہیں تو معیذ کی ذہنی کیفیت بھی

اس دوران ٹھیک نہیں تھی۔“

عون نے اس کی تصحیح کی۔ ٹانیہ نے سر جھٹکا۔

”وہ اذیت ان کی اپنی مولی ہوئی تھی۔ اگر تب ہی خدا کی رضا میں راضی ہو جاتے تو نہ وہ تکلیفوں سے گزرتی

اور نہ خود معیذ بھائی کو ذہنی اذیت سے گزرنا پڑتا۔“

وہ متاثر ہونے والوں میں سے نہیں تھی۔

”بلکہ ایسہا کا تو زیادہ برا حال تھا۔ محض جسمانی ہی نہیں ذہنی اور روحانی طور پر بھی تکالیف برداشت کی ہیں اس

نے، محض اپنے شوہر کی بے رخی کی وجہ سے۔“
”چلو خیر۔ پلٹ کے آنے والوں کو تو اللہ بھی معاف کر دیا کرتا ہے۔ اس نے بھی کھلے دل سے اپنی غلطیوں کو تسلیم کر لیا ہے۔“

عون نے بات سمیٹی۔ پھر مسکرا کے اطلاع دی۔
”اب تو ایسا اپنی شادی کی شاپنگ کر رہی ہے زارا کے ساتھ۔“
ثانیہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”اور ان ”ہٹلر آئی“ نے اجازت دے دی؟“ سفینہ بیگم کے بارے میں پوچھا۔
”اب وہ معیذ احمد کی بیوی ہے۔ اس کی پوزیشن کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔“
”مگر پھر بھی۔ میری بہن بنی ہوئی ہے وہ۔ کیا میرا جانا نہیں بننا وہاں۔ ایک تمہاری بیچ کہ اکیلی نہیں جاسکتی اور خود وہاں لے کے جا نہیں رہے۔“ ثانیہ کو اپنا مسئلہ پھر سے یاد آیا۔

”لے جاؤں گا یا ر! ابھی تو شادی میں دو ہفتے پڑے ہیں۔“

عون نے اسے تسلی دی تو وہ چلا ہی تو اٹھی۔

”کیا مطلب۔ ڈائریکٹ شادی میں ہی لے جاؤ گے؟“

عون گڑبڑایا۔

”افوہ۔ میرا مطلب ہے پہلے ہی لے کے جاؤں گا۔ ابھی کافی ٹائم ہے۔“

”کل اگر تم مجھے نہیں لے کے گئے تو پھر دیکھنا تم۔“ چند لمحوں تک اسے گھورنے کے بعد ثانیہ نے اسے دھمکایا۔

”میں تو اب بھی دیکھ ہی رہا ہوں بس۔“ عون نے شرارت سے آہ بھری۔ ثانیہ نے وائٹ پیسے

”ہاں۔ تو آئندہ بھی صرف دیکھتے ہی رہو گے۔“ شاخ سے کہا تو عون کا تہقہ بے ساختہ تھا۔

”اب تو لے جانا ہی پڑے گا۔ بھئی اپنا حقہ پانی بند ہو جائے گا ورنہ۔“

وہ اپنی جگہ پر لیٹتے ہوئے بریدار رہا تھا۔ ثانیہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کن اکھیوں سے

تکیے۔ تھیلے عون کے بازو کو دیکھا۔ پھر کھسک کر سراس کے بازو پر رکھ دیا۔

”مجھے پتا تھا عون! تمہاں جاؤ گے کیونکہ تم بہت اچھے ہو۔“

بڑے مان سے کہا۔

”اچھا۔ اور یہ تمہیں میری بریدار ہٹ سننے کے بعد پتا چلا ہو گا؟“

عون نے طنزاً ”پوچھا تو ثانیہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگی۔ عون کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔“



سفینہ بیگم نے ایک ہی نگاہ میں پورے ماحول کا جائزہ لے لیا۔ شاپنگ بیگ کی گنتی انہوں نے آتے ہی کر لی تھی۔

ایسا کچن سے نکلی تو ان کو دیکھتے ہی جیسے خائف ہو کر زمین پہ جم سی گئی۔ اس کی اس کیفیت نے سفینہ بیگم کو

بہت تقویت پہنچائی۔ یعنی کہ ابھی بھی ان کا پلہ بھاری ہی تھا۔ معیذ کا ساتھ پا کر بھی وہ ان کے رعب کی ”حد“ سے

باہر نہیں نکلی تھی۔

”ہوں۔“ انہوں نے اپنے مخصوص ”ملکہ“ والے انداز میں سراٹھائے تنفر سے ہنکارا بھرا۔ پھر انگلی سے شاپنگ بیگز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حقارت سے بولیں۔

”بڑی عیاشی ہو رہی ہے تمہاری۔“

ایسہا کی پیشانی پر پسینہ چمک اٹھا۔

کل تک یہ اس معیذ احمد کی ماں تھیں جس نے ایسہا کو قبول نہیں کیا تھا۔

اور آج وہ اس معیذ احمد کی ماں تھیں جو دل و جان سے ایسہا کو قبول کرنے کا اذن دے چکا تھا تو اب اس کی حکمت عملی کیا ہونی چاہیے؟

اسے اپنے ذہن سے کوئی جواب نہ ملا تھا۔

وہ ہلکا سا کھنکھاری پھر ہمت جمع کرتے ہوئے ان سے مخاطب ہوئی۔

”آپ بیٹھیں پلیز۔ میں چائے لاتی ہوں آپ کے لیے۔“

”باس۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر گویا پھنکاریں۔ ”مہمان نہیں آئی ہوں میں تمہارے گھر۔ اپنے غلیظ وجود کے ساتھ

تم کھڑی ہو میری سلطنت میں۔“

اف۔ اف۔!!

ایسہا کا دل چاہا یہاں سے غائب ہو جائے۔

کسی کو اس کی اوقات یاد دلاتے وقت جو الفاظ ہمارے لبوں سے نکلتے ہیں وہ درحقیقت دوسروں کو ہماری اوقات بتا رہے ہوتے ہیں۔

سفینہ بیگم بھی جو منہ میں آئے وہ کہہ دینے کی عادی تھیں۔

”مگر تم درحقیقت اس کھیل کو سمجھ نہیں پا رہیں۔ معیذ تمہارا شوہر بعد میں پہلے وہ میرا بیٹا ہے۔ میرے

ذہن سے سوئے اور میری زبان بولنے والا۔“ انہوں نے اپنی بساط بچھانی شروع کی تھی۔

”اگر وہ تمہیں لفٹ کرانے لگا ہے تو کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔ لڑکوں کو چار دن ایسے ہی کشش نظر آتی ہے

لڑکیوں میں۔ ورنہ پچھلے تین سالوں میں جو تمہاری ماہیت تھی اس کے نزدیک۔ وہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔“

وہ اسے اتنی بری طرح رگیدنا چاہتی تھیں کہ وہ سراٹھانے کے قابل ہی نہ رہے۔

ایسہا کا وجود کپکپانے لگا۔ سفینہ بیگم کے لب و لہجے کی بیخ بستگی اسے اپنی ہڈیوں میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔

”میں نے بھی کہا جو ان بچہ ہے ٹھیک ہے۔ اس کا بھی حق ہے اپنی زندگی میں من چاہے تجربات کرنے کا۔ دو ماہ

کا ٹائم دیا ہے میں نے اسے تمہارے ساتھ۔ اس کے بعد پھر وہی ہو گا جو میں چاہتی ہوں۔“

وہ فاتحانہ کہہ رہی تھیں۔ ایسہا کا وجود سن ہونے لگا۔ پھر وہ پُرا سرار انداز میں بولیں تو چہرے پر عجیب سی

مسکراہٹ تھی۔

”اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کیا چاہتی ہوں۔“ وہ بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہی۔

ان کے لفظوں کے سکے کھن کھن سماعتوں سے ٹکرا کر ذہن کے کشکول میں گرتے تو جیسے پگھلے ہوئے پیسے کی

شکل اختیار کر لیتے تھے۔

”چلو۔ انجوائے کرو تم بھی۔ دو ماہ ہیں تمہارے پاس۔ جتنا کچھ سمیٹ سکتی ہو سمیٹ لو مگر اس کے بعد یہ ہم

ماں بیٹے میں طے ہے کہ تمہیں اس گھر سے دفع ہی ہونا ہے۔“ انہیں اس کی شکل میں صالحہ دکھائی دیتی تھی۔ جیسے

صالحہ موجود نہ ہوتے ہوئے بھی امتیاز احمد اور ان کے بیچ حائل رہی ویسے ہی یہ لڑکی ان کے بیٹے کے دل و دماغ پہ

قابض ہونے والی تھی۔ یہ جاوگرماں بیٹی۔ صالحہ کا تو کچھ نہ بگاڑ سکیں مگر وہ ایسہا کی ایسی کی تیسری کرونا چاہتی تھیں۔ جیسے آئی تھیں ویسے ہی حقارت سے اسے دیکھتی چلی گئیں تو ایسہا کی لرزتی ٹانگوں نے اس کا مزید بوجھ برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ وہیں ہاتھوں میں منہ چھپائے بیٹھتی چلی گئی۔



شارجہ سے شادی میں خاص طور پر شرکت کے لیے ماموں، ممانی اور عمر گھر میں کیا آئے رونق اور شادمانی کا نیا سامان آگیا۔

جیسا موڈ ہو ویسا منظر ہوتا ہے

موسم تو انسان کے اندر ہوتا ہے

کے مصداق عمر جب معیذ سے ملا تو دونوں نے لبا معانقہ کیا۔ معیذ کو یاد آیا وہ دونوں کتنے اچھے دوست ہوا کرتے تھے۔

”بہت مبارک ہو میرے دوست! زندگی میں واپسی کے لیے“ عمر اس کے اس اقدام سے بہت خوش اور پُر جوش تھا کہ معیذ نے ایسہا کو اپنا لیا ہے۔

ممانی نے سفینہ بیگم کو دونوں شادیوں کی مبارکبادوں کی مسکراہٹ سکڑنے میں مل نہیں لگا۔

”معذرت چاہتی ہوں بھابھی۔ مگر میں صرف زارا کی شادی کی مبارکباد قبول کروں گی۔“

”ارے۔“ انہوں نے حیرت سے نند کو دیکھا۔ ”ابھی تک حالات درست نہیں ہوئے؟“

”ابھی تو میکے والوں کی تھو تھو باقی ہے۔ ساری عمر میں صالحہ کو کوستی رہی تو کیا سب طعنے نہیں دیں گے کہ اب اسی کی بیٹی کو سو بنا لیا۔ پوری دنیا میں معیذ کے لیے اور کوئی نہیں ملی تھی۔“

وہ سخت برگشتہ تھیں۔

ممانی جان کو ان کے خیالات جان کر سخت تاسف ہوا۔ ان کی سخت طبیعت سے واقفیت تو اچھی طرح تھی اور باقی کی کہانی عمر نے جا کے انہیں من و عن سنا لی تھی، انہیں ایسہا کو بنا دیکھے ہی اس سے ہمدردی ہونے لگی۔ ”بن ماں باپ کی بچی کیسی سزا کاٹ رہی تھی۔ وہ بھی اس جرم کی جو اس نے کیا ہی نہیں“ اویہ بات انہوں نے صاف گوئی سے سفینہ سے بھی کہہ دی۔ تو وہ تڑخ کر بولیں۔

”ہر کسی کو اپنے ہوتے سوتے کا بویا کاٹنا پڑتا ہے۔ اسے بھی صالحہ کی بیٹی ہونے کی سزا مل رہی ہے۔“

”یوں کہو کہ ناگرہ گناہوں کی سزا مل رہی ہے اسے عمر بتا رہا تھا دیکھنے لائق بچی ہے۔ اوپر سے صابرو شاگر

بھی۔“

ممانی جان کو نند کی ذہنیت پر افسوس ہو رہا تھا۔

”ہنہ۔ صابرو شاگر۔“ سفینہ نے سر جھٹکا اور طنزیہ بولیں۔

”گھنٹی اور مہسنی۔۔۔ ماں کی طرح پوری ادا میں ہیں اس کی بلکہ ایک آدھ زیادہ ہی ہوگی۔ تب ہی تو امتیاز

احمد نے صالحہ کو کسی طور چھوڑ ہی دیا مگر اس کبجنت نے توہنا نہیں کیا جاو کیا۔ طلاق دیتے دیتے مگر گیا معیذ۔“

”جو صبر کا ہتھیار استعمال کرتے ہیں دنیاوی جنگوں میں ان کی شکست ناممکن ہوتی ہے سفینہ۔ بہر حال۔۔۔ تم

یہ بتاؤ داماد کیسا ہے۔ ہم نے تو بڑی تعریفیں سنی ہیں عمر سے۔“

انہوں نے محل سے کتے ہوئے بات بدل دی تھی۔ سفیر کے ذکر پہ فی الفور سفینہ کی تیوریاں غائب ہوئیں اور

چہرے پر مسکراہٹ نے ڈیرہ ڈال لیا اور وہ انہیں سفیر کی بابت بتانے لگیں۔



خاندان والوں کو معیذ اور ایسہا کے نکاح کا پتا نہیں تھا۔ اب جگ ہنسائی سے بچنے کے لیے ہی طے کیا گیا کہ زارا کی مندی والے روز ان دونوں کا علی الاعلان نکاح کیا جائے گا۔ سفینہ بیگم تو ایسے ہر پروگرام پر خون کے گھونٹ بھر کے رہ جاتیں ان سب نے تو قسم کھا رکھی تھی ان کی خوشیوں کو ملیا میٹ کرنے کی۔ ابھی تو انہیں سوچ سوچ کے ہول اٹھتے کہ بنامان باپ کی بچی کا خاندان میں تعارف بھی کروانا تھا۔ ممانی جان خاص طور پر انیکسی میں ایسہا سے جا کر ملیں تو اس کا سوگوار سا روپ دیکھ کر بے ساختہ ”ماشاء اللہ“ کہہ اٹھیں۔ انہیں سفینہ پر افسوس ہوا۔

بہت سے اچھے لوگوں کو ہم محض اپنی انا کی خاطر نادری کی دھول میں رول دیتے ہیں۔ سفینہ بھی بدلے اور انتقام کی اسی منزل پر تھیں۔

ممانی جان آئیں تو سفینہ کا دھیان تھوڑا سا پلٹا۔ وہ اب دل جمعی سے زارا کی شادی کی باقی تیاریوں میں مصروف تھیں۔

معیذ کی کال آئی تو ایسہا کا دل دھڑک اٹھا۔ جب سے سفینہ بیگم انیکسی سے ہو کر گئی تھیں معیذ کی پہلی کال آئی تھی اس کے بعد۔ اور ایسہا اس دورانہے میں یہ طے نہیں کر پائی تھی کہ معیذ کو ان کی ”ناگمانی آمد“ اور ان کے انکشافات کے بارے میں بتانا چاہیے یا نہیں۔

”کیسی ہو۔۔۔؟“

Downloaded From
Paksociety.com

وہ بہت محبت سے پوچھ رہا تھا۔ ایسہا کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

”ٹھیک۔“

”۳ بھی ریڈی ہو جاؤ۔ تھوڑی دیر میں شاپنگ کے لیے چلنا ہے ہمیں۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

”سب مکمل ہو چکا ہے۔ پلیز اب بس۔“

وہ بمشکل صاف آواز میں بولی۔ ورنہ آنسو تو گلے کا پھندا بننے لگے تھے۔

”اب۔۔۔ رے۔“ وہ حیران سا ہوا۔ پھر دھونس سے بولا۔ ”ایسے کیسے۔ آج برائڈل ڈریس لینا ہے تمہیں۔ وہ

بھی میری پسند کا۔“

ایسہا کا دل چاہا پھوٹ پھوٹ کے رو دے۔ جانے سفینہ بیگم نے کیا کھیل کھیلنا شروع کر دیا تھا۔

”ہوں۔“ وہ بیہوش سا بولی۔ مبادا معیذ کو اس کے رونے کا پتا چل جائے۔

”چلو ٹھیک ہے۔ بس تم تیار ہو جاؤ۔ میں آتا ہوں۔“ وہ مطمئن ہوا۔

”وہ۔۔۔ زارا کو بھی لے لیں ساتھ۔“

وہ مہمانوں کے سامنے کوئی تماشائے نہیں چاہتی تھی۔

”اوہ۔۔۔ وہ تو پردے میں بیٹھ گئی بس۔ اور تمہارا بھی بازار کا یہ لاسٹ چکر ہو گا۔ اس کے بعد تم بھی پردے

میں۔“ وہ شرارت سے ہنسا تھا۔

”آپ خود اپنی پسند کا لے لیں پلیز۔ مجھے تو ان چیزوں کا کچھ نہیں پتا۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

واقعی پہلے تو زارا اپنی پسند سے اس کے لیے بھی شاپنگ کر لیتی تھی۔ کبھی کبھار وہ بھی مشورہ دے دیتی یا زارا

زبردستی اس سے پسند پوچھتی تو اسے بھی دلچسپی لینا پڑتی تھی۔
”تم اس کی فکر مت کرو۔ تم صرف میرے ساتھ چل رہی ہو۔ باقی کام میرا ہے۔“
معیز کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اپنے ساتھ لے کر ہی جائے گا۔
”معیز۔“ وہ ہچکچا کر چپ سی ہو گئی۔

”کیا بات ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟“
ان چند دنوں میں وہ کم از کم اس کی آواز کے اتار چڑھاؤ سے تو واقف ہو ہی چکا تھا۔
”آئی۔ راضی ہیں اس رشتے کے لیے؟“

اس نے مدھم لہجے میں پوچھا تو لہجہ بھر کو معیز چپ سا ہو گیا۔
”ہمارا نکاح ہو چکا ہے ایسہا۔ اب ان سب تکلفات کی ضرورت نہیں۔ بہت سے لوگ رضامند نہیں ہوتے
لیکن آہستہ آہستہ وہ حقیقت کو قبول کر لیتے ہیں۔“
قدرے توقف کے بعد وہ ہلکے ہلکے انداز میں بولا تو ایسہا کو سفینہ بیگم کی ”رضامندی“ کا اندازہ ہو گیا۔
”کیا انہوں نے کوئی شرط رکھی ہے آپ سے؟“
وہ ہچکچا کر بولی تو ایک ٹانہ کے لیے معیز کا دماغ گھوم گیا۔
”تم سے کس نے کہا؟“

اس نے سوال کے بدلے فی الفور سوال کیا تھا۔ شک گزرا کہیں زار نے تو۔
”کسی نے نہیں۔ یوں ہی۔ دل میں خیال آیا تھا۔“ وہ مگر گئی۔
”ان دنوں اچھے اچھے خیالات لاؤ دل میں۔ خدا خدا کر کے تو یہ دن آئے ہیں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔
”ہوں۔ ٹھیک ہے۔“

ایسہا نے صرف بات بدلنے کی خاطر مختصراً ”کہا۔ جس بات نے کل رات سے اسے ٹینشن کا شکار کر رکھا تھا۔
اسے معیز نے کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔
”اوکے۔ پھر ریڈی ہو جاؤ میں آ رہا ہوں۔“
وہ کہتے کہتے رکا۔ پھر سنجیدگی سے بولا۔
”ایسہا۔ کسی کے بارے میں مت سوچو۔ کوئی جو کرتا ہے کرنے دو جو کہتا ہے کہنے دو۔ تم صرف میرے
جذبات کے خالص پن پہ نظر رکھو اس میں کوئی کمی بیشی ہوئی تو میں قابل سزا۔ باقی سب کو بھول جاؤ۔ سوائے

میرے۔“
آخری بات پر اس کا لہجہ مسکراتا ہوا سا تھا۔ ایسہا بھی جھینپ گئی۔



ممائی جان نے ڈھولک رکھوا کر گھر میں اچھی خاصی رونق لگا دی۔ رشتہ داروں نے معیز کی دولہن کے روپ میں
صالحہ کی بیٹی کو دیکھ کر حیرت کا اظہار تو ضرور کیا مگر اتنی باتیں نہ بنائیں جتنی کہ سفینہ بیگم کو توقع تھی۔ اس کی وجہ
شاید صالحہ کا اس دنیا سے چلے جانا تھا۔ وہ زندہ ہوتی تو شاید لوگ چسکے لینے کی خاطر ضرور کریدتے۔ فی الحال تو وہ ایسہا
کی من موہنی سی شکل اور معصومیت دیکھ کر معیز اور اس کی جوڑی کو سراہ ہی رہے تھے۔
زارا کی مہندی لڑکے والے بہت دھوم دھام سے لائے تھے۔ سفیر اور اس کے بھائیوں کے دوستوں کے

بھگڑے کمال کے تھے۔

زارا کی مایوں کی رسم سے ذرا پہلے ایسہا اور معیز کے نکاح کی سنت ادا کی گئی۔ ایسہا کا دل بھر بھر آ رہا تھا۔ کیا کیا یاد نہ آیا تھا اس لمحے۔ اور معیز شاد تھا۔ مطمئن اور پرسکون۔ جیسے من کی ہر مراد پالی ہو۔ جیسے لومینج کرنے چلا ہو۔ ماضی کی کسی یاد کا شائبہ تک اس کے ذہن میں نہ تھا۔ اسے یقین تھا ان کی زندگی آج سے شروع ہونے والی ہے۔

آج ہی ایسہا کی رخصتی تھی۔ اگلے دن زارا کی بارات کے ساتھ ان کے ولیمہ کی سنت ادا ہو جاتی۔ رباب بھی تنے ہوئے تاثرات لیے تقریب میں موجود تھی مگر بحالت مجبوری۔ اگر اس کے بھائی کی شادی نہ ہوتی تو وہ کبھی مڑ کے بھی ادھر نہ دیکھتی۔

سفینہ بیگم معیز کی بے وفائی کے ازالے کے طور پر اسے خصوصی اہمیت دے رہی تھیں۔ مگر رباب کا انہیں بھی لفت کرانے کا موڈ نہیں تھا۔

سفینہ بیگم رباب کو دیکھ دیکھ کے کڑھ رہی تھیں۔ اگر اس کے ساتھ معیز کی شادی ہو جاتی تو زارا کی کامیاب شادی کی گارنٹی مل جاتی محق ہا۔

ثانیہ کتنی ہی بار ایسہا کو لپٹا کر پیار کر چکی تھی۔
”ماشاء اللہ۔ بہت پیاری لگ رہی ہو۔ اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔“

اور ہر بار اس دعا پر ایسہا کی آنکھیں بھر آتیں۔
معیز پر اعتبار اپنی جگہ مگر سفینہ بیگم کی دھمکی ذہن سے جاتی ہی نہ تھی۔ وہ معیز کی اپنی ماں سے محبت اور لگاؤ سے اچھی طرح واقف تھی۔ سفینہ بیگم جیسی پتھر دل عورت اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتی تھیں۔

ایرازا اور عمر کے برجستہ جملوں اور لوگوں کے قہقہوں نے محفل کو زعفران زار بنا دکھا تھا۔ زارا اور سفیر کی مہندی اکٹھی ہو رہی تھی۔ سب نے ان دونوں کو تیل لگانا کر اور مٹھائی کھلا کھلا کر نڈھال کر دیا تھا۔ رات گئے محفل اپنے اختتام کو پہنچی اور لڑکے والے رخصت ہوئے۔ دو لہا دلہن بنے معیز اور ایسہا کے ساتھ سب کا فوٹوشوٹ بھی مکمل ہوا۔

اب ایسہا کی معیز کے ساتھ رخصتی تھی۔ سفینہ بیگم تو کسی بھی رسم میں حصہ لے کر خود کو ”گناہ گار“ نہیں کر سکتی تھیں۔ سو بیار بن کے کمرے میں پہنچ گئیں۔ تب ممانی جان نے خوش اسلوبی سے ماں کے فرائض سرانجام دیے۔ ایسہا کو تھام کر وہ معیز کے کمرے تک لائیں۔ ثانیہ اسے اندر لے گئی تھی۔

”واؤ۔“ خوشبوؤں اور گلابوں سے بچے بیڈ روم کو دیکھ کر ثانیہ مبہوت ہو گئی۔ مگر ایسہا کی کیفیت کچھ اور ہی تھی۔ اس نے سر دھوتے ہاتھوں سے ثانیہ کے ہاتھ تھام لیے۔

”ارے۔ تمہیں کیا ہوا؟ اتنی گرمی میں بھی ٹھنڈی پڑ رہی ہو۔“ ثانیہ حیران ہوئی۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ بے چارگی سے بولی تو ثانیہ ہنستے ہوئے بولی۔

”بھی معیز بھائی آئیں گے تو یہ ڈرور اٹن چھو ہو جائے گا۔“ ثانیہ نے اسے احتیاط کے ساتھ پھولوں سے بچے بستر پر بٹھایا۔

”معیز بھائی نے بیڈ روم میں فوٹوشوٹ سے منع کر دیا تھا۔ فوٹو گرافر کو۔ مووی میکر کو بھی نہیں آنے دیا ادھر۔“ ثانیہ بتا رہی تھی۔

اسی اثنا میں زار اپنی کاجک اور گلاس لاکر سائیڈ ٹیبل پر رکھنے لگی۔ پھر ایسہا کے پاس بیٹھی اور اسے پار کیا۔
”اللہ کرے تم ہمارے گھر کو ہمیشہ خوشیوں سے بھرا رکھو۔“ اس نے دل سے دعا دی تو اس کے ساتھ ایسہا کی آنکھوں میں بھی نمی اتر آئی۔

”کیا خیال ہے گھر بھرنے کے لیے پانچ چھ خوشیاں کافی ہوں گی؟“

ثانیہ نے ماحول بدلنے کے لیے شرارت سے کہا تو اس کا مطلب سمجھ کر ایسہا جھینپ گئی۔ زارا ہنسی تھی۔

”ہاں۔۔۔ دو بچے خوش حال گھرانہ والوں کے موٹو کی ایسی کی تیسری ہو جائے گی۔“

ثانیہ کا ارادہ تو ابھی اور رکنے کا تھا مگر عوں کی کال آگئی۔

”شرم کرو۔ تم تو وہیں چپک گئی ہو اور ادھر ایک شریف بندہ اپنی بیوی سے پہلی ملاقات کے لیے بے چین و بے قرار ہو رہا ہے۔“

عون نے اسے اچھی خاصی سنائی تھیں۔ وہ موبائل آف کر کے ہنستی ہوئی اٹھ گئی۔

”چلو بھئی۔ جن کی سلطنت ہے وہ آنا چاہتے ہیں اب۔ ہمیں تو اشارہ مل گیا۔“

زارا اس کا گال تھپتھاتی اٹھ گئی تو بے ترتیب دھڑکنیں لیے ایسہا اکیلی بیٹھی رہ گئی۔

معین کمرے میں آیا تو اک طمانیت آمیز خوشی نے اس کے پورے وجود کا حصار کر رکھا تھا۔

مسکراتی نظروں سے وہ بیڈ کے وسط میں سر جھکائے ساکت بیٹھی ایسہا کو دیکھتا اس کے پاس آ بیٹھا۔ دونوں

ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں الجھائے وہ سنی مجتہ سے کی طرح جا بد تھی۔

”السلام علیکم! معین نے مسکرا کر کہا تو ایسہا نے چہرہ مزید جھکا لیا۔

معین نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھاما۔

ٹپ۔ ٹپ۔

وہ چونکا۔ آنسوؤں کے گرم قطرے اس کے ہاتھ کی پشت پر گرے تھے۔ اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ اس

نے دونوں ہاتھوں میں تھام کر ایسہا کا چہرہ اوپر کیا تو وہ رو رہی تھی۔ معین کا دل تاسف کا شکار ہونے لگا۔

”تم نے مجھے ابھی بھی معاف نہیں کیا یا۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔ ایسی بات میں ہے۔“

وہ جلدی سے بولی ”مبادا وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے۔“

معین نے دونوں انگلیوں سے اس کے آنسو صاف کیے۔

”تو پھر۔۔۔ یہ آنسو۔۔۔؟“

”یہ تو بس ایسے ہی۔۔۔“ وہ نجل سی ہو گئی مگر آنسوؤں کو کنٹرول کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

اسے اپنی خوش نصیبی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ گزرے چار سالوں میں اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آیا تھا

کہ وہ معین احمد کے دل میں کبھی اپنی جگہ بنا سکے گی۔

”تم نے بہت رو لیا ایسہا۔ میرے بغیر جتنا رونا تھا رو لیا۔ اب میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اور کبھی تمہیں

رونے نہیں دوں گا۔“

وہ یقین بھرے انداز میں بولا تو ایسہا کو اس کی ہر بات پہ یقین آنے لگا۔ معین نے اس کے گرد بازوؤں کا

حصار بنایا تو وہ اس کی مضبوط پناہوں میں سمٹ سی گئی۔

اس دنیا کے ہر علم اور ہر دکھ کو بھلائے۔ محبت کی صدا پر لبیک کہتے۔ ان دونوں پر محبت پر پھیلائے سایہ فگن

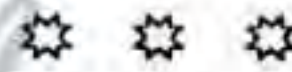


سفینہ بیگم کو زارا کے مستقبل کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ رباب کی صورت وہاں زارا کے لیے ایک مستقل درد سر موجود تھا۔ کیا تھا اگر معیذ یہ بار اپنے سر لے کر زارا کی آزمائش ختم کر دیتا۔ سفینہ بیگم کو شکوہ تھا۔ مگر آہ بھر کے رہ جاتیں معیذ تو ایک طرف رہا خود زارا بے وقوف بھی اپنے مستقبل کے ان مسائل سے لاپرواہ تھی۔

وہی زارا جو پہلے رباب کو بھائی بنا کر سسرال میں اپنی حیثیت مضبوط بنانا چاہتی تھی۔ اب بھائی اور ایسہا ”بھابھی“ کی محبت میں گوڈے گوڈے ڈوبی ایسہا کی خوب طرف داری کرتی تھی۔ مگر۔۔۔ جب وہ ایسہا کو ڈرا ڈھمکا کر آئیں تو ان کے دل کو از حد طمانیت ملی جب انہوں نے ایسہا کا اپنے رعب کے آگے وہی سابقہ حال دیکھا۔ معیذ کے ساتھ نے اسے نہ تو زبان دراز بنایا تھا اور نہ ہی نڈر۔ وہ ابھی بھی ان کے جوتے تلے آیا کیرا تھی۔ جسے وہ کبھی بھی مسل سکتی تھیں انہوں نے بڑی طمانیت اور شرف سے سوچا۔

انسان سوچتے وقت یہ بھول جاتا ہے کہ ”تذلیل انسانی“ کے منصوبے بنانے والوں کے منصوبے اکثر فیل ہو جایا کرتے ہیں۔

مگر رب کی گرتی نہیں بدلا کرتی۔ اس کا ”کن“ ”کیسے“ ”کون“ ہو جایا کرتا ہے۔
تو کوئی ہے جو سوچے سمجھے؟؟؟؟



ان کا خیال تھا کہ رباب ان کا منصوبہ سن کے خوشی کے مارے اچھل پڑے گی۔ باغ باغ ہو جائے گی مگر وہ تو چلا اٹھی۔

”کیا۔؟ آئی آپ کا باغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ دو ماہ۔ دو ماہ اس لڑکی کو مجھ سے بنا کے رکھے گا اور آپ فلمی ظالم ساس کی طرح ایسہا پہ طرح طرح کے ظلم ڈھا کر اسے یہاں سے بھگانے کی سازشیں کریں گی۔“
وہ تند و تیز لہجے میں بولتی چلی گئی تو سفینہ بیگم نے بے اختیار پہلو بدلا۔ ان کے سامنے اپنی اولاد کو بھی اس لب و لہجے میں بولنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

(اگر یہ خبیث لڑکی اس گھر میں آگئی تو کیا کرے گی؟) انہیں بے ساختہ خیال آیا۔
مگر ہر حال فی الوقت تو اپنے سے زیادہ بیٹی کا گھر بچانے کی فکر تھی۔ سو لہجے کو نرم ہی رکھا۔
”تم فکر مت کرو رباب! معیذ صرف ہمدردی کے بخار میں مبتلا ہے اور کچھ نہیں۔“

”اسے دوسرے لفظوں میں عشق کا بخار کہتے ہیں آئی۔“ اس نے جتانے والے انداز میں کہا۔ تو وہ خفیف سی ہو گئیں۔ تب وہ اطمینان سے بولی۔

”مگر میں نے اچھی طرح سے اس مسئلے کا حل سوچ لیا ہے۔“

وہ چونکیں۔ ”کیا۔؟“

”یہی کہ میں آپ کی ہونے والی بہو کو اتنا بدنام کروں گی کہ معیذ کے پاس اسے چھوڑنے کے سوا کوئی آپشن بچے گا ہی نہیں۔“

وہ رباب کے مقابل ہوتیں تو اس سے اس کی آنکھوں کی وحشیانہ چمک دیکھ کر جھرجھری لے کر رہ جاتیں۔ اور شاید اسے اپنی بہو بنانے کی خواہش پر نظر ثانی بھی کر لیتیں۔ مگر ابھی چونکہ فون پر تھیں سو حیران ہو کر پوچھ ہی

سکیں۔
”ایسا کیا کرو گی تم؟“ بلا ارادہ ہی اعتراف کر گئیں۔ ”معہذ اب اس سے متنفر ہونے والا نہیں ہے رباب۔
اس نے بہت آزمائشوں کے بعد اس لڑکی کو پایا ہے۔“
رباب تلمسلائی۔ (تو کیا میں مفت کا مال بھی اس کے لیے؟)
”اور اگر بھری محفل میں کوئی دوسرا مرد آکر آپ کی نام نہاد ہو کا ہاتھ تھام لے اور اپنے عشق کے قصے سنائے
تو۔؟“

رباب نے چمکتی آواز میں کہا تو لمحہ بھر کو وہ خاموش ہو گئیں۔ انہوں نے ایسہا کو گھر سے نکالنے کے بہت سے
طریقے سوچے تھے وہ اسے بد کردار بھگوڑی ماں کی بیٹی تک کہتی تھیں مگر اس طرح سے اسے بد کردار ثابت کرنے
کا انہوں نے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ تب ہی بے ساختہ بولیں۔
”معہذ بے وقوف نہیں ہے رباب۔! جو لڑکی جائیداد کا حصہ لے کر بھی معہذ کو چھوڑ کر نہیں گئی اس کے فرضی
عشقیہ قصے پر وہ یقین نہیں کرے گا۔“

”کرے گا آئی! ضرور کرے گا۔“ وہ پراسرار انداز میں مسکرائی۔ پھر گویا دھماکا کیا۔
”اور اس معاملے کو ہوا دیں گی آپ۔“

”مم۔ میں۔؟“ وہ اس اچانک افتاد پر گڑبڑائیں۔ ”میں کیسے۔؟“

”معہذ اس پر جتنا بھی اعتماد کا اظہار کرے آپ ایسی بد کردار ہو کو اپنانے سے انکار کر دیجئے گا اینڈ ڈیش آل۔
اتنے سارے لوگوں کے درمیان تو ویسے بھی معہذ کی بولتی بند ہو جائے گی۔ ایسی پھولیشن دیکھ کر۔“
آواز سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ اپنے منصوبے پر اٹل ہے اور محفوظ بھی ہو رہی ہے۔
سفینہ بیگم ہچکچائیں۔ ”تم صبر کر جاؤ تو میں معہذ کو اسے طلاق دینے پر مجبور کر دوں گی رباب۔“
”مگر مجھے برتا ہوا مرد نہیں چاہیے۔“ رباب نے سرد اور قطعی لہجے میں جو الفاظ کہے انہوں نے لمحہ بھر کو سفینہ
بیگم کو سننا دیا۔

(یہ ایک کنواری لڑکی کا انداز گفتگو تھا کیا؟)

”آپ بس خاموشی سے تماشا دیکھیں۔ اور وقت آنے پر بس اپنا کردار نبھائیں۔ باقی ساری ٹینشن میرے لیے
رہنے دیں۔“

وہ اپنے ہلکے پھلکے انداز میں لوٹتے ہوئے بولی تھی۔ ان کے لیے اب یہ منصوبہ چاہے ناقابل قبول تھا مگر اندر
سے تو وہ بھی ایسہا سے چھٹکارا چاہتی تھیں سومان ہی گئیں ضمیر کو بھی تاویل دے کر ہلا دیا۔
کون سا میں یہ سب کر رہی ہوں۔ میرا کام تو ساری صورت حال پر رد عمل ظاہر کرنا ہے اور بس۔
”اور وہ مرد کون ہو گا جو یہ ڈرامہ کرے گا۔؟“ انہوں نے برسمیل تذکرہ پوچھا۔

”وہ آپ فکر مت کریں۔ میرا ایک بہت اچھا دوست ہے۔“ سفینہ بیگم کو نیم رضامند پا کر۔ رباب کی آواز میں
کھنک سی اتر آئی تھی۔ جبکہ وہ تو لفظ۔
”دوست“ پر ہی اٹک گئیں۔

(اتنا گرا دوست کہ ایسے منصوبے میں حصہ دار بنالیا؟)

مگر جب عقل پر پروردہ پڑ جائے تو آنکھوں کے ہوتے بھی انسان اندھے ہو جایا کرتے ہیں۔ سفینہ بیگم بھی اسی
صورت حال کا شکار تھیں۔

”اب جو بھی کرنا ہے، وہ ہم دونوں کو مل کر کرنا ہوگا آئی۔ آپ گھبرائیں مت۔ بس آپ کو موقع پر میرا ساتھ دینا ہے اور بس۔“

”بات بگاڑ مت دینا رباب۔“

”آپ بے فکر رہیں آئی! اب ہی تو صحیح معنوں میں بات بنے گی۔“ رباب کا لہجہ عجیب سا تھا۔
 ”تئی بدنامی ہوگی آپ کی بہورانی کی۔ کہ معیذ کے پاس اسے چھوڑنے کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں ہوگا۔“ اور یہ خیال چاہے سفینہ کے لیے خوش کن ہی سہی کہ وہ ایسہا سے چھٹکارہ پاسکتی ہیں، ان کا دل بہت سے اوبام کا شکار تھا، مگر ایسہا کے لیے یہ گڑھے کھودنا بہت ضروری تھا۔ ورنہ تو کل کو وہ ان کی راجدھانی کی ملکہ بن بیٹھتی۔

انہوں نے اندر ہی اندر خود کو تاویلیں دے کر ضمیر کو تھپتھپایا تھا۔
 دوسروں کے لیے گڑھے کھودنے والوں کے نصیب میں بھی خدا عموماً وہی راستہ لکھ دیا کرتا ہے۔ اس کی مرضی ہو یا نہ ہو۔ کبھی نہ کبھی وہ خود بھی اس راستے پہ ضرور آ نکلتا ہے۔



وہ ایک بے حد روشن، لیبیلی اور متوالی سی صبح تھی۔
 ایسہا کی زندگی کی سب سے خوب صورت اور روشن صبح۔
 معیذ واش روم میں تھا۔ وہ خشک ہوتے بالوں کو ڈھیلے سے جوڑے میں لپیٹے کھڑکی میں اکھڑی ہوئی۔ نیچے وسیع لان میں پھولوں کی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا بھی چل رہی تھی، آج تو سورج سوانیزے پر بھی ہوتا تب بھی ایسہا کے لیے یہ ایک جگمگاتی حسین ترین صبح تھی۔
 وہ سحرزہ سی ہواؤں کی پھولوں کے ساتھ اٹھ کھلیوں کو دیکھ رہی تھی۔ جب معیذ نے آستکی سے آکر اسے بانسوں کے حصار میں لے لیا۔
 لہجہ بھر کو وہ ہڑبڑاسی گئی۔
 ”کیا دیکھا جا رہا ہے؟“

وہ مسکرایا۔ ایسہا کے ہونٹوں پر بھی شرمیلیں سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
 ”زندگی۔“ اس کا جواب بھرپور تھا۔

معیذ نے اس کے جواب سے محظوظ ہوتے ہوئے اسے گھما کر اپنی طرف کیا۔
 ”تو پھر ہا ہر کیا دیکھ رہی ہو۔ میری آنکھوں میں دیکھو۔“
 شرارت سے کہا تو وہ جھینب سی گئی۔

”خوش ہو یا۔؟“ معیذ کے دل کا ایک کونا شاید ہمیشہ کے لیے مضطرب رہنے والا تھا۔
 ”ہوں۔“ اس نے بچوں کی طرح معصومیت سے اثبات میں سر ہلایا۔ تو معیذ نے اس کی پیشانی پہ لب رکھ دیے۔ ایسہا کے دل میں سکون سا اتر گیا۔

”جو بھی ہوا، اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں تھا معیذ۔ یہ زندگی کے گزرنے کا ڈھنگ ہے اور ان طے شدہ راستوں پر سے ہر ایک نے گزرتا ہی ہے۔ مجھے حال میں جینا پسند ہے اور یہ اٹل حقیقت ہے کہ اس میں آپ میرے ساتھ ہیں۔ تو پھر میں خوش کیوں نہ ہوں گی۔“

اس کے مان بھرے لمس نے ایسہا کو بولنے پر مجبور کر دیا تھا۔
”ارے۔“ معیذ ہنسنا۔ پھر شرارت سے بولا۔
”میں تمہاری زبان چیک کروانے کا سوچ رہا تھا ڈاکٹر سے۔ مگر تم تو اچھا خاصا بول لیتی ہو۔“
ایسہا نے خفیف سا ہوا کر اس کے سینے میں چہرہ چھپا لیا۔ تو معیذ بھرپور انداز میں مسکرا دیا۔



معیذ اور ایسہا دلہے کی تقریب میں اس قدر مکمل اور ایک دوسرے کے جوڑ کے لگ رہے تھے کہ ہر ایک نے ان کی تعریف کی۔

سفینہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے بہو بیٹے کی تعریفیں سن کے خوش ہوں یا جلیں کڑھیں۔
فی الوقت تو ان کا دل رباب کے پلان میں اٹکا ہوا تھا۔
انہوں نے دور سے ایک گہری نگاہ اسٹیج پر ڈالی۔ معیذ کے ساتھ شرمیلی سی مسکراہٹ لیے بیٹھی ایسہا آج ہمیشہ سے زیادہ برا اعتماد لگ رہی تھی۔

ان کا دل غم و غصے سے بھر گیا۔ آج یہاں آنے سے پہلے وہ بھر کو ایسہا کے پاس رکیں، جب وہ اکیلی تھی۔
”آج دیکھتا۔ جو ذلت کی سیاہی تمہارے منہ پہ ملی جائے گی۔ میرا بیٹا تمہو کے گا بھی نہیں تم پر۔“ انہوں نے زہریلے انداز میں کہا تو ایسہا گنگ رہ گئی تھی۔

بارت آئی تو معیذ اور ایسہا بھی اسٹیج سے اتر آئے۔ زارا دلہن کے کمرے میں بالکل تیار بیٹھی تھی۔ چونکہ نکاح پہلے ہی ہو چکا تھا اس لیے کوئی افراتفری نہیں تھی۔

ایسہا نے معیذ کا بازو تھاما۔ تو وہ مسکراتی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔
”میں۔۔۔ زارا کے پاس چلی جاؤں۔“

وہ سب کے بیچ معیذ کی وارفتہ نگاہوں سے نروس ہوئی جا رہی تھی۔
”اور اسے یوں ہی چھوڑ جائیں گی۔ شتر بے مہار۔“ عمر کی سماعت تیز تھی۔ اس نے لقمہ دیا تو ایک قہقہہ پڑا۔
”شٹ اپ۔“ معیذ ہنسنا تھا۔
”چلو۔ میں چھوڑ آتا ہوں۔“

اس نے ایسہا کا ہاتھ تھاما تو سب نے ہاؤ، ہو کا شور مچا دیا۔ معیذ تو خیر عادی تھا مگر ایسہا کو شرم بھی آرہی تھی اور ہنسی بھی۔

وہ اسے دلہن کے کمرے تک چھوڑ کر واپس پلٹ گیا تو ایسہا اطمینان کی سانس بھرتی اندر آئی۔
”شکر ہے۔ کوئی تو آیا ادھر۔ سب بارات دیکھنے بھاگ گئیں۔“

اسے دیکھ کر زارا نے شکر ادا کیا تھا۔
”بہت خوب صورت لگ رہی ہو زارا۔“ ایسہا نے دل سے تعریف کی تو وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ صاف گوئی سے بولی۔

”مگر تم سے کہ۔“

”ارے نہیں۔“ ایسہا جھل سی ہو گئی۔

”سفیر بھائی بھی بہت اچھے لگ رہے ہیں۔“ جلدی سے کہا تو زارا مسکرائی۔

”ہاں۔ وہ ضرور لگ رہے ہوں گے۔“
باہر دوڑھ بلائی کی رسم ہو رہی تھی تو ہر کوئی اسٹیج پر چڑھا ہوا تھا۔
سفینہ بیگم نظر کا شکار ہر جگہ ایسہا کو تلاستی پھر رہی تھیں۔
وہ نہ ملی تو رباب کا پلان کیسے پورا ہوگا۔ یہیں ہال میں معہذ کے ساتھ ہونا چاہیے تھا اسے۔
انہوں نے دیکھا۔ معہذ اکیلا ہی سب کزنز کے ساتھ ہنسی مذاق میں مصروف تھا۔
انہیں کچھ خیال گزرا تو وہ تیزی سے دلہن کے کمرے کی طرف بڑھیں۔ دروازہ کھول کے اندر داخل ہوئیں تو
اندر کا عجیب سا ماحول دیکھ کر ٹھنک گئیں۔
اندر زارا اکیلی نہیں تھی۔ رباب اور اس کی امی بھی تھیں۔ زارا کے تاثرات عجیب سے تھے۔ ماں کو دیکھ کر وہ
تیر کی تیزی سے لپک کر ان سے چمٹ گئی۔
”ماما۔! اس کے آنسو بننے لگے تو وہ پریشان ہو گئیں۔“
”کیا ہوا میری جان۔ زارا کچھ بتاؤ تو۔“
انہوں نے نظر سے باری باری رباب اور مسز احسن کی طرف دیکھا۔
پھر دوبارہ چونک کر رباب کو۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اور ہونٹوں پر پراسراری مسکراہٹ تھی۔
”میں بتاتی ہوں آئی۔ آپ کی بیٹی نے اپنے کسی پرانے واقف کار کو یہاں اکیلے میں ملنے کے لیے بلایا ہوا
تھا۔“

رباب نے گویا دھماکا ہی کر دیا تھا۔ آن واحد میں جیسے سفینہ بیگم کے سر پہ چھت آگری۔
تب انہوں نے پہلی بار ایک طرف کھڑے چہرے پر خبیث مسکراہٹ سجائے شخص پر نظر ڈالی۔ جو بڑے اعتماد
سے کھڑا تھا۔ ان کا داغ سنسنائے لگا۔
رباب نے کہا تھا کہ یہ شخص میں ج ہال میں سب کے سامنے جا کر ایسہا کے ساتھ اپنے افسوس اور ایسہا کی بے
وفائی کا اعلان کرے گا۔ تو پھر غلطی کسے ہوئی تھی؟ کسی کی بیٹی کی جگہ ان کی بیٹی کیسے بدنام ہونے لگی تھی؟
کیا یہی قانون قدرت تھا؟ اتنی جلدی وہ کڑھوں والے راستے پر نکل آئی تھیں؟ وہ کڑھے جو انہوں نے ایسہا
کے لیے کھودے تھے۔

”یہ کیا بکو اس ہے رباب۔ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔“
ان کی آواز مارے صدے اور غم و غصے کے پھٹ سی گئی۔

انہوں نے سر اٹھایا ہو کر مسز احسن کو دیکھا۔ ان کی رنگت بھی فق تھی۔ انہیں تو رباب لے کر آئی تھی کہ
دیکھیں یہاں کیا تماشا ہو رہا ہے۔

”جھوٹ یہ نہیں۔ آپ کی بیٹی بول رہی ہے۔“ سیفی نے اطمینان سے کہا۔

زمین کانپ رہی تھی اور آسمان انہیں گرنے کو تھا۔ ان کے پورے وجود پر لرزہ طاری ہونے لگا۔
وہ رباب کا کھیل سمجھ گئی تھیں۔ وہ شخص معہذ سے بدلہ نہیں لینا چاہتی تھی۔ وہ اس گھر سے منسلک ہر رشتے کو
اپنے خاندان سے کاٹ پھینکنا چاہتی تھی۔

اور ایک اور لرزہ کیا تھا جو اسی کمرے کے اسٹیج ہاتھ دم میں دروازے کے ساتھ لگ کے کھڑا تھا۔
سیفی کی نفرت انگیز آواز نے ایسہا کو کیا کیا یاد نہیں کروا دیا تھا۔ بے بس و معصوم لڑکیوں کی زندگیاں تباہ کرنے
والا آج زارا کی زندگی سے خوشیاں چھیننے والا تھا۔

”ماما۔ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں تو اسے جانتی تک نہیں ایک دم سے روم میں آگیا۔“
 زارا روتے ہوئے اپنی صفائی دے رہی تھی۔
 دلفعتا ”ایسہا کو خیال آیا کہ وہاں کیا ہونے والا تھا۔“
 ”میں بھائی کو بلا کے لاتی ہوں۔“

رباب کی پرسکون آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو اس کے وجود پہ طاری لرزہ ختم گیا۔ زارا کی زندگی بربادی کے راستے پہ چل پڑی تھی۔
 رباب نے سفیر کو کال کر دی تھی اور فی الفور برائیل روم میں آنے کا کہا تو پریشانی کے عالم میں معین بھی اس کے ساتھ چل پڑا۔
 ”خدا گواہ ہے آئی! میں اس آدمی کو نہیں جانتی۔ میں بے گناہ ہوں۔“ زارا اب سفیر کی امی کو یقین دلا رہی تھی۔

ایسہا ایک دم سے کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے لرزتے ہاتھ سے دروازہ کھول کے باہر نکلی۔
 ”زارا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ یہ اس آدمی کو نہیں جانتی مگر میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“
 اس نے مضبوط اور اونچی آواز میں کہا تو سب کے ساتھ بے اختیار سیفی بھی اس کی طرف گھوم گیا۔ حیرت و بے یقینی سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
 ”یہ سفیان حمیدی ہے۔ سیفی ہے نا؟“
 وہ سفینہ بیگم کے بالکل ساتھ آکھڑی ہوئی اور اب بڑے اعتماد سے سیفی سے پوچھ رہی تھی۔
 ”یہ لو۔ یک نہ شدو شد۔ بیٹی تو بیٹی۔ سو بھی۔“ رباب ترخ کر کہنے لگی تھی کہ سفینہ بیگم اونچے سخت لہجے میں اسے ٹوک گئیں۔

”بکو اس مت کرو رباب! میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں تمہاری چال کو۔“
 ”آپ بے فکر رہیں آئی! یہ زارا سے نہیں مجھ سے ملنے آیا ہے۔ زارا تو اسے جانتی بھی نہیں۔“
 مزاحسن سے کہتے ایک پل میں ہی ایسہا نے زارا کو ہر الزام سے بری کر دیا تھا۔ رباب کا چہرہ نفرت سے سیاہ پڑنے لگا۔

اسی وقت دروازہ کھلا اور تیزی سے سفیر اور معین آگے پیچھے اندر داخل ہوئے اور اتنی دیر سے کلائمکس کا انتظار کرتا سیفی تو معین احمد کو وہاں دیکھ کر ہی بوکھلا گیا۔
 رباب نے کہا تھا کہ بس وہ سفیر کو یقین دلا دے کہ زارا سے اس کا پرانا الفیو تھا اور آج وہ اس سے آخری بار ملنے آیا تھا۔ اس کے بعد اس کا کام ختم ہو جاتا۔

مگر پہلے ایسہا مراد اور اب معین احمد۔ سیفی کا تو سر ہی چکرانے لگا۔
 ”تم۔“ معین کے سر پہ تو حیرت کا آسمان ٹوٹ پڑا سیفی کو وہاں دیکھ کر۔
 ”نہ۔ میں۔ غلطی سے شاید اس روم میں آگیا تھا۔“ سیفی ہڑبڑایا اور واپس پلٹنے کو تھا جب معین نے اسے دانت پیٹتے ہوئے کالر سے پکڑ کے کھینچ لیا۔

مزاحسن نے تیزی سے سارا واقعہ کہہ سنایا تو اس کے بعد معین نے سر دھری سے کہا۔
 ”یہ بد بخت وہی ذلیل آدمی ہے آئی! جس نے ایسہا کو کڈنپ کیا تھا۔ بد معاشی اور عیاشی کا اڈہ چلانے والا۔“
 سفینہ بیگم کو جھٹکا سا لگا۔ وہیں رباب کی رنگت بھی سفید پڑ گئی۔ ایراز اور عمر بھی وہاں آپہنچے تھے۔

معیز نے طیش کے عالم میں سیفی کو اچھی خاصی لگا دیں۔ رباب دیوار سے پشت لگائے پھٹی آنکھوں سے سارا منظر دیکھ رہی تھی۔

”میں کوئی اڑھ نہیں چلا رہا۔ غلطی سے اس روم میں آ گیا تھا۔“

وہ اپنی بات بہ ڈٹا ہوا تھا۔ رباب ادھ موٹی ہوئی جا رہی تھی۔ اگر اب وہ رباب کا نام لے لے تو۔۔۔ مگر شاید سیفی کو اب بھی یقین تھا کہ رباب کسی کی بات کا یقین نہیں کرے گی۔ اس لیے اس نے فی الحال تو مار کھا کے بھی رباب کا حوالہ نہیں دیا تھا۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری بہن اور میری بیوی پہ الزام تراشی کرنے کی۔“

معیز کا غصہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ عمر نے اسے سنبھالا۔

”میں اور ایرازا سے دیکھ لیتے ہیں۔ تم سفیر کو لے کے باہر جاؤ۔ مہمان بھرے پڑے ہیں۔ سو طرح کی باتیں بنیں گی۔“

سیکورٹی گارڈ کو بلوا کر ایرازا اور عمر نکلنے کو تھے جب عون بھی پریشان سا وہاں چلا آیا۔ سیفی کو وہاں دیکھ کر اس کو بھی حیرت نے گھیر لیا۔ ایرازا سے تفصیل بتانے لگا۔

Downloaded From
Paksociety.com

سزا حسن نے آگے بڑھ کے زارا کو اپنے ساتھ لپٹایا تو وہ سکنے لگی۔

سب سے بری حالت رباب اور سفینہ بیگم کی تھی۔

”دیکھ لوں گا میں تم سب کو۔“ سیفی بکو اس کرتادھمکیاں دیتا ان کے ہمراہ گیا تھا۔

معیز نے زرد رنگت لیے خاموش کھڑی ایسہا کو جا کر بازو سے تھاما تو وہ اس کے شانے سے آگئی۔

معیز کو پتا تھا اتنی سی دیر میں اس پر کیا قیامت بیت گئی ہوگی۔ مگر نہیں۔

اصل قیامت جو آئی اور آکر گزر گئی۔ اس کا پتا صرف رباب، سفینہ بیگم اور ایسہا کو تھا۔

”چلو بھئی۔ اب دیر مت کرو۔ میری بیٹی کو لے جا کر اسٹیج پر بٹھاؤ۔ یہاں تو سیکورٹی کا انتظام ہی بہت ناقص ہے۔ اللہ کا شکر کوئی نقصان نہیں ہوا۔“

سزا حسن نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ عون نے ثانیہ کو بھیجا تھا۔ وہ آکر ایسہا کی طرف بڑھی۔

”تم ٹھیک ہو ایسہا۔“

”ہوں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

سزا حسن اور ثانیہ زارا کو باہر لے گئیں۔ رباب میں تو اتنی بھی ہمت نہ تھی کہ اپنی جگہ سے اٹھ سکتی۔ ماں کے

کنے پر بھی یوں ہی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی رہی تو وہ اس کی بعد میں گوشالی کرنے کا سوچ کر چلی گئیں۔

”ریلیکس ایسہا۔ پہلے تو وہ بچ گیا تھا مگر اب دیکھنا بس سزا دلواؤں گا۔ اس خبیث انسان کو۔ تاکہ آئندہ کسی

لڑکی کی زندگی برباد نہ کر سکے۔“

معیز اس کا ہاتھ تھامے تسلی دے رہا تھا۔ پھر بازو پھیلا کر سفینہ بیگم کو بازو کے گھیرے میں لیا تو ان کا جی چاہا

اوپنی آواز میں رو دیں۔

انتاہین کریں کہ اس کمرے کی دیواریں اور چھت ان پر آگریں اور وہ یہیں دب کر مر جائیں۔

”تم چلو۔ میں آ رہی ہوں۔“

انہوں نے معیز سے نگاہ ملائے بغیر کہا تو وہ مسکراتے ہوئے ایسہا کو لے کر باہر نکل گیا۔

سفینہ بیگم نے نفرت بھری نظروں سے رباب کو دیکھا۔

READING
Section

”آج تمہاری بد کرداری نے میری آنکھوں پہ بندھی پٹی اتار دی رباب! اور تمہاری بد کرداری نے ہی میری بہو کا کردار بھی مجھ پر عیاں کر دیا۔“

ان کی آنکھوں میں یکایک آنسو بھر آئے۔

انہیں خیال آیا کس طرح ایسہا نے ان کی بیٹی کی بدنامی کو اپنے سر لینے کی کوشش کی تھی۔
”اور میں سوچتی رہی کہ ایسہا کو صرف گھر توڑنا ہی آتا ہے گھر تو تم جیسی لڑکیاں بساتی ہیں۔ مگر میں غلطی پر تھی۔ اور وہ بھی اتنی ناش غلطی۔“ وہ حقارت سے اسے دیکھتی باہر نکل گئی تھیں۔
رباب پھوٹ پھوٹ کر روتی وہیں دیوار کے ساتھ لگ کے بیٹھتی چلی گئی۔

قسمت نے آج کیسے اسے دو خاندانوں میں رسوا ہونے سے بچایا تھا۔ وہ لرزی گئی۔

اور سیفی۔ معیذ احمد کو ٹھوکر مار کر وہ سیفی کے ساتھ تباہی سے رخصت ہونے کے خواب دیکھ رہی تھی اور وہ کیا نکلا۔ لڑکیوں کی فریخت کا کاروبار کرنے والا۔

آج پھر ایسہا مراد فرسٹ پوزیشن لے گئی تھی۔ رباب نے حسرت سے سوچا۔ فی الوقت تو اس کا اپنا نقصان اتنا بڑا تھا کہ وہ کسی اور کے متعلق نفرت انگیزہ انداز میں سوچ بھی نہیں پا رہی تھی۔ بعد میں شاید اپنی فطرت سے مجبور ہو کر وہ اسی پنج پھال لیتی مگر فی الحال تو جس قیامت سے بچی تھی اسی کا خیال اسے لرزا رہا تھا۔



زارا خیر و عافیت سے اپنے گھر رخصت ہو گئی مگر جو قیامت ان کے گھرانے کو چھو کر گزری تھی۔ اس کی حقیقت سے سفینہ بیگم ہی واقف تھیں۔

ایسہا کے لیے کھودے گڑھے میں ان کی اپنی بیٹی گر گئی۔ اس پر مستزاد ہاتھ بڑھا کے نکالا بھی ایسہا نے ہی تھا۔ وہ ماں ہو کر بھی اس پل اپنی بچی پر سے وہ داغ اٹار نہ سکتی تھیں جو ایسہا نے آرام سے اپنی ذات پر سجایا۔ فقط اس گھر کی عزت بچانے کے لیے۔

ساری رات وہ گھٹ گھٹ کر روتی رہیں۔ اللہ سے معافی کی طلب گار رہیں۔
صبح تک وہ بخار میں پھنک رہی تھیں۔

ایسہا سے بے بنیاد نفرت نے انہیں اتنا گھٹیا پن اپنانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ جسے ہر وقت بھگوڑی ماں کی گھٹیا تربیت کے طعنے دیتی رہتی تھیں اور رباب۔ ایک باعزت گھرانے اور بہترین ماحول میں پرورش پانے والی۔ سفیر احسن کی بہن۔ انسان کا کردار اس کی فطرت کی بنیاد پر بنتا ہے۔ اگر فطرت اچھی ہو تو ڈاکو کا بیٹا مولوی اور اگر فطرت بری ہو تو مولوی کا بیٹا ڈاکو بن سکتا ہے۔

مگر سفینہ بیگم کو کڑے تجربے کے بعد یہ علم حاصل ہوا تھا۔ شام کو زارا کے ولیمہ کا فنکشن تھا۔

ڈاکٹر گھر آ کے سفینہ بیگم کو چیک کر کے دوائیں دے کر گئی تھی۔

ایرا اور عمر کمرے میں تھے۔ ممانی جان ادھر ادھر کی باتوں سے ان کا دل بہلا رہی تھیں۔ معیذ ابھی کمرے میں آیا تھا۔

”شام تک بالکل ٹھیک ہو جائیں آپ۔ زارا پریشان ہو جائے گی وہاں۔“

وہ مسکرا کر بولا۔ تو سفینہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

چار سالوں سے وہ معیذ کے ہنسنے مسکرانے کی دعائیں مانگ رہی تھیں مگر جب اس نے مسکراتا سیکھا تو سفینہ

بیگم کو اچھا نہیں لگا۔ تفسے مجھ پر۔ وہ دل ہی دل میں کڑھیں۔
انہیں آرزو دیکھ کر وہ ان کے پاس بیٹھ گیا۔ یقیناً ”وہ سینٹی والے معاملے کو لے کر اتنی حساس ہو رہی تھیں۔
”ڈونٹ وری ماما! وہ صرف ایک ایکسیڈنٹ تھا۔ کمینہ انسان اب سالوں جیل میں سڑے گا۔ کافی کیس
ڈلوائے ہیں اس پر۔“

”تم نے کہا تھا وہ گھر کو بنانے اور جوڑنے والی ہے۔ اور وہ اپنے ماں باپ سے بہت مختلف ہے۔“
وہ رندھے لہجے میں بولیں تو معیذ حیران سا انہیں دیکھنے لگا۔ سب ہی ان کی طرف متوجہ تھے۔
وہ یقیناً ”ایسہا کی بات کر رہی تھیں۔“

”تم نے بالکل ٹھیک کہا تھا معیذ۔ کل اس نے ہمارے گھر کی عزت بچالی۔“
وہ کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں۔

”میری بیٹی پہ لگنے والا الزام اپنے سر لے لیا اس نے اور اس نے بتا دیا کہ شریف گھرانے کی بہو بیٹیاں کیسی
ہوتی ہیں۔“

انہوں نے روتے ہوئے کہا۔ تو معیذ نے سنجیدگی سے کہا۔
”اس نے جو کیا وہ اس کا فرض تھا ماما۔ آپ دل پہ بوجھ مت رکھیں۔“ معیذ کا انداز ایسا ہی تھا جیسے انہیں ذہنی
پریشانی سے بچانے کی خاطر بہلا رہا ہو۔

مگر سفینہ بیگم کا دل تو مستقل جیسے مٹھی میں آیا ہوا تھا۔ وہ جب بھی اپنے اور رباب کے بنائے گھٹیا منصوبے کی
بابت سوچتیں تو ان کی تڑپ میں اضافہ ہی ہوتا تھا۔ زارا کی بخیر و عافیت رخصتی کے بعد سے انہوں نے ایک پل بھی
چین نہ پایا تھا۔

”اے متکبر انسان! اے خاک اور نطفے سے پیدا ہونے والے متکبر انسان! اگر تو اپنی زندگی کی ”بنیاد“ پر ہی غور
کر لے تو تیری ساری اکثر عاجزی میں بدل جائے۔ مگر نہیں۔ ہم اکثر اپنی ان خوبیوں پر بڑا اتراتے ہیں جن کے
ہونے میں ہمارا کوئی کمال ہی نہیں۔ جو سب اس رب ذوالجلال کی نوازی ہوئی ہیں تو بجائے اس کا شکر ادا کرنے کے
ہم اس کی (نعوذ باللہ) خصوصیت اپنانے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ اللہ اکبر۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ تکبر صرف
اس ذات کریمی کو زیب دیتا ہے جس نے اپنے جاہ و جلال پر اپنی رحمت کو حاوی کر رکھا ہے۔“
سفینہ بیگم کی آنکھیں بھی زوردار ٹھوکر کھانے کے بعد کھلی تھیں۔ انسان جس کے سامنے غرور و تکبر کے
مظاہرے کرتا ہے اللہ اکثر اسی کے سامنے انسان کو ذلیل و خوار کرتا ہے۔ تو کوئی ہے جو سوچے سمجھے؟
سفینہ بہت اچھی طرح سمجھ گئی تھیں۔ اللہ نے ان کی عزت اس کے ذریعے رکھی تھی جسے وہ عزت کے قابل
سمجھتی ہی نہ تھیں۔ اللہ کو انسان سے ناک رگڑوانا آتا ہے۔ اپنے مقرر کردہ دائرے سے باہر نکلتی سفینہ اور رباب کو
پلٹ کر دائرے میں پٹا گیا تھا۔

”اسے بلاؤ معیذ۔!“ اس کا بہت قرض ہے مجھ پر۔ وہ رو رو کر تھک سی گئیں۔

ممائی جان کے اشارے پر وہ جا کر کچن میں سوپ بناتی ایسہا کے پاس کھڑا ہوا۔

”میں بس دو منٹ میں لارہی تھی۔“ وہ بہ عجلت باؤل اور چیچ صاف کر کے ٹرے میں رکھتے ہوئے بولی۔ مہندی

سے رچے ہاتھ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔

”آئی! غصے میں تو نہیں۔؟“ وہ ذرا جھجکی۔

”تم نذیراں سے کہتیں۔ خود کیوں بنانے کھڑی ہو گئیں۔“ معیذ نے اس کے مہندی لگے ہاتھوں کو تھاما اور

انگ ہی بات کی تو وہ جھینپ کر مسکرا دی۔

”یونہی۔ میں نے سوچا شاید آئی کو اچھا لگے۔“

”بہت اچھا لگے گا۔“ معیز زور دے کر بولا تو ایسہا خفیف سا مسکرا دی۔ اور اپنے ہاتھ کھینچ لیے۔ اور باؤل میں سوپ نکالنے لگی۔

”ماما تمہیں بلار ہی تھیں۔“ ایسہا ٹھنکی۔ پھر ہاتھ روکا اور چہرہ موڑ کر معیز کو دیکھا اس نے لاعلمی کے اظہار کے طور پر شانے اچکا دیے۔

”وہاں سب ہوں گے ان کے پاس؟“ ایسہا نے جھجک کر پوچھا۔ (اکیلے میں بے عزتی برداشت ہو جاتی تھی مگر یوں سب کے سامنے عزت اتارنا۔) اسے جھرجھری سی آئی۔

معیز کے پیچھے سوپ کا پیالہ لیے وہ ڈری سہمی سی کمرے میں آئی۔ تو سفینہ بیگم کے ذہن میں اس کی گم شدگی والا دن لہرا گیا۔ جب انہوں نے کھانے کے برتن اٹھا کے اسے دے مارے تھے اور اسی رات زارا کے کہنے پر محض ان کے سکون کی خاطر وہ تنہا گھر سے نکل گئی تھی۔

شاید ایسہا کے ذہن میں بھی کچھ ایسا ہی خیال ہو چکا ہو چکا ہے۔ سہمی ہوئی لگ رہی تھی۔

”ادھر آؤ۔“ سفینہ بیگم نے اس کے لیے اپنے پاس جگہ بنائی تو وہ سائیڈ ٹیبل پر سوپ کا پیالہ رکھتی ان کے پاس آ بیٹھی۔

دل میں ایک وہم سا بدستور موجود تھا۔ سفینہ بیگم کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتی تھیں۔ مگر یہ کیا۔؟ ایسہا حیرت سے مرنے کو ہو گئی۔

Downloaded From
Paksociety.com

انہوں نے دفعتاً اس کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

”مجھے معاف کرو ایسہا۔“

وہ شذر تھی مگر ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے ان کے بندھے ہاتھ تھام کے کھول دیے۔

”مجھے گناہ گار مت کریں آئی۔!“ اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

”گناہ گار تو میں ہوں۔ اب تلافی کا طریقہ تم بتاؤ۔“ وہ رونے لگیں۔

کتنی کمینگی اور گھٹیا پن دکھا چکی تھیں وہ اس کا منی سی لڑکی کو۔ مگر اب غرور و تکبر کا بت پاش پاش ہو چکا تھا۔

ایسہا نے ان کے ہاتھ تھامے ہوئے بھیگی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں دیکھ کر سادگی سے کہا۔

”بس! مجھے اپنی بیٹی کہہ دیں۔ سادگی کی ہر کوتاہی اپنے آپ معاف ہو جایا کرتی ہے۔“

روتی آنکھوں سنگ اس نے اتنی پیاری بات کہی تھی کہ سفینہ نے کھینچ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اور رونے لگیں۔ باقی سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

صبر اور شکر۔ کبھی رائیگاں نہیں جاتے۔ ایسہا بھی ان ہی دو ہدایتوں کو تھامے آج منزل پر شاداں و فرحاں پہنچ گئی تھی۔ غم و اندوہ کے سائے کہیں دور رہ گئے تھے۔

اور ایسہا کو دیکھتے معیز کا دل اپنے رب کے حضور سجدہ شکر بجالایا۔ ایسہا اس کی زندگی میں قبول ہونے والی وہ

مبارک دعا تھی جو اس نے مانگی ہی نہ تھی۔ مگر جانے کس نیکی کے صلے میں معیز کی جھولی میں انعام کے طور پر ڈال دی تھی

سفینہ بیگم کے گلے لگی ایسہا نے بھیگی مسکراہٹ کے ساتھ معیز کو دیکھا تو وہ بھی خوش دلی سے مسکرایا۔ کہ

اب ان کی زندگی پر غم اور غلط فہمیوں کا سایہ تک نہ تھا۔



لور فاطمہ



ہو اور تنخواہ بھی کٹاؤ۔ لیکن آہستہ آہستہ انتظامیہ کا سخت رویہ دیکھ کر سب جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ اور سب نے نئے زمانے کی نئی حاضری کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ ہاں اس کی وجہ سے عالیہ اور اس جیسے چند اور لوگوں کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا۔ اور اس کا حل ان ہی میں سے کسی نے یوں نکالا کہ اپنے کسی دوست کو اپنا کوڈ بتا دیتے جس دن ”دیر“ ہونے کا خطرہ ہوتا اور وہ مہربان دوست نوکری خطرے میں ڈال کر اسے پہنچا کر دیتا اور یہ

”لیٹ کمر“ پانچ منٹ یا سات منٹ میں حاضر ہو جاتا کیونکہ نظام نیا بنایا تھا تو اس کی گنجائش تھی۔ احتیاط برتی جاتی کہ ”لیٹ کمر“ مزید ”لیٹ“ نہ ہو ورنہ۔

”شکر ہے“ عالیہ نے بیگ کرسی پر رکھتے ہوئے رکا ہوا سانس خارج کیا اور ساتھ ہی ساتھ نے بھی۔ کیونکہ ٹھیک سوا آٹھ بجے منجر صاحب راؤنڈ لیتے اور اگر عالیہ موجود نہ ہوتی تو اس کے ساتھ ساتھ ساتھ کی بھی۔ سوچتے ہی ساتھ کو جھرجھری آگئی۔

”بھئی عالیہ! دس از دالاسٹ ٹائم آئی، ہو پھلٹ یو۔“ (یہ آخری دفعہ ہے کہ میں تمہاری مدد کر رہی ہوں)۔ قدرے ناراض ساتھ نے عالیہ سے آہستہ آواز میں کہا۔

”یار، سو سوری، آئندہ نہیں ہو گا۔“ عالیہ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

جانتی تھی کتنا مشکل ہے کسی کی آج کل ایسی مدد کرنا یہ تو شکر ہے کہ حاضری کوڈ کے ذریعے تھی بائو میٹرک نہیں۔ ورنہ انگلی، انگوٹھا تو عالیہ دینے سے رہتی۔

”صفر چار، آٹھ، صفر تین۔“

”اوکے اب پہنچ جانا واقعی پانچ منٹ میں۔“

”ہاں ہاں بس میں آئی۔“ عالیہ نے اپنی طرف سے ساتھ کو یوری یقین دہانی کروائی مگر یہ الگ بات تھی اسے خود بھی یقین نہیں تھا۔ ساتھ کو ابھی ابھی عالیہ نے عجلت بھرے انداز میں اپنا ایمپلائی کوڈ، فون پر لکھوایا تھا تاکہ وہ اس کوڈ کو پہنچ کر دے۔ آٹھ بجے سے پہلے پہلے۔

یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ عالیہ کو دفتر پہنچنے میں دیر ہو رہی ہو یا کہ ہو گئی ہو۔ شادی کے بعد تو یہ تقریباً معمول ہی بن گیا تھا۔ آٹھ کے بجائے سوا آٹھ یا کبھی کبھی تو ساڑھے آٹھ بھی۔ اور یہ بھی سچ تھا کہ دیر سے آنے والوں کی اس لسٹ میں عالیہ اکیلی نہیں تھی۔ کچھ اور بھی لوگ اس قسم کے مسائل کا شکار تھے سو دفتر انتظامیہ نے اس سے نپٹنے کے لیے حال ہی میں ”کمپیوٹرائزڈ اینڈنس“ متعارف کروائی تھی اور ہر ”ایمپلائی“ کو ایک کوڈ جاری کر دیا گیا تھا جسے دروازے میں داخل ہونے کے لیے اسے پہنچ کرنا ہوتا تھا اور اس سے اس کی حاضری ریکارڈ کر لی جاتی تھی۔

جو ایمپلائی آٹھ بجے سے ایک منٹ بھی اوپر ہوتا تھا اس کا نام خود بخود دیر سے آنے والوں میں شامل ہو جاتا اور اس دن اس بے چارے کا ”ہاف ڈے“ گنا جاتا۔ اور تین ہاف ڈیز کا مطلب تھا ایک پورے دن کی لیو یعنی غیر حاضری۔

شروع شروع میں تو تمام لوگوں نے بہت شور کیا کہ یہ کیا بات ہوئی دفتر بھی آؤ کام بھی کرو اور چھٹی ظاہر

جان بوجھ کر دیر کرتی تھی۔ بلکہ عالیہ بے چاری تو صبح سب سے پہلے اٹھتی۔ جو کام اس کے ذمے ہوتے سب کرتی۔ ساس کی ”بیڈنی“۔ پھر ان کا ناشتا۔ عادل کے کپڑے تو وہ رات کو ہی استری کر دیتی اور اپنے بھی۔ پھر عادل کا ناشتا بنا کر اسے ڈھک کے رکھنے کے بعد خود تیار ہوتی۔ اگر ٹائم بچتا تو اپنا بھی ناشتا بنا لیتی اور کبھی کبھار گھر میں کھانے کی عیاشی بھی کر لیتی ورنہ زیادہ تر تو ناشتا بنانے کا وقت ہی نہ ہوتا یا پھر سب جاتا تو پیک ہو کر دفتر

”چلو اب سوچوں میں غرق نہ ہو جانا۔ یہ فائل کی انٹری مکمل کرو۔ دس بجے میل کرنی ہے۔“ سائہ نے عالیہ کی پریشانی دیکھ کر ماحول کو نارمل کرنے کے لیے اسے چھیڑا۔ عالیہ مسکرا کر جلدی جلدی اپنے کام پر جھک گئی۔



ایسا نہ تھا کہ عالیہ وقت پر اٹھتی نہ تھی یا کام میں



READING
Section

کی بریک میں ہی کھایا جاتا۔ اور عالیہ کے ساتھ یہ مسئلہ صرف یہاں تک نہ تھا بلکہ دفتر سے گھر اور پھر گھر سے دفتر۔ سب ہی کچھ متاثر تھا۔ لگتا تھا کہ شاید ہی کوئی کام وقت پر ہوتا ہے۔

یہ بات عادل سے باریا بتا چکا تھا کہ اسے عالیہ پہلی نظر میں ہی اچھی لگ گئی تھی اور پھر اس کے بعد ہی اس نے امی کو مجبور کیا تھا کہ عالیہ کے گھر رشتہ لے کر جائیں۔ عالیہ کو اس نے کسی دوست کی شادی کی تقریب میں دیکھا تھا اور اسے یہ معصوم اور قدرے جھجھکی ہوئی لڑکی پہلی نظر میں ہی پسند آگئی تھی۔ عادل کی جاب اچھی تھی اور شکل و صورت بھی تو یوں عالیہ کے گھر والوں نے کچھ رسمی تکلف کے بعد یہ رشتہ قبول کر لیا تھا۔

ویسے عالیہ بھی ایک سلجھی ہوئی بیٹیوں کا ادب کرنے والی لڑکی تھی اور شادی کے چھ مہینے میں نہ تو اسے کسی شکایت کا سامنا تھا اور نہ ہی عادل اور اس کی امی کو۔ ہاں بس یہ تھا کہ کبھی کبھار عادل کو لگتا کہ عالیہ بہت سی چیزیں وقت پر نہیں کر پاتی کوشش کے باوجود۔ عادل خود ایک مصروف بندہ تھا۔ صبح نو بجے سے لے کر رات نو بجے تک اس کا کام تھا۔ کبھی کبھار اتوار والے دن بھی چھٹی نصیب نہ ہوتی تو اس کے پاس اتنا وقت کم ہی ہوتا کہ تفصیل سے عالیہ کی رو میں دیکھے۔ جاب کرنا عالیہ کا شوق کم اور مجبوری (خاص کر آج کل) زیادہ تھی۔ کیوں کہ عادل نے سوچ رکھا تھا کہ دونوں محنت کر کے دو سال تک اپنا کوئی پلاٹ وغیرہ لے لیں گے تاکہ بعد میں بچوں کے اخراجات کے ساتھ تھوڑی بہت بچت بھی ہو تاکہ مشکل نہ ہو۔ ساری عمر کرائے کے گھر پر گزارنے کے بعد اپنا گھر حاصل کرنا عادل کا ہمیشہ کا خواب تھا اور عالیہ اس سلسلے میں اس کا بھرپور ساتھ دینا چاہتی تھی۔



چھٹی کا دن تھا۔ عادل صبح دیر سے اٹھا تھا۔ عالیہ بھی امی کو بیڈنی دے کر تھوڑی دیر کے لیے سو گئی تھی۔ ویسے بھی آج کل اس کی طبیعت بوجھل تھی۔ دس

ابھی کل ہی کی بات تھی۔ عادل کا موڈ یکدم ہی چکن بریانی کھانے کا ہو گیا جبکہ عالیہ کے مینو میں چکن بریانی دو دن بعد شامل تھی۔ اور اس دن عالیہ کو ساہ و ال چاول، سلاد کے ساتھ بنانے تھے۔ شوہر کی فرمائش تھی، ٹالی نہیں جاسکتی تھی سو عالیہ نے وال کے ساتھ ساتھ چکن بھی پکنے کے لیے رکھ دی۔ لیکن فریز ہوا چکن اتنی جلدی تو پکنے سے رہا۔ عالیہ نے سوچا کہ پہلے عادل کو ریشین سلاد دے دیتی ہوں تاکہ بھوک میں کچھ کمی واقع ہو اور ویسے بھی کل ہی اس نے ٹی۔ وی پر دیکھا تھا کہ سلاد بھوک بڑھانے کا کام کرتا ہے تو عالیہ نے سوچا کہ عادل کی بھوک بریانی کھانے کے لیے خوب چمک جائے گی۔ جلدی جلدی عالیہ نے رشین سلاد کے لیے آلو ابالنے رکھے اور اس کے لیے تھوڑی دیر کے لیے وال کو چولہے سے ہٹا دیا۔

وال بھی پکنی ضروری تھی کہ امی (ساس) پر پیزی کھانا کھاتی تھیں، مرچ برداشت نہیں کر سکتی تھیں اور عادل چٹ پٹا کھانا کھائے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ سو وہ وال میں تو گرم مسالا چھڑک کر بگھار سے کچھ اور سجا کر عادل کو دے دیتی اور امی کو ساہ وال۔

اب عالیہ نے بھیکے ہوئے چاول دیکھے اور سوچا کہ بریانی کے لیے نئے چاول بھگولے کیونکہ جب تک چکن کلتی ان چاولوں کو بھیکے بہت دیر ہو جاتی اور جب تک بریانی کے چاول کا دانہ دانہ الگ نہ دکھتا عادل کی پسند کے معیار پر پورا نہ اترتا۔ عالیہ لاکھ کہتی۔ چکھ کر دیکھیں۔ لیکن عادل کی ایک ہی بات پہلے دیکھنے میں تو اچھے لگیں پھر اگلا مرحلہ۔ اس کے لیے عادل کے پاس سوہانے۔

”بھئی دیکھو! پہلے کوئی چیز آنکھوں کو بھلی لگتی ہے پھر اسے لینے کا سوچا جاتا ہے اور لے کر پر کھا جاتا ہے۔ اچھی لگے تو رکھا جاتا ہے ورنہ کئی چیزیں مجبوری میں

کچھ علیحدہ نکال کر علیحدہ سے دم بھی ڈے دے گی اور یہ چاول ”اف“ بھی بعد میں دیکھ لوں گی۔ ”عالیہ نے خود کو تسلی دی۔

بریانی کے چاول کاپانی رکھا تو یاد آیا، رشمن سلاڈ پورا نہیں بنا اور وہ اس لیے بنانا ضروری تھا کہ عادل کو بریانی پکنے کے دوران دے دیا جائے تاکہ وقتی بھوک کا علاج ہو سکے اور بریانی کے لیے بھوک چمک جائے مگر اس سب چکر میں وہ یہ مکمل طور پر بھول گئی تھی۔ جب تک عالیہ نے رشمن سلاڈ بنا کر فریج میں رکھا تاکہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے اور امی کے لیے کھانا ٹرے میں سجایا تو ڈیڑھ بج چکا تھا اور اس کا مطلب تھا کہ امی ظہر کی نماز شروع کر چکی ہیں۔ پھر بھی عالیہ نے سوچا کہ دیکھ لیا جائے اور ٹرے امی کے کمرے میں لے گئی۔

امی واقعی نماز شروع کر چکی تھیں۔ عالیہ نے خاموشی سے ٹرے اٹھائی اور واپس کچن میں ڈھک کر رکھ دی۔ بریانی کے چاول میں چکن کی تہ لگا کر دم پر رکھی اور فریج سے رشمن سلاڈ نکالا۔ عادل کی عادت تھی چھٹی والے دن سارا دن کمرے میں گزار تا یہاں تک کہ کھانا پینا بھی۔ سو عالیہ نے بڑے گہرے پیالے میں سلاڈ ڈالا اور جیسے ہی کمرے کی طرف رخ کیا تو عادل کو چابی اٹھائے جانے کے لیے تیار تیار پایا۔

”یہ رشمن سلاڈ“ بمشکل عالیہ کے منہ سے الفاظ ادا ہوئے۔

”کھالینا خود ہی۔“ عادل کتنا غصے میں ہے یہ جاننے کے لیے عالیہ کو کسی خاص علم کی ضرورت نہیں تھی۔ ”وہ۔ بس ذرا دیر ہو گئی۔ آپ یہ کھائیں میں بس دس منٹ میں بریانی لارہی ہوں۔“ عالیہ نے سچی لہجے میں کہا۔

”سوری عالیہ! صبح سے انتظار کر کر کے میری بھوک مر گئی ہے اور شہزاد کافون آگیا ہے اور ہمارا باہر کھلنے کا پروگرام بن گیا ہے۔“

”مگر وہ بریانی عالیہ منمنائی۔“
”وہ بھی خود کھا لیتا۔“ عادل سنگ دلی سے بولا۔
”مگر اتنی زیادہ۔“ عالیہ کی آواز رندھ گئی مگر عادل

بجے اٹھ کر امی کو ناشتا دیا تھا اور دوپہر کے کھانے کی تیاری اپنے ناشتے کے ساتھ شروع کر دی تھی۔ امی کا اصول تھا دوپہر کو کھانا سادہ ہونا چاہیے چاہے چھٹی کا دن ہو لیکن آج عادل کا زبردست موڈ دیکھ کر امی نے بھی بریانی کی اجازت دے دی تھی۔ سو عالیہ دال چاول، بریانی، سلاڈ اور رشمن سلاڈ سب کچھ بنانے کے چکر میں گھن چکر بنی ہوئی تھی۔

عادل تو چھٹی والے دن ناشتا کرتا ہی نہ تھا سو عالیہ کو کھانا پکانے کی جلدی ہوتی لیکن ساتھ میں وہ اپنا ناشتا بنا لیتی اور کھانا پکانے کے دوران ہی کھا بھی لیتی لیکن آج تو ناشتا کرنے کا وقت ہی نہ ملا تھا اور بے چارہ ناشتا پڑے پڑے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

ایک بجنے کے قریب تھا اور کوئی چیز تیار نہ تھی۔ عالیہ نے چکن بھونتے بھونتے وال کا بگھار بھی اتارا اور جلدی جلدی ابلے ہوئے آلو کٹے ہوئے سیبوں کے ٹکڑوں میں ڈالنے لگی۔ ابھی مایونیز میں کالی مرچ ڈال کر پھینٹنے ہی لگی تھی کہ یاد آیا کہ بریانی کے لیے چاول تو بھگونا بھول ہی گئی اور اوپر سے ستم ظریفی کہ دال کے ساتھ کھانے کے لیے بھگوائے ہوئے چاول چولے پر جگہ نہ ملنے کی وجہ سے ابھی تک نہ ابالے گئے تھے۔

جلدی جلدی رشمن سلاڈ چھوڑ کر بریانی کے چاول بھگوائے۔ دال کو چولے سے اتارا اور چاولوں کاپانی چڑھایا۔ چکن کو ایک فاسٹل بھونی لگا کر انار کر سلیب (Slab) پر رکھا۔ اتنی سی دیر میں ایک بیج گیا اور سوا ایک بجے ہر صورت امی کھانا کھاتی تھیں۔ عام دنوں میں تو عالیہ دفتر میں ہوتی مگر چھٹی والے دن کھانا عالیہ کی ہی ذمہ داری تھی۔

اب عالیہ نے جلدی میں جو دو گھنٹے سے بھگے ہوئے چاول ابالے تو چاول نرم ہو گئے بلکہ کچھ زیادہ ہی نرم ہو گئے۔ خیر امی عادل کی طرح کھانے سے انکار تو نہیں کرتی تھیں لیکن عالیہ کے لیے شرمندگی کی بات تھی کہ پورے ایک سفتے کے بعد بھی وہ گھیر والوں کو اچھا کھانا بھی نہ کھلا سکی۔ اسی خیال کے تحت عالیہ نے سوچا کہ وہ بریانی کے لیے جو چاول ابالے گی اس سے ہی

کا کچھ سوچنا ہوگا۔ بیٹی! اگر دن میں چوبیس کے بجائے اڑتالیس بلکہ بہتر گھنٹے بھی ہوں تا تب بھی ایک چیز بہت ضروری ہے جسے کہتے ہیں ”ٹائم مینجمنٹ“ یعنی ہر کام وقت پر کرنے کی کوشش کرنا۔

میں یہ نہیں کہہ رہی کہ تم کوشش نہیں کرتیں بلکہ تم بہت زیادہ کوشش کرتی ہو بس اس میں ایک چیز شامل کر لو کہ ہر کام کرنے کا اندازہ مقرر کرنے کی کوشش کرو۔ اور اپنے آپ کو ٹارگٹ دو کہ وہ کام اس مقررہ کردہ وقت میں مکمل ہو۔ شروع میں تمہیں مشکل ہوگی، لیکن آہستہ آہستہ تم دیکھو گی کہ یہ اتنا ناممکن یا مشکل نہیں اور ہاں! ایک بات اور اتنا ہی کام کا پھیلاؤ اور کھوجنا سمیٹ سکو۔ ”امی نے عالیہ کے بال بچوں کی طرح سہلاتے ہوئے کہا۔

”چلو اب پہلے پلیٹ میں میرے اور اپنے لیے بریانی لاؤ۔ صبح سے تم نے کچھ کھایا نہیں۔“ امی کی اس بات پر عالیہ نے چونک کر دیکھا۔ جانتی تھی امی پر ہیزی کھانا لگتی ہیں۔

”بھئی کبھی کبھی بد پر ہیزی جائز ہے۔“ امی نے مسکرا کر کہا۔ ”اور ہاں رشین سلاڈ بھی لانا۔“

عالیہ نے روتی آنکھوں سے مسکرا کر ”اچھا جی“ کہا اور کھانا لینے کے لیے اٹھنے لگی کہ اچانک پھر بیٹھ گئی۔ امی نے سوالیہ نظروں سے دیکھا اور پھر سمجھ گئی۔ ”فکر نہ کرو۔ عادل آیا تو اس کو سمجھا دوں گی۔ تمہاری حالت بھی ایسی ہے اور تمہیں پتا ہے کہ وہ زیادہ دیر ناراض نہیں رہنے والا۔“

عالیہ نے شکر گزاری اور محبت کے طے چلے تاثرات سے اپنی ساس کو دیکھا اور دل میں دو باتوں کا عہد کرتے ہوئے کھانا لینے چل پڑی۔ ایک تو امی کی نصیحت کے مطابق ”ٹائم مینجمنٹ“ کا خیال رکھنے اور دوسرا۔ دوسرا اپنی ماں جیسی نیک صفت ساس کی اور بھی دل سے قدر کرنے اور خیال کرنے کا۔

Downloaded From
Paksociety.com

تب تک جاچکا تھا۔
جلدی سے گلے میں آنسو دھکیل کر عالیہ امی کے کمرے میں گئی۔ امی نماز ختم کر چکی تھیں اور اب تسبیح پڑھ رہی تھیں۔

”وہ امی۔۔۔ سوری وہ کھانا۔“ بے ربطی سے عالیہ جملے ادا کرتی انگلیاں مروڑتی گویا ہوئی۔

”بیٹا۔۔۔ رات میں کھالوں گی اب دیر ہو گئی ہے اور میں نے پھل وغیرہ کھالے تھے۔“ امی نے پھلوں کی ٹوکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نرمی سے کہا تو عالیہ روہا سی ہو گئی۔

”سوری امی! آئندہ خیال رکھوں گی۔ بس وہ عادل نے بریانی۔ اور پھر میں نے سوچا کہ رشین سلاڈ تو وہ سب۔“ بس اس سے آگے عالیہ سے بولا ہی نہ گیا۔

اپنی حالت رات کے فاقے اور سب چیزوں کے الٹ پلٹ کھانے کالیٹ ہونا عادل کی ناراضی اور کھانا نہ کھانا۔ سب کچھ گڈمڈ ہو گیا۔ اوپر سے امی کی نرمی بھری آواز عالیہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”سوری امی۔۔۔ وہ۔۔۔ سوری۔“ بس اس سے آگے کچھ کہا ہی نہ جا رہا تھا۔

”اوہو۔ ادھر آؤ میری بچی! میں کوئی ناراض نہیں۔ تمہیں پتا ہے ناکہ میں ذرا وقت پر کھانا کھاتی ہوں۔ مریض بندہ ہوں بس اس لیے۔ تم پریشان نہ ہو۔ میں نے کہا ناکہ رات کو کھالوں گی۔“ امی نے پچکارتے ہوئے عالیہ کو پیار کیا، لیکن عالیہ کے رونے میں اور شدت آگئی تھی۔

”امی! سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں۔ ہر کام لیٹ ہو جاتا ہے۔ سب کو خوش کرنا چاہتی ہوں، لیکن سب کچھ خراب ہو جاتا ہے۔ کوئی کام وقت پر نہیں ہوتا۔ مجھے لگتا ہے دن میں چوبیس نہیں اڑتالیس گھنٹے ہونے چاہئیں۔“ عالیہ کی آخری بات پر امی کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

”نہ میری بچی۔۔۔ پہلے تو تم یہ جان لو کہ تم مجھے اپنی بیٹی کی طرح پیاری ہو اور ہم سب تم سے بہت خوش ہیں۔ ہاں بس جہاں تک کام میں دیر کا سوال ہے تو اس

ناولٹ

”یار! ہم بھی ساتھ کھیلتے ہیں، بلکہ پارٹنر بن جاتے ہیں۔“ وہ اسے اچھالتے ہوئے بولا۔

”اوہ میری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ بریرہ تیزی سے کرسیوں کی طرف بڑھی تو اس نے بڑی مشکل سے مسکراہٹ ضبط کی، پھر دونوں کے ساتھ کھیلنے لگا۔ وہ آکر تھرماس سے چائے نکالنے لگی۔

”مغرب ہونے والی ہے۔ درختوں کے نیچے سر ڈھانپ کر رکھا کرو۔“ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ نشاط ممانی کے چہرے پر تناؤ تھا اس نے جلدی سے اپنا دوپٹا سر پر ڈالا۔ حرم بھی کچھ چپ سی ہو گئی۔ عمارہ نے

”تین اور یہ چار۔“ اس نے چیکو کے درخت کی شاخوں کو نگاہوں سے مزید ٹٹولا پھر حرم کو چار کا اشارہ کیا۔ وہ مسکرا دی۔

”آپو! گھونسلے حتم، اب بال کھیلیں۔“ زین جو اس کے ساتھ گھونسلے کھوج رہا تھا، اکتا کر بولا، اس نے جھک کر دونوں کو پیار کیا، پھر زیب سے گیند لے کر ان کے ساتھ دھیرے دھیرے کھیلنے لگی۔ نانو، ماما، فرح ماما جانے کون سی خاندانی باتوں میں مگن تھیں۔ نشاط ممانی بھی قریب ہی بیٹھی تھیں، مگر خاموشی سے چائے پی رہی تھیں۔ چھوٹے سے لان میں موتیا کی خوشبو

میلو صدیقی



Downloaded From
Paksociety.com

Downloaded From
Paksociety.com

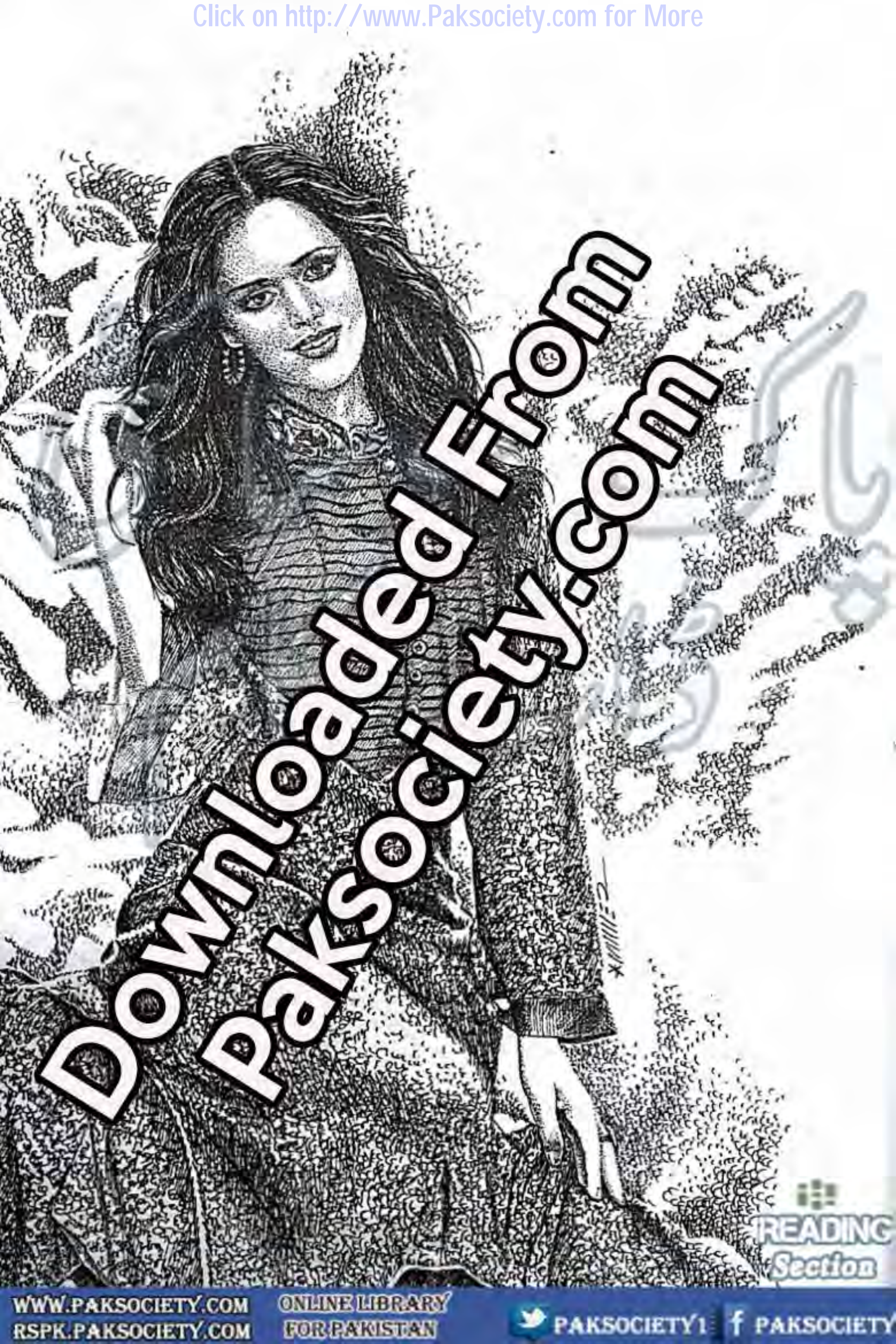
ایک نظر بھانج کو دیکھا، پھر نظر انداز کر دیا۔ فرح ماما اور نانو بدستور مگن تھیں۔ کچھ دیر بعد عمار بھی زیب کو گود میں اٹھائے آستینیں فولڈ کرتا وہیں آ گیا۔

”بھئی، مجھے تو کوئی چائے پوچھ ہی نہیں رہا۔“ اس نے شور مچایا۔

”تم آکر بیٹھے تو دیتی تا۔“ نشاط ممانی کی آنکھوں میں بیٹے کی محبت چھلکنے لگی۔ نیلی جینز اور سیاہ شرٹ، ہلکی سی بڑھی شیو کے ساتھ اس کے دراز قد پر بیچ رہی تھی۔ جب سے جنید نے لندن میں شادی کی تھی۔ ان کے دل میں عجیب سے خوف اگنے لگے تھے۔ ایک بیٹے نے تو اپنی صورت کو ترسا دیا تھا۔ اب عمار ہی ان کے دل کی ٹھنڈک تھا۔ انہوں نے چائے دی تو وہ آہستہ

چھیلی ہوئی تھی۔

لان کے کونے پر دو بڑے چیکو اور نیم کے درخت تھے۔ ان کے نیچے نیچے اور بریرہ مگن تھے۔ اس سے تھوڑی ہی دور سب سفید میز، کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ درختوں کے ساتھ روش کے بعد رہائشی حصہ تھا۔ نشاط ممانی تو ان درختوں کو کٹوانا چاہ رہی تھیں، مگر نانو نے منع کر دیا تھا۔ اس پر وہ کافی دن خفا بھی رہیں، مگر اس بات پر نانو بھی ڈٹ گئی تھیں۔ یہ ان کے مرحوم شوہر نے اپنے ہاتھ سے لگائے تھے اور لان کی رونق بھی ان ہی کے دم سے تھی۔ اسی وقت عمار گھر کے اندرونی حصے سے باہر آیا۔ آتے ہی اس نے زین کو گود میں اٹھایا۔



Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section



اور بابر ماموں کا بزنس اسٹیمبلش تھا۔ روپے پے کا کوئی مسئلہ نہ تھا، مگر عمارہ نے آنے کی شرط ہی یہ رکھی کہ ان کے اخراجات عالم صاحب کے ملنے والے واجبات اور پنشن سے ہی پورے ہوں گے جو کہ خاصے معقول تھے۔ احتشام ماموں نے یہ بات مان لی تھی۔ مگر ہر مہینے حریم اور بریرہ کو اتنی پاکٹ منی دے دیتے کہ ان کی فیسیں بھی با آسانی جمع ہو جاتیں۔ ان کو شاپنگ کرواتے۔ عمارہ کچھ بولتیں تو کہتے 'میں نے تمہاری بات مان لی۔ اب میرے معاملے میں تم بھی نہ بولو۔' پھر وہ کیا کہتیں۔ نشاط ممائی یہ سب دیکھ کر اندر ہی اندر کھول کر رہ جاتیں۔ عمارہ سے عمر بھر ان کی نہ بنی تھی۔ اب تو برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ ان کے برعکس ہنس مکھ سی فرح مائی ان لوگوں کے آنے سے بہت خوش ہوئی تھیں۔ ان کا پورشن نیچے تھا۔

احتشام ماموں کی فیملی اوپر پورشن میں تھی۔ صرف شام کی چائے ساتھ پی جاتی تھی۔ نانو کو اتوار کو احتشام ماموں زبردستی اور لے جاتے تھے۔ بابر ماموں احتجاج کرتے، مگر وہ کسی کی نہ سنتے۔ احتشام ماموں سب سے بڑے تھے۔ ان کا بڑا بیٹا تو ایم کام کے بعد لندن گیا اور وہیں کا ہو گیا۔ عمار نے آئی ٹی کی فیلڈ چنی اور ایم سی ایس کے بعد ایک فرم میں جاب کر لی۔ احتشام ماموں کو اپنے بیٹوں سے شکوہ تھا کہ ان کا بزنس کون سنبھالے گا۔ عمار ہنس کر تسلی دیتا کہ بابا جب جاب سے دل بھر جائے گا۔ جو اسن کر لوں گا۔

"تو اپنا لپ ٹاپ چھوڑ ہی نہیں سکتا۔" احتشام

ماموں ماننے سے انکار کر دیتے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ بچپن سے ہی کمپیوٹر کا دیوانہ ہے۔ اس لیے فیلڈ بھی یہ ہی چنی۔ وہ ہنس دیتا۔

ان سے چھوٹی فارحہ پھر عمارہ تھیں۔ ان کے بعد بابر ماموں تھے جو کہ جنید سے آٹھ سال ہی بڑے تھے۔ ان کے دو جڑواں بیٹے پانچ سالہ زیب اور زین گھر بھر کی رونق تھے۔ نانو بیٹی کے آجانے سے بہت خوش ہوئی تھیں۔

آہستہ پختہ لگا۔ بریرہ اور حریم باتوں میں مگن تھیں۔ اسی وقت گیٹ پر ہارن کی آواز آئی۔ پھر گیٹ کھلا اور عشبہ دانیال کے ساتھ گاڑی سے اتری۔

"ارے عشبہ آئی ہے۔" نشاط ممائی کا چہرہ کھل اٹھا۔ انس بھاگتا ہوا آیا اور عمار سے لیٹ گیا۔

"ماموں کی جان۔" اس نے بھی بھینچ کے پار کیا۔ تین سالہ گول مٹول انس میں پورے ننھیال کی ہی جان تھی۔ باقی سب بھی کھڑے ہو گئے۔ ایک خوش گوار ہنگامہ برپا ہو گیا تھا، مگر اس کا دھیان اس کا سنی آپٹل پر ہی سرسرا تا رہا۔



عالم صاحب کے انتقال کے بعد ان کی چھوٹی سی فیملی بکھری گئی تھی۔ عمارہ کے لیے تو اپنے محبوب شوہر سے دائمی جدائی کا تصور ہی سوہان روح تھا، مگر بریرہ اور حریم کے لیے انہوں نے خود کو بہت جلد سنبھال لیا۔ اپنی بیٹیوں کو انہوں نے بہت چاؤ سے پالا تھا۔ انہیں باہر کے مسئلے مسائل کا کچھ پتا ہی نہ تھا۔

"تم لوگ میرے ساتھ جاؤ گے۔" چالیسویں کے بعد احتشام ماموں کی بات سن کر بریرہ متوحش ہو گئی۔ اپنے گھر سے جانا کوئی آسان کام ہے بھلا۔ اپنا گھر تو اپنا گھر ہی ہوتا ہے۔

"نہیں بھائی! اس گھر میں عالم ہیں، میں نہیں جاسکتی۔" عمارہ کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔

"عمارہ! بات کو سمجھو، تمہارا گھر ہم سے ڈیڑھ گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ دو جوان بچیوں کا ساتھ ہے۔ تم باہر کے مسئلے مسائل ہینڈل نہیں کر سکو گی۔ نیچے کے پورشن میں تین چار کمرے فالتو پڑے ہیں۔ آرام سے ہمارے ساتھ رہنا۔ اماں بی بھی تمہیں یاد کرتی رہتی ہیں۔" احتشام ماموں نے سبھاؤ سے سمجھایا، پھر سب کے بے حد اصرار پر عمارہ راضی ہوئیں، مگر گھر کو جوں کا توں رہنے دینا صرف ضروری سامان ساتھ لیا۔ ویسے بھی ان کے کمرے فرنیچر کے ساتھ سیٹ تھے۔ احتشام

منظور نہ تھا۔ اس کے امی ابو کی پسند کی شادی تھی۔ جبکہ دادی اپنی بھانجی کو بہو بنانا چاہتی تھیں۔ ان کی خواہش پوری نہ ہوئی تو انہوں نے زندگی بھر بہو کو سکون کا سانس نہ لینے دیا۔ بریرہ جب دس سال کی تھی۔ تب ان کا انتقال ہوا، مگر وہ سب اس کے معصوم ذہن پر جم سا گیا تھا۔ پوتیاں بھی ان کے زیرِ عتاب رہتی تھیں۔ پوتانہ ہونے کا انہیں شکوہ ہی رہا۔ بریرہ نے یہ بات گرہ میں باندھ لی تھی کہ اب یہ غلطی نہیں ہونی چاہیے۔ حریم نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے اداسی چھلک رہی تھی۔ غلامی آنکھوں پر بے حد مڑی گھنی پلکیں، موسیٰ رنگت بے حد نازک سراپا اور گھنے بالوں کا حصار۔ وہ سب بھول کر مسکرا دی۔

”تم امی بابا کا بے حد حسین کنٹراسٹ ہو۔“ اس غیر متوقع بات پر بریرہ نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ پھر کتاب اٹھا کر اسے دے ماری۔

”میں کیا کہہ رہی ہوں اور تم کیا جواب دے رہی ہو۔“ وہ خفگی سے بولی۔

”یہ بھی تو دیکھو نا ڈیرا! یہاں آنے سے بعض لوگ بہت خوش بھی ہوئے ہیں۔“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرا دی۔

جس طرح تم کو پیاری لگتی ہوں اسی طرح ہر ایک کو لگتی ہوں گی اور کوئی میری خوب صورتی دیکھ کر بڑھے تو کیا فائدہ۔“ وہ بھی اس کی معنی خیز باتوں سے تنگ آگئی تھی۔ اس لیے جو منہ میں آیا کہہ دیا۔

”اور یہ مت بھولو کہ بچپن میں جب تم سوکھی سڑی سی تھیں اور تمہاری ناک بہتی رہتی تھی اور بو اے کٹ بال تھے۔ تب بھی کوئی تمہارا ہی سایہ بنا رہتا تھا۔“ حریم بھی اس کی بہن تھی۔ حساب بے باق کر ڈالا۔

”تم کچھ بھی کہو مجھے منظور نہیں۔“ وہ متاثر ہوئے بغیر یا ہر نکل گئی اور حریم ٹھنڈی سانس۔ بھر کر رہ گئی۔



عمارہ بھی کافی سنبھل گئی تھیں۔ وہ کسی بھی غلط بات پر چپ نہیں رہ سکتی تھیں۔ اس لیے نشاط ممانی سے شروع سے ہی تکرار ہوتی رہتی تھی، مگر اب انہوں نے خود کو الگ تھلگ کر لیا تھا۔ انہیں محسوس تو ہوا تھا کہ نشاط ممانی کو ان کا آنا ناگوار گزارا ہے، مگر باقی سب کو دیکھ کر انہوں نے یہ بات نظر انداز کر دی اور عمار تو ان کا بہت لاڈلا رہا تھا۔ اس کا نام بھی انہوں نے اپنے نام پر رکھا تھا۔ جس پر نشاط ممانی کو بہت دن تک غصہ رہا، مگر احتشام ماموں کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔



بریرہ اپنے کپڑے تہ کر رہی تھی۔ حریم حسب معمول تاریخ کی کسی کتاب میں سروے بیٹھی تھی۔ ”یہاں دل تو لگ گیا ہے، مگر اپنا گھر بہت یاد آتا ہے۔“ وہ نارضا۔ ”وہ کچھ اداسی سے بولی۔ حریم نے اسے دیکھا۔ پھر عینک اتار کر سائیڈ پر رکھی۔ کتاب بھی ایک طرف رکھ دی۔ ان دونوں نے ایک ہی کمرہ لیا تھا۔ عمارہ کہاں بی بی کے ساتھ شفٹ ہو گئی تھیں۔

”ہاں یا۔ یاد تو مجھے بھی بہت آتا ہے۔“ وہ بھی اداس ہو گئی۔ ان کو یہاں آئے دو ماہ ہونے کو آئے تھے، مگر نشاط ممانی کی وجہ سے غیریت سی لگتی تھی۔ بریرہ بی بی کام کے فائنل ایر میں تھی۔ جبکہ حریم سیکنڈ ایر میں تھی۔ مگر اسے تاریخ جنون کی حد تک پسند تھی۔ تاریخ کا مضمون تو رکھا، لیکن لائبریری سے کتابیں لے کر بھی چاٹتی رہتی اور اسی میں ہی ماسٹرز کا ارادہ تھا۔ دونوں بہترین اسٹوڈنٹس تھیں، مگر یہاں آکر ڈسٹرب

سی ہو گئی تھیں۔ شاید کچھ وقت اور چاہیے تھا۔ بریرہ کی الجھن کی وجہ تو کچھ اور بھی تھی۔ وہ پہلے بھی عمار کی وجہ سے کتراتے تھی۔ مگر اب تو کوئی راہ فرار ہی نہ تھی۔ اب تو اس کی آنکھوں میں ہیرے سی چمک ٹھہر گئی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ یہ چھلکتے جذبے سب پر عیاں ہو جائیں گے اور نشاط ممانی تو شاید بیٹے کا چہرہ پڑھ بھی چکی تھیں۔ ان کا گریز وہ جانتی تھی اور اسے یہ سب

آجائیں۔“ عمار بڑی بے چارگی سے بولا تو وہ ہنس پڑیں۔

”بے فکر رہو، تمہیں نہیں کھلاؤں گی۔“ انہوں نے پیار سے بیٹے کو گھورا۔ اسی وقت فارحہ خالہ خرم کے ساتھ اندر داخل ہوئیں۔

”لو باتوں میں کسی نے گاڑی کی آواز ہی نہیں سنی۔“ نانو بلند آواز میں بولیں۔ سب اولادوں کی موجودگی نے ان کو پر جوش کر دیا تھا۔ فارحہ خالہ سب سے ملنے لگیں۔ بریرہ بھی سب کے درمیان آکر بیٹھ گئی تھی اور اب زیب کو سین رہی تھی جو اپنے اسکول کا حال سنانے کو بے تاب تھی۔ زین، بابر ماموں کی گود میں تھا۔

”زیب جانو! ہمیں بتا دو کیا بتا رہی ہو۔“ خرم ادھر ہی آکر بیٹھ گیا۔ لہبا، دبلا سا خرم گوری رنگت پر حسب معمول نئے ہیرا سٹائل کے ساتھ تھا۔ بریرہ نے جب پچھلی دفعہ اسے دیکھا تب وہ مونچھوں میں تھا، مگر اب کے کلیم شیو تھا۔ وہ مسکرا دی۔

”آج کل کیا کر رہے ہیں خرم بھائی اور پھر ایک نیا چیئنج؟“ وہ زیب کو فریج فرائز کھلاتے ہوئے بولی۔ جو فرح مائی اسے پکڑا کر گئی تھیں۔ خرم ان کے ساتھ ہی کچن میں تھی۔

”بس مجھے چیئنج پسند ہے۔“ وہ کندھے اچکا کر مسکرایا۔ ”اور ایم بی اے کر رہا ہوں۔“ پھر اس نے قدرے غور سے اسے دیکھا۔ ساوہ سے گلابی سوٹ میں بھی وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ سر ہلا کر رہ گئی۔ پھر یوں ہی اس کی نظر بابر ماموں سے عمار کی طرف اٹھ گئی۔ وہ بیک ٹک اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ سلگتی نظریں وہ گھبرا کر اٹھی اور کچن کی طرف قدم بڑھا دیے، پیش

اس کے ساتھ تھی۔



”چاکلیٹ ایک اگلے ہفتے سے ہلے نہیں بنے گا۔“ نشاط ممانی نے بالوں میں برش پھیرتے ہوئے

عمارہ مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد لاؤنج میں نانو کے پاس آ بیٹھیں۔ ان کا وظیفہ ابھی جاری تھا۔ عمار قریب ہی بیٹھانیوز چیمینلز سرچ کر رہا تھا۔

”اوہو عمار بھائی، آج نیچے کیسے نظر آ رہے ہیں؟“ خرم اپنی تاریخ کی کتاب اٹھائے لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔

”کریلے گوشت کے خلاف دھرتا دے کر چکن بریانی پاس کروائی ہے۔“ وہ مسکرایا۔ نانو نے وظیفہ ختم کر کے ایک لمبی پھونک اس پر ماری۔

”نانو! ناٹ فیئر۔“ خرم احتجاجاً بولی۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے پاس بلایا، پھر ایک پھونک اس پر بھی ماری۔

”جی جی۔ آپ بھی لیں۔ اس عمر میں دادو کی کاربن ڈائی آکسائیڈ ختم کروادیں۔“ وہ والیوم بڑھاتے ہوئے بولا۔ خرم ہنس دی۔

”تیرے تو کان کھینچنے پڑیں گے۔“ نانو نے ہنستے ہوئے اس کا کان پکڑا عمارہ محفوظ ہوتے ہوئے ہنس رہی تھیں۔

”ارے یہ بریرہ ابھی تک نہیں آئی۔“ فرح مائی کچن سے کفگیر لیے برآمد ہوئیں۔ اسی وقت بریرہ، بابر ماموں کے ساتھ اندر آئی۔

”چچی! ہمیں پتا ہے اصل انتظار چچا جی کا ہوتا ہے، مس بریرہ کا تو بس بہانا ہے۔“ عمار انہیں دیکھ کر مسکرایا۔ بریرہ کا دل اسے بیٹھا دیکھ کر دھڑک اٹھا۔ پھر وہ اسی انداز میں سلام کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ بابر ماموں، عمار کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ اسی وقت نشاط ممانی کریلے گوشت کا ڈونگا لیے نیچے اتر آئیں۔

”بھئی میں نے سوچا رات کا کھانا ساتھ ہی کھالیں، ہم دو افراد ہی تو بانی رہ گئے۔“ بیٹا نظروں سے اوجھل ہو کر انہیں کہاں گوارا تھا۔

”مما جانی! کیا کریلے گوشت میرا پچھا کر رہے ہیں؟ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے میرے خواب میں بھی نہ

بھروا رہی تھی کہ عمار اس کے پاس آکھڑا ہوا۔ وہ اس سے چار سال بڑا تھا۔ بچپن سے ہی نام لینے کی عادت تھی، مگر اب وہ عادت بدلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لان میں ابھی شام پوری طرح اتری نہیں تھی۔ گھر کے مکین ابھی اندر ہی تھے۔ وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ عمار کو یہ موقع بہت مشکل سے ملا تھا۔

”بریرہ پلیز، میری بات سنجیدگی سے سنا اور سمجھنا۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”جی بولیں۔“ وہ اسے دیکھنے لگی۔

”بریرہ میں۔۔۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں شاید تمہیں اندازہ ہو، میں نے ماما سے بات کی تھی، مگر وہ راضی نہیں ہیں، مگر بریرہ! میں چاہتا ہوں کہ تم میرا ساتھ دو۔ میں انہیں منالوں گا۔“ اس نے ایک بار بات شروع کی تو پھر بلا جھجک بولتا چلا گیا۔ بریرہ ہکا بکا دیکھتی رہ گئی۔ وہ اب منتظر نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں میں اس نے خود پر قابو پایا، مگر جب بولی تو آواز مضبوط تھی۔

”میں ہرگز آپ کا ساتھ نہیں دے سکتی۔“ وہ چپ چاپ اس کو دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا، مگر یاد رکھنا، تم نہیں تو کوئی نہیں۔“ اس کے لہجے میں چٹانوں سی سختی تھی۔ بریرہ خالی ذہن کے ساتھ اسے جاتا دیکھتی رہی۔ دھوپ بے حد زرد ہو چکی تھی۔



عمارہ آہستہ سے ماں کے قریب آ بیٹھیں۔ وہ ٹاک شو دیکھ رہی تھیں۔

”پڑوس کے ہمدانی صاحب کی بیٹی کی شادی کا کارڈ آیا ہے، اتوار کو تیار رہنا۔“ انہوں نے آواز دھیمی کرتے ہوئے کہا۔

”اماں! آپ لوگ چلے جائے گا۔ اتنے لوگ جائیں، اچھا نہیں لگتا۔“ وہ مدھم لہجے میں بولیں۔

”یہ کیا کہہ دیا۔ لو بھلا تم ہم سے الگ ہو۔“ انہوں نے گھر کا، مگر وہ کسی اور سوچ میں ہی گم تھیں۔

آئینے میں اسے دیکھ کر کہا۔

”او ماما! کیا آپ نے مجھے ابھی تک بچہ سمجھ رکھا ہے۔“ عمار جو کافی دیر سے گوگو کی حالت میں بیٹھا تھا۔ جھنجلا گیا۔

”اچھا۔۔۔“ نشاط ممانی مڑتے ہوئے مسکرائیں۔

”میرا بچہ بڑا ہو گیا ہے۔“ وہ جبریز ہوا۔

”اب بول بھی چکو، پھر مجھے ٹیلر کی طرف جانا ہے۔“ وہ کچھ ابھیں۔

”وہ ماما! مجھے۔۔۔ وہ مجھے بریرہ سے۔۔۔ منگنی کرنی ہے۔“ اٹکتے ہوئے اس نے سانس روک کر جلدی سے بول دیا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہ گئیں۔

”عمار! یہ فیصلہ تمہارے کرنے کا نہیں ہے۔“ کچھ دیر بعد وہ سنجیدگی سے بولیں۔

”مما زندگی میری ہے۔“ اب کے وہ مضبوطی سے بولا۔

”جس دن سے وہ ماں بیٹی آئی ہیں، مجھے اسی بات کا ڈر تھا۔“ وہ پھٹ پڑیں۔

”مما پلیز! بریرہ کو تو معلوم بھی نہیں ہے۔ پلیز ماما! یہ ہی میری خوشی ہے۔“ اس کا لہجہ انہیں نرم نہ کر سکا۔

”عمار! اب تم مجھ سے یہ بات مت کرنا۔ ورنہ۔۔۔ ورنہ میرا مرانا دیکھو گے۔“ انہوں نے سفاکی سے بات مکمل کی۔ عمار ساکت رہ گیا۔

”ٹھیک ہے ماما۔“ اس نے اپنا شکست خورہ لہجہ سنا۔

”مگر پھر آپ مجھے شادی کے لیے فورس نہیں کریں گی۔“ وہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

”ہو نہ! سب وقتی اباں ہوتا ہے۔“ نشاط ممانی نے سر جھٹکا۔



”بریرہ!“ اس نے سراٹھا کر اسے دیکھا۔

”مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”جی عمار بھائی!“ وہ زیب کی کلرنگ بک میں کلر

تنگ نہیں کیا۔ ”حرم نے کہا بوں کی پلیٹ لا کر سب کے بیچ رکھی۔ بریرہ نے اسے گھورا۔ عمار لا تعلق سا باہر ماموں کے ساتھ سلام دعا کر رہا تھا۔ فرح مامی نے چائے لا کر رکھی۔ وہ باہر جانے لگا۔

”عمار چائے پی کر جاؤ۔“ فرح مامی نے اسے روکا۔ ”موڈ نہیں ہو رہا پیچی۔“ وہ آہستہ سے کہہ کر نکل گیا۔ لاؤنج کے شور میں بریرہ کی نظروں نے اس کا خاموشی سے پیچھا کیا۔



دن خاموشی سے گزر رہے تھے۔ وہ لاؤنج میں بیٹھی بوں ہی بے دلی سے چینل سرچ کر رہی تھی۔ وہی لوگ وہی باتیں وہی خبریں اکتا کرٹی وی بند کرتے کرتے اس کی نظر نیوز چینل کے کونے پر پڑی۔ ”اونو آج دو اگست ہے، یعنی کل حرم کی سالگرہ ہے۔“ وہ جلدی سے ٹی وی بند کر کے اپنے کمرے میں گئی۔ باہر ماموں کو کال ملائی۔ انہیں سب معاملہ بتایا۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔

”بیٹا! میری تو ایک ضروری میٹنگ ہے۔ یہ خرم سامنے بیٹھا ہے، اسے بھیجتا ہوں۔ تم اس کے ساتھ چلی جانا۔ اوکے ڈونٹ وری۔“

”لیکن ماموں۔“ وہ فون بند کر چکے تھے۔ اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس نے جا کر عمار کو بتایا۔ انہوں نے تو اجازت دے دی، مگر اسے الجھن ہو رہی تھی۔ جلد ہی خرم بھی آگیا۔ وہ پرس سنبھالتی کار میں آ بیٹھی۔ ”کس سلسلے کی شاپنگ ہے؟“ وہ گاڑی اشارٹ کرتا بولا۔

”حرم کی برتھ ڈے کا گفٹ لینا ہے۔“ وہ ذرا سا مسکرا کر بولی۔

”اوگڈ گڈ۔“ اس نے سر ہلایا۔ گاڑی کو گھماتے ہوئے وہ انگلش میوزک آن کر چکا تھا۔ جلد ہی وہ گفٹ سینٹر کے اندر کھڑے تھے۔

”مے آئی ایلمپ یو؟“ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ

”اماں! میں بھی دونوں بیٹیوں کے فرض سے جلد فارغ ہونا چاہتی ہوں۔“ انہوں نے ان کی طرف دیکھا۔

”یہ تو اچھی بات ہے، مگر فی الحال بریرہ کا سوچو اور اتنی جلدی بھی نہ کرو، ہم لوگ ابھی بیٹھے ہیں۔“ انہوں نے سھاؤ سے کہا۔

”اماں! آپ کی بات ٹھیک، مگر عالم کے بعد مجھے بہت خوف آیا ہے۔“ عمار بے چارگی سے بولیں۔ ”اللہ پر توکل رکھو عمار۔“ انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔

”اچھا۔ ہم بریرہ کے لیے سوچتے ہیں۔“ ساتھ تسلی بھی دی۔ اسی وقت بریرہ، باہر ماموں کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ زیب اور زین گاڑی کی آواز سن چکے تھے۔ اچھلتے کودتے آکر باپ سے لپٹ گئے۔ بریرہ مسکراتے ہوئے اندر بڑھ گئی۔ فرح مامی پانی کا گلاس لے کر آئیں۔ باہر ماموں بیٹھ کر آہستہ آہستہ پانی پینے لگے۔

”آپ کو پتا ہے، آج زیب نے کیا کیا؟“ زین نے دونوں ہاتھ پھیلا کر آنکھیں بھی پھیلائیں۔ باہر ماموں مسکرا دیے۔ یہ اس کا مخصوص شکایتی انداز تھا۔

”ہماری زیب کچھ گندا کر ہی نہیں سکتی۔“ بریرہ آتے ہی زیب کو گود میں سمیٹ کر بیٹھ گئی۔ ”آپو! آج اس نے اتے سارے چوٹے (چیونٹے) مارے۔“ اس نے گویا اس کا بھانڈا پھوڑا۔

”ارے زیب کیوں؟ اگر وہ آپ کو کاٹ لیتے تو۔۔۔؟“ وہ بے اختیار اس کی نازک انگلیاں دیکھنے لگی۔ ”آپو! پہلے زین نے بھی مارے تھے۔“ زیب نے اپنی پونی کتے ہوئے لب کشائی کی۔

”نلڑ کے زیادہ شریر ہوتے ہیں۔“ عمار بے اختیار ہنس پڑیں۔ عمار سیڑھیاں اترتا نیچے ہی آ رہا تھا۔

”یہ اپنا عمار بھی بچپن میں کتنا شرارتی تھا۔“ وہ اسے دیکھ کر مسکرائیں۔

”جی تین بار میرا چشمہ توڑ دیا تھا۔ البتہ بریرہ کو کبھی

ڈالے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”جی بتادیں؟“ وہ اخلاقاً بولی۔

”دس از آگڈ چوائس۔“ اس نے ایک کرشل ڈول کیل کی طرف اشارہ کیا۔ وہ پیس بے حد نفاست سے ترشا ہوا چمک رہا تھا۔ مگر ڈانس کرتے کیل کا پوز اس قدر بے باک تھا کہ اس کی نظریں جھک گئیں، مگر خرم یوں کھڑا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

”نو۔“ وہ رکھائی سے کہتی آگے بڑھ گئی۔ وہ کندھے اچکاتا اس کے پیچھے چل دیا۔ آگے لپ گلوں اور بلیش اون کا گفٹ پیک رکھا تھا۔

”حریم کو تو لپ گلوں کا کریز ہے۔“ اس نے پریشان ہوتے ہوئے وہ اٹھالیا۔ وہ اب جلد ہی گھر جانا چاہتی تھی۔ خرم نے گھر کے باہر گاڑی روکی۔

”او کے بریرہ! میں چلتا ہوں۔“ وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”تھینکس۔“ وہ کہتی ہوئی اتر گئی۔ اسی وقت عمار کی کار آ کر رکی۔ بریرہ نظریں چراتی اندر کی طرف بڑھ گئی۔

”رکو بریرہ!“ اس نے لان میں قدم رکھا ہی تھا کہ عمار کی آواز پر رکننا پڑا۔

”جی۔“ اس نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ بلیک کوٹ ہاتھ پر ڈالے۔ وہ کافی تھکا تھکا محسوس ہوتا تھا۔

”تم اب خرم کے ساتھ کہیں نہیں جاؤ گی۔“ وہ بولا تو غصہ دھیمی آواز میں نمایاں تھا۔

”یہ آپ مجھ سے کس طرح بات کر رہے ہیں۔“ بریرہ نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔

”مجھے پتا ہے اس کی کمپنی کیسی ہے۔ گھر والوں سے جتنا بھی چھپالے، مگر میں اسے جانتا ہوں۔ اس کے ایگز کی کوئی گنتی نہیں۔“ وہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔

”میرا اس سب سے کیا تعلق۔“ وہ چٹختی۔

”میری بات سنو۔“ اس نے یک دم اس کا بازو پکڑا

”اور دھیان سے سنو۔ تم اب اس کے ساتھ کبھی

کہیں نہیں جاؤ گی۔“ وہ غرایا۔

”چھوڑیں۔“ اس نے جھٹکا دیا۔ مگر بازو نہ چھڑا سکی۔ ”آپ مجھے آرڈر نہیں دے سکتے۔ آپ کو اس بات کا کوئی حق نہیں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ عمار یک دم چپ ہو گیا۔ وہ بازو چھڑاتی اندر چلی گئی۔ اس نے مٹھیاں بھینچیں، پھر کرسی کو ٹھوکر مارنا باہر نکل گیا۔



بہت دنوں بعد موتیا کی خوشبو اپنے جوبن پر تھی۔ ہوا کا ہاتھ پکڑے کبھی یہاں کھڑی ہوتی، کبھی وہاں۔ ٹھنڈی ہوا سے اس کا میل سب کو ہی بھلا لگ رہا تھا۔ سبزے کی تازگی رات میں بھی نمایاں تھی۔ آدھا چاند درختوں کی اوٹ میں تھا۔ وہ لوگ درختوں سے ہٹ کر کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ زیب اور زین بار بار لپک کر درخت تک جاتے اور چیکو گننے لگتے۔ فرح مامی انہیں آواز دیتیں، پھر کھینچ کر لاتیں۔ باہر ماموں کا ذوق سخن آج عروج پر تھا۔ انہوں نے محفل جما کر بیگم کو بھی شریک کر لیا۔ مگر بچوں کو ذوق سے کیا مطلب۔ بریرہ اور حریم ان کا بیت بازی میں برابر ساتھ دے رہی تھیں۔ حریم کو اشعار یاد نہیں ہوتے تھے، مگر بریرہ کالج میں بیت بازی کے مقابلے میں ضرور حصہ لیتی تھی۔ حریم کا ٹوٹا پھوٹا شعر سن کر فرح مامی نے قہقہہ لگایا۔

”کوئی بات نہیں، آپ تو یہ بھی نہیں سنا رہیں۔“ وہ چڑ کر بولی۔

”مگر میں چیٹنگ بھی نہیں کر رہی کہ خود شاعرہ بن جاؤں۔“ انہوں نے دوسرا قہقہہ لگایا تو بریرہ بھی بے ساختہ ہنسنے لگی۔ باہر ماموں بھی مسکرانے لگے۔ حریم نے ان سب کو دیکھا پھر خود ہی ہنس پڑی۔ آج کتنے دنوں بعد اس نے بریرہ کو یوں ہنستے دیکھا تھا۔ اطمینان کی ایک لہر اس کے اندر سراہیت کر گئی۔

”تو بھئی اب محفل جمے گی۔“ باہر ماموں کے کہنے پر اس نے سامنے دیکھا تو خرم آتا دکھائی دیا۔

”اف!“ بریرہ کے وجود پر کوفت چھانے لگی۔
”تھوڑا بریک لے لیا کرو پر خوردار! یہ نہ ہو کسی دن ہم کہیں کہ کون ہو تم؟ اندر کیسے آگے۔“ وہ اٹھ کر ٹانگی سے اس سے ملتے ہوئے بولے۔ اب کے اس نے بل بالکل چھوٹے کروالیے تھے اور فریج کٹ داڑھی رکھ لی تھی۔

”سوٹ ماموں! یہ ظلم نہ کیجئے گا۔ اس بھانجے کے لیے دل کی آنکھیں استعمال کیجئے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”عجیب ہی لگ رہے ہیں۔“ حرم نے بریرہ سے سرگوشی کی۔

”وائس اپ؟ اور کزنز کبھی ہمارے گھر بھی آجایا کرو۔“ وہ بولا دونوں سے تھا مگر نظریں بریرہ پر ہی بھٹک رہی تھیں۔

”میں کافی بھجواتی ہوں اور ان کو بھی سلا کر آتی ہوں۔“ قرح مایا انھیں اور زین اور زیب کو پکڑ کر اندر لے گئیں۔ بریرہ نے اپنا ڈھلکتا دوپٹا سر کے اوپر تک کھینچ لیا۔ یکدم اٹھ کر جانا سے مناسب نہ لگا۔
”بیت بازی کی محفل جمی ہے۔“ بابر ماموں کے بتانے پر وہ سرہلانے لگا۔

”چند شعر میں نے بھی پڑھ رکھے ہیں۔“ وہ بولا۔ اسی وقت عمار اندر سے آنا دکھائی دیا۔ بریرہ تھوڑی نروس ہو گئی۔ اس دن کے بعد سے اب ان کا یوں سامنا ہو رہا تھا۔

”چاچو! آپ بلارہے تھے۔“ حرم سے سلام دعا کے بعد وہ بولا۔

”ہاں بھئی! ہمیں جوائن کرو۔“ انہوں نے کہا تو وہ سنجیدہ سا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”میں شروع کرتا ہوں۔“ وہ بولے۔ ”اور جملہ حاضرین کی آسانی کے لیے بتا دوں کہ وہ جو چاہیں سادیں آزاد نظم، رباعی، غزل، شعر بس شاعری ہونی چاہیے۔“ وہ مسکرائے۔

”دیس گڈ۔“ حرم خوش ہو گئی۔ ”اب کچھ بھی گھڑ دوں گی۔“ اس نے بریرہ سے سرگوشی کی۔

”غالب کا شعر ہے۔“
کی وفا ہم نے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں
انہوں نے شعر سنایا۔ ”مجھے ن سے ایک شعر آتا ہے۔“ حرم نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

”یار! یہ آخری حرف سے شروع کرنے کی شرط بھی میں نے ہٹا دی تھی کیونکہ بریرہ کے علاوہ ماشاء اللہ مجھے آپ سب کے ذوق کی بلندی کا پتا ہے مگر تم سناؤ۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو حرم مسکراہٹ دبانے لگی۔

نہ کر کرنوں پر اتنا غور سورج
کسی کی زلفوں سے کہوں تو رات ہو جائے۔

حرم نے مسکراتے ہوئے شعر سنایا اور آخر میں بریرہ کو نظروں کی گرفت میں لے لیا۔ عمار کی پیشانی پر ناگواری کی سلوٹ ابھری بریرہ لا تعلق سی تھی۔

”بیٹا جی! آپ نے صرف ٹانگ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بے چارہ شعر پورا اپناج ہو چکا ہے میں تصحیح کرتا ہوں۔“
نہ کر شعاعوں پہ اتنا غور اے خورشید
کسی کی زلف سے کہہ دوں تو شام ہو جائے
بابر ماموں نے بہت آرام سے سمجھایا۔ حرم کی ہنسی کا فوراً چھوٹا۔ بریرہ بھی مسکرائی لگی۔ عمار نے سر جھٹکا۔

”جی جی ماموں! مطلب تو وہی ہے۔“ حرم جھپٹتے ہوئے بولا۔

ڈھانپ دیتے ہیں ہوس کو عشق کی پوشاک میں
لوگ سارے شہر میں بدنام ہو جانے کے بعد
حرم نے اسے تین شعر حرم کو سنایا۔ اسے وہ ذرا پسند نہ تھا مگر وہ مسکرا مسکرا کر سنتا رہا۔ اس کی جان ہی تو جل گئی۔ اس نے برا سامنہ بنا کر بریرہ کو دیکھا جس کی نظریں درختوں کے پار چاند پر بھٹک رہی تھیں۔ اب اس کی باری تھی۔

دور سنگن پر ہنسنے والے نزل کو مل چاند
بے کل من کہتا ہے آو ہاتھ لگائیں تمہیں
کچھ دیر بعد اس نے دھیمے سے شعر پڑھا۔

کون

ماہنامہ کون
نومبر 2015 کا شمارہ شائع ہو گیا

- ✽ اداکار ”زاہد افتخار احمد“ سے شاہین رشید کی ملاقات
- ✽ اداکارہ ”منشا پاشا“ کہتے ہیں ”میری بھی سنیے“
- ✽ ”آواز کی دنیا سے“ اس ماہ مہمان ہیں ”مظہر علی قریشی“
- ✽ اس ماہ ”شوقِ راجپوت“ کے ”مقابل ہے آئینہ“
- ✽ ”راہِ منزل“ حزیلہ ریاض کا سلسلے وار ناول
- ✽ ”روائے وقا“ فرحین انظر کا سلسلے وار ناول
- ✽ ”میں گمان نہیں یقین ہوں“ نیلا امجد کے مکمل ناول کی آخری قسط
- ✽ ”وامن دل“ عزیزین دلی کا مکمل ناول
- ✽ ”شاید“ قاترہ انخار کا دلکش ناول
- ✽ ”تم ہی میرا حوالہ“ مریم ماہ منیر کا ناول
- ✽ ”زندگی مسکرانے لگی“ ام ایمان کا ناول
- ✽ سردیہ عزیز آفریدی، سمیرا غزل، آسیہ عارف، عائشہ جمیل
- ✽ شازیہ ستار تاپاب اور عابدہ احمد کے افسانے اور مستقل سلسلے

اس شمارے کے ساتھ کون کتاب

”یوگا کے ذریعے صحت مند
اور اسمارت بنے“

”واہ کلاسک پوسٹری۔ یا برماموں نے بے ساختہ داد دی۔“

”فتنا شک بریرہ۔“ خرم تو جھوم اٹھا۔ وہ چپ بیٹھی رہی۔ یا برماموں، عمار کو دیکھنے لگے جو گھاس پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

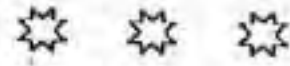
”ہاں بھئی عمار۔“ وہ بولے، عمار نے ذرا سر اٹھایا پھر دوبارہ زمین پر نظریں جمادیں۔

کب تک رہو گے آخر یوں دور دور ہم سے ملنا پڑے گا تم کو اک دن ضرور ہم سے اس کی بھاری گھمبیر آواز۔ حریم نے بے ساختہ بریرہ کو دیکھا۔ اس نے پہلو بدلا۔

وامن بچانے والے یہ بے رخی ہے کیسی؟ کہہ دو اگر ہوا ہے کوئی قصور ہم سے ہم چھین لیں گے تم سے یہ شان بے نیازی تم مانگتے پھرو گے اپنا غرور ہم سے بریرہ کا ضبط ختم ہو گیا۔ وہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی آواز کافسوں بکھرا ہوا تھا، مگر وہ اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

”وہ۔ کافی مائی کو دیکھتی ہوں میں۔“ جیسے بے ربط انداز میں کہتی وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔ وہ مبسم سا مسکرایا۔

”زبردست یار۔“ یا برماموں اسے سراہ رہے تھے۔ حریم ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔



نانو، زیب کو تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ فرح مائی، زین کو ہوم ورک کروا رہی تھیں۔ عمارہ بھی قریب بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ نشاط ممانی بھی اسی وقت آکر بیٹھی تھیں۔ چائے کا وقت ہونے والا تھا۔ ٹھنڈی شام اترنے ہی لگی تھی۔ اسی وقت فارحہ خالہ اندر داخل ہوئیں۔

”خرم چھوڑ کر گیا ہے۔“ وہ سب سے ملتے ہوئے بتانے لگیں۔ سب کے چہروں پر خوشی دوڑ گئی تھی۔ فرح مائی مسکراتے ہوئے چائے بنانے چلی گئیں جہاں

”زین بیٹا! یہ کچن میں ماما کو دے کر آؤ ان سے کہنا کہ پلیٹ میں نکال کے لائیں۔“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑے شاپر میں سے مٹھائی کا ڈبا نکال کر زین کو دیا۔ وہ بھاگ کر کچن میں چلا گیا۔ اسی وقت بریرہ کمرے سے نکلی۔

”لو میری بیٹی بھی آگئی۔“ فارحہ خالہ بولیں تو وہ مسکرا کے سلام کرنے آگے بڑھی مگر انہوں نے اسے گلے لگالیا۔ وہ کچھ حیران حیران سی الگ ہوئی۔ فرح ماما چائے لے آئی تھیں۔ حریم ہاتھ میں مٹھائی کی پلیٹ لیے سنجیدہ سی کھڑی تھی۔

”ارے ادھر لاؤ۔“ فارحہ خالہ نے ایک گلاب جامن لے کر بریرہ کو تھوڑی سی کھلائی۔ اس نے حریم کو دیکھا، وہ کچھ فکر مند سی لگی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سب مسکرا رہے تھے۔ فارحہ خالہ نے اپنی سب سے چھوٹی انگلی سے سونے کی انگلی اتاری پھر اس کا ہاتھ پکڑ کے اس کی بیچ کی انگلی میں ڈال دی اس نے حیران نظروں سے ماں کو دیکھا۔ وہ بھی مسکرا دیں۔

”مبارک ہو بھئی۔“ نشاط ممانی سب سے پہلے بولیں۔

”خیر مبارک۔“ فارحہ خالہ نے ایک بار پھر اسے گلے لگایا۔

”اب یہ میری امانت ہے۔“ انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی۔ بات اب اس کی سمجھ میں آرہی تھی۔ اس نے شاک زدہ حالت میں حریم کو دیکھا۔ اس نے نظریں جھکالیں۔ فارحہ خالہ اب عمارہ کو ساتھ لگا چکی تھیں جو اپنے شوہر کو یاد کر کے آبدیدہ ہو گئی تھیں۔ فرح ماما عمارہ کو مٹھائی کھلاتے ہوئے انہیں تسلی بھی دے رہی تھیں۔ نانو ان کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ زین اور زیب مبارک مبارک کہتے اچھل رہے تھے۔ نشاط ممانی مسکراتے ہوئے انہیں ہٹھا رہی تھیں، بریرہ خاموشی سے انھی اور اس منظر سے او جھل ہو گئی۔

حریم کٹلس بنا رہی تھی۔ فارحہ آرام سے بیٹھ گئیں پھر محبت سے بہن کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

”کیسی ہو عمارہ؟ کتنے دن ہو گئے ہم نے بہت ساری باتیں نہیں کیں؟“

”ٹھیک ہوں آیا! بس عالم کے بعد دل نہیں لگتا۔“ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔

”عمارہ! ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ اور آج تو تم سے ایک خاص بات کرنے آئی ہوں۔“ فارحہ خالہ کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ نشاط ممانی نے الجھن سے انہیں دیکھا۔

”جی بولے آیا۔“

عمارہ بھی انہیں دیکھنے لگیں۔

”میں اپنے خرم کا رشتہ بریرہ کے لیے مانگنے آئی ہوں۔ بچپن سے ہی میرا دل تھا بریرہ کے لیے۔“ انہوں نے مان بھرے لہجے میں کہا۔ کچن میں کام کرتی حریم کے ہاتھ سے چھری چھوٹ گئی۔ فرح ماما بھی باہر دیکھنے لگیں۔

”ایم پی اے کا رزلٹ آتے ہی اس کی جا ب بھی ہو جائے گی، کل اسلام آباد سے نور عین کا فون آیا تھا، کہنے لگی کہ امی دیر کیوں کر رہی ہیں ابھی بات کی کر دیں، اگلے سال گرمیوں کی چھٹیوں میں شادی رکھ لیجئے گا، میں آرام سے بچوں کے ساتھ آجاؤں گی، ان کے ابو کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ تو خوش ہیں کہ گھر کی دیکھی بھالی بچی ہے۔“ وہ خوش خوش بولے جا رہی تھیں۔

”مگر آپ! اتنی جلدی کیسے؟ کچھ سوچنے کا موقع تو دیں۔“ عمارہ بو کھلا گئیں۔

”ارے گھر کا بچہ ہے وہ بھی بہن کا بیٹا۔ اب کیا سوچنا ہے۔“ نشاط ممانی جلدی سے بولیں۔ ان کی تو دل کی بات پوری ہو رہی تھی۔

”تم بریرہ کے لیے پریشان ہو رہی تھیں، دیکھو جوڑے تو آسمانوں پر بٹتے ہیں۔“ نانو بھی اطمینان بھرے لہجے میں بولیں۔ عمارہ نے ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر مسکرا کے چپ ہو گئیں۔



”یہ سب کیا ہو گیا بربرہ؟“ حریم کمرے میں آتے ہی بے حد پریشانی سے بولی تھی۔
”تیا نہیں۔“ وہ عجیب کھوئی کھوئی حالت میں بیڈ پر بیٹھی انگوٹھی بار بار اتار کر پہن رہی تھی۔

”اب تم میرے سامنے تو مت بنو۔ مجھے سب پتا ہے۔ ویسے بھی خرم بھائی بالکل الگ خیالات کے ہیں۔ تم جیسی لڑکی کا خیال نہیں کرپائیں گے۔“ وہ فکر مندی سے اسے لتاڑنے لگی۔

”تو کیا کروں؟ میں کیا کروں حریم؟ میں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ مجھ میں بغاوت کی ہمت نہیں۔ ویسے بھی بغاوت کروں بھی تو کس بل بوتے پر۔“ وہ پھٹ پڑی پھر انگوٹھی پھینک کر رونے لگی۔ حریم افسوس سے اسے روتا دیکھنے لگی پھر آگے بڑھ کر اسے چپ کروانے لگی۔

”شاید یہی میری قسمت ہے حریم۔“ وہ ہارے ہوئے لہجے میں بولی۔ حریم دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں ہاتھ پھرتی رہی۔



احتشام ماموں کافی کے گھونٹ بھرتے ہوئے ٹاک شو دیکھ رہے تھے۔

”بہت اچھا ہو گیا۔ بہنوں کا رشتہ اور مضبوط ہو گیا۔“ نشاط ممانی ہاتھوں پر لوشن لگاتے ہوئے بولیں۔

”ہاں مجھے تو دلی خوشی ہوئی یہ بچیاں میری ہی تو ذمہ داری ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

نشاط ممانی نے برا سامنہ بنایا اور کھڑکی کا پردہ سرکانے لگیں۔ ان کی نظر عمار پر پڑی جو لان میں بیٹھا تھا۔ یہ لڑکا اس وقت وہاں جا کے کیوں بیٹھ گیا انہیں غصہ آیا۔ وہ ذرا آگے ہو کر دیکھنے لگیں۔ وہ اکیلا ہی بیٹھا تھا مگر اس کے ہاتھ میں جلتی سگریٹ انہیں دور سے ہی نظر آئی۔ انہیں سخت شاک لگا۔ عمار کب سے سگریٹ منے لگا۔ انہوں نے سخت بے یقینی سے سوچا پھر بے یقینی دکھ میں ڈھل گئی۔ وہ شوہر کے برابر میں

چپ چاپ بیٹھ گئیں۔
سگریٹ ہاتھ جلانے لگی تھی۔ عمار نے اسے پھینک کر سیلپر سے مسل دیا اور دوسری سگریٹ سلگائی۔ لاؤنج کی رونق میں بربرہ کو کھٹن ہو رہی تھی۔ وہ خاموشی سے باہر نکلی مگر وہیں رک گئی۔ لان میں عمار بیٹھا تھا۔ وہ اسے دیکھ نہیں پایا تھا مگر وہ اس کے ہاتھ میں جلتی سگریٹ اچھی طرح دیکھ چکی تھی۔ اذیت کی اک لہر اس کے اندر سرایت کر گئی۔ وہ اپنے کمرے کی طرف پلٹ گئی۔ دروازہ بند کر کے اس نے اپنے آنسو پونچھے۔ حریم سب کے ساتھ لاؤنج میں تھی ورنہ اس کے لیے مشکل ہو جاتی۔ وہ چپ چاپ لیٹی رہی۔ بڑے فیصلہ کر چکے تھے۔ مطمئن تھے نشاط ممانی کا رویہ سامنے تھا مگر اس دل کو کون سمجھاتا۔ اس نے چادر مٹھیوں میں بھینچ لی۔ عمار بھی اسے ہی قصور وار سمجھتا ہوگا۔ وہ خود اذیت میں تھی۔ مگر وہ اذیت میں ہے اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے سر تھام لیا۔ موبائل بج رہا تھا مگر اس کا دیکھنے کو بھی دل نہ چاہا متواتر نبل پر اس کا سر پھٹنے لگا۔ آخر اس نے کال ریسیو کر لی۔

”ہیلو؟“ وہ بمشکل بولی۔

”کیسی ہو ڈیر فیاسی۔“ دوسری طرف خرم تھا۔

اس کی بے زاری حد سے سوا ہو گئی۔

”جی ٹھیک۔“ وہ مختصراً بولی۔

”میں تو اس رشتے سے بہت خوش ہوں۔ میں نے

سوچا تم سے پوچھ لوں۔“ وہ اپنی ہی رو میں تھا۔

”دل۔ میرے جیسا فیاسی ملنے پر تو ہر لڑکی ہی

خوش ہوگی مگر اب تم ٹیپیکل ایسٹرن لڑکیوں کی طرح

شرمانا مت شروع کرو پلیز۔“ وہ بولے جا رہا تھا۔

”مجھے شرمانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ اسے

غصہ آنے لگا تھا۔

”اور ہاں! مہینے میں ایک دو بار میرے ساتھ آؤنگ

پر چلنا تاکہ تم تھوڑا میر مزاج انڈر اسٹینڈ کر سکو اور تم اپنا

ایسٹرن لک بھی تھوڑا چینیج کرو تاکہ میں تمہیں دیکھ

سکوں، فیل کر سکوں۔“ اس کا لہجہ ہی بدل گیا تھا۔ بربرہ کا

ہمکنے لگا۔ حریم ہنستے ہوئے اسے سنبھالنے لگی سب ہی مسکراتے ہوئے بچوں کی شرارتوں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔



وہ فروٹ ٹرانسفل لے کر اوپر کے فلور پر آئی تھی۔ رات ہو گئی تھی، عشبہ آئی ہوئی تھی، اس لیے فرح ماما نے اس کا فیورٹ فروٹ ٹرانسفل بھجوا دیا تھا۔ اسے کوئی نظر نہ آیا تو ٹرانسفل کچن میں رکھ کر وہ نشاط ممانی کے کمرے کی طرف بڑھی۔ اسی وقت عمار سیڑھیاں چڑھتا اوپر آیا۔ آج کتنے دنوں بعد نظر آیا تھا۔

”سنیں۔“ وہ بے ساختہ پکار بیٹھی۔ وہ اسے سگریٹ پر ٹوکنا چاہتی تھی، مگر اسی وقت نشاط ممانی کے کمرے سے عشبہ کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ اس نے کچھ بو کھلا کر عمار کی طرف دیکھا، وہ بھی فکر مند سا دروازے کو دیکھ رہا تھا۔

”مما! آپ کو نہیں پتا وہ کتنا کمینہ ہے۔ پانچ لاکھ مانگ رہا ہے، میں کہاں سے دوں گی۔“ وہ پھر رونے لگی۔

”ارے پہلے مجھے پوری بات تو بتاؤ بیٹا۔“ نشاط ممانی کی پریشان آواز آئی۔ بریرہ ہکا بکا سی بے اختیار کھڑی رہ گئی۔

”مما! میں نے دانیال سے پوچھے بغیر اپنا سیل فون ایک موبائل شاپ پر ٹھیک کرنے کو دیا تھا، مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ سیل میں میری کچھ۔ بولڈ تصویریں ہیں، کچھ تصویروں میں۔ دانیال بھی ساتھ تھے بس انہوں نے یونہی۔ یونہی شوق میں لی تھیں۔“ وہ جھینپتے ہوئے اٹک اٹک کرتا رہی تھی۔

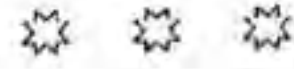
”شاپ پر چار لڑکے تھے، مجھے نہیں پتا کون مجھے دھمکی دے رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ ایک ہفتے میں پیسے نہ دے تو سب تصویریں نیٹ پر ڈال دے گا۔“ وہ پھر رونے لگی۔

”تم لوگوں کو اس بے شرمی کی کیا ضرورت تھی، اب کیا ہوگا۔“ نشاط ممانی اسے لتاڑنے لگیں۔

چہرہ تپ گیا۔

”مجھے کہیں نہیں جانا، میری اسٹیڈیز بہت ٹف جا رہی ہیں، اب آپ مجھے فون مت کیجئے گا۔“ اس نے کھولتے ذہن کے ساتھ فون کاٹ دیا۔

”فولش کرل۔“ حریم نے سر جھٹک کر موبائل بیڈ پر پھینکا اور نیٹ آن کرنے لگا۔



دن اپنی رفتار سے گزرتے جا رہے تھے۔ دوپہر میں سب کھانا کھا کر فارغ ہی ہوئے تھے جب عشبہ، انس کے ساتھ چلی آئی۔ سب خوش ہو گئے۔ زین اور زیب انس کو پکڑ کے بیٹھ گئے۔

”تم ہمارے ساتھ کھیلو گے؟ زیب اس کا ہاتھ پکڑے پوچھ رہی تھی۔ وہ اپنی گول مٹول گردن ہلانے لگا۔ زین اسے اپنی ٹرین دکھانے لگا۔ نشاط ممانی بھی عشبہ کو دیکھ کر نیچے ہی چلی آئیں۔

”کھانا لگواتی ہوں،“ نانو بولنے لگیں۔

”ارے نہیں دادو! کھانا کھا کر آئی ہوں۔ بس آج دل چاہا آپ سب سے ملنے کے لیے۔ دانیال لہج کرنے آئے تھے، واپسی میں مجھے یہاں چھوڑتے ہوئے گئے ہیں۔“ وہ کچھ چپ چپ سی لگ رہی تھی۔

”کچھ تھکی تھکی سی لگ رہی ہو۔“ عمارہ اسے دیکھتے ہوئے بولیں۔

”ہاں پھوپھو! بہت تھکن ہو رہی ہے۔ کچھ دیر سو جاتی ہوں۔“ وہ یک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ نشاط ممانی نے اسے غور سے دیکھا۔ حریم اور فرح ماما بھی اچھسے سے دیکھنے لگیں۔ وہ سیڑھیاں چڑھتی اوپر چلی گئی، نشاط ممانی بھی اس کے پیچھے چلی گئیں۔

”اسے کیا ہوا؟“ عمارہ کچھ فکر مندی سے بولیں۔

”بیٹیاں میکے آکر ہی تھکن اتارتی ہیں اور تکلفات تو سسرال کی مجبوری ہیں بس۔“ نانو سنجیدگی سے بولیں۔

”ترین چلی ترین چلی۔“ انس، زین کی چلتی ہوئی ٹرین دیکھ کر کھلکھلاتے ہوئے اسے پکڑنے کے لیے

جس سے تنگ کیا جا رہا ہے، دکان کا ایڈریس وغیرہ۔“
عشبہ اپنے ہینڈ بیگ سے سیل اور مختلف کارڈز نکالتے
اسے تفصیل بتانے لگی تھی۔ وہ توجہ سے سننے لگی۔



ان دنوں صرف وہ عمار کی رازدار تھی۔ اس نے
کسی کو بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی۔ عمار نے اس پر
اعتماد کیا تھا تو اتنا کرنا تو اس کا فرض تھا۔ وہ ایک ہفتہ بہت
پریشانی میں گزرا۔ وہ بہت بے چینی سے مسئلہ حل
ہونے کی منتظر تھی۔ عشبہ روز اسے فون کر کے
پوچھتی۔ نشاط ممانی الگ فکر مند تھیں۔ عمار راتوں کو
دیر سے گھر آتا۔ کھانا برائے نام کھاتا۔ ایک ہفتے بعد
اس نے عشبہ کو خوش خبری سنائی۔ اس کو دھمکانے
والے لڑکے کو رات بھر لاک اپ میں مہمان بنایا گیا تو
اس کی عقل ٹھکانے آگئی تھی۔ وہ پیشہ ور مجرم نہیں تھا
ویسے بھی اسے عدالت تک نہیں لے جانا تھا اس لیے
معاملہ دبا دیا گیا تھا۔ عمار نے اسے سب بتاتے ہوئے
اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ اپنیوں
کے لیے کس قدر حساس تھا۔ وہ اسے پہلے سے بڑھ
کے اچھا لگا تھا۔



وہ نماز فجر کے بعد لان میں آگئی تھی۔ ہر شے تازہ سی
نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ پرندوں کی چکارنے ماحول
کو دلکش کر دیا تھا۔ سبزے کی ٹھنڈک ہر طرف پھیلی
تھی۔ وہ موتیا کے پودوں کے پاس کھڑی ہو کر ان کی
کلیوں کو ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگی۔

”بریرہ! نشاط ممانی کی آواز پر وہ چونک کر پلٹی۔

”ارے ممانی آپ اتنی صبح؟“ وہ حیران ہوئی۔

”ہاں بس آنکھ کھل گئی تھی پھر نیند نہیں آئی۔“ وہ
مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئیں۔ وہ بھی ان کے
انداز پر حیران ہوتے ہوئے ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔
”مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا تھا جس طرح تم نے

عشبہ کو اس مسئلے سے نکالا، رازداری برتی۔ کسی کو علم
بھی نہ ہوا اور ہم اتنے بڑے مسئلے سے نکل گئے ورنہ

”دانیال کو پتا چلا تو بہت برا ہو گا ماما۔“ وہ خوف زدہ
لہجے میں بولی۔ بریرہ عمار کے سامنے اس بے باک گفتگو
پر سٹپٹا گئی۔

”میری بات غور سے سنو۔“ اسے عمار کی دھیمی
آواز سنائی دی۔ اس کے جبرے بھیچے ہوئے تھے۔
پریشانی کی رگیں تن گئی تھیں۔ وہ بے حد ضبط سے بول
رہا تھا۔

”اندر جا کے ان سے کہو کہ تم نے سب سن لیا ہے۔
تمہاری دوست کا بھی یہ مسئلہ تھا اور اس کے بھائی
نے سولو کیا تھا۔ بھائیوں کو یہ باتیں کبھی نہیں بتائی
جاتیں، مجھے بھی نہیں بتایا جائے گا۔ اس لیے تم یہ
سب معلومات لا کر مجھے دو گی۔ باقی سب مجھ پر چھوڑ
دو۔“ بریرہ نے تذبذب کے عالم میں اسے دیکھا۔

”پلیز بریرہ۔“ وہ بھاری لہجے میں بولا۔ اس نے
ایک لمحے سوچا پھر ہلکا سا دروازہ بجا کر اندر چلی گئی۔ وہ
دونوں اسے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔ عشبہ جلدی
سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

”عشبہ آپی! آئی ایم سوری، مگر میں آپ کی باتیں
سن چکی ہوں اور میں یہ مسئلہ حل کر سکتی ہوں۔“ وہ
جلدی جلدی بولی۔

”تم نے ہماری باتیں سن لیں۔“ نشاط ممانی کو بے
حد غصہ آیا۔

”تم کیا کر سکتی ہو بریرہ؟“ عشبہ ماں کو نظر انداز
کرتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئی۔

”میری فرینڈ کے ساتھ بھی ایسا ہی مسئلہ ہوا تھا، وہ
اپنے بھائی سے بہت کلوز تھی اس نے بھائی کو مسئلہ بتایا
اس کے بھائی کا ڈی ایس پی سے لنک ہے اس نے
چٹکی بجاتے یہ مسئلہ حل کر دیا۔“ وہ دل میں لفظ ترتیب
دیتی بولتی جا رہی تھی۔

”پھر تو یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔“ عشبہ نے
امید بھری نظروں سے ماں کو دیکھا۔ وہ اب چپ بیٹھی
تھیں۔

”جی ان شاء اللہ۔“ بریرہ جلدی سے بولی۔
”بس آپ مجھے ساری باتیں بتائیں، وہ نمبر دیں

بریرہ نے ایک نظر اسے دیکھا پھر نظریں جھکا لیں۔
 ”ممی نے کچھ شالیں دی ہیں۔“ اس نے چارپانچ
 شالیں سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے بریرہ کو دیکھا۔ حریم
 شالیں دیکھنے لگی۔ وہ مختلف رنگوں میں تھیں۔
 ”بریرہ! تم کون سی لوگی؟“ وہ خواہ مخواہ اس سے
 مخاطب ہوا۔

”کوئی بھی۔“ دھیان عمار کے ہاتھ میں موجود
 سگریٹ پر ہی ہنک رہا تھا۔
 ”تم یہ ریڈ والی لو۔ تم ریڈ کلر بہت سوٹ کرتا
 ہے۔“ خرم نے اس کا ہاتھ تھاما اور ریڈ شال ہاتھ پر رکھ
 دی۔ اس نے بے ساختہ ہاتھ کھینچا۔ نظریں اختیار اوپر
 اٹھی۔ عمار ایک ٹک اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ جلتی سگریٹ
 اب اس کی مٹھی میں بند تھی۔ بریرہ کے لبوں سے
 سسکی نکلی پھر اس نے ہاتھ جھٹکا اور واپس مڑ گیا۔ حریم
 ہکا بکا سی خرم کی حرکت ہی دیکھ رہی تھی۔

”مجھے یہ سب پسند نہیں آسندہ خیال رکھیے گا۔“
 وہ سختی سے کہتی اٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ خرم
 ایک لمحے کو حیران ہوا پھر توہین کا احساس غالب آ گیا۔
 ”سک ایسٹرن مینٹلٹی۔“ وہ چپا چپا کر بولتا اٹھا اور
 جھٹکے سے باہر نکل گیا تھا۔ حریم کبھی کمرے کی طرف
 دیکھتی تو کبھی جاتے ہوئے خرم کو۔



شمال سے سیاہ گھنگھور گھٹائیں اٹھ رہی تھیں پھر
 ہر سو چھانے لگیں۔ تین سفید کبوتران کی طرف
 اڑتے سیاہ بادلوں میں یوں دلربائی سے واضح ہوئے کہ وہ
 ان کو دیکھتی چلی گئی۔ ہوا کا خشک جھونکا ٹکرایا تو اس
 نے جھرجھری لے کر کھڑکی بند کی ہرف خاموشی اور
 بو جھل پن کا راج تھا۔ سب فارحہ خالہ کی طرف گئے
 ہوئے تھے۔ صرف فرح مامی اور بابراموں اپنے کمرے
 میں تھے وہ کبل لپیٹ کر خاموشی سے بیٹھ گئی نہ جانے
 کتنی دیر گزر گئی۔ اندھیرا چھانے لگا تھا۔ اس نے اٹھ
 کر کمرے کی لائٹ جلائی پھر باہر نکلی۔ لاونج میں مدھم
 سی روشنی تھی۔ کچن میں جا کر وہ چائے بنانے لگی۔

جانے کتنی شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ ”انہوں نے اسے
 نرمی سے دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”ممائی! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ عشبہ آلی
 میری بہنوں کی طرح ہیں جب میں یہ مسئلہ حل کر سکتی
 تھی تو کیوں نہ کرتی؟ یہ تو ان کا حق تھا۔“ وہ ان کے
 بدلے رویے پر حیرت زدہ بولتی چلی گئی۔

”تم بہت اچھی لڑکی ہو۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں پھر
 اس کا سر پھتھپھتاتے ہوئے اندر کی طرف بڑھ
 گئیں۔ وہ آنکھوں میں نمی لیے انہیں جاتا دیکھتی
 رہی۔ ایسا ہوتا ہے تاکہ جب کوئی ازلی بدگمان شخص
 مہربان ہو جائے نیکی کی خوشبو بکھرے تو دل و جاں میں
 ایک سرخوشی سی پھیل جاتی ہے وہ بھی اس نیکی کی
 خوشبو محسوس کر رہی تھی۔



مینے دبے پاؤں گزرتے جا رہے تھے۔ سر دیوں کا
 زور پوری طرح جھمنے لگا تھا۔ بریرہ کے امتحان ختم
 ہو چکے تھے۔ حریم اسے زبردستی لاونج میں لے آئی۔
 اس نے اخروٹ اور چلغوزوں سے بھری پلیٹ سینٹر
 ٹیبل پر رکھی اور ٹی وی کی آواز تیز کی۔
 ”یار! میرا موڈ نہیں ہو رہا اور ویسے بھی مجھے ہارر
 موویز نہیں پسند۔“ وہ ٹی وی پر چلتی ”MAMA“
 کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”مگر مجھے تو پسند ہیں نا۔“ حریم نے اسے کھینچ کر
 بٹھایا اور اس کے منہ میں چلغوزے ڈال دیے اسی
 وقت خرم فرح مامی کے ہمراہ اندر آنا دکھائی دیا۔
 ”یہ اس وقت کہاں سے آگئے؟“ حریم بڑبڑائی پھر
 والیوم کم کرنے لگی۔ بریرہ سپاٹ چہرہ لیے اہیں دیکھتی
 رہی۔

”بھئی، آپ نے تم لوگوں کے لیے کچھ بھجوایا ہے۔
 دیکھ لو۔“ فرح مامی بتاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف
 بڑھ گئی تھیں۔ اسی وقت عمار اپنے کمرے سے نکل کر
 نیچے پورشن کی طرف بڑھا مگر انہیں دیکھ کر رک گیا پھر
 وہیں کھڑے کھڑے اس نے سگریٹ سلگائی تھی۔

”تم نے میرا ساتھ نہیں دیا تم میرا عشق ہو۔ میری بچپن کی محبت۔ تم صرف میری ہو۔ یہ میرا یقین ہے۔ میں تمہیں یوں کسی اور کا نہیں ہونے دوں گا۔ سنا تم نے۔“ ایسی وحشت ایسی دیوانگی۔ وہ بہکا بہکا سا لگتا تھا۔ بربرہ نے خوف زدہ ہو کر اپنا آپ چھڑایا اور پلٹ کر بھاگتی چلی گئی۔

”آج سن لو تم۔ سننا پڑے گا تمہیں۔“ عمار پکار رہا تھا، مگر اس نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ کمرے میں آکر اس نے چکراتے سر کو تھاما پھر بیڈ پر گر کے رونے لگی۔



نشاط ممانی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
 ”اماں! آپ پوچھیں یہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ کیوں اپنی جان کے پیچھے بڑ گیا ہے؟ مجھے دکھ دے کر کیا ملتا ہے؟“ انہوں نے عمار کے سرہانے بیٹھی بانو کو مخاطب کیا۔ دوسری طرف عمارہ فکر مندی بیٹھی تھیں۔ احتشام ماموں فکر مندی سے شمل رہے تھے، صبح نشاط ممانی اسے اٹھانے آئیں تو وہ بخار میں پھنک رہا تھا۔ گیلے کپڑے صوفے پر ہی بڑے تھے۔ وہ سارا ماجرا سمجھ گئی۔ ڈاکٹر ابھی چیک کر کے گیا تھا اور کافی سخت ہدایات دی تھیں۔ وہ یک ٹک اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر نشاط ممانی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ عمار نے ایک نظر بربرہ کو دیکھا پھر آنکھیں بند کر لیں۔

”یہ کیا ایڈو سنر تھا عمار؟ کچھ بتاؤ گے؟“ احتشام ماموں کو بھی اس پر غصہ تھا۔

”بھائی! آپ اس کی حالت دیکھیں۔ بعد میں ڈانٹ لیجیے گا۔“ عمارہ فوراً اپنے لاڈلے نتیجے کی حمایت میں میدان میں آئیں۔ وہ لب بھینچ کر رہ گئے۔ نشاط ممانی اپنے آنسو پونچھنے لگیں۔ فرح ماما ناشتے کی ٹرے لے کر اندر آئیں۔ حریم بھی ساتھ ہی تھی۔

”لو بھئی عمار۔ فنانٹ اٹھ جاؤ، تمہاری پسند کا چکن کارن سوپ بھی ہے۔“ وہ ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولیں۔

بادل اور بو جھل ہوئے پھر زمین ان کا بوجھ بانٹنے لگی۔ ہلکی پھوار برسنے لگی۔ گیلی سی باس چار سو پھیل گئی۔ چائے بنا کر وہ یونہی لاؤنج کے دروازے پر آگئی۔ سبزہ بھیک رہا تھا۔ وہ تھوڑا اور آگے آئی۔ بوندیں اب تیز ہونے لگی تھیں۔ اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ لان میں اسے کوئی بیٹھا نظر آیا۔

”عمار!“ وہ بے آواز بڑبڑائی پھر کپ رکھ کر چادر سر پہ لے کر بھاگتی ہوئی وہاں گئی۔ وہ کرسی کی پشت سے سر نکالنے آسمان کی طرف رخ کیے بے خبر سا آنکھیں بند کر کے بیٹھا تھا۔ بوندیں اس کے چہرے پر پھسل رہی تھیں۔ وہ کافی حد تک بھیک چکا تھا۔ بربرہ کو بے ساختہ جھڑپ ہوئی۔

”بارش ہو رہی ہے اندر چلیں۔“ وہ تیز آواز میں بولی۔ عمار نے ذرا سی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا پھر آنکھیں بند کر لیں۔

”تم اندر جاؤ۔“ لہجے میں رکھائی تھی۔
 ”آپ بھی چلیں، بہت ٹھنڈ ہے۔“ وہ بلجی لہجے میں بولی۔

”مجھے تنہا چھوڑ دو۔ جاؤ۔“ وہ آنکھیں کھولتے ہوئے سختی سے بولا۔

”یہ کیا پاگل پن ہے عمار۔“ اس نے جھنجلا کر بے ساختہ اس کا بازو پکڑا۔

”ہاں پاگل ہو رہا ہوں میں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو تم۔“ وہ جھٹکے سے کھڑا ہوا اور اس کی طرف مڑ کر رہی سے بولا۔

”ایسا کیوں کر رہے ہیں؟“ وہ بے چارگی سے بولی۔
 ”تمہیں نہیں پتا؟“ اس نے اسے کندھوں سے تھام لیا اور اپنی سرخ آنکھیں اس پر جما کے بو جھل سا بولا۔

”بولو بربرہ! تمہیں نہیں پتا؟ یہ سب جو مجھ پر گزر رہی ہے۔ تم نہیں جانتیں؟ میری جسمانی تکلیف کی تمہیں فکر ہے اور جو زخم میری روح پر لگے ہیں؟“ اس نے اسے جھنجھوڑا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کا یہ روپ دیکھ رہی تھی۔ وہ جنون کے عالم میں تھا۔

میں بولیں۔
 ”مما! بھائی کو بیٹھنے تو دیں۔“ عمار بھی مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور جنید کے گلے لگ گیا۔
 ”مما! دعا خود تو نہیں آسکی، مگر اس نے سب کے لیے بہت ساری چیزیں بھیجی ہیں۔“ جنید مسکراتے ہوئے بولا۔ اس نے وہیں مسلم فیملی میں شادی کی تھی۔ دعا اس کی بیوی تھی۔

”اچھا۔“ نشاط ممائی دھیمے سے مسکرائی تھیں۔ باتوں کا نہ تھمنے والا سلسلہ چلتا ہی جا رہا تھا۔
 ”باقی باتیں بعد میں۔ جنید بھائی! چلیں پہلے سب دوپہر کا کھانا کھالیں۔ آج اتفاق سے فرح مامی نے آپ کے فیورٹ شامی کباب بنائے ہیں اور ابھی گاجر کا حلوا بھی بنالیا ہے اور جناب میں نے بنایا ہے چائینیز پلاؤ۔“ حریم اعلان کرنے والے انداز میں آکر شروع ہو گئی تھی۔

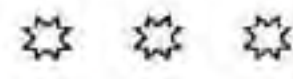
”واہ بھئی! لزن اور چچی ہوں تو آپ دونوں جیسی۔“ جنید کے کہنے پر دونوں مسکرائے لگیں۔
 ”بریرہ تو بریانی بنا رہی تھی، مگر میں نے زبردستی اس سے چارج چھین لیا۔ مجھے پتا تھا اتنی جلدی آپ کو دسی کھانے ہضم نہیں ہوں گے۔“ وہ شرارت سے بولی۔

”نہیں لٹل گرل! وہاں بھی میں دسی کھانوں کو پریفر کرتا تھا۔“ وہ اسے چپت لگاتا مسکرائے لگا۔
 ”ہاں چلو۔ میں نے بھی کوئی بنائے تھے، اسے بھی سرو کرو۔“ نشاط ممائی حریم سے کہنے لگیں۔
 ”گریٹ ممما۔“ جنید نے انہیں ساتھ لگایا سب کھانے کے لیے اٹھ گئے۔ بریرہ خاموشی سے عمار کو دھیما دھیما مسکراتے دیکھتی رہی۔
 کھانے کے بعد تحفے تحائف کا دوز چلا تھا۔
 ”اور تمہاری جاب کیسی جا رہی ہے؟“ وہ عمار سے مخاطب ہوا تھا۔

”اچھی جا رہی ہے بھائی۔“ وہ دھیمے سے بولا تھا۔
 ”کبھی آف لے کر لندن آؤ۔ مل کے انجوائے کریں گے۔ ممما! یہاں سے کہتے تو میں تھک گیا ہوں۔“ وہ

”ارے بریرہ! تمہاری آنکھیں اتنی سرخ کیوں ہو رہی ہیں؟ فلو ہے تو تم بھی سوپ لے لو۔“ انہوں نے بریرہ کو دیکھا تو چونک گئیں۔ حریم نے جتنی نظروں سے اسے دیکھا۔

”جی۔ وہ میں چائے کے ساتھ ٹیبلٹ لے لوں گی۔“ وہ خود پر سب کی توجہ ہوتے دیکھ کر نروس ہو گئی۔
 ”چل بیٹا! اٹھ جا۔ سب کتنے پریشان ہیں۔“ نانو اس پر ایک لمبی پھونک مارنے کے بعد بولیں۔ وہ بدقت اٹھ کر بیٹھنے لگا۔ بریرہ نے سکون کی سانس لی۔



دو دن گزر چکے تھے اس کی طبیعت بہتر تھی۔ وہ واش روم سے باہر آیا تو نشاط ممائی ٹرے میں اس کا پرہیزی کھانا لیے بیٹھی تھیں۔
 ”میں کل سے آفس جوائن کر لوں گا۔“ وہ تولیے سے ہاتھ خشک کرتا ہوا بولا۔

”پاگل ہوئے ہو اتنی سی شکل نکل آئی ہے۔ کم از کم دو دن اور آرام کرو۔“ وہ خفگی سے بولیں۔
 ”مما! کام بہت جمع ہو گیا ہے۔“ وہ بے زاری سے بولا۔

”بھابھی! آپ کے مہمان آئے ہیں۔“ بابر ماموں اونچی آواز میں بولتے ادھر ہی آرہے تھے۔
 ”یہ اب کون آگیا۔“ وہ حیرت اور بے زاری کے ملے جلے تاثرات لیے دوپٹا سنبھالتے کمرے سے نکلیں۔ ان کے ساتھ فرح مامی بھی تھیں۔ نانو بھی مسکراتی ہوئی ساتھ تھیں اور لوگ بھی آرہے تھے۔ انہوں نے حیران ہو کر بابر ماموں کے پیچھے دیکھا اور پھر ساکت ہو گئیں۔ سامنے جنید کھڑا تھا، وہ چار سال بعد وطن آیا تھا، ان کی پہلی لاڈلی اولاد۔ وہ بے ساختہ آگے بڑھ کر ان سے لپٹا۔ ان کے آنسو بہنے لگے تھے۔
 ”ارے ممما! میں آگیا ہوں۔“ وہ ان کے آنسو صاف کرتا ہوا بولا۔

”اب ماں کا خیال آیا ہے۔“ وہ شکایت بھرے لہجے

اس کے کندھے رہا تھ مارا بولا۔
 ”میں تو مستقل آپ کے پاس آنے کا سوچ رہا ہوں
 یا پھر آسٹریلیا جہاں سے اچھی آفر آئے۔“ اس نے
 آہستہ سے چائے کا کب رکھتے ہوئے دھماکا کیا۔ نشاط
 ممانی اسے دیکھتی رہ گئی تھیں۔ حریم نے بریرہ کو دیکھا۔
 وہ دکھ سے عمار کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔
 ”کیا کئے جا رہا ہے یہ لڑکا۔ یہاں کیا برائی ہے؟“ نانو
 بولنے لگیں۔

”تم دونوں کو باپ کی فکر نہیں ہے۔“ احتشام
 ماموں اسے گھور کر بولے تھے۔
 ”یہ مجھے سزا دے رہا ہے۔ آپ لوگ سمجھا میں
 اسے۔“ نشاط ممانی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ تھکے
 تھکے لہجے میں بولیں۔
 ”مما پلیز! میں نے بہت سوچ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔“
 وہ سختی سے بولتا اٹھ گیا تھا۔ سب حیران پریشان رہ گئے
 تھے۔ فرح مامی نشاط ممانی کو تسلی دینے لگی تھیں۔



”چائے پو نشاط! ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ انہوں نے
 سوچوں سے ابھر کر ساس کو دیکھا پھر چائے اٹھالی۔ عمارہ
 بھی ساتھ بیٹھی انہیں ہی دیکھ رہی تھیں۔
 ”بریرہ گھر کی بچی تھی۔ دیکھی بھالی۔ خوا مخواہ
 بیرباندھا میں نے۔“ سامنے سے آئی بریرہ کو دیکھ کر ان
 کے پچھتاوے میں اضافہ ہوا۔

”وہ نند بھانج کا بیر تو ماضی کا قصہ ہو گیا تھا۔ عمارہ
 شوہر کے انتقال کے بعد بالکل بدل گئی ہے۔“ انہوں
 نے عمارہ کی طرف دیکھا۔ وہ ماں سے کچھ بات کر رہی
 تھیں۔ لان میں خوش گوار ٹھنڈی ہوا کا راج تھا۔
 پودوں میں ننھی کوئیلیں پھوٹ رہی تھیں۔ چیکو اور
 تیم کے درخت تھوڑی تھوڑی دیر بعد سرسراتے تھے۔
 بریرہ آکر بیٹھ گئی تھی۔ زیب ساتھ تھی۔ وہ یونہی اسے
 دیکھے گئیں۔ اسی وقت فارحہ خالہ کی اپنے شوہر کے
 ہمراہ آمد ہوئی تھی۔
 ”ارے آج تو شفیع بھائی بھی آئے ہیں۔“ عمارہ

کھڑی ہو گئی تھیں۔ بریرہ نے سر ڈھاپنا تھا۔ سلام دعا
 کے بعد سب وہیں بیٹھ گئے تھے۔
 فارحہ خالہ جیسے زبردستی مسکرائی تھیں۔ خالو بھی
 سر جھکائے بیٹھے تھے وہ کچھ حیران ہوتی چائے لانے کا
 کہہ کر اٹھ گئی۔ اندر آ کے حریم کے ساتھ سینڈویچ کو
 فائنل ٹیچ دینے لگی۔ چائے بنا رہی تھی زیب نے پھر
 لان میں جانے کی ضد پکڑ لی۔

”تم جاؤ۔ سب تیار ہے۔ میں لے کر آتی ہوں۔“
 حریم بولی۔ فرح مامی کپ نکال رہی تھیں۔ ساتھ ہی
 اسٹرابری کیک کے پیس گر رہی تھیں۔ وہ سر ہلا کر باہر
 آگئی۔
 ”یہ کیا کہہ رہی ہو فارحہ؟“ نانو کی غصے بھری آواز
 نے اس کے قدم جکڑ لیے۔ عمارہ فق چہرہ لیے بیٹھی
 تھیں۔

”اگر اسے یہ سب کرنا تھا تو منگنی کیوں کی؟“ نشاط
 ممانی تیز آواز میں بولی تھیں۔

”ناخلف اولاد ہمیشہ ماں باپ کو شرمندہ کرواتی
 ہے۔“ خالو شرمندہ لہجے میں بولے تھے۔ عمارہ تیز تیز
 سانس لینے لگی تھیں۔ ان کا چہرہ سفید پڑتا جا رہا تھا۔ وہ
 تیزی سے بھاگتی ہوئی ماں کے پاس آئی۔
 ”امی! امی! کیا ہوا ہے آپ کو۔“ وہ انہیں سنبھالے
 بولے جا رہی تھی۔ سب پریشان ہو کر ان کے گرد جمع
 ہوئے تھے۔
 ”حریم! ماموں کو فون کرو جلدی۔ امی کو اسپتال لے
 جانا ہے۔“ اس نے حریم کو آتا دیکھ کر چیخ کے کہا۔ وہ
 اٹنے قدموں بھاگی تھی۔



خرم امریکا جا چکا تھا۔ پہلے تو فارحہ خالہ نے اسے
 بلانے کی بہت کوشش کی ”مگر فوراً“ ہی اس نے اپنی
 دوست جکولین سے اپنی شادی کی خبر سنا کر سب راستے
 بند کر دیے۔ جکولین اس کی نیٹ فرینڈ تھی۔ معاملات
 بہت تیزی سے آگے بڑھے تھے۔ ویسے بھی وہ ہمیشہ
 مغربی طرز زندگی سے متاثر رہا تھا۔ یہ اس کے لیے

اطمینان سے کہا جسے روزمرہ کی باتیں کر رہی ہوں۔
دوائی کا شمار اندر لانا عمار وہیں جم گیا۔ بریرہ کے ہاتھ
ٹھنڈے پڑ گئے۔ حرم کا منہ کھلا رہ گیا۔ نانو کی تسبیح رک
گئی۔ عمارہ انہیں دیکھتی رہ گئیں۔ احتشام ماموں بھی
حیرت سے زوجہ کا وہ روپ دیکھ رہے تھے جس کی ہمیشہ
حسرت رہی تھی۔ بریرہ اور عمار کی نگاہ بے ساختہ ملی پھر
بریرہ کی نظر جھک گئی۔

”حب کیوں ہو گئیں عمارہ؟ عمار تو تمہارا سب سے
لاڈلا بھتیجا ہے کہیں بھانج کے روایتی سمدھن بن
جانے کا تو خوف نہیں؟“ وہ چمک رہی تھیں۔ عمارہ
مسکرانے لگی تھیں۔

”دونوں ہی ہمیں بہت عزیز ہیں۔ اس سے اچھا کیا
ہو گا بھلا۔“ نانو خوش گوار لہجے میں بولی تھیں۔

”احتشام بھائی! فوراً“ مٹھائی لے آئیں۔ اس سے
پہلے کہ وہ سٹر دوبارہ آجائے کمرہ خالی کرنے کا آرڈر
لے کر۔“ فارحہ خالہ کے لہجے سے بھی خوشی پھوٹ
رہی تھی۔ حرم نے بریرہ کو کہنی ماری۔ وہ اسے گھورتی
ہوئی ہٹ کر بیٹھ گئی۔ عمار خاموش بیٹھا تھا مگر اس کے
وجود سے اٹھتا اطمینان ہر کسی کو محسوس ہو رہا تھا۔



بھینی خوشبو سے بو جھل لان میں خوش گوار ہوا کے
سنگ خوشیاں تیلیوں کی طرح ادھر ادھر لہرا رہی
تھیں۔ تیز روشنیوں میں بہت عمدہ انتظام تھا۔ زن
زیب اور انس بھاگتے پھر رہے تھے۔ کچھ تیار ہو گئے
تھے۔ کچھ باقی تھے۔ بریرہ کو عشبہ کی بیوٹیشن دوست
تیار کر رہی تھی۔ سب اتنی جلدی ہوا تھا کہ اسے اب
تک یقین نہ آتا تھا۔ وہ بار بار اپنے رب کا شکر ادا
کرتی۔ لائٹ سے میک اپ کا فائنل ٹیچ دیکھ کر وہ
مسکرائی۔ عشبہ نے ایمر جنسی میں اپنی کام دار لائٹ بر
پل لائٹ فراک اسے دے دی تھی جو وہ ایک ہفتہ پہلے
ہی طارق روڈ سے لائی تھی۔

”تم جیسی بھابھی کو تو جتنا دلوں کم ہے۔“ وہ اس کے
کان کے پاس کھلکھلائی تھی فرح مامی نے اپنا نازک

سنہری موقع تھا۔ بریرہ کے بارے میں اس نے کہا تھا کہ
اسے اتنی دقیانوسی لڑکیاں پسند نہیں اور بریرہ بھی اسے
پسند نہیں کرتی اس لیے یہ سب یہیں ختم کر دیں مگر
رشتے ختم کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ ان سے امیدیں
جڑی ہوئی ہیں۔ تعلقات بندھے ہوتے ہیں اسی لیے
عمارہ یہ سب نہ پائی تھیں۔ انہیں انجانا کا اٹیک
ہوا تھا۔ بریرہ اور حرم نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔
سب انہیں تسلی دے دے کر تھک چکے تھے۔ عمار اور
باہر ماموں تو مسلسل اسپتال میں ہی تھے۔ اب ان کی
حالت خطرے سے باہر تھی۔ سب ان کے بیڈ کے گرد
جمع تھے۔ جب فارحہ خالہ کمرے میں داخل ہوئیں۔
عمارہ نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ فارحہ خالہ کی
آنکھیں ڈبڈبائی گئی تھیں۔

”عمارہ! وہ بن ہے اس نے تو سب اچھا چاہا تھا۔“
نشاط ممانی ان کے ہاتھ پکڑ کر دھیرے سے سمجھانے
لگیں۔

”ہاں بیٹا! اولادوں کے پیچھے رشتے کیوں توڑو۔ اس
نے تو ہمیشہ بریرہ کو اپنی بیٹی سمجھا ہے۔“ نانو نے ان کے
سر پر ہاتھ رکھا تو انہوں نے فارحہ خالہ کو دیکھا پھر دونوں
گلے مل کر رونے لگیں۔

”ارے نہیں نہیں۔“ حرم لپک کر آئی۔
”کوئی جذباتی سین نہیں ہو گا۔ امی آپ اپنی
طبیعت دیکھیں۔“ وہ فوراً ان سے لگ کر بیٹھ گئی تو
دونوں بہنیں مسکراتے ہوئے خود کو سنبھالنے لگیں۔
”بریرہ تو اتنی اچھی بیٹی ہے ماشاء اللہ جس گھر میں
جائے گی وہاں کی مشکلات ختم کر دے گی۔“ نشاط ممانی
اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔
”ہاں۔“ فارحہ خالہ نے اس کا ہاتھ چوما۔

”میری اولاد قدر نہ کر سکی۔“ وہ دکھی لہجے میں
بولیں۔ بریرہ کا دل چاہا وہ کہیں دور چلی جائے جہاں یہ
سب باتیں نہ ہوں۔ وہ آہستہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
”بھئی عمارہ! تم انجان لوگوں سے گھبرا رہی ہونا اب
مطمئن ہو جاؤ۔ یہ تمہاری نظروں کے سامنے ہی رہے
گی میرے عمار کی دلہن بن کر۔“ انہوں نے یوں

ساجاندی کا سیٹ اسے پستادیا تھا۔

”بھئی عمارہ! چند دن تو دیتیں۔ میں اپنی بہو کے لیے شاندار سی ہر چیز لاتی۔“ نشاط ممانی نے شکوہ کیا۔

”بہت ہے بھابھی۔ آپ اپنے ارمان شادی پر نکال لیجئے گا۔ ایک مہینہ تو ہے۔“ عمارہ مسکرائیں۔ عمارہ کے دل میں جانے کیسا خوف بیٹھا تھا کہ انہوں نے فوراً نکاح کی فرمائش کی تھی اور یوں ان کے گھر آنے کے دو سری ہی شام گھر پر ان کا نکاح ہو رہا تھا۔ شادی جنید کی فرمائش پر ایک مہینے بعد رکھی گئی تھی۔ یوں وہ بھی شرکت کر کے جاتا۔ کچھ دیر میں نکاح بھی ہو گیا تھا۔

”کتلی پیاری لگ رہی ہو بریرہ۔“ عشبہ اسے لینے آئی تو بے ساختہ بولی۔ نکاح کے بعد اب اس کی چادر اتاری گئی تھی۔

”ماشاء اللہ۔“ فرح مامی مسکرائیں۔ حریم اور عشبہ اسے لے کر باہر آگئیں اور عمارہ کے پہلو میں بٹھانے لگیں۔ عمارہ نے ایک بھر پور نگاہ اس پر ڈالی۔ کلاسیوں میں ڈھیروں چوڑیاں ڈالے موتیا کے گھنے گجرے پنے وہ صرف اس کی تھی یہ اس کا یقین تھا۔ وہ دھیرے سے مسکرایا۔ وہ اس کی نظر محسوس کر کے سمٹ سی گئی۔ اس کے برابر بیٹھتے ہوئے اسے حجاب نے آگھیرا۔ اب اس کے وجود پر اس کا حق تھا۔ اس احساس سے ہی اس کی پلکیں بو جھل ہو رہی تھیں۔ اس کے وجود سے اچھی خوشبو حواس پر چھانے لگی تھی۔ وہ بے ساختہ نروس ہو کر اپنی ننھی سی بندیا کو چھونے لگی۔ پھر تانک کی پالی کو چھوا۔

”سب ٹھیک ہے محترمہ! تصویریں بن رہی ہیں۔ سامنے دیکھو۔“ حریم دبی آواز میں شوخی سے بولی تو اسے ارد گرد کا احساس ہوا۔ جنید کیمرے لیے کھڑا تھا۔ تھوڑی دیر میں ڈنر ہونے والا تھا۔ باری کیو، علوہ پوری، فروٹ ٹرانسفل اور گلاب جامن کا انتظام کیا گیا تھا۔ عمارہ کو ایک طرف کر کے جنید اور بابر ماموں نے ساری بھاگ دوڑ کی تھی۔

”اچھا صاحبزادے! اب جناب کے وہ باہر جانے کے

ارادے کیا ہوئے؟“ بابر ماموں اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولے تو وہ مسکرانے لگا۔ بریرہ نے سر جھکا لیا۔ ”تو یہ بات تھی جناب۔“ فرح مامی نے بھی بیٹھتے ہوئے اسے گھورا۔ وہ سر کھجانے لگا۔ جنید اور حریم تو زور سے ہنس پڑے۔ اسے پتا تھا اب سب نے بہت ریکارڈ لگانا تھا۔

”ہمارا یہ چھوٹا بھائی تو شروع سے بڑا پکا ہے۔“ عشبہ بھی پیچھے آکر کھڑی ہو گئی۔

”اب تم بھی ایسا کرو گی۔“ اس نے اسے گھورا۔ ”ارے عمارہ بھائی جان! آپ کو کیا پتا کہ سالیاں کیا چیز ہوتی ہیں! اور ہم نے طے کیا ہے کہ شادی میں عشبہ آپلی بھی سالی کا رول ادا کریں گی۔“ حریم نے شرارت سے آکر اسے تھوڑی سی مٹھائی کھلائی۔

”جی! اور یہ سزا ہے کیوں کہ آپ نے مجھ سے کچھ شیئر نہیں کیا تھا۔“ عشبہ منہ پھلا کر بولی۔

”او کے بابا! منظور ہے منظور ہے۔ تم دونوں طرف سے نیک گھسیٹنا۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ سب ہنس پڑے۔

”ارے بچو! ہٹو چلو، کچھ رسمیں کرنی ہیں۔“ نانو اسٹیج پر آتے ہوئے بولیں۔ وہ سب نیچے اتر آئے۔ عمارہ فارحہ خالہ اور نشاط ممانی بھی اسٹیج پر آگئی تھیں۔ احتشام ماموں بھی ساتھ تھے۔ سب مسکراتے ہوئے انہیں دیکھنے لگے۔ عمارہ نے بیٹھے کو گھڑی پہنائی تھی۔ نشاط ممانی نے بریرہ کو ساتھ لگاتے ہوئے سونے کی تازک سی پازیب تھمائی تھی۔ جنید نے فوراً ”یہ لمحہ کیمرے میں قید کیا۔ اپنوں کے سنگ یہ خوشیاں انمول تھیں۔ ہر سو گنگناتی خوشبوؤں کا راج تھا اور ہر دل دھنک رنگوں میں بھیک چکا تھا۔“



دن بے حد خوب صورت ہو چکے تھے گھر میں ایک خوش گوار سا ہنگامہ بہا رہتا تھا۔ عشبہ اکثر یہیں پائی جاتی تھی۔ تقریباً ”روز ہی شاپنگ پر جانا ہو رہا تھا۔ حریم نے ڈھولکی منگوالی تھی۔ جب عشبہ نہ ہوتی وہ

”آ۔۔ آپ مجھ سے ناراض۔۔ تو نہیں۔“ وہ اس کے دیکھنے پر تھوڑا گڑبڑا گئی تھی۔ باہر بوندیں شور مچا رہی تھیں اور اندر اس کا دل۔۔ وہ پلٹا اور پھر ٹیرس کی طرف جا کر کھڑا ہو گیا۔ بھگے لان کا منظر واضح تھا۔ سب پھول پتے دھل کر نکھرے چلے جا رہے تھے۔ بارش کی خوشبو ہر سو پھیلی تھی۔ کمرے میں ہلکا سا اندھیرا تھا۔

”آپ زیادہ ناراض ہیں؟“ وہ افسردگی سے بولی۔ وہ پلٹا پھر اس کے قریب آ کر رک گیا۔ وہ گھبرا کر تھوڑسا ہٹی۔

”ہم چھین لیں گے تم سے یہ شان بے نیازی۔“ اس کی لٹ کو چھو تا وہ ہلکا سا ہنسا۔

”جانتی بھی ہو، کتنی تکلیف میں رہا ہوں۔ کتنا تنہا تھا۔ بہت دعاؤں سے تم کو پایا ہے۔ تمہیں کیا پتا۔“ وہ سرگوشی کرتا بو جھل لہجے میں بولا۔

”آپ اس تکلیف میں اکیلے نہیں تھے۔“ پلکیں جھکائے وہ بدقت بولی۔

”جانتا ہوں۔“ وہ آہستہ سے مسکرایا۔

”میری زندگی میں آنے کے لیے شکریہ بریہ۔“ عمار نے ہاتھ تھاما۔

”آپ کا یقین کامل تھا۔“ وہ دھیسے سے مسکرائی پھر نرمی سے ہاتھ تھپتھپتے ہوئے ملنے لگی۔

”اگلی بارش میں یوں نہیں جاسکوگی۔“ وہ مدہم آواز میں شرارت سے بولا۔ وہ شرمگین سا ہنسی پھر تیز قدموں سے واپس مڑ گئی۔ وہ مسکراتا ہوا پلٹ کر برستی بارش کو دیکھنے لگا۔ پانی کی رم جھم تیز ہوتی جا رہی تھی جیسے خوشیاں تیز تر ہو گئی ہوں۔ فضا خوشبو سے بو جھل ہوئی جا رہی تھی۔ ساری کلیاں کھل چکی تھیں۔ اب زندگی حسین تھی۔

فرح مای یا زیب اور زین کو پکڑ کر بیٹھ جاتی۔ وہ بھی بھرپور ساتھ دیتے۔ جنید فارغ ہونے کے باعث اکثر اوقات ڈرائیور کے فرائض سرانجام دیتا اور خواتین کی لمبی شاپنگ پر خوب احتجاج کرتا۔ آج شام بھی سب شاپنگ پر گئے تھے۔ حریم کو شادی کے لیے اپنے ڈریس خریدنے تھے۔ عشبہ اور نشاط ممانی بری کی تیاری کر رہی تھیں۔ فرح مای کو زیب اور زین کے سوٹ لینے تھے۔ دو دن بعد وہ لوگ شادی کے ڈریسز کے لیے بربرہ کو بھی لے جانے والے تھے۔ ہلکی بوند اباندی ہو رہی تھی۔ اسے پچھلی بارش کا خیال آیا۔ عمار کی دیوانگی یاد آئی تو کافی بناتے ہوئے وہ دھیرے سے مسکرانے لگی۔ یہ احساس ہی سرشار کر دیتا تھا کہ اب وہ اس کی منکوحہ ہے بس اتنا تھا کہ وہ اسے نظر انداز کر رہا تھا۔ اس کا چہچہہ چلاتا ہاتھ رکا۔ ہاں وہ مجھ سے ناراض ہے۔ سیل فون پر بھی رابطہ نہیں کیا۔ اس نے سوچا پھر عمارہ کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ وہ دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

”امی آپ کی دوا کا وقت ہو رہا ہے۔“ اس نے گھڑی دیکھی تو فوراً بولی۔ عمارہ دوا کھانے کی چور تھیں۔

”ہاں یاد آیا“ کل احتشام بھائی ٹیلیٹ لائے تھے۔ نشاط بھا بھی نے ابھی فون کیا تھا کہ ان کی سائیڈ ٹیبل میں ہے۔ وہ دینا بھول گئیں اب تم جا کر لے آؤ۔“ عمارہ نے اس سے کہا وہ جھجک گئی۔ عمار اوپر ہی تھا۔ عمارہ آنکھیں بند کر کے لیٹ چکی تھیں۔ چارونا چاروہ اٹھی اپنے کمرے میں ہوگا۔ خود کو تسلی دیتی وہ اوپر چلی آئی۔ دراز سے ٹیلیٹ نکالتے وہ ٹھنکی آگے بڑھ کر دیکھا۔ عمار ٹیرس پر کھڑا تھا۔ چائے کا کپ سائیڈ میں رکھا تھا۔

”عمار۔“ ہمت کر کے اس نے پکارا۔ اس نے پلٹ کے دیکھا۔

”کہو؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

For More Visit
Paksociety.com

امتل عزیز شہزاد



ایک ڈھلتی عمر کی عورت سڑک پار کرتے ہوئے ایک لڑکی کو دیکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ایک ماڈرن عورت ہے۔ وہ اسے چلا کر رکنے کے لیے کہتی ہے لیکن وہ دونوں سڑک پار کر کے گاڑی میں بیٹھ کر چلی جاتی ہیں۔ وقار صاحب کے دو بچے ہیں۔ اجیبہ اور سائرہ۔ وہ سائرہ کی شادی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ان کی بیوی اس دنیا میں نہیں ہے۔ ان کی سالی مہ پارہ خاص طور پر لندن سے اس شادی میں شرکت کرنے آئی ہیں۔ اجیبہ وقار صاحب کو بتاتی ہے کہ سائرہ اس شادی سے ناخوش نظر آتا ہے۔ وقار صاحب یہ سن کر پریشان ہو جاتے ہیں۔

اجیبہ بہت خوب صورت ہے۔ وہ دو ماہ کی تھی جب اس کی ماں چلی گئی۔ وہ اپنی خالہ مہ پارہ سے پوچھتی ہے اس کی ماں کیسی تھیں۔ مہ پارہ بتاتی ہیں کہ اس کی ماں بہت خوب صورت تھی بالکل کالچ سے بنی عورت۔ وقار صاحب کی بہنیں بھی انہیں احساس دلاتی ہیں کہ سائرہ اس شادی سے خوش نہیں ہے۔ تب وقار صاحب سائرہ سے براہ راست بات کرتے ہیں کہ سائرہ کہیں اور انٹرنشپ تو نہیں ہے۔ تب سائرہ کہتا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے اور وہ اپنے باپ کی کوئی بھی خواہش رد نہیں کر سکتا۔

سائرہ کی شادی میرب سے ہو رہی ہے۔ میرب دو سال کی تھی جب ان کی ماں بھی دنیا سے چلی گئی تھیں۔ ابراہیم صاحب نے اس کے بعد شادی نہیں کی۔ ان کے پڑوسی اور دوست احمد سعید اور ان کی بیگم نے میرب کا خیال اپنے بچوں کی طرح رکھا سعید صاحب کی بیٹی ماریہ کی میرب سے گہری دوستی ہے ان کا ایک بیٹا عاشر ہے جو اجیبہ کو پسند کرتا ہے شادی کی

مہمان اول

Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section



READING
Section

تقریبات میں سائر کا رویہ بہت اکھڑا ہوا رہتا ہے۔ شادی کی رات بھی وہ میرب سے بہت رکھائی سے پیش آتا ہے وہ میرب سے کہتا ہے کہ وہ اس سے صرف وفاداری کی توقع رکھتا ہے اور اسے اپنی بہن اور والد کا خیال رکھنے کو کہتا ہے۔ اجیہ کی دوست شینا بہت آزاد خیال لڑکی ہے۔ اس کا بھائی آغا شایان اجیہ میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ اجیہ بھی اس کی طرف مائل ہے۔ جبکہ میرب کا بھائی سعد اجیہ کو پسند کرتا ہے۔

سائر کا رویہ میرب کے ساتھ بہت عجیب ہے۔ وہ معمولی باتوں پر شدید رد عمل ظاہر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ کسی بھی لڑکے سے بات نہ کرے۔

وہ عورت جس نے سڑک پر مہ پارہ کو دیکھا تھا۔ ایک خستہ فلیٹ میں رہتی ہے۔ وہاں سے کوئی پرانا پتلا نکال کر مہ پارہ کے گھر جاتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ مہ پارہ وہ گھر چھوڑ چکی ہے۔ لیکن وہاں کے مکین اسے وقار صاحب کے گھر کا پتادے دیتے ہیں۔

تب وہ کہتی ہے وقار آج سے سالوں پہلے تم نے جوازیت مجھے پہنچائی تھی اس کے بدلے کا وقت آپہنچا ہے۔

شیخ عبد الحمید کریانہ فروش ہیں۔ دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں، نازو، چندا اور مانو۔ چندا کا مزاج اور صورت سب سے الگ ہے۔ وہ بے حد حسین ہے اور پڑھائی کے بجائے دوسری رنگارنگ سرگرمیوں میں دلچسپی رکھتی ہے۔ شیخ صاحب کی لاڈلی ہے۔ کالج میں ایک ڈرامے میں قلو پطرحہ کا کردار کرتی ہے تو آصف شیرازی اسے نیوی پر اداکاری کی آفر کرتا ہے۔ وہ ایک ڈائریکٹر شکیل ملک کا ملازم ہے۔ اس آفر پر چندا بہت خوش ہوتی ہے لیکن وہ جانتی ہے کہ اس کے گھر والے کبھی اسے نیوی پر کام کرنے کی اجازت نہیں دیں گے اور شادی کر کے رخصت کر دیں گے۔ وہ آصف شیرازی سے کہتی ہے کہ تم مجھ سے شادی کر لو یہ اصلی شادی نہیں صرف ایک معاہدہ ہوگا۔ میں گھر والوں کے چنگل سے نکل آؤں گی۔ آصف مان جاتا ہے۔

میرب سائر کے رویے سے بہت پریشان ہے۔ وہ عاشر سے بات کرنے کو منع کرتا ہے۔

اجیہ کا تعلق آغا سے بہت بڑھ چکا ہے۔ دونوں ملاقاتیں کر رہے ہیں۔ اڈھیر عمر عورت اجیہ کو فون کر کے بتاتی ہے کہ اس کی ماں زندہ ہے۔ وہ کہتی ہے کہ وہ اجیہ کی ماں سے ملاقات بھی کر سکتی ہے۔

تیسری قسط

”بس اس سے شکل تو کنفرم ہو ہی سکتی ہے اور اگر وہ کوئی اور نکلی اور پلاسٹک سرجری وغیرہ کی کہانی بنانے بیٹھ گئی تب تم سمجھ جانا کہ یہ محترمہ کوئی ٹھگ ہیں۔“ وہ اسے مشورے دینے لگا۔

”کیسی عجیب بے وقوفانہ باتیں کر رہے ہو۔ بنا اس کی سچائی کی تصدیق کے لیے اس سے ملنے چلی جاؤں اور اگر واقعی وہاں کوئی ٹریپ ہوا پھر؟“ وہ ذرا غصے سے بولی۔

”ارے یار۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تم کسی بہانے سے اسے دیکھو۔“

”ہاں یہ ہو سکتا ہے۔“ وہ کچھ اطمینان سے بولی۔

”تم دو بگے میرا ساتھ۔“ اس نے آغا کو گہری

”مگر آغا۔ اگر وہ جھوٹ بھی بول رہی ہے تب بھی اسے چیک تو کرنا چاہیے ناکہ وہ جھوٹ کیوں بول رہی ہے۔“ وہ زور دے کر بولی۔

”ہاں۔ یہ بات تمہاری البتہ مناسب ہے۔“ وہ متفق انداز میں گردن ہلا کر بولا۔

”اسے چیک کس طرح کروں؟“ وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”تم نے اپنی امی کی فوٹو تو دیکھ رکھی ہوگی؟“ اس کے کہنے پر یاد آیا کہ اس کے گھر میں کہیں بھی ان کی تصویر نہیں تھی۔

”شاید اسٹور میں ہو۔“ اس نے سوچا۔

”پھر؟“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔

”یار! معاملہ ذرا سیرھا ہے بہتر ہو گا کہ تم اپنے گھر والوں کو اعتماد میں لے کر یہ قدم اٹھاؤ۔“ وہ دامن بچانے لگا۔

”دو دن میں ساتھ نبھانے کے وعدے پھیکے پڑ گئے۔“ وہ استہزائیہ ہنسی۔

”یہ کیا بات کی تم نے۔“ وہ خفگی سے بولا۔ ”وہ ایک مختلف معاملہ ہے یہ بالکل الگ۔ ساتھ نبھانے کا مطلب ہوتا ہے کہ اگر تم پر کوئی آزمائش آپڑے تو تمہارا ساتھ دوں ایسے بے وقوفانہ ایڈونچر میں میرا ساتھ دینا ضروری نہیں۔“

یہ آزمائش ہی ہے آغا۔ اس نے دل میں سوچا مگر بولی نہیں۔

”گھر چلنا ہے یا بیٹھنا ہے سارا وقت برباد کیا ہے تم نے اس بے کار کے ٹاپک پر بات کر کر کے۔“ وہ نروٹھے پن سے بولا۔

”نہیں۔ گھر چلتے ہیں۔ بیٹھ کر کیا کروں گی۔“ وہ مزید کچھ کہنے بنا اٹھ کھڑی ہوئی۔ بے زاری سے سر جھٹک کر آغا بھی اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔



ظہر کی اذان بلند ہو رہی تھی جب لالی نے میرب کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ میرب نے بے زاری سے دستک کی آواز سنی اور بال سمیٹتی اٹھ بیٹھی۔ گزشتہ رات کے واقعات ایک مرتبہ پھر فلم کی مانند اس کی آنکھوں میں پھرنے لگے۔ سائر کے الفاظ گھلے ہوئے سیسے کی مانند اس کے کانوں میں اترے تھے۔ ایک عجیب سے اضمحلال نے اس کے وجود کو جکڑ رکھا تھا۔ نہ اٹھنے کا دل چاہتا تھا نہ ہی کچھ کرنے کا۔ سو وہ صبح سے بنا کچھ کھائے پیے یونہی پڑی تھی۔ دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔

”کون آجاؤ۔“ وہ نقاہت سے بولی۔

”بڑی بی بی۔ وہ جی آپ کی دوست کا فون ہے۔“

صبح سے دوبار کرچکی ہیں۔ آگے ان سے بات کر لیں۔“ وہ اطلاع دے کر پلٹ گئی۔ وہ اپنے منتشر وجود کو سمیٹ کر اٹھی اور آہستگی سے چلتی ہوئی لاؤنج کے ڈارنر پر رکھے فون کا کریڈل جو ہولڈ تھا اٹھایا۔

”ہیلو۔“ دھیسے سے کہا۔

”ہیلو۔ جی بیگم صاحبہ، آپ زندہ ہیں یا گزر گئیں؟“ وہاں سے ماریہ چھوٹے ہی طنز آمیز لہجے میں بولی۔

”پتا نہیں زندہ ہوں یا محض جی رہی ہوں۔“ وہ

پر ملاں لہجے میں بولی تو دوسری طرف ماریہ بری طرح تھک گئی۔

”کیا ہوا میرو۔ سب خیریت تو ہے طبیعت کیسی ہے؟ سائر بھائی نے کچھ کہا۔“ وہ تابلو توڑ سوال کیے گئی۔

”پتا نہیں کیا بات ہے ماریہ۔ دل عجیب طرح سے گھبراہٹ کا شکار ہے۔“ وہ کرسی پر بیٹھ کر جیسے بے بسی سے بولی۔

”ایک تو تم اپنا فون بھی نہیں ریسیو کرتی ہو کیا مذاق ہے یار۔ کیا شادی کا مطلب اپنے پچھلے رشتوں سے کٹ جانا ہوتا ہے۔“ وہ بے حد خفا لہجے میں بولی۔

”کنسی کا مجھے نہیں پتا، مگر میرے لیے شاید شادی کا یہی مفہوم ہے۔“ وہ دل گرفتہ تھی۔

”کوئی جھگڑا ہوا ہے سائر بھائی اور تمہارے بیچ؟“ اس نے محتاط اندازہ لگایا۔

”جھگڑا۔؟ جھگڑا تو نہیں ہوا۔ جھگڑنے تو برابر ہی کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ حاکم اور محکوم کے درمیان کیسا جھگڑا۔“ اس نے زخمی مسکراہٹ سے کہا۔

”بہت آپ سیٹ ہو میرو۔“ وہ تاسف سے بولی۔

”کچھ روز کے لیے یہاں آجاؤ۔“

”بالکل نہیں۔“ وہ یک لخت ٹھوس لہجے میں بولی۔ ”میں نہیں آسکتی۔“

”کیوں نہیں آسکتیں، بالکل آسکتی ہو۔ ایسا کرو تم تیاری کرو، شام تک امی اور سعد تمہیں لینے آجائیں۔“

”گئے“

”نہیں ماریہ! سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں بار بار اپنا گھر چھوڑ کر وہاں نہیں آسکتی۔“ اب کی بار وہ خود کو سنبھال کر بولی۔

”چلو ٹھیک ہے، مرضی تمہاری مگر یار! اپنی خیریت کی اطلاع تو دے دیا کرو جانتی ہو امی کو پریشانی ہونے لگتی ہے۔“

”ہاں۔ آئندہ خیال رکھوں گی۔ گھر میں سب کیسے ہیں!“ اس نے بات پلٹنے کو پوچھا۔

”سب ٹھیک ہیں۔“

”چلو اچھا، میں فون رکھتی ہوں بعد میں بات کروں گی۔“

”اوکے“ فون پکڑے وہ کتنی ہی دیر گم صم بیٹھی رہی۔

”کیا ہوا میری بیٹی۔ سب خیریت تو ہے؟“ وقار صاحب جو اسٹڈی سے نکل رہے تھے اسے یوں ریسور پکڑے گم صم بیٹھا دیکھ کر تشویش سے پوچھنے لگے۔

”جی ابو۔ السلام علیکم!“ اس نے ریسور کریڈل پر ڈال کر انہیں سلام کیا۔

”کیا ہوا بیٹی۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ وہ اسے یوں بچھا بچھا سا دیکھ کر پریشان ہوا ٹھے۔

”جی۔“ وہ مختصراً بولی۔

”آج ہماری بیٹی نے ہمیں صبح کا ناشتا بھی نہیں دیا“ کیا بات ہے کوئی ناراضی ہے کیا۔“ وہ شگفتگی سے پوچھنے لگے۔

”نہیں تو بابا۔“ وہ شرمندگی سے بولی۔

”طبیعت کچھ بوجھل سی تھی بس اسی لیے۔“ وہ اٹھ کر ان کے پاس صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔

”کچھ کھایا تم نے۔ دیکھو تو چہرہ کیسا پیلا پڑ رہا ہے۔“ انہوں نے محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھا پھر لالی کو آواز دی۔

”لالی میری بیٹی کے لیے اچھا سا ناشتا تولے کر

”آو۔“

”رہنے دیں بابا! یہ تو لچ کا وقت ہے۔“

”کوئی بات نہیں تم بریج کر لو۔“ وہ مسکرائے۔ پھر پوچھنے لگے۔

”باب بھائی یاد آرہے ہیں؟ اپنی سعدیہ آئی کے گھر جانا ہو تو رہ آو ان کے ہاں کچھ روز۔“

”نہیں نہیں۔ مجھے کہیں نہیں جانا۔“ وہ اس طرح گھبرا کر بولی کہ وہ تعجب میں پڑ گئے۔

”اچھا بابا، جب تک لالی ناشتا لگاتی ہے میں فریش ہو کر آئی ہوں۔“ وہ جلدی سے اٹھ گئی۔ وہ ان کے پر شفقت انداز پر شرمندگی سی محسوس کر رہی تھی۔

وقار پر سوچ و کھوجی نگاہوں سے اس کی پشت تلے گئے۔

”السلام علیکم بابا جان۔“ اپنے روم سے نہایتی دھوئی سی اجیہ برآمد ہوئی۔ وہ ابھی ابھی کلج سے لوٹی تھی۔

”وعلیکم السلام!“ انہوں نے محبت سے پُرجے میں اس کے سلام کا جواب دیا۔

”بھابھی کہاں ہیں وہ آج انھیں نہیں ابھی تک؟“ اس نے صوفے پر بیٹھ کر آج کا اخبار یونہی اٹھایا۔

”طبیعت ٹھیک نہیں اس کی۔ اب وہ ہمارے گھر کی فرد ہے ذرا اس کا حال احوال پوچھتی رہا کرو۔ اس کے پاس بیٹھا کرو۔ اس کی دل جوئی کرو۔“ وہ اسے سمجھانے لگے۔ کہ دیکھ رہے تھے اجیہ گھر کے معاملات سے مزید لا تعلق ہو گئی تھی۔

”کیوں۔ ایسا کیا ہو گیا انہیں؟“ اس نے اخبار پر نظریں جمار کھی تھیں۔

”کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ تمام گھر والوں کو مل جل کر باہم محبت و رواداری سے رہنا چاہیے۔“ وہ اس کے اس طرح کہہ دینے پر کچھ برہمی سے بولے۔

اب کی بار اجیہ کچھ نہیں بولی۔ وقار بھی کتاب ٹیبل پر رکھ کرٹی وی پر نیوز لگا کر بیٹھ گئے۔

”بابا! امی کا انتقال کیسے ہوا تھا؟“ کچھ دیر بعد اجیہ نے بظاہر اخبار پر نگاہیں ڈالتے ہوئے سرسری انداز

میں پوچھا مگر وقار بری طرح چونکے۔

وہ اسے ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ انہوں نے آواز بند کر کے جواب دیا۔

”ان کی تدفین کہاں ہوئی ہے۔ یہیں یا لاہور میں؟“ اب کی بار اس نے اخبار تمہ کر کے رکھ دیا۔

”آہ۔ یہیں، لاہور سے تو ہم کافی عرصہ پہلے کراچی شفٹ ہو گئے تھے۔“ انہوں نے بتایا۔

”تب تو ان کی میت میں کوئی بھی نہیں آیا ہوگا۔ کیونکہ ہمارے زیادہ تر رشتے دار وہیں رہتے ہیں۔“

اجیہ نے نکتہ پکڑا۔

”اچھا، کہاں ہے ان کی قبر۔ آپ کو کبھی جاتے نہیں دیکھا۔“ وہ پوری طرح ان کے چہرے پر ابھرتے

ڈوبتے تاثرات کی جانب متوجہ تھی۔

”یہیں ڈیفنس کے قبرستان میں تھی۔ میں جاتا رہا ہوں شاید تمہیں دھیان نہیں۔“ وہ بڑی حیرانی میں

گھرے تھے اس کے سوالات سن کر۔

”کیا آپ مجھے لے کر جائیں گے وہاں۔“ وہ اب پوری سنجیدگی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو اجیہ۔ لڑکیاں قبرستان نہیں جاتیں۔“ وہ عاجز لہجے میں بولے۔

ان کے جوابات کا بے زار انداز لہجے کا کھوکھلا پن، اجیہ کو نیزے کی انی کی طرح چبھاتا تھا۔

”کہیں تو کچھ غلط ہوا ہے۔ کیا؟ یہ نہیں معلوم مگر میں بہت جلد معلوم کر لوں گی بابا۔“ وہ چمکتی نگاہوں

سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

تب ہی لالی نے کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ اور وہ کھانے کے لیے اٹھ گئے۔ کھانے کے بعد میرب

واپس اپنے روم میں اور وقار قیلولہ کرنے چل دیے۔ اجیہ اسی کی منتظر تھی۔ اسے دھندلا سا یاد تھا کہ کچھ

تصاویر تھیں ایک چرمی کالے بیگ میں اسے وہ بیگ اسٹور میں دھونڈنا تھا۔ اس نے بڑی آسانی سے ڈھونڈ

بھی لیا۔ وہ اسٹور میں ایک الماری کے نچلے خانے میں دیگر کاٹھ کباڑ کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ اس نے بیگ

جھاڑا۔ اور کھانتے ہوئے اس کی زنگ آلود زپ کھولی۔ اندر چند تصاویر تھیں۔ جن کے رنگ پھیکے پڑ

گئے تھے۔ نی سے آپس میں وہ کچھ جڑ بھی گئی تھیں۔ اس نے ایک تصویر احتیاط سے علیحدہ کی۔ اور عجیب

سے محسوسات میں گھر کر تصویر دیکھے گئی۔ ایک دو تصاویر نکال کر اس نے باقی چیزیں بیگ میں یوں ہی

ٹھونس دیں اور بیگ پھینک کر اسٹور سے باہر نکل آئی۔ اسے اب ایک ضروری کال کرنی تھی۔



لحہ لہجہ اس پر بہت گراں گزر رہا تھا۔

”اگر یوں ہو گیا۔“ کہیں ویسا ہو گیا۔ جیسے سوالات اس کے من میں اٹھ کر اس کے صبح شام بے چین کیے

ہوئے تھے۔ وہ اپنی چال چل چکی تھی۔ اب منتظر تھی کہ بازی کیا رنگ اختیار کرتی ہے۔ کبھی جی میں آنا کہ

ایک مرتبہ پھر کال ملائے۔ مگر بدقت تمام وہ اپنے آپ کو روک رہی تھی۔ شاید وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ سامنے

سے کیا رو عمل آتا ہے۔ اس وقت بھی وہ اپنے بوسیدہ سے بیڈ پر بیٹھی ممکنات اور ناممکنات کے متعلق

اندازے لگانے میں مصروف تھی تب ہی اس کا فون تھر تھرانے لگا۔ وہ بڑی طرح چونک گئی۔ پھر فون پر نگاہ

پڑتے ہی اس نے بڑی عجلت میں فون ریسیو کیا۔ ”ہیلو۔ میں اجیہ بات کر رہی ہوں۔ اجیہ فاروقی۔“

مکمل طور پر جذبات سے عاری لہجے میں کہا گیا۔ ”ہاں۔ بولو۔“ اس نے دانستہ لہجے پر واہنایا۔

”آپ اس روز جو کچھ کہہ رہی تھیں کیا وہ سچ ہے؟“

”اب بھی شک ہے تمہیں؟ میرا خیال ہے کہ ان دو تین دنوں میں تم نے یہ بات جاننے کی کوشش تو

ضرور کی ہوگی۔“ وہ یقین سے بولی۔ اس کا یقین غلط نہیں تھا۔

اجیہ کو اس کا یقین انداز کچھ اچھا نہیں لگا۔ ”میں نے کیا جاننے کی کوشش کی یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔

مجھے تو آپ کا ”سچ“ جانچنا ہے۔ تو پھر آپ کب ملواری

ہوں جنہوں نے اپنی تقدیر بدلنے کی کوشش ضرور کی مگر آج بھی کبھی کبھی لگتا ہے کہ وہ بدنصیبی جو میرا مقدر رہی ہے میرے بچوں کے تعاقب میں ہے۔ میں نے اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے کیسی کیسی کٹھنائیاں جھنگلی ہیں یہ میرا دل جانتا ہے۔

مگر یہ آج اجیہ۔ میری گڑیا سی بیٹی کو کیا ہوا؟

وہ کیوں اتنے اجنبی لہجے میں مجھ سے سوالات کر رہی تھی؟ کیا اس کا یقین مجھ پر سے اٹھ گیا ہے۔ نہیں نہیں ایسا تو ممکن نہیں۔ میں دودھ کا جلا ہوں نا اس لیے۔ ہر واقعے کو اسی پس منظر میں دیکھنے کا عادی ہوں۔ شاید یہ میرے اندر چھپا خوف ہے جو مجھے ہر لمحہ کھائے جاتا ہے۔ سارے سچ ایک جھوٹ کے آگے اپنی حیثیت نہ کھو دیں یہ دھڑکا مجھے ہمیشہ لگا رہتا ہے۔ زندگی نے کبھی بھی مجھے آہستہ آہستہ نہیں دیے ایک راہ

منتخب کر دی اور حکم ملا کہ اس پر چلتے جاؤ میں چلا گیا، چلا گیا مگر اب سوچتا ہوں کہ کیا کوئی راستہ اس کے علاوہ بھی تھا؟ وقار ماضی کے دھند لکوں میں کھور ہے تھے۔



اک چال چندا چل رہی تھی تو دو سہری چال اس کی قسمت۔

اس سے قبل کہ وہ گھر والوں کو اپنی پسند سے آگاہ کرتی۔ قاسم کے دوست کے توسط سے اس کے لیے ایک رشتہ آگیا۔ لڑکا خوش شکل تھا۔ تعلیم یافتہ تھا۔ ذاتی گھر و کاروبار تھا اور پھر نہ ماں نہ باپ، بہنیں اپنے گھر بار والی ہاں اک چھوٹا بھائی تھا جو عنقریب بڑھنے کے لیے باہر جانے والا تھا۔ بی بی رقیہ کو تو یہ رشتہ نعمت غیر مترقبہ ہی محسوس ہوا۔ وہ تو اس کی تنگ مزاجی سے ہمہ وقت ہولا کرتی تھیں کہ اس لڑکی کا سسرال میں گزارا کیسے ہوگا۔

”واہ رے مولا تیرے کام۔ گھر بیٹھے ایسا اچھا رشتہ دلوادیا، لو بیٹا مانو۔ بہن کو لڑکے کی تصویر دکھا دو۔ اچھا ہے دیکھ لے ویسے ہی بڑی نخریلی ہے۔“ آج بی بی کے

ہیں مجھے ”میری ماں سے“ وہ تمسخرانہ انداز میں بولی۔
”جب تم چاہو۔ جہاں تم چاہو۔“ اس نے جیسے مکمل طور پر اسے بے بس کر دیا۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔ وہ منڈ کالج کے سامنے جو پارک ہے اس پارک میں موجود جھیل پر وہ مجھ سے مل سکتی ہیں۔“ اس نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔

”کب اور کس وقت؟“ اس نے محتاط انداز میں پوچھا۔

”کل صبح دس بجے شارپ۔ میں انتظار کروں گی۔“
”کی آؤ گی؟“

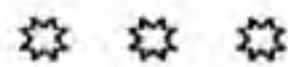
”ہاں کیوں؟“ اس کا ماتھا ٹھنکا۔

”بڑی بہادر ہو جو اتنی آسانی سے میری باتوں پر یقین کر کے اپنی ماں سے ملنے اکیلی آ رہی ہو۔“ تو صوفی انداز میں اسے سراہا گیا۔

”بعض معاملات میں بہادری دکھانا پڑتی ہے اور آپ پر یقین کرنے یا نہ کرنے کا سوال قبل از وقت ہے۔ اس بات کا فیصلہ تو کل ہو ہی جائے گا۔“ وہ پر اعتماد لہجے میں بولی۔

”خوب۔ تمہارا انداز مجھے اچھا لگا۔“

”خدا حافظ یاد رہے کل۔ دس بجے شارپ۔“
اس نے اس بات پر کوئی تبصرہ کئے بنا فون رکھ دیا۔
”شروعات تو اچھی ہے۔ تم ایک مرتبہ ملو تو سہی۔ ملاقات کا انجام بھی میں اپنی مرضی کے مطابق سیٹ کر ہی لوں گی۔“ اس کی آنکھوں کی چمک لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس چبھتی روشنی نے پورا کمرہ بھر دیا۔



اگر آپ بد قسمت ہیں تو یہ بد قسمتی تا عمر آپ کا تعاقب کرتی ہے۔ وہ کون لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ انسان اپنی قسمت خود لکھتا ہے۔ لکھتا ہے بالکل لکھتا ہے مگر جو اپنی قسمت خود لکھتا ہے وہ بھی تو خوش قسمت ہی ہوتا ہے۔ بد قسمت انسان اپنی تقدیر کہاں بدل پاتا ہے۔ اور میں بھی شاید ان ہی لوگوں میں سے

افسوں و خیراں دوڑی چلی آئیں۔
 ”ہیں تو ہوا کریں۔ سب کو اچھی طرح سمجھا دو مجھے
 نہیں کرنی وہاں شادی، جہاں یہ لوگ طے کیے بیٹھے
 ہیں۔“

بی بی حق دق سی اس کی بکو اس نے گئیں۔
 ”پھر کہاں کرنی ہے۔ وہ جگہ بتاؤ۔“ اس ٹھہری
 ہوئی سنجیدہ آواز پر بی بی مانو اور نازو کو لگا جیسے ان کے
 بدن کا سارا خون کسی نے نچوڑ لیا ہو۔

”ہاں۔ ہے ایک لڑکا، اسی سے شادی کروں گی
 میں۔“ وہ قاسم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بلا
 خوف و خطر بولی۔

”بے غیرت۔ تیری بڈی پسلی ایک کروں گا میں۔
 تیری اتنی ہمت۔“ بس لٹخوں کا کھیل تھا۔ قاسم کے
 منہ سے کف اڑنے لگا اور وہ بُری طرح اس پر پل
 پڑے۔

ہر اسماں سی نازو ہی اسے بچانے کو آگے بڑھی۔ بی

بی تو ششدر کھڑی تھیں اور مانو بُری طرح روپتے
 ہوئے انہیں تھا سے کھڑی تھی۔

”چھوڑو قاسم۔“ وہ اسے چھڑانے لگیں۔
 ”سمجھا دو اس بے حیا کو اچھی طرح۔ ورنہ مجھ سے
 بُرا کوئی نہیں ہوگا۔“ ان کا تنفس بُری طرح زیر و زور
 تھا۔

”اے۔“ وہ جو زمین پر اوندھی پڑی ہوئی تھی ایک
 جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔ ”جو کرنا ہے کر لو۔ شادی تو
 میں اسی سے کروں گی اور اگر مجھ سے زبردستی کی
 کوشش کی تو میں بھاگ جاؤں گی یاد رکھنا۔“ اک لمحہ
 کے لیے تو سب ہی کو لگا جیسے انہیں سننے میں کوئی غلطی
 ہوئی ہے۔ اتنی بڑی بات وہ کتنی آسانی سے کہہ گئی۔
 مگر نہیں۔ انہیں سننے میں نہیں اسے سمجھنے میں غلطی
 ہوئی تھی۔ بہت بڑی غلطی۔

”بے شرم۔ تجھے میں آج ہی مار کر تیرا قصہ تمام
 کرتا ہوں۔“ وہ جو باہر نکل رہے تھے پھر کر پلٹے۔
 ”اس کی ضرورت نہیں قاسم۔“ ایک خفیف و تھکی

لبوں پر اس کے لیے خیر ہی خیر کے کلمات رکھے تھے۔
 مانو جو پہلے ہی لڑکے کی تصویر دیکھ کر اوکے کر چکی تھی،
 خوشی خوشی تصویر اٹھا کر اپنے گمرے میں لے گئی۔

”دیکھا نیک بخت! میں نہ کہتا تھا“ میری چندا
 قسمت کی دھنی سے دھنی ان شاء اللہ وہاں راج کرے
 گی میری بیٹی۔“ شیخ صاحب حقہ گڑ گڑا گہری طمانیت
 سے بولے کہ وہ اور قاسم لڑکے کا گھربار دیکھ آئے
 تھے۔ چال چلن کے متعلق بھی تصدیق کروالی تھی۔
 خاندان کے حوالے سے بھی نسلی بخش چھان بین
 ہو چکی تھی۔ لڑکے کی بہنیں دور دور شہروں میں بیاہی
 گئی تھیں۔ انہیں شادی پر ہی آنا تھا۔ سارے
 معاملات قاسم کے دوست کے توسط سے طے ہونے
 تھے۔ چندا کی تصویر بھی اسی نے لڑکے کو دے دی
 تھی۔ اس نے اوکے کیاتب ہی یہ لوگ اسے دیکھنے
 گئے تھے۔

”کیا بکو اس کر رہی ہو؟“ وہ جواب بھی ابھی ریڈیو پر اپنی
 پسند کا نغمہ سن کر فارغ ہو کر بیٹھی تھی مانو کی بات پر
 اٹھ بیٹھی۔

”اور کیا۔ سچ ہی تو کہہ رہی ہوں، رشتہ پکا ہو گیا ہے
 تمہارا۔ یہ رہی لڑکے کی تصویر، مانو نے خوشی سے
 ملفوف، تصویر اس کے ہاتھ میں دی۔ چندا بھنا کر ایک
 جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔

”تم لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ مجھے بھیڑ بکری
 سمجھ رکھا ہے کیا۔“ وہ حلق کے بل اتنی زور سے چیخی
 کہ باورچی خانے سے گھبرا کر نازو دوڑی آئی۔ مانو اس
 کے رد عمل پر ہکا بکا ہی کھڑی تھی۔

”کیا بات ہو گئی، کیوں اتنی زور سے چلا رہی ہو۔“ وہ
 ناگواری سے بولی۔

”چیخوں گی اور زور سے چیخوں گی وہ دیوانگی سے بولی
 ان لوگوں کی ہمت کسے ہوئی میرا رشتہ یہاں طے
 کرنے کی۔“ وہ مارے طیش کے کپکپا رہی تھی۔

”آہستہ چندا ابا گھر پر ہیں۔“ نازو نے گھبرا کر اسے
 کنٹرول کرنے کی سعی کی۔ بی بی بھی یہ چیخ و پکار سن کر

”دیکھو وہ دیکھو گئی نیچے۔ ہا ہا۔“ وہ ہدیائی قہقہے لگانے لگی۔

”اجیہ۔ میری بہن۔“ اس کی آخری چیخ بڑی بے بس تھی کیونکہ گلابی آپل والی نے اس کی تہن کو پہاڑ کی چوٹی سے نیچے پھینک دیا تھا۔

”اجیہ۔“ اس کی گھبرا کر آنکھ کھلی تھی۔ اس نے کچھ دیر تک یاد کرنے کی کوشش کی کہ وہ کہاں ہے۔ پھر سائڈ ٹیبل سے پانی کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا کر ایک سانس میں خالی کر دیا۔ پھر اٹھا اور اضطراری انداز میں سگریٹ سلگا کر کچھ لمحوں تک کمرے میں یہاں وہاں ٹہلتا رہا۔ پھر رائٹنگ ٹیبل تک آیا۔ وہاں کالیپ روشن کیا۔ بے آواز انداز میں مقفل درواز کھولی اور اس میں سے گرین جلد والی ڈائری کھول کر کچھ لکھنے لگا۔ لکھتے لکھتے کبھی کبھی وہ رک کر لمبے لمبے سانس لینے لگتا۔ میرب نے آنکھوں پر رکھے بازوؤں کی اوٹ سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھ سائز کے چیخ کراٹھنے سے کھل گئی تھی تاہم اس نے اپنے آپ کو سوتا ہی ظاہر کیا۔ ماحول میں اترا سناٹا بتا رہا تھا کہ رات بہت بیت چکی ہے۔ مگر وہ اس جتنی رات میں آخر کیا لکھ رہا تھا۔ میرب پریشانی و تجسس کی ملی جلی سی کیفیت میں گھری سوچے گئی۔



یہ صبح اجیہ کی زندگی کی سب سے عجیب صبح تھی۔ وہ جلدی جلدی تیار ہو گئی اور ڈرائیور کے ساتھ کلج آگئی۔ ڈرائیور کے جانے تک وہ یوں ہی رخ موڑے کھڑی رہی۔ پھر اس نے اک میسیج سینڈ کیا۔ بوتل کے جن کی طرح آغا حاضر تھا۔ وہ اس کے ساتھ آج بھی سمندر کنارے چلی آئی۔

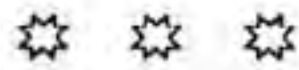
”اور اگر وہاں وہ موجود ہو میں تو۔“ وہ مضطرب سی ہو کر پوچھنے لگی۔

”تو کیا جا کر بات کر لیتا۔ پتا تو چلے آخر کیا راز ہے۔“ وہ مزے سے بولا۔

”تمہارے لیے یہ کہہ دینا آسان ہے آغا۔ میں

تھکی سی آواز گونجی۔“ جب نقیب گھر میں موجود ہوں تو اونچی فصیلیں بھی ریت کا ڈھیر ثابت ہوتی ہیں۔ میری رہی سہی عزت کا تماشا لگوانے سے بہتر ہے کہ اس لڑکے کے متعلق معلوم کرواؤ۔ مجھے ایک ہفتے کے اندر اندر ہی اسے اس گھر سے دفع کرنا ہے۔“

شیخ صاحب کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور آواز میں ڈوبنے والوں جیسی آہیں تھیں۔ مانو کے لبوں سے کھٹی کھٹی سی چیخ برآمد ہوئی۔ نازو نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ بی بی تیورا کر زمین پر گری تھیں۔



دور دور تک خشک، ٹیالے پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ نجانے وہ یہاں کیسے پہنچا تھا۔ آج بھی وہ ننگے پاؤں تھا۔ کنکر، پتھر، خشک خاردار جھاڑیاں اس کے پیروں کو زخم زخم کر چکی تھیں۔ سورج غائب تھا مگر بادل بھی نہیں تھے، نجانے یہ کون سا موسم تھا۔ جس، شدید قدر اور ماحول ٹیالا سا تھا۔ اور وہ دوڑ رہا تھا۔ نجانے اس پر کیا جنون طاری تھا۔ تب ہی اس کے کانوں نے مانوس سی آواز سنی۔ بے حد مہین و نالتواں سی آواز۔

”اجیہ۔ اجیہ۔“ وہ وحشت ناک انداز میں چلایا۔ ”میری بہن کہاں ہو؟“ وہ درد انگیز لہجے میں اسے دیوانہ وار پکارے گیا۔

”یہاں ہے آوا سے لو۔“ شوخ سی آواز پر وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تب ہی ایک پہاڑ کی چوٹی پر اس کو وہی گلابی آپل دکھائی دیا جس نے اس کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ اس کے سڈول بازوؤں نے اک چھوٹی سی بچی کو تھام رکھا تھا۔

”آجاؤ۔ اسے بچالو دیکھو منحوس رو رہی ہے۔ میں اسے نیچے پھینکنے لگی ہوں آجاؤ۔“ بڑے دل آواز انداز میں وہ اسے پکار کر بلارہی تھی۔

”مت پھینکنا اسے۔ میں آ رہا ہوں۔“ وہ متوحش سا

چینا۔

وہاں لگے بے شمار درختوں میں سے اک موندے تنے والے برگد کے درخت کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔ اس نے بے تابی سے گھڑی دیکھی سوادس ہو رہے تھے۔ تب ہی کالی چادر کی بکل مارے کوئی عورت یہاں وہاں مشکوک انداز سے دیکھتی ہوئی وہاں نصب ہنچوں کی اور بڑھتی دکھائی دی۔ پھر ایک بیچ منتخب کر کے وہ بیٹھ گئی۔ اس نے چادر سے اپنا آدھا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ وہ محتاط انداز سے ارد گرد دیکھے جارہی تھی۔ پھر اس نے منہ سے چادر ہٹا کر رومال سے شاید پسینہ پونچھا تھا۔ اور تب ہی اجیہ نے دیکھا۔ کھنڈرات بتا رہے تھے کہ عمارت وہی تھی جو اس نے شادی کی تصاویر میں اپنے باپ کے پہلو میں دیکھی تھی۔ اس کے ہاتھ پر ٹھنڈے پڑ گئے۔ دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ آنسو تھے کہ بے وجہ ہی گالوں پر پھسل آئے اور اس کے قدم میاں کی انداز میں اس کی جانب بڑھنے لگے۔ ابھی وہ اس بیچ کے نزدیک پہنچ بھی نہیں پائی تھی کہ وہ عورت لپک کر اس تک پہنچی۔

”میری بچی۔ میری اجیہ۔“ اس نے والہانہ انداز

میں اسے خود سے لپٹا لیا۔ ”کتنی تڑپتی ہوں۔ کتنا روٹی ہوں میں تمہارے لیے۔“ وہ اسے بے تحاشا چوم کر بولی۔ اجیہ سن سی کھڑی تھی۔

”کیسا اندھیر ہے میرے مولا۔ اک بے بس ماں اپنی نوزائیدہ بچی کے لیے تڑپتی رہی مگر کسی کو ترس نہ آیا۔“ اس کی آنکھوں سے سیل رواں جاری تھا۔

”آ۔ آپ نے مجھے کیسے پہچانا۔“ اجیہ کے منہ سے تحیر آمیز سرسراتی آواز نکلی۔

”ماں ہوں تمہاری میرے بچے! تمہارے وجود کی خوشبو نے تمہارا پتا بتا دیا۔“ وہ اسے یوں چھو چھو کر دیکھ رہی تھی گویا اس کے ہونے کا یقین کرنا چاہتی ہو۔

”چلو، چلو میرے گھر، باہر ٹیکسی کھڑی ہے۔ ابھی تو مجھے اپنی بچی سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر بے قراری سے بولی۔

”آج نہیں پھر بھی۔“ وہ شدید ذہنی دھچکے میں

جس مینٹل کنڈیشن سے گزر رہی ہوں اس کا تمہیں اندازہ نہیں۔“ وہ اس کے لا پروا انداز پر برہم ہوئی۔

”بھئی کیا ہو گیا ہے تمہیں۔“ وہ چڑ کر بولا۔ ”کیوں بات بات پر ناراض ہونے لگی ہو۔ میں تمہیں بالکل ٹھیک مشورہ دے رہا ہوں۔ اگر وہاں تمہاری مام ہو میں تو جا کر ان سے بات کر لیتا۔ نہیں تو صرف دیکھ کر کیا کرنا ہے۔ اچار ڈالنا ہے۔“ وہ اس سے بولا تو اجیہ اسے گھورنے لگی۔

”مسئلہ تو سارا یہی ہے۔ میرے لیے بچپن سے وہ مرچکی ہیں۔ اب اچانک وہ زندہ ہو کر میرے سامنے آئیں گی تو کیا تم میرے جذبات کا اندازہ لگا سکتے ہو کہ کیا ہوں گے؟“ وہ اسے اپنا موقف بتانے لگی۔

”جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ ویسے لگے گا تو تمہیں عجیب ہی۔ مگر یہ کیا سپینس ہے یار۔ تم نے اپنے گھر میں کسی سے ذکر کیا۔“

اس نے پوچھا۔

”نہیں۔“ اجیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بیچ جانے

کے لیے یہ ضروری تھا۔“

”تو گویا تمہیں اس عورت کی باتوں پر کچھ نہ کچھ یقین ضرور ہے؟“

”ہاں۔ نجانے کیوں میں اس کی باتوں کو رو نہیں کر سکی۔“ اس نے اعتراف کیا۔ ”مگر میں بے حد کنفیوژ ہوں۔“

”ہاں وہ تو لگ ہی رہی ہو، یہ لو پیو۔“ اس نے جو س کاٹن اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ جو اس نے بے دلی سے پرے کر کے نفی میں سر ہلادیا۔ پھر وہ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اسی اثناء میں پونے دس ہو گئے تب وہ اٹھ گئے۔

”وش یو بیسٹ آف لک۔“ آٹا نے اس کے گاڑی سے اترنے کے بعد اسے انگوٹھا دکھایا۔

”ہوں۔“ وہ ناچار مسکرائی اور پارک میں قدم رکھ دیے۔ اندر موجود اکادکا افراد نے اسے معنی خیزی سے دیکھا۔ وہ نظر انداز کرتے ہوئے۔ جھیل تک آئی اور

دو منٹ تک تو چندا سے خون آشام نگاہوں سے گھورتی رہی۔ پھر جھٹکے سے انھی اور صحن میں نکل گئی۔

”ابا سے شکایت لگانے گئی ہے“ مانو نے بے ساختہ کہا پھر یک دم ہی جیسے بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگی۔

”وہ یہ حق کھو چکی ہے مانو۔ جنہیں ہم نے اپنے دل میں بہت اونچے مقام پر بٹھار کھا ہو۔ وہ جب اس مقام سے گرتے ہیں تو اتنے نیچے چلے جاتے ہیں کہ جھک کر دیکھنے پر بھی دکھائی نہیں دیتے۔“ وہ کھانا کھا کر برتن رُے میں رکھنے لگی۔ تب ہی وہ واپس لوٹی اٹھے ہاتھ سے اپنی سیدھی کلائی تھامے۔ ”برنال کہاں ہے“ وہ تکلیف دہ انداز میں بولی۔ شاید اس نے چاول بنانے کے چکر میں اپنا ہاتھ جلا لیا تھا۔

”اماں کے پاس رکھی ہوئی ہے۔“ جواب مانو نے دیا تھا۔ نازو برتن سمیٹ کر بنا اس کی طرف دیکھے کمرہ عبور کر گئی تھی۔

”لا کے دو فوراً“ وہ اپنی کلائی پر پھونکیں مارتی ہوئی بولی۔ مانو انھی اور اماں کے کمرے میں جا کر آہستگی سے بولی۔

”برنال چاہیے۔ چندا نے اپنا ہاتھ جلا لیا ہے۔“ اور بی بی نے آج اس کے پھوٹن پر بالکل غصہ نہیں کیا۔ چپ چاپ اپنے سرہانے بے طاق میں بھی انواع و اقسام کی چیزوں میں سے برنال برآمد کر کے اسے تھما دی۔ مانو اسے تھام کر باہر چل دی۔ بی بی بلا ارادہ ہی وہ واقعہ سوچے گئیں کہ جب ایک مرتبہ انہوں نے چندا کے ذمے سبزی کاٹنے کا کام لگایا تھا۔ پیاز کاٹتے کاٹتے یک دم ہی تیز دھار چھری اس کے انگوٹھے پر پھر گئی تھی۔ زیادہ کچھ نہیں ہوا تھا، کھنص اوپر کی کھال پھلی تھی مگر اس نے رورور کر آسمان سربرا اٹھالیا تھا۔ پھر شیخ صاحب نے بی بی کے وہ لتے لیے تھے کہ خدا کی پناہ۔ اور یوں آئندہ اس سے سبزی کٹوانے پر بی بی نے توبہ کر لی تھی۔

”شیخ صاحب! کھانا کھالیں۔“ بی بی نے گھبرا کر

تھی۔ ”نہیں۔ نہیں آج ہی۔ ابھی تو میری ممتا کو قرار بھی نہیں ملا تمہیں دیکھ کر۔“ وہ جذباتیت سے بولی۔ تو وہ پسپا ہو کر اس کے ساتھ چل دی۔ زندگی کا یہ موڑ اسے کس سمت لے جانے والا تھا اگر جان جاتی تو یہیں ٹھہر جاتی۔



گھر میں موت کا سناٹا طاری تھا۔ گھر کے سب ہی نفوس ایک دوسرے سے دانستہ نگاہیں چرائے پھر رہے تھے۔ نہ کسی کو ڈھنگ سے کھانے پینے کا ہوش تھا نہ کسی اور بات کا۔ ایسے میں بی بی کی آواز کبھی کبھی ماحول کا سناٹا چیرتی۔

”ہائے میرے مولا۔ میرے مالک! یہ سیاہ دن دکھانے سے پہلے تو نے مجھے مٹی میں کیوں نہ ملا دیا۔“ وہ کر لارہی تھیں۔ اور شیخ صاحب تو وہی دنوں میں اپنے بستر سے لگ گئے تھے۔ انہوں نے ایک گہری خنپ اوڑھ رکھی تھی گہری بی جانتی تھیں کہ وہ اندر سے قطرہ قطرہ پکھل رہے ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی ہواؤں کی

طرح ہلکا پھلکا تھا تو وہ صرف چندا تھی۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ جسے گھر میں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ حالانکہ گھر میں وہ کچھ بیت چکا تھا کہ جس کا دوا نہ تھا۔

”کیا مصیبت ہے۔ آج پھر دوپہر میں روٹی بنالی۔ تم جانتی ہو مجھے دوپہر میں چاول کھانے کی عادت ہے، مجھے نہیں کھانی روٹی۔ جاؤ میرے لیے چاول بناؤ۔“ چندا نے دیکھ کر حسب معمول وعادت اعتراض جڑا۔ مانو خاموشی سے بنا کچھ۔ کہے اٹھنے لگی۔ نازو جو چندا کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اس نے یکدم ہی اس کا ہاتھ پکڑا۔

”تم پیٹھ کر کھانا کھاؤ اور تم اس نے نفرت سے اسے دیکھا، روٹی کھانی ہے تو کھاؤ۔ نہیں تو خود ہاتھ پیرہا لو۔ یہاں کوئی تمہارا نوکر نہیں ہے جو تمہارے احکامات بجا لائے۔“ وہ کہہ کر کھانے کی جانب متوجہ ہو گئی۔

کے اپنے ماں باپ کے منہ پر کالک تھوپیں۔“

ادھر چندا ان ساری باتوں سے بے نیاز چادر منہ تک تانے چھوٹے سے ریڈیو نہ کہیں سے آتا کوئی ڈرامہ بغور سننے میں مشغول تھی۔

دو تین دن قبل آصف شیرازی کو فون پر وہ تمام تفصیلات بتا کر سمجھا چکی تھی۔ اس جمعہ کو وہ اس کا رشتہ لے کر آ رہا تھا۔ یہ محاذ وہ اتنی جلدی فتح کر لے گی۔ اس کا تو خود اسے بھی اندازہ نہیں تھا۔



”میرے ابا جی مرحوم غریب آدمی تھے۔ کچھ قرضہ لے رکھا تھا انہوں نے تمہارے باپ سے۔ وہ قرضہ اتار نہیں سکے۔ الثامیر ارشتہ تمہارے باپ کے ساتھ طے کر دیا۔ میں نے اس وقت انیسویں سن میں قدم رکھا تھا تمہارا باپ مجھ سے دو گنی عمر کا تھا۔ مگر میں باپ اور بھائیوں کی عزت کو سنبھالنے ہوئے اس کے گھر بیاہ کر چلی آئی۔ بڑی عمر کامریوں بھی شکی ہی ہوتا ہے اور اگر اس کی بیوی ذرا چھٹی شکل و صورت کی ہوتی تو اس کے شکوک و شبہات سوائیزے پر پہنچ جاتے ہیں۔ میرے کہیں آنے جانے پر پابندی تھی۔ غیر تو غیر رشتے داروں تک سے یہ مجھے مکنے نہیں دیتا تھا۔ میرا میکا جانا اسے پسند نہیں تھا۔ زندگی مجھ پر ہر طرح سے تنگ کر رکھی تھی اس آدمی نے۔“

ایک روز میں ذرا در کو تنہائی سے گھبرا کر کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔ اس نے دیکھ لیا۔ مجھے اتنا مارا کہ میں بے ہوش ہو گئی۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی میرے ماں باپ فوت ہو چکے تھے۔ زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ چند روپوں کی خاطر جس جہنم میں بیٹی کو اٹھا پھینکا تھا۔ بھائی اپنی دنیا میں مگن، بہنیں بیاہ کر دو روپس جا بسی تھیں۔ ایسے میں کون تھا جو تمہارے باپ سے اس کے ناروا سلوک کے متعلق باز پرس کرتا اس لیے وہ اور شیر ہوتا گیا۔ میں اپنی جانب سے ہر ممکن کوشش کرتی کہ اسے کوئی شکایت نہ ہو مگر قسمت کی خرابی انسان درست نہیں کر سکتا۔

”دل نہیں چاہ رہا نیک بی بی۔“ وہ ہنوز کروٹ لیے لیٹے تھے۔ مگر ان کی نم آواز گواہ تھی کہ وہ رو رہے تھے۔ بی بی تڑپ کر ان کے تحت پر آ کر بیٹھیں۔

”شیخ صاحب! آپ رو رہے ہیں؟“ خود ان کی آواز بھی بھگ گئی تھی۔

”نہیں بی بی۔ یہ تو میرے دل میں پکتا ناسور ہے جو آنکھوں کے راستے بہ رہا ہے۔“ وہ نحیف آواز میں بولے۔

”کیوں ہلکان کر رہے ہیں خود کو۔“ وہ ان کا کندھا دبانے لگیں۔

بعض اوقات درد اتنا سوا ہوتا ہے کہ اسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ وہ بھی اس وقت درد کی اسی کیفیت سے گزر رہے تھے۔

”پانی پلاؤں؟“

”پلا دو۔“ اور بی بی انھیں اور ان کی مخصوص صراحی میں سے صاف ٹھنڈا پانی نکال کر انہیں دیا۔ وہ اٹھے۔ انہوں نے گلاس تھاما۔ گلاس تین گھونٹ میں خالی کر کے انہیں دوبارہ تھما دیا۔ وہ اٹھے کھڑے ہوئے اور اپنی چلنے کی اسٹک تھامی۔

”کہاں چلے۔ کھانا تو کھالیں؟“ بی بی نے پریشانی سے کہا۔

”بھوک نہیں۔ گھر میں دم گھٹ رہا ہے۔ ذرا باہر سے ہو کر آتا ہوں۔“ انہوں نے قدم پر ہائے۔

”مگر ابھی تو بہت دھوپ ہے باہر۔ ذرا دن ٹھنڈا پڑنے دیں۔“

”میرے اندر اتنی آگ دہک رہی ہے بی بی کہ باہر کی گرمی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ مت رو کو مجھے نکلنے دو باہر۔“ وہ بے بسی سے بولے۔ اور یہ کہہ کر باہر چل دیے۔ بی بی ایک مرتبہ پھر گھٹی گھٹی آواز میں رونے لگیں۔

”ہائے میرے اللہ۔ کیا اسی دن کے لیے اماں باوا اپنے بچوں کے لاڈ اٹھاتے ہیں کہ یہ یوں اپنی من مانی کر

رورہی تھی۔
اجیہ بنا پلک جھپکائے بہتی آنکھوں میں بے یقینی
سموئے یہ داستان سستی رہی۔
”پھر اس کے بعد آپ نے کیا کیا؟“ اس کے منہ
سے سرسراہٹ نما آواز نکلی۔

”کیا کرتی؟ خود کشی ہی کرنے جا رہی تھی کہ
تمہارے باپ کے دوست ہی نے سمجھایا کہ اپنے گھر
والوں سے بات کرو۔ میں ان سے بات کرتی اس سے
قبل ہی وہ میرے گھر والوں کو میری بے حیائی اور گھر
چھوڑ جانے کے قصے سنا چکا تھا۔ انہوں نے صاف
لفظوں میں مجھے قبولنے سے انکار کر دیا۔“ اس نے
آہستگی سے اپنی آنکھیں پونجھتے ہوئے دل گرفتہ انداز
میں بتایا۔

”بہت ظلم ہوا ہے آپ کے ساتھ۔“ اس نے
ہچکیوں کے درمیان کہا۔ ”پھر آپ نے زندگی دوبارہ
شروع کیسے کی؟ کیا شادی کر لی؟“

”پہلی شادی ہی اتنا بھیانک تجربہ تھی کہ آئندہ
کر کے کیا کرنا تھا۔ تعلیم میری اتنی نہیں تھی شروع
میں چھوٹی موٹی نوکریاں کر کے گزارا کرتی رہی۔
قسمت میڈم کے پار لڑے گئی۔ آج تک وہیں جا ب
کر رہی ہوں۔“ وہ یاسیت سے مسکرائی۔

”آپ نے اپنے حق کے لیے آواز کیوں نہیں

اٹھائی۔“ وہ ایک دم مشتعل ہو کر بولی۔

”میں مفلس، غریب، خالی جیب میری بھلا کون
سنتا؟“ اس نے اپنا مذاق خود اڑایا۔

”مجھے آپ کے بھائی بہنوں پر حیرت ہے انہوں
نے کیوں آپ کی بات نہیں سنی؟“ وہ کڑوے لہجے میں
بولی۔

”اپنے گلے میں گھنٹی کون باندھتا ہے۔“ وہ رنجیدہ
سی بولی۔ ”میرے سچ کو تسلیم کر لیتے تو اخلاقاً یا دنیا
داری ہی کو مجھے چھت کا تحفظ بھی فراہم کرنا پڑتا۔“

”زندگی نے بہت غلط کیا ہے آپ کے ساتھ۔“
اس کے آنسو پھر بننے لگے۔ وہ بستر سے اٹھی اور اس

یہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں اکثر شہر سے باہر جاتا
تھا۔ ان دنوں یہ اپنے ایک خاص کارندے کو میری
نگرانی پر مامور کر جاتا۔ یہ تمہاری پیدائش کے بعد کا
قصہ ہے یہ حسب معمول اپنے کسی کام سے دوسرے
شہر جا رہا تھا۔ اس روز بہت موسم خراب تھا۔ بارش
نے طوفان کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ مغرب کے بعد
ایئر پورٹ کے لیے نکل گیا۔ تمہاری پیدائش کے بعد
میں بہت بیمار ہو گئی تھی۔ مارے نقاہت کے مجھ سے
اٹھا بھی نہ جاتا تھا۔

اس کو گئے تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ اس کا ہی
کوئی دوست ایک اچھی کیس اٹھائے اس سے ملنے چلا
آیا۔ اس زمانے میں موبائل تو تھے نہیں۔ گھر کا فون
ڈیڈ پڑا تھا۔ اس نے اطلاع دینے کی کوشش کی تھی۔ مگر
بوجہ نہ دے سکا۔ خیر اس کی آمد کا مجھے بشیرین ملازمہ
نے بتایا۔ خرابی موسم کی وجہ سے سڑکیں بند تھیں۔
سواری ملنا بھی مشکل۔ میں نے کہا مہمان خانہ کھلوادو
وہیں پڑ جائے گا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میری نیکی اگلے
ہی لمحے میرے گلے پڑ جائے گی۔

طوفانی بارشوں کی وجہ سے فلائٹ کینسل ہو گئی
اور تمہارا باپ واپس گھر چلا آیا۔ میں اس وقت اپنے
کمرے میں سو رہی تھی جب اس کے بڑی طرح چیخنے

سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں وحشت زدہ سی ہو کر
لاؤنج کی طرف بھاگی۔ وہ اپنے دوست کو بری طرح
زدو کوب کر رہا تھا دوست اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی
کوشش کرتا رہا تھا مگر اس پر تو گویا دیوانگی طاری ہو چلی
تھی۔ جیسے ہی میں لاؤنج میں داخل ہوئی اس کے غصے کا
سُخ میری طرف ہو گیا۔ اس نے مجھے بہت مارا،
مغالطات بلیں، الزام تراشی کی، بہتان باندھا۔ میں
ہاتھ جوڑے گڑ گڑاتی رہی مگر تمہارے شکی مزاج باپ
کو ذرا بھی رحم نہ آیا۔ اس نے دھکے مار کر مجھے اس
بڑی بارش میں اپنے گھر سے نکال باہر کیا۔ تمہیں بھی
دیکھنے نہ دیا۔“

اس کا پورا وجود جھٹکوں کی زد میں تھا اور وہ بری طرح

میں اٹکا دیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چلا رہا تھا اس نے آخری منظر جو دیکھا وہ یہ تھا کہ وقار صاحب تیزی سے اس کے نزدیک آرہے تھے انہیں پوری قوت سے دھکیلنے کی خواہش لیے وہ زمین پر گرتی چلی گئی۔



آج جمعہ تھا۔

آنے والے مہمان ناپسندیدہ ہی سہی مگر بہر حال آتو رہے تھے اور ان کی خاطر داری بھی کرنی ہی تھی۔ بے دلی ہی سے ہی مانو نے گھر کی صفائی ستھرائی کر دی تھی۔ نازو نے شامی کباب، چنا چاٹ اور دہی بڑے بھی بنا دیے تھے۔ چند اسب کی کیفیات سے بے پروا اپنی رگڑائی دھلائی میں مصروف تھی۔ شیخ صاحب نجانے کون کون سی فکرات کو محقق کے دھوس میں اڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بی بی بھی تفکرات میں گھری بے دلی سے رات کی سزنی بنا رہی تھیں۔ قاسم بالکل خاموش سا تھا جبکہ ہاسم تو کسی گنتی ہی میں نہیں تھا۔ سہ پہر سے شام ہوئی۔ شام سے مغرب۔ پہلے دلی دلی سی بے چینی پھیلی۔ پھر جھنجھناہٹ تیز ہو گئی۔ سچی سنوری سی چندا پہلے تو اتراتی پھر رہی تھی۔ پھر وہ کچھ جھنجھلائی، آخر میں فکر مند ہو کر آصف کو آفس کے نمبر پر فون کیا۔

”شیرازی تو صبح کی فلائٹ سے دہی روانہ ہو گئے

ہیں۔ انہیں ملک صاحب نے نوکری سے برخاست کر دیا ہے۔ کوئی کیس چل رہا تھا ان پر۔ سب کچھ ان کی اپنی وجہ سے ہوا ہے۔“ آریٹرنے جو اطلاع دی وہ چندا کے لیے کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔ اسے لگا اس کے وجود کے پر نچے اڑ گئے ہوں۔

”وہاں کا کوئی کانٹیکٹ نمبر۔“ اس نے تھوک نکل کر پوچھا۔

”جی، ہمیں کیا معلوم۔ بلکہ یہ بات بھی مشکوک ہی ہے کہ وہ دہی ہی گئے ہیں یا۔“ وہ کچھ اور بھی کہہ رہی تھی مگر چندا کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے لہذا

کے نزدیک آکر اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر مضبوط لہجے میں بولی۔

”کوئی آپ کا ساتھ دے یا نہ دے میں آپ کا ساتھ دوں گی۔ آپ کو وہ سارے حق دلاؤں گی جن سے آپ کو محروم رکھا گیا ہے۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔“ اس نے ایک عزم سے کہہ کر اس کے ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگا لیے۔

”میری بچی۔ مجھے تجھ سے یہی امید تھی۔ سدا خوش رہے تو۔“ اس نے بھی جواباً ”اجیہ کا ماتھا چوم کر کہا۔

”امی! مجھے جانا ہے۔ نہیں تو دیر ہو جائے گی۔“ وہ اپنا بیگ اٹھا کر کندھے پر ٹکاتی ہوئی بولی۔

”ایسے کسے۔ تو پہلی بار گھر آئی اور یوں ہی سوکھے منہ چلی جائے گی۔“ وہ گڑبڑا کر اٹھی۔

”رہنے دیں۔ اب تو آتی ہی رہوں گی۔ فی الحال مجھے ٹیکسی تک چھوڑ دیں۔“ وہ اداسی سے مسکرا کر بولی۔

زندگی میں انسان پر ناقابل یقین وقت بھی آتا ہے۔ یہ اجیہ کی زندگی کا ناقابل یقین وقت تھا۔ مگر اس نے بہت جلد ہی اس پر یقین کر لیا تھا۔

واپسی کے سفر میں۔ وہ سارا وقت روتی رہی۔ رو کر اس کی آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں۔ سر میں درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں پورا بدن جلتا انگارہ بن گیا تھا۔

جس دم وہ ٹیکسی سے اپنے گھر کے گیٹ پر اتری۔ اس کے قدم اندر بڑھنے سے انکاری ہو گئے۔ وسیع و عریض گیٹ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں کے سامنے تنگ و تاریک سیڑھیاں جو اس کی ماں کے فلیٹ تک جاتی تھیں، گھوم گئیں۔ اسے دیکھ کر جو کیدار نے مستعدی سے دروازہ کھول دیا۔ وہ مرے مرے قدم اٹھاتی اندر داخل ہوئی۔ سامنے ہی سرسبز لان تھا۔ کھلے پھولوں کی خوشبو پر بوسیدہ فلیٹ کی متعفن راہداریاں حاوی ہو گئیں۔ گھر کے داخلی حصے داخل ہوئی تو فرش کی چمک۔ نے دھیان فلیٹ کے اکھڑے ٹوٹے فرش

دوسری جانب سے آتی آواز سن نہ سکے۔

سے بے ہوش ہوئی تھیں تم۔" میرب نے مفصل بتایا۔



اس کے حلق میں کانٹے سے پڑے تھے تب ہی اس نے مندی مندی سی آنکھوں سے ارد گرد کا جائزہ لیا۔

"تم پورے تین دن بعد مکمل ہوش و حواس میں ہو آج۔ ہوش میں تو خیر تم کچھ دیر بعد ہی آگئی تھیں مگر بخار کی شدت کی وجہ سے غنودگی میں تھیں پھر مسکن دواؤں کے زرا اثر تم سوتی بھی رہیں۔"

"اوہ نو۔ تجھے تین دن ہو گئے اس کنڈیشن میں۔" وہ حیرت سے بولی۔

"ارے اجیہ! کیا ہوا کچھ چاہیے کیا؟" اس کے سرہانے رکھی کرسی پر براجمان میرب نے اسے اٹھتے دیکھ کر سرعت سے پوچھا۔

"جی بالکل۔ بابا تو مسلسل روتے رہے ہیں۔ وہ تو تمہارے سرہانے سے ہٹ ہی نہیں رہے تھے۔"

"پانی۔" وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ بیٹھ میں ایک درد کی لہر اٹھی اس کی کراہ نکل گئی۔

انہیں بڑی مشکل سے سمجھا بچھا کر ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو اپنے روم میں بھیجا ہے ایسے تو وہ خود اپنی طبیعت خراب کر لیں گے۔" اس نے بتایا۔ مگر نجانے کیوں وقار صاحب کے تذکرے پر اجیہ کے چہرے کے عضلات تن سے گئے۔

"آرام سے بیٹھو بھئی اور یہ لو پانی۔" وہ اسے پانی تھما کر واپس کرسی پر ٹک گئی۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟" اس نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر رکھا۔

"مجھے کیا ہوا ہے۔" وہ نا سمجھی سے اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"سائر بھی دن رات چکر لگا رہے ہیں تمہارے کمرے کے۔ اجیہ! تم بہت خوش قسمت ہو کہ تمہارا خیال رکھنے والے تم سے پیار کرنے والے لوگ تمہارے نزدیک ہیں۔" میرب بولی۔

"واہ بھئی۔ یہاں ہم سب کی جان تمہارے لیے آدھی رہ گئی اور تمہیں یہ ہی نہیں معلوم کہ تمہیں ہوا کیا ہے؟" وہ شوخی سے بولی۔

"کون جانے خوش نصیب ہوں یا بد نصیب۔ دنیا کی سب سے سچی اور بے لوث محبت سے دور کرنے کے بعد یہ میرے لیے اب اتنے فکر مند کیوں ہیں۔"

"بھابھی پلیز۔ میں سنجیدہ ہوں۔" وہ واقعی کھل سنجیدگی سے بولی۔

اب تو میں اپنا خیال خود رکھ سکتی ہوں کن کی فکر مندی اور احساس اس وقت کہاں تھے جب یہ اک شیر خوار کو اس کی ماں سے علیحدہ کر رہے تھے ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ دروازے پر دستک دے کر وقار صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔

"اس روز تم کالج سے آنے کے بعد بے ہوش ہو گئی تھیں۔ تمہیں بہت تیز بخار تھا غالباً" اسی لیے اس دن تم کالج سے ٹیکسی پر آئی ہوگی۔ طبیعت خراب تھی تو گھر کال کر کے ڈرائیور کو بلوا لیتیں۔" میرب نے رمان سے بتایا۔

"آں۔ ہاں" وہ چونکی اس کے ذہن میں اس دن گزرے واقعات در آئے۔

"فون بزی تھا گھر کا۔ ان فیکٹ میرے پاس بیلنس بھی نہیں تھا۔" وہ وضاحتی انداز میں بولی۔

"میری بیٹی جاگ گئی۔" وہ خوشی سے اس کی جانب بڑھے۔

"خیر۔ پھر تمہیں بابا نے اٹھایا اور روم تک لائے۔" ڈاکٹر انصاری کو فون کیا۔ انہوں نے تمہارا چیک اپ وغیرہ کر کے تمہیں انجکشن دیے۔ ذہنی دباؤ کی وجہ

"جی بابا! جاگ گئی۔ اب تو ریلیکس ہو جائیں آپ۔" میرب خوش دلی سے بولی۔ اجیہ کا چہرہ سپاٹ تھا۔

"کچھ کھائے گی میری بیٹی۔" وہ اس کے نزدیک بیٹھ کر اپنا بازو اس کے گرد پھیلا کر بولے۔

"آں۔ ہاں" وہ چونکی اس کے ذہن میں اس دن گزرے واقعات در آئے۔

"فون بزی تھا گھر کا۔ ان فیکٹ میرے پاس بیلنس بھی نہیں تھا۔" وہ وضاحتی انداز میں بولی۔

"میری بیٹی جاگ گئی۔" وہ خوشی سے اس کی جانب بڑھے۔

"خیر۔ پھر تمہیں بابا نے اٹھایا اور روم تک لائے۔" ڈاکٹر انصاری کو فون کیا۔ انہوں نے تمہارا چیک اپ وغیرہ کر کے تمہیں انجکشن دیے۔ ذہنی دباؤ کی وجہ

"جی بابا! جاگ گئی۔ اب تو ریلیکس ہو جائیں آپ۔" میرب خوش دلی سے بولی۔ اجیہ کا چہرہ سپاٹ تھا۔

"کچھ کھائے گی میری بیٹی۔" وہ اس کے نزدیک بیٹھ کر اپنا بازو اس کے گرد پھیلا کر بولے۔

"آں۔ ہاں" وہ چونکی اس کے ذہن میں اس دن گزرے واقعات در آئے۔

"فون بزی تھا گھر کا۔ ان فیکٹ میرے پاس بیلنس بھی نہیں تھا۔" وہ وضاحتی انداز میں بولی۔

"میری بیٹی جاگ گئی۔" وہ خوشی سے اس کی جانب بڑھے۔

"خیر۔ پھر تمہیں بابا نے اٹھایا اور روم تک لائے۔" ڈاکٹر انصاری کو فون کیا۔ انہوں نے تمہارا چیک اپ وغیرہ کر کے تمہیں انجکشن دیے۔ ذہنی دباؤ کی وجہ

"جی بابا! جاگ گئی۔ اب تو ریلیکس ہو جائیں آپ۔" میرب خوش دلی سے بولی۔ اجیہ کا چہرہ سپاٹ تھا۔

(میں سے زہر لادیں۔ نو اس اذیت سے تو چھٹکارا ملے) وہ کس سے مس نہ ہوئی۔

”کیا بات ہے ہمارا بیٹا ہم سے ناراض ہے کیا؟“ انہوں نے اس کی پیشانی چوم کر پوچھا۔ اس نے محبت کے اس مظاہرے کو بہ وقت تمام برداشت کیا پھر بے تاثر لہجے میں بولی۔

”آپ جا کر آرام کریں۔ مجھے کچھ درکار ہو گا تو بھابھی سے کہہ دوں گی۔“

”اچھا۔ اچھا جیسے تمہیں اچھا لگے۔ اوہ بیٹی میرب! انہیں یک دم جیسے کچھ یاد آیا، تمہاری سہیلی کا فون ہے، جا کر سن لو اور ایک بات تو بتاؤ۔ یہ تمہارا موبائل کیوں ہر وقت آف رہتا ہے۔ تمہارے میکے سے جب کوئی فون کرتا ہے یہی شکایت کرتا ہے۔ دھیان رکھا کرو۔“ وہ ذرا خفگی سے بولے۔

”کچھ روز پہلے فون پر ان نون نمبر سے کالیں آرہی تھیں۔ اس لیے سائز کہہ رہے تھے کہ فون آف رکھو، ویسے بھی گھر کا فون ہے تو مجھے پرستل فون رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ اٹھتے ہوئے بتانے لگی۔

”رائنگ کالز تو گھر کے نمبر پر بھی آجاتی ہیں۔ فون بند کرو تا تو اس مسئلے کا حل نہ ہو۔ تم کرو آن اپنا فون۔ ابراہیم بھی کیا سوچتا ہو گا ایسے فون بند کر کے بیٹھ جانا کوئی تک ہے۔“

”سائز نہیں مانیں گے بابا۔ پلیز آپ مجھے مجبور مت کریں۔“ وہ پریشانی سے بے ساختہ بولی۔ وقار صاحب

تفکر میں پڑ گئے۔ میرب مڑ کر کمرہ عبور کر گئی۔ اجیہ کے چہرے پر مسکراہٹ زہر کی طرح پھیلی تھی۔

”گویا تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔“ اس نے سوچا۔



”دیکھ لیا من مانی کا نتیجہ۔ جس کی خاطر باپ بھائی کی نظر میں خود کو ارزاں کیا وہ چپ چاپ تے کہیں اور

نکل گیا۔ اگر اسے اتنا ہی تمہاری عزت کا خیال ہوتا تو لاکھ رکلوٹیں آئیں مگر وہ اپنی زبان سے نہ پھرتا۔ جس آدمی کی زبان ہی ایک نہیں اس کا کیا اعتبار۔ اگر ماں باپ کے فیصلے کے آگے سر جھکتیں تو آج یہ سر شرمندگی سے نہیں جھکا ہوا ہوتا۔“ نازو کی لٹاڑ۔

”اب بھی وقت ہے شریف بیبیوں کی طرح باپ کے فیصلے کے آگے سر جھکاوے۔ آگے سارے راستے آسان ملیں گے۔ ارے جو تجھے بیچ راستے میں چھوڑ گیا۔ اب اس کے لیے جوگ لے کی کیا۔“ بی بی کی نصیحتیں۔

”مجھے اب اس کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں جتنا ذلیل وہ ہمیں کروا سکتی تھی کروا چکی۔ وہ بی بی پر کام کرنے والا نو سر باز اچھا ہوا خود ہی بھاگ گیا۔ گھر تک آتا تو سہی ٹانگیں نہ توڑتا اس کی تو قاسم نام نہیں۔“ دن رات قاسم کے دعوے۔

شیخ صاحب البتہ کچھ نہ بولے گھر کی فضا مگر تھی۔ اس کی وجہ سے مانو کو بھی کالج سے اٹھالیا تھا۔ وہ بیٹھی الگ کلمتی رہتی۔ کچھ روز میں نازو کی تاریخ لینے اس کے سرال والوں کو آنا تھا۔ بی بی اس سے پہلے ہی یہ اونٹ کسی کروٹ بٹھا دینا چاہتی تھیں۔

اور وہ چپ چاپ اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑے ہوئے تھی۔ زندگی میں سب کچھ اتنی آسانی سے نہیں ملتا اور اپنے خوابوں کی تعبیر تو بالکل بھی نہیں۔ یہ بات تو وہ جانتی تھی کہ راستے میں کٹھنایاں، دشواریاں آئیں گی مگر وہ اس بات سے ناواقف تھی کہ اس کے راستے ہی مسدود ہو جائیں گے۔ وہ دن رات سوچوں میں غلطی رہتی۔ شہزادی کو دو تین بار مزید فون کرنے پر بھی آپریٹر نے سابقہ جواب ہی دیا تھا۔ گھر پر فون نہیں تھا۔ اور اس کے گھر کا تا بھی لاپتا تھا۔ ایسے میں وہ کوئی روزن تلاش کر رہی تھی جو اسے اس قید سے نجات دلائے اور پھر اک روز اس نے فیصلہ کر لیا۔



”تم کن مسائل کا شکار ہو میری۔ تم کچھ شیئر کیوں نہیں کرتیں شاید بہتری کے آثار پیدا ہو جائیں۔“ وہ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر نرمی سے بولی۔
میرب کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

”کیوں جھیل رہی ہو تنہا اپنی ذات پر، کچھ بتاؤ گی نہیں تو مسئلہ حل کیسے ہو گا؟“ اس کے ہاتھ کا لمس تھا یا کیا تھا، میرب کے آنسو بہتے چلے گئے۔

”سائز کسی اور میں انٹرشڈ تھے۔“ وہ بولی۔
”تمہیں کیسے معلوم؟“ وہ اس کے ہاتھ پر سے ہاتھ ہٹا کر پوچھنے لگی۔

”میں نے ان کی پرسنل ڈائری میں اس کا فوٹو دیکھا تھا۔“

”صرف تصویر دیکھ کر تم نے یہ قیاس کر لیا۔ یہ تو بڑی بے وقوفی ہوئی۔“ اس نے جھاڑا۔ ”اور محض تصویر دیکھ کر ہی تم نے اپنا یہ حال کر لیا؟“ وہ ناپسندیدگی سے بولی۔

”یہ بات نہیں ہے، میرا ہر عمل ان کی نگاہ میں مشکوک ہے۔ میری ہر بات کو وہ بڑی کڑی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ سائز بھائی شکی مزاج شوہر ہیں اس میں دو سری لڑکی میں انٹرشڈ ہونے والی بات کہاں سے آگئی۔ اگر بالفرض وہ کہیں انٹرشڈ تھے بھی تو وہ تو ماضی کا قصہ ہوا نا۔ اب تو تم ان کی بیوی ہو۔ ایک زندہ مسلم حقیقت۔ تم کس لیے یوں ہاتھ پر چھوڑ کر بیٹھ گئی ہو۔“ اس نے لتاڑا۔

”میں مجھ پر یقین ہی نہیں تو میری محبت پر کیسے ہو گا۔“ وہ ناخن کترنے لگی۔ ماریہ نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”کیا کہتے ہیں وہ؟“

”وہ۔ انہیں لگتا ہے کہ میں۔ میں کردار کی کچی ہوں۔“ اس کے آنسو پھر چہرہ بھگونے لگے۔

”وہاٹ، ماریہ ناگواری سے بولی ”ناگل تو نہیں ہو گئے وہ ان کے ذہن میں یہ غناس سلایا کیسے؟“

”مجھے کیا معلوم، میں تو اسی نیچے پر پہنچی ہوں کہ

”میں نے سوچا تم ملنے آؤ گی نہیں سو اسی لیے کل تمہیں فون کیا اور آج خود ہی ملنے چلی آئی۔“ ماریہ نے فروٹ چاٹ کھاتے ہوئے کہا۔ وہ اور میرب اس وقت میرب کے روم ٹیرس پر رکھی، کین کی چیئرز پر براجمان تھیں۔ سچ کے بعد وہ ٹیرس پر چلی آئی تھیں۔ موسم ابر آلود تھا اس لیے سہ پہر میں بھی شام کا گمان ہو رہا تھا۔ سرمئی بادل ٹھنڈی مست ہوا، فضا میں تیرتے خوش رنگ طائر اور سہ پہر کا مخصوص سناٹا۔

یہ موسم میرب اور ماریہ دونوں کی پسندیدہ تھا۔
”اچھا کیا یار۔ میرا خود تم سے ملنے کو بہت دل چاہ رہا تھا۔“

”اجیہ کی طبیعت کیسی ہے؟“

”بہتر ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اور تمہاری؟ مجھے تو تمہاری طبیعت بالکل بھی ٹھیک نہیں لگ رہی۔ اسکن دیکھو کتنی رف ہو رہی ہے اور آنکھوں کے نیچے حلقے ہونٹ خشک اور پٹری زدہ، میرب! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ چند ہی ماہ میں۔“ ماریہ از حد تشویش سے بولی۔ اور خالی پیالی سامنے میبل پر رکھ دی۔ میرب پھکی سی ہنسی ہنس دی۔

”کچھ نہیں۔ بس کھر کے بکھیرٹوں میں وقت ہی نہیں ملتا خود پر دھیان دینے کا۔“

”آدھ درجن تو نوکر ہیں تمہارے ہاں۔ کیا تم مل جوتی ہو۔“ وہ تپ گئی۔

”شادی شدہ زندگی اتنی آسان نہیں ہے ماریہ۔“ وہ سنجیدگی اور نجیدگی سے بولی۔

”تمہیں دیکھ کر تو مجھے شادی سے چڑھنے لگی ہے۔“

”خدا نہ کرے جو تمہیں میری طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑے۔“ وہ بے ساختگی سے بول کر پشیمان دکھائی دینے لگی۔ محسوس تو ماریہ نے بہت کچھ کیا تھا اور اس سے پارہا استفسار بھی کیا تھا۔ مگر اس نے کبھی میرب کے حالات کی کرید نہیں کی تھی۔

”اب بہتر ہوں۔“ اس نے کھڑکی کے پردے سمیٹتے ہوئے بتایا۔

”قسم سے یار! جب سے تائی سے تمہاری حالت کا سنا ہے تب سے تخت بے چین ہوں۔ میرا بس چلتا تو کب کا تمہیں دیکھنے آچکا ہوتا۔“

”جانتی ہوں۔“

”اس روز کیا ہوا تھا؟ ملیں تمہاری مام“ اس نے فطری تجسس میں گھر کر پوچھا۔

”میں اس کے متعلق فی الحال بات کرنا نہیں چاہ رہی۔“ اس نے واقعی بڑی مشکل سے اپنا ذہن ہٹایا تھا۔

”کرنا بھی نہیں چاہیے۔ اتنا رومانٹک موسم ہے، سنو! ملنے آجاؤ۔“ وہ جان کھینچ لینے والے لہجے میں ملتجی ہوا۔

”آغا۔ میں نہیں آسکوں گی فی الحال۔“ اس نے اس کی التجا سے صرف نظر کرتے ہوا کہا۔ آغا نے اک طویل ٹھنڈی سانس لی۔

”بکھی بکھی تو پوری ہٹلر بن جاتی ہو تم، خیر جلدی ٹھیک ہو جاؤ یار۔ میں مس کر رہا ہوں تمہیں۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

”چلو رکھتی ہوں بعد میں بات ہوگی۔“

”اوکے۔“ اس نے فون کلن سے ہٹایا۔ تب ہی سرمئی آسمان پہ بادلوں کی گرج گونجی اور اس کے کچھ ہی دیر بعد چاروں طرف جل تھل ہو گیا۔ وہ چپ چاپ گرل سے سر نکائے گاڑن پر برستی بارش کا منظر دیکھے گئی۔ اس کے احساسات اس وقت عجیب تر ہو رہے تھے۔ دد اتنا تھا کہ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی رگ رگ میں محشر بپا ہے اور سکون ایسا کہ مرجانے کو جی چاہے۔

زندگی کبھی کبھی انسان کو بے بسی کے کس مقام پر لاکھڑا کرتی ہے۔ بچپن ہی سے جس کی جدائی کا دکھ ساتھ لے کر جوان ہوئی۔ کتنی بار شدت سے سوچا کہ کاش میری ماں زندہ ہوتی اور آج یہ دعا قبول ہوتی بھی تو کس رنگ میں۔

شاید وہ کسی کو پسند کرتے تھے۔ اس نے انہیں دھوکہ دے دیا۔ اب وہ ہر لڑکی کے کردار پر شک کرتے ہیں۔ میں ان کی بیوی ہوں۔ ان کے رحم و کرم پر ہوں۔ مجھے تو جو چاہے کہہ سکتے ہیں۔“ وہ افسردگی سے جاتی چلی گئی۔

”ہاں۔ بات تو تمہاری معقول ہے۔ یہ وجہ ہو سکتی ہے مگر میرو پھر تو یہ بہت تشویشناک بات ہے۔ وہ تو تمہاری زندگی عذاب بنا دیں گے۔“ وہ کہہ نہیں سکی کہ عذاب ہی تو بنا رکھی ہے زندگی۔

”تم انہیں کسی سائیکالوسٹ کو دکھاؤ۔“ اس نے خلوص دل سے مشورہ دیا۔

”یہ سب اتنا آسان نہیں ہے ماریہ۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”یوں گھٹ گھٹ کر جینا آسان ہے تمہارے لیے۔“ وہ ناراضی سے پوچھنے لگی۔

”تو پھر میں کیا کروں۔“ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ ماریہ گہری افسردگی سے اسے دیکھتی رہی۔

”رو مت میرو۔ میں کچھ کرتی ہوں۔“ اس نے اس کا کندھا تھپک کر کہا۔

”پلیز ماریہ۔ کسی سے ذکر مت کرنا ان باتوں کا میں اپنے بابا کو کوئی دکھ نہیں دینا چاہتی۔“ وہ ملتجیانہ لہجے میں بولی۔

”ہاں میں سمجھتی ہوں۔ تم فکر مت کرو۔“ اس نے تسلی آمیز انداز اختیار کیا۔



”کیا حال ہے تمہارا جانم۔ کہاں ہو، کیسی ہو تم؟“ اس کی آواز سنتے ہی آغا حسب توقع بے قراری سے گویا ہوا۔ آج اس کی طبیعت بہتر تھی سو اس نے فون جو بیٹھری حتم ہو جانے کی وجہ سے بند پڑا تھا، آن کیا۔ مسڈ کال نوٹیفکیشن سے معلوم ہوا کہ آغا کل سے لاتعداد کالز کر چکا ہے۔ اس کے تشویش ظاہر کرتے مسجوز بھی تھے۔ تب ہی اس نے آغا کو کال ملائی۔

”میں برآمدے میں کرسی ڈال کر بیٹھوں گی بھیک
آپ لیجئے گا پھر کافی ساتھ ہی پی لیں گے“ وہ
مسکرائی۔ جبری مسکراہٹ کہ اس وقت کچھ بھی کرنے
کادل نہیں چاہ رہا تھا۔
”بس تو پھر آجاؤ۔“ پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ باہر
نکلے۔

”ارے کہاں چلیں تم؟ اندر بیٹھو ابھی تو بیماری
سے اٹھی ہو۔“ نیوز دیکھتے وقار اجیہ کولان میں نکلا دیکھ
کر فکر مندی سے بولے۔

”فکر مت کریں اتنی آسانی سے نہیں مریں گی۔“
وہ خشونت آمیز کبجے میں کہہ کر باہر نکلتی چلی گئی۔
میرب کو بارش کی پڑی تھی اس لیے اس کا کٹروالجہ و
انداز محسوس نہ کر سکی۔ اس کی بات پر وقار کا چہرہ بچھ سا
گیا تھا۔

”تمہیں بارش میں نہانا کیسا لگتا ہے؟“ میرب نے
برستی بوندیں ہتھیلیوں پر جمع کرتے ہوئے پوچھا۔
”ایک دم بے کار۔“ اجیہ نے منہ بنا کر بتایا۔
”ارے مگر اکثر لڑکیاں تو بارش کی بہت شوقین
ہوتی ہیں۔“

”آپ مجھے تو اس اکثریت سے خارج تصور
کریں۔“ وہ ٹھوڑی سیدھے ہاتھ پر نکائے سنجیدہ
نگاہوں سے بارش کا رقص دیکھ رہی تھی۔
”میرادل چاہتا ہے کہ میں بارش کی طرح نرم جھم
ناچوں۔“ میرب کی آواز بہت مدھم مدھم تھی اور وہ بہت
کھوئے کھوئے سے انداز میں کہہ رہی تھی۔

”بارش میرے اندر ڈھیروں اداسی سی بھرتی ہے۔
مجھے ایسا لگتا ہے جیسے بارش ہمیں ہماری زندگی کے خالی
پن کا احساس دلانے آئی ہے۔“ اجیہ کی نگاہیں دور
نہیں بھٹکیں۔

”بارش کی آواز مجھے بہت سکون بخشتی ہے۔“
”مجھے اس کی آواز سے وحشت ہوتی ہے۔“

”اپنا اپنا نظریہ ہے۔ مجھے تو یہ موسم دیوانہ کر دیتا
ہے۔“ وہ مست انداز میں گول گھومی۔ اجیہ اس مرتبہ
خاموش رہی۔ اک دم ہی سے مسکراہٹ نے اس کے

جی تو چاہ رہا ہے کہ جا کر ان ظالموں کا گریبان پکڑ کر
ایک بار تو ضرور ہی پوچھوں کہ جتے جی کسی کے بیچ
جدائی ڈالنے والے خداؤں۔ کیا تبھی تمہیں میری
محرومی پر ترس نہیں آیا۔ اس لاچار عورت کو تھی داناں
کرتے وقت تمہارے ہاتھ کیوں نہ کانپے۔ کس بیدردی
سے اٹھا کر اسے کسی کوڑے کی طرح اپنی زندگیوں سے
نکال پھینکا۔ پوچھوں تو سہی کہ کیا اس کا قصور اتنا ہی بڑا
تھا کہ اس پر زندگی کا ہر دروازہ بند کر دیا جاتا مگر بے بس
ہوں۔ مجبور ہوں میں۔ وہ ٹھیک کہتی ہیں۔ اگر ان
لوگوں کو ہماری ملاقات کا علم ہو گیا تو ایک مرتبہ پھر وہ
خالی ہاتھ رہ جائیں گی۔ اور یہ ہی میں نہیں چاہتی۔
گرم گرم پکھلتا لاوا اس کا چہرہ بھگونے لگا۔ دروازے پر
کھٹکا ہوا تھا۔ اس نے تیزی سے اپنے آنسو پونچھے۔
اور خود کو کمپوز کیا۔

”اجیہ۔ کیسی طبیعت ہے؟“ آنے والی میرب
تھی۔

”جی بھابھی بہتر ہوں۔“ اس نے مڑتے ہوئے
جواب دیا۔

”جانتی ہو! یہ موسم مجھے دیوانہ کر دیتا ہے۔“ وہ
بچوں کی سی خوشی اور معصومیت سے گویا ہوئی۔
”اچھا۔ تو آپ انجوائے کریں۔“ وہ برش اپنے
بالوں پر پھیرتی ہوئی بولی۔

”کیلے کیا خاک مزہ آئے گا۔“ وہ بے دلی سے بولی۔
”تو سائز بھائی تو اس وقت آفس میں ہوں گے۔
آپ انہیں کال کریں۔“ وہ برش رکھ کر پلٹی۔

”افوہ وہ جھینپ گئی میرا وہ مطلب نہیں تھا۔
اصل میں اپنے گھر میں میں اور ماریہ بارش میں بھیک
کر، گرم گرم پکوڑے چپس کھا کر اور کافی پی کر اس
موسم کو انجوائے کرتے تھے۔“

”تو چلیں میں چلتی ہوں آپ کے ساتھ۔“ اجیہ
یوں بھی اپنے اندر کی تنہائی سے اکتائی ہوئی تھی۔

”ارے۔ یہ ہوئی نابات“ وہ بے ساختہ خوش دلی
سے بولی۔ ”مگر کہیں بھینکنے سے تمہاری طبیعت واپس
نہ بگڑ جائے۔“ اسے خدشہ ہوا۔

”ف خدا یہ آدمی۔ نجانے کون کون سے انسانوں کا
گلا گھونٹے گا میرے۔“ وہ سر تھامے بیٹھی تھی۔
”یہ ہر وقت بے کار کارونا دھونامت شروع کر دیا
کرو۔ جاؤ چینیج کر کے میرے لیے کافی بنا کر لاؤ۔“
ناچار وہ اٹھی۔ شاور لیکر چینیج کیا پھر کافی بنا کر واپس
کمرے میں آئی تو وہ ٹیرس بہ تھا۔
”بیٹھو۔“ وہ کافی رکھ کر بیٹھنے لگی تو وہ یکدم بولا۔
”مجھے کام ہے۔“ وہ رکھالی سے بولا۔ چہرے پر
آنسوؤں کے مٹھے مٹھے نشانات تھے۔
”کچھ دیر بعد کر لیتا۔“ وہ بیٹھ گئی۔
”تم مجھے پاگل تو نہیں سمجھتیں۔“ اس کے سوال پر
بے ساختہ اس نے اپنا جھکا سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس
کی جانب ہی متوجہ تھا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
”دیکھو میرو! زندگی بہت مشکل ہے۔ اتنی کہ تم
تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“ وہ اضطراری انداز میں اٹھ
کھڑا ہوا۔ وہ بھی اٹھ کر اس کے برابر میں آکھڑی
ہوئی۔

”زندگی اتنی دشوار عموماً ہوتی نہیں جتنا کہ ہم خود
اپنے ہاتھوں سے اسے بنا ڈالتے ہیں۔“ وہ بولی۔

”زندگی کا ایک ہی کاری دار سارے فلسفوں کو
فیل کر دیتا ہے میرو۔“ وہ گنہگار لہجے میں بولا۔

”میں فلسفہ کیا جانوں سائر۔ یہ تو سامنے کی حقیقت
ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ جب جینا مرنا اسی شخص
کے ساتھ ہے تو پھر کیوں نہ بہادری سے سب کچھ فیس
کیا جائے۔ اس نے سوچ لیا تھا۔

”حقیقت آزار میں مبتلا کر دیتی ہے۔“
”ہرگز نہیں عمقاً تو کی روشنی میں زندگی زیادہ سہل
طریقے سے آگے بڑھتی ہے۔“

”میرو۔ کیا بارش تمہیں خوفزدہ نہیں کرتی۔“ اس
نے گردن موڑ کر اس معصومیت سے اس سے استفسار
کیا کہ یک لحظہ تو میرب کا جی چاہا اسے خود میں سمو کر
اس شخص کے دل میں گڑے سارے کانٹے اپنی
پوروں سے جن لے

لیوں کا احاطہ کیا تھا اس کی بے خودی دیکھ کر۔ تب ہی
اجیہ نے پورچ میں آکر رکتی سائر کی کار دیکھی۔ میرب
آنکھیں بند کیے چہرہ اونچا کے کھڑی بارش میں بھیگ
رہی تھی۔ اجیہ نے سائر کو لپک کر اس تک آتے
دیکھا۔ اس نے یقیناً ”بڑی زور سے میرب کا بازو دبوچا
تھا کہ تکلیف اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔
وہ چہرہ جو کچھ دیر پہلے گلاب کی مانند کھلا ہوا تھا سائر کو
دیکھتے ہی سرسوں کے باسی پھول میں تبدیل ہو گیا۔

”اندر چلو۔“ سائر کی آواز تھی یا غراہٹ۔ میرب تو
میرب اجیہ کے بھی رونے لگے کھڑے ہو گئے۔ اور وہ اسے
وحشی جنگیوں کی طرح اندر کھینچتا چلا گیا۔

اجیہ نے بے حد کرب سے یہ منظر دیکھا۔ اس کی
آنکھیں لچک بھر کو حیرت میں ڈوبی تھیں مگر دوسرے ہی
لحظے حیرت کی جگہ اشتعال نے لے لی۔

سائر کھالی۔ بابا کار تو ہیں ویسے ہی شکی، تنگ نظر
اور غصہ ور آپ نے تھیک کہا تھا امی۔ بابا یقیناً ”ایک
ظالم انسان رہے ہوں گے۔ وہ تنفر سے سوچے گئی۔
بارش اسی تو اتر سے برس رہی تھی۔



”مرو ادھر۔“ سائر نے ایک جھٹکے سے لا کر میرب کو
بیڈ پر پھینکا۔ وہ بے آواز رو رہی تھی۔

”اب کیا گناہ سرزد ہو گیا مجھ سے۔“ وہ چیخ ہی تو گئی۔
”زیادہ زبان درازی مجھے پسند نہیں پہلے بھی تمہیں
وارن کر چکا ہوں۔“ وہ پرسکون انداز میں کف لنکس
کھول رہا تھا۔

”مگر آپ کی ناراضی کی وجہ تو پوچھ سکتی ہوں نا۔“ وہ
سک کر بولی۔

”بارش میں نہانے کا اتنا ہی شوق ہے تو اپنا شوق
چھت پر جا کر پورا کرنا چاہیے تھا تمہیں۔ لان میں یوں
بارش میں اچھل کود کر کے گھر کے نوکروں کو دعوت
نظارہ دینے کی کیا ضرورت تھی۔“ وہ درشتی سے بولا۔

”وہاں کوئی نہیں تھا۔“ وہ بولی۔
”مگر آؤ سکتا تھا نا۔“ اس نے بات ہی ختم کر دی۔

نمٹانا چاہتی تھیں مگر قاسم کوئی رسک لیے پر تیار نہ تھا۔
سواسی لیے وہ سب سے پہلے رخصت ہوئی اور یوں اس
کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

کافی سوچ بچار کر کے کیا گیا یہ فیصلہ چندا کے حق
میں بہت ہی بہتر ثابت ہوا۔ جمیل اس کا شوہر اس کی
معصومیت اس کے حسن پر بے طرح مرعٹا تھا۔ اس کا
صرف ایک چھوٹا بھائی ہی تھا اس کے ساتھ جو شادی
کے محض پندرہ ہی دن بعد بغرض تعلیم انگلینڈ
سدا ہارا۔ ساس سر کا جھگڑا تو سرے سے تھا ہی
نہیں۔ ننڈیں بھی دور دور شہروں میں تھیں۔ ایسے
میں وہ تھی اور اس کا بے دوام کاغلام اس کا شوہر جمیل۔



”کیوں بند ہے مسلسل اس کا فون۔ کہیں اس
جذباتی لڑکی نے سب کچھ گھر جا کر تو نہیں بتا دیا۔“ گل
نے موبائل غصے سے پٹخا۔ وہ دو تین سے مسلسل اجیبہ کو
فون ملتا رہی تھی اور مسلسل ہی اس کا فون بند جا رہا تھا۔
خداشات اور واہموں نے اس کی ننڈیں اڑا رکھی
تھیں۔

کیا گھر کے نمبر پر فون کر لوں؟ کتنی ہی بار وہ یہ
سوچ کر رد کر چکی تھی۔ اپنی جاب پر بھی اس کا جی نہیں
لگ رہا تھا۔ وہ اٹھی اور اپنے نیم ماریک و بوسیدہ سے
فلیٹ میں چکرانے لگی۔

”کیا کروں۔ کیا کیا ہے اس لڑکی نے کچھ معلوم تو
پڑے۔“ تب ہی اس کا فون بجا۔ وہ لپک کر آئی اور
جلدی سے فون ریسیو کیا۔

”ہیلو۔“ وہ بے تابانہ بولی۔

”ہیلو۔ السلام علیکم۔ میں اجیبہ بات کر رہی ہوں۔“
”میری بچی کہاں رہ گئی تھی تو۔ تیری یہ ماں کتنی
پریشان رہی تیرے لیے۔“ اس کی آواز بھینکنے لگی۔

”میں کل آئی ہوں آپ کی طرف۔ بس یہی بتانے
کے لیے ہی الحال فون کیا ہے۔“

”ہاں۔ ہاں ضرور آؤ۔ میرا غریب خانہ تمہارے
لائق تو نہیں مگر کیا کروں میرا تو ٹھکانہ وہی ہے۔“ وہ

”بارش سے کیا خوف۔“ اس نے دانستہ بے پرواہ
لہجے میں کہہ کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”مجھے لگتا ہے یہ سب کچھ چھین لے گی مجھ
سے۔“ وہ آسمان کی جانب نا پسندیدگی سے دیکھتا ہوا
بولتا۔ بارش اب ہلکی پھوار میں تبدیل ہو گئی تھی۔

”یہ تو خود رب کے حکم کی محتاج ہے اس میں اتنی
طاقت کہاں۔ سائز، آپ اپنے رب پر بھروسہ کر بیجیے ان
شاء اللہ وہ آپ کے سارے اندیشے، فکریں اور
خداشات سب دور کر دے گا۔“ وہ حوصلہ افزا انداز میں
بولی۔ وہ چند ثانیے بے یقینی سے اس کی جانب دیکھتا رہا
پھر یکدم بولا۔

”تم مجھے چھوڑو تو نہیں دوگی میرو۔ تمہیں میرے
ساتھ کسی کمی کا احساس تو نہیں ہوتا۔“ اس کا انداز ڈرا
ڈرا سا تھا۔ خداشات میں گھرا ہوا۔ کچھ دیر میرب
پریشانی سے اس کی شکل دیکھے گئی۔

”آپ کو یہ وہم کیوں ستاتا ہے سائز۔ میں آپ کی
بیوی ہوں۔ ہمراز ہوں ہمراہی ہوں۔ اگر آپ کے دل
میں کوئی بوجھ ہے تو مجھ سے بانٹ بیجیے۔“ میرب کو لگا
کہ یہ آسمانی لہو ہے جو اسے غیب سے فراہم کیا گیا
ہے۔ اگر اس نے اس موقع کا فائدہ نہ اٹھایا تو وہ بڑے
نقصان میں رہے گی۔

”چلو کافی پیو۔ ٹھنڈی ہو گئی ہوگی۔“ وہ معاثر اور
واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔

اسرار اپنی جلدی کہاں کھلتے ہیں۔ میرب ایک ہو کا
سابھر کر کرسی پر آئی تھی اور ٹھنڈی ہوتی تلخ کافی لیوں
سے لگالی۔



چندا نے قاسم کے لائے رشتے پر جاہی بھولی تھی۔
گھر بھرنے گویا سکون کی سانس لی تھی۔ جبکہ شیخ
صاحب نے کسی رد عمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ٹھیک کہا
تھا نازو نے دل کے اونچے سنگھاسن پر بیٹھنے والے جب
اپنے مقام سے گر جائیں تو وہ جھک کر دیکھنے پر مجھی
دکھائی نہیں دیتے۔ بی بی اس کی شادی نازو کے ساتھ

یاسیت سے بولی تو اذیت کی ایک شدید لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔

”آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔“ اس نے بہ طور خاص پوچھا۔

”نہیں نہیں بالکل نہیں۔ بس تم آ جاؤ میرے لیے یہ ہی کافی ہے۔“

”پھر کل ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ۔“



”میری کلج فرینڈ ہے نا ماہ۔ اس کا بھائی سائیکائرسٹ ہے۔ P.E.C.H.S میں کلینک ہے ان کا میں نے اس سے تمہارا مسئلہ ڈسکس کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پوری، سٹری معلوم ہو تب ہی کچھ مشورہ دیا جاسکتا ہے۔ آئی مین ان کے بچپن کے واقعات جوانی کے حالات وغیرہ وغیرہ۔“ ماریہ نے کہا۔

”مگر وہ سب تو مجھے معلوم نہیں۔“ وہ پریشانی سے بولی۔

”یہی تو میرب معلوم کرونا کھوجو کریدو انہیں بلکہ کھوج اور کرید بھی رہنے دو ان سے یوں ہی ان کے بچپن کے متعلق سوالات کرو دوستوں کے بارے میں پڑھائی کے بارے میں۔ تم بیوی ہو ان کی۔ شوہر اور بیوی کے پاس تو اتنا کچھ ہونا ہے شیئر کرنے کے لیے۔“

”مگر کوئی شیئر کرنا چاہے تب نا۔“ اصل مجبوری یہی تھی۔

”تو وقار انکل سے پوچھ لو میوں ہی نا محسوس انداز میں۔“

”پوچھ چکی ہوں۔ کوئی خاص بات نہیں بتائی انہوں نے سوائے اس کے کہ سائز بچپن سے ہی بہت حساس ذہن پڑھا کو اور تنہائی پسند قسم کا بچہ تھا۔“ میرب نے بتایا۔

”گویا نفسیاتی پن کی ساری علامات بچپن ہی سے موجود تھیں موصوف میں۔“ ماریہ ٹھہر کر بولی۔

”ارے ارے میرب کے لبوں پر خفیف سی

”ذرا ادب سے بات کرو بھئی۔“

”مجھے کیا کرنا ہے ان کا ادب کر کے تمہارا فرض ہے۔ تم جی بھر کر کرو بھی اور کراؤ بھی۔ یار میو تم نے بتایا تھا کہ تم نے ان کی پرسنل ڈائری سے تصویر نکالی تھی۔“ ماریہ نے جیسے نکتہ پکڑا۔

”ہاں۔ مگر ڈائری وہ لاکڈ رکھتے ہیں۔“ میو بھی جیسے اس امکان پر غور کرنے لگی۔

”افوہ ایک تو تم گھامڑ بہت ہو ارے بھئی لاک توڑا بھی تو جاسکتا ہے نا۔ ایک ایسا بندہ جو اندر سے بہت گہرا ہو حساس ہو جس کا کوئی دوست و ہمزائہ ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی پر یقین نہیں کرتا آئی مین کسی انسان پر۔ مگر وہ ڈائری لکھتا ہے۔ بس یہی پوائنٹ ہے میو۔ یقیناً وہ اپنے خیالات، احساسات ڈائری کے سپرد کر کے مطمئن ہو جاتے ہوں گے کہ ڈائری تو بے جان ہے اور بے جان چیزیں دھوکہ نہیں دیتیں۔“ ماریہ مارے جذبات کے تیز تیز بولتی رہی۔

”میں تمہاری بات نہیں سمجھی۔“ وہ ناہمی سے بولی۔

”یار! ان کی ڈائری پڑھنے کی کوشش کرو کیا پتا کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔“ اس نے سمجھایا ایسے تو یہ مسئلہ حل ہونے والا نہیں ہے۔ تمہیں تھوڑی ہمت دکھانی ہوگی۔“

”ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مگر کیا انہوں نے کچھ بھی نہیں بتایا۔؟ اس کا اشارہ سائیکائرسٹ کی طرف تھا۔“

”میں نہیں غیب کا علم تو ہے نہیں محترمہ۔ ہاں البتہ ان کا کہنا یہ ہے کہ اکثر وہ بچے جن کی مائیں یا باپ بچپن میں چھڑ جاتے تو ان کی پرسنلٹی عدم تحفظ کا شکار ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے سائز بھائی کے ساتھ یہ مسئلہ ہو مگر فی الحال حتمی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ ابھی تو یہی ہے کہ تم انہیں پوری توجہ دو۔ پیار دو۔ ان کے شکوک و شبہات اپنے طرز عمل سے دور کرنے کی کوشش کرو۔“ ماریہ نے کہا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

سے میں نے یہ چکن پلاؤ۔ یہ طور خاص تیرے لیے بنایا ہے۔ تو نے بتایا تھا نا کہ مجھے پسند ہے میں تو اور بھی بہت کچھ پکانا چاہ رہی تھی مگر کیا کروں مہینے کا آخر ہے نا اس میں وال روٹی ہی مشکل سے چلا پاتی ہوں۔" وہ ہاتھ پیچھے کر کے گہرے رنج میں ڈوب گئی۔

"اچھا لائیں کھلائیں۔" اجیبہ نے اس کا وہی ہاتھ پکڑ کر منہ میں ڈالا۔ وہ خوش ہو گئی۔ کھانے کے بعد وہ اسے لیے پلنگ پر چلی آئی۔

"اتنے دن تیرا فون بند رہا، میں تو گھبرا ہی گئی کہ کہیں تو نے اپنے باپ کو کچھ بتا تو نہیں دیا اور کہیں اس نے تجھ پر مجھ سے ملنے کی پابندی تو عائد نہیں کر دی۔" وہ اسے تکیہ پر لٹا کر ہمارے اس کا سر ہلکا رہی تھی۔

"بتایا تو بیمار ہو گئی تھی میں، جیسے ہی صحت یاب ہوئی ہوں، سیدھی آپ سے ملنے چلی آئی اور ان سے فی الحال میں اس سے متعلق کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔" اس کے لہجے میں ناراضی صاف محسوس ہوتی تھی۔

"ہاں اچھا ہی ہے اجیبہ۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ تجھ پر ہرے نہ بٹھاوے۔" وہ خائف تھی۔

"ایسے کیسے؟" وہ بھٹا کر اٹھ بیٹھی "میں کمزور نہیں ہوں امی۔ جوان کی ہر جائز ناجائز برداشت کر لوں اور پوں بھی دنیا کی کوئی طاقت مجھے آپ سے ملنے سے نہیں روک سکتی۔" اس نے قطعیت سے کہا۔ گل کی جانچتی نگاہوں میں ڈھیروں اطمینان اتر آیا۔

"پھر بھی۔"

"پھر بھی کچھ نہیں۔ آپ اپنے دل سے ہر قسم کا ڈر خوف نکال دیں۔ اب آپ کی بیٹی آپ کے ساتھ ہے۔" وہ اس کے کندھے پیار سے دبا کر بولی۔

"سائے۔ کیا وہ مجھے کبھی یاد کرتا ہے؟" کچھ سوال انسان محض تصدیق کے لیے کرتا ہے حالانکہ جواب اسے معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی۔

"پتا نہیں۔ جب بابا نے آپ کو گھر سے بید گل کیا، اس وقت وہ کہاں تھے۔ کیا عمر ہوگی ان کی؟" اجیبہ نے پوچھا۔

"ہوں۔ چلو میں کوشش کرتی ہوں۔ تمہارا بہت شکر یہ ماریہ تم نہ ہو تیں تو نجانے میرا کیا ہوتا۔" میرب نے تشکر سے کہا۔

"رہش۔ چلو فون رکھو اور یار کوشش کر کے یہاں کا چکر لگالو، امی بہت یاد کر رہی ہیں تمہیں۔" اس نے کہا۔

"ہاں کر تو رہی ہوں۔ تم دعا کرو میرے لیے۔" وہ اپنی پیشانی سہلاتی ہوئی بولی۔

"ہاں وہ تو ہر نماز میں کرتی ہوں۔ اوکے خدا حافظ۔" ماریہ نے کہہ کر فون رکھ دیا۔ میرب کے ماتھے پر تفکرات کا جال پھیلا تھا۔



یہ زندگی اس کے خوابوں جیسی تو بالکل نہیں تھی ہاں البتہ شیخ صاحب کے گھر میں گزارنے والی زندگی سے یہ پر تعیش زندگی لاکھ درجہ بہتر تھی۔ اپنی مرضی سے سوئی، اپنی مرضی سے جاگتی، جی چاہا تو گھر میں کھالیا نہیں تو باہر سے منگوا لیتی۔ جمیل نے ایک کل وقتی ملازمت بشیرا اس کی خدمت پر مامور کر دی تھی۔ سو وہ ہاتھ پیر ہلانے سے بھی گئی۔ سارا سارا دن بیٹھی رنگین نی وی پر اینڈین فلمیں وی سی آر لگا کر دیکھا کرتی۔ جمیل اس پر ذرا روک ٹوک نہیں کرتا تھا۔ نہ وہ اپنے میکے جانا چاہتی نہ وہاں ہی سے کوئی چکر لگاتا۔ کبھی کبھار بی بی جمیل کے آفس فون کر کے اسے میکے لانے کو کہیں کیا کرتیں، ماں تھیں شیخ صاحب کی اس سے لگاؤ و محبت ان کے اس برہان کے ساتھ ہی اپنی موت آپ مر گئی تھی۔ سناو اس کے گھر آنا چاہتی تھی۔ مگر قاسم نے سختی سے منع کر رکھا تھا۔

راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا کہ اچانک اسے قلم روکنا پڑا۔



"بس اور نہیں۔" اجیبہ نے گل کا نوالہ بنا ہاتھ پیچھے کیا۔

"کیوں میری جان۔ کھاؤ نا اور دیکھ تو کتنے پیار

لاؤنچ میں بیٹھی بیوی دیکھ رہی تھی تب وہ اپنے اسٹڈی سے نکلے اور اسے وہاں بیٹھا دیکھ کر اس کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ پہلے وہ چونکی پھر وہاں سے اٹھ کر جانے لگی۔
 ”اجیہ بیٹھے۔“ انہوں نے حلاوت سے پکارا۔
 ”جی؟“ وہ لٹھ مار انداز میں بولی اور رک کر انہیں دیکھنے لگی۔

”یہاں آؤ۔ میرے پاس بیٹھو۔“ انہوں نے اپنے نزدیک اشارہ کیا۔

”مجھے پڑھنا ہے۔“ وہ روکھے لہجے میں بولی۔
 ”پڑھ لیتا یا۔۔۔ کچھ دیر بیٹھ جاؤ باپ کے پاس۔“ وہ محبت بھرے انداز میں بولے۔

”بولیں۔“ وہ احسان کرنے والے انداز میں سامنے صوفے پر ٹک کر انہیں دیکھنے لگی۔

”کیا ہمارا بیٹا ہم سے ناراض ہے؟ کوئی غلطی ہو گئی ہم سے؟“ انہوں نے پیار سے پوچھا۔

”غلطی؟ جرم کیا ہے آپ نے۔ مجرم ہیں آپ۔ اس کا جی چاہا وہ چیخ کر کہہ دے مگر مصلحت کا تقاضا کچھ اور تھا۔“

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

”مگر مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تم مجھ سے ناراض ہو؟“ انہوں نے چشمے کی اوٹ سے بغور اس کے تاثرات جانچے۔

”غلط فہمی ہو گئی ہے آپ کو۔“ وہ جھٹ سے بولی۔

تب ہی بالی نے چائے وہیں لا کر رکھ دی۔ میرب بھی وہیں لاؤنچ میں چلی آئی۔

”کیا باتیں ہو رہی ہیں؟“ وہ خوش دلی سے بولی سو قار کچھ خاموش سے ہو گئے تھے، اسے دیکھ کر بولے۔

”سائز کی برتھ ڈے آنے والی ہے۔ تم اور اجیہ اس کے لیے تحفہ خرید لاؤ۔“ وہ یقیناً ”بات بدلنا چاہ رہے تھے۔“

”گڈ“ وہ خوش گواریت سے بولی کب ہے ان کی برتھ ڈے۔“

”اس ماہ کی تین کو۔“ انہوں نے کپ اٹھا کر لیوں

”جھ۔۔۔ سات سال کا ہو گا اور شاید وہ اس وقت سو رہا تھا اور مجھے نہیں معلوم تمہارے باپ نے اسے کیا کہانی سنائی ہو گی؟“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”مجھے حیرت ہوتی ہے بابا پر وہ بظاہر ایسے لگتے تو نہیں۔ مجھے تو ہمیشہ ہی وہ بہت نرم خو، مہربان اور شفیق ہی لگے ہیں۔ میرے لیے یہ یقین کرنا از حد مشکل ہے۔“ وہ بے یقینی کی سی کیفیت میں گھری ہوئی تھی۔

”انسان کا ظاہر اس کے باطن سے میل کھائے یہ ضروری تو نہیں۔ اور مردوں کے اصول تو ہمیشہ ہی سے اپنی اولاد کے لیے کچھ اور بیوی کے لیے کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔“ وہ طنزیہ بولی۔

”یہ جھی ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔“

”اب زیادہ باتیں نہیں۔ تم آرام کرو۔“ وہ پیار سے بولی۔

”سو سوں گی تو اٹھ نہیں پاؤں گی اور امی۔۔۔ اٹھارہ سال سے جمع ہیں باتیں، اتنی جلدی کہاں ختم ہوں گی۔“ وہ ہنس کے بولی۔

”یہ بھی ٹھیک کہا۔“ اس نے سر ہلایا۔

”میں کچھ دیر میں نکلوں گی۔ نہیں تو بہت دیر ہو جائے گی۔“ وہ ٹائم دیکھ کر فکر مندی سے بولی۔ گھڑی دن کے پونے بارہ بج رہی تھی۔

”چلو ٹھیک ہے۔“ اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں سر ہلادیا۔ دراصل اس کا ذہن اس وقت کہانی کو نیا رخ دینے کی سوچ رہا تھا۔

کچھ دنوں سے وقار صاحب محسوس کر رہے تھے کہ اجیہ ان سے کھنچی کھنچی سے رہنے لگی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اجیہ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو اپنے دل کی بات اپنی حرکات و سکنات سے ظاہر کیے بنا نہیں رہ سکتے۔

ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو۔ انہوں نے کئی بار خود کو سمجھایا۔ مگر ہر بار کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو جاتی جو وہ دوبارہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے۔ اس وقت بھی اجیہ

لے چلوں گا کھمانے کی الحال تو گھر سے کہیں باہر لا نگ سے لگایا۔

ڈرا سہو پر۔

”مجھے صابن دانی میں بیٹھ کر لا نگ ڈرا سہو پر جانے

کا قطعی شوق نہیں۔“ وہ مسخرانہ لہجے میں بولی۔ جمیل

کی چھوٹی گریس کو وہ اسی نام سے پکارتی تھی۔

”ارے بھئی وہ ذرا جھینپ کر ہنس دیا کہا تو ہے

تمہیں دو تین مہینے میں بڑی گاڑی لے لوں گا تمہارے

پسندیدہ رنگ اور برانڈ کی۔“ وہ اس کے نزدیک آ بیٹھا

اور پیار سے ایک کندھے پر اپنا بازو پھیلا کر بیٹھ گیا۔

چند آنے ناگواری سے پرے کھسکنا چاہا مگر جمیل نے

اس کی کوشش ناکام بنا دی۔

اپنے ارادے کی ناکامی پر وہ جھنجھلا سی گئی۔ جمیل کو

اس کی جھلاہٹ نے خاصا محظوظ کیا۔

”پھر چل رہی ہو یا زبردستی اٹھا کر لے چلوں؟“ وہ

پیار سے بولا۔

”مجھے تیار ہونے میں دیر لگے گی۔“ وہ پسپا ہو کر

روٹھے پن سے بولی۔

”میں انتظار کر سکتا ہوں، تم آرام سے تیار

ہو جاؤ۔“ کہہ کر اس نے سگریٹ سلگالی اور اس کے

پاس سے اٹھ کر سامنے جا بیٹھا اور میگزین کھول لیا۔

درحقیقت تو چندا خود بھی اس وقت باہر نکل کر گھومنا

پھر ناچاہ رہی تھی مگر جمیل کی پرانی اور چھوٹی کار دیکھ کر

اس کا موڈ بری طرح آف ہو جایا کرتا تھا اور پھر یہ بھی تھا

کہ اسے جمیل سے فٹنس کروانے کی عادت سی پڑ گئی

تھی۔

پھر جس وقت وہ اپنی نئی آتش گلانی ساڑھی جو اس

نے اک نئی فلم کی ہیروئن کو دیکھ کر سلوائی تھی میں

ملفوف خوشبوؤں میں بس کر سنور کر سامنے آئی۔

جمیل تو اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

”اب چلیں جی۔“ وہ نزاکت سے بولی۔

”کیا کرنا ہے باہر جا کر چھوٹو۔ گھر ہی میں رہ کر

موسم انجوائے کرتے ہیں۔“ وہ اٹھ کر اس کے نزدیک

آیا اور پیار سے اس کی تھوڑی چھو کر جذبوں سے بھری

آواز میں بولا۔

”کیوں اجیہ چلوگی؟“ میرب نے جواب طلب

نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”میں تو حلی چلوں گی۔“ وہ استہزائیہ بولی۔ مگر آپ

پہلے سائز بھالی سے تو پوچھ لیں، کہیں اس بات پر بھی

آپ کو وہ کھیٹے ہوئے اپنے کمرے میں نہ لے

جائیں۔“

یکدم ہی میرب کے مسکراتے لب بھینچے تھے وقار

نے اچھے سے میرب کی جانب دیکھا۔ اس نے

شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

”کیا کہہ رہی ہو اجیہ۔ فضول گوئی مجھے پسند

نہیں۔“ وہ درشتی سے بولے۔

”ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ آپ بھابھی سے

پوچھیں۔ وہ نہ انہیں کہیں آنے جانے دیتے ہیں۔ نہ

ہی پر سٹل فون رکھتے دیتے ہیں۔ نہ ہی انہیں ان کا ہنستا

بولنا پسند ہے۔ وہ حد درجہ ٹھکی مزاج ہیں بابا۔ بالکل

آپ کی طرح۔“ اس کا تنفس بری طرح پھولنے

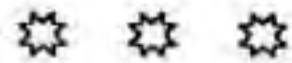
لگا۔ وقار نے حیرت و دکھ میں گھر کر اسے دیکھا۔

”میری طرح؟“ میرب بالکل خاموش بیٹھی تھی۔

اس کی بات پر چونک کر وقار کو دیکھنے لگی۔

”ہاں آپ کی طرح۔“ وہ اٹھی اور لاؤنج عبور

کر گئی۔ فضا میں اس کے الفاظ کی بازگشت رہ گئی۔



چھٹی کا دن تھا۔ اوپر سے موسم کی دل فریبی، جمیل

یوں تو خاصا خشک مزاج سا بندہ رہا تھا مگر چندا کو پا کر تو لگتا

تھا۔ جیسے وہ سر تپا تبدیل ہو گیا ہو۔ وہ اطمینان سے

بیٹھی حسب عادت لی وی سے لطف اندوز ہو رہی

تھی تب ہی جمیل نے اسے پکارا۔

”چندا۔ کہیں باہر چلیں؟“ وہ چونک کر سیدھی

ہوئی۔

”باہر کہاں؟ یورپ یا امریکا؟“ اس نے استفہامیہ

نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”اوہ یا سوہ کھیا کر بولا۔ کچھ وقت دو وہاں بھی

ذرا حاضر ہوا تو سامنے کرسی پر اخبار دیکھتی ڈاکٹر پہ نظر گئی۔

”بشیرن۔ جمیل۔“ وہ بے ساختہ پریشانی سے چیخی۔

”ریلیکس۔ میں ڈاکٹر شازیہ ہوں۔ اب کیا محسوس کر رہی ہیں آپ؟“ ڈاکٹر شازیہ نے اخبار ایک طرف رکھ کر اسے مسکرا کر دیکھا۔ بشیرن اس کی پکار پر دوڑی چلی آئی تھی۔

”وہ بیگم جی، آپ ادھر دروازے کے پاس بے ہوش ہو کر گر گئی تھیں جی۔ صاحب ڈاکٹر صاحبہ کو لے کر آئے تھے۔“ بشیرن نے جلدی جلدی بتایا۔

”آپ ان کے لیے دودھ لے آئے۔“ ڈاکٹر نے بشیرن کو کہا۔ وہ سر ہلا کر چلی گئی۔ تب ہی جمیل انجکشن لے کر لوٹ آیا۔

”مجھے کیا ہوا ہے۔“ وہ بوکھلا کر پوچھنے لگی۔

”آپ ماں بننے والی ہیں۔“ ڈاکٹر نے جمیل کے ہاتھ سے انجکشن لے کر پر مسرت انداز میں اسے اطلاع دی۔

”کیا؟“ وہ بے یقینی سے جمیل کو دیکھ کر چیخی۔ جس کی نگاہوں کی چکاچوند تار ہی تھی کہ اسے یہ خبر پہلے ہی مل چکی ہے۔



”مجھے کچھ خریداری کرنی ہے۔ میں اچیہ کے ساتھ شاننگ سینٹر چلی جاؤں؟“ میرب نے کافی سائیڈ نیبل پر رکھتے ہوئے سائرس سے استفسار کیا۔

”کیا خریدنا ہے مجھے بتاؤ۔ میں لاؤں گا۔ خواہ مخواہ وہاں جا کر ٹکریں کھاؤ گی۔“ اس کی نگاہیں لیپ ٹاپ پر تھیں۔ گو اس کا جواب حسب توقع تھا مگر میرب کی جان جل گئی۔

”میں کسی لنڈا بازار یا بولٹن مارکیٹ نہیں جا رہی، جہاں ہر کوئی گزرتی ہوئی عورت سے ٹکرانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ میں فورم یا پھر زمزمہ جاؤں گی جہاں محض ٹکرانے یا ٹکریں مارنے والی ”تفریح“ کوئی نہیں پسند

”ہٹیں بھی۔“ اس نے کوفت زدہ سے انداز میں اس کا ہاتھ پرے کیا۔ ”اگر باہر نہیں جانا تھا تو مجھے تیار کیوں کروایا۔“ اس کے تیکھے نقوش تن گئے۔

”اوہ یا۔ مذاق کر رہا تھا چلو۔“ وہ کہہ کر مڑا اور نیبل پر سے گاڑی کی چابی اور سگریٹ اٹھانے لگا۔ اسی اثنا میں چندا سب سے ہجرت قدم اٹھاتی روم سے باہر نکل گئی۔ جمیل اس کے پیچھے آ رہا تھا تب ہی اس نے چندا کو گھر کے داخلی دروازے کے پاس لڑکھڑا کر گرتے دیکھا۔

”ارے۔ رے۔“ وہ متوحش سا دوڑا۔

”کتی بار منع کیا ہے اتنی اونچی ایڑی کا سینڈل مت پہنا کرو، مگر تم ہو کس۔“ اس نے اسے سیدھا کرتے ہوئے شدید ناراضی سے کہا، مگر اسے بے ہوش دیکھ کر چپ رہ گیا۔ پھر اسے اپنی بانہوں میں اٹھایا اور قریبی صوفے پر لٹا کر بشیرن کو اسے دیکھنے کا کہہ کر اقساں و خیزاں گھر کے نزدیکی کلینک سے ڈاکٹر کو لینے دوڑا۔

جس وقت وہ ڈاکٹر شازیہ کو لے کر لوٹا۔ بشیرن اس کے تلوے سہلا کر شاید اسے ہوش میں لانے کی سعی کر رہی تھی۔ ڈاکٹر کو آتے دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔

ڈاکٹر نے چیک اپ کیا۔ اس دوران جمیل گھڑا بے حد پریشانی اور فکر مندی سے اسے دیکھا رہا۔

”مبارک ہو جمیل صاحب۔ آپ کی بیگم ایکسپیکٹ کر رہی ہیں۔“ چیک اپ کے بعد ڈاکٹر شازیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”در اصل کمزوری کی وجہ سے یہ بے ہوش ہوئی ہیں۔ ویسے فکر مند ہونے والی کوئی بات نہیں۔ یہ انجکشن آپ لے آئیں تو میں انہیں لگا دیتی ہوں۔“

”آ۔ آپ کو پورا یقین ہے نا۔“ وہ بے یقینی میں گھرا خوشی سے کپکپاتی آواز میں ڈاکٹر سے پرچہ لیتے ہوئے بولا۔

”آف کورس جمیل صاحب۔“ وہ اس کی کیفیت بھانت کر مسکرائی۔

”بشیرن ڈاکٹر صاحبہ کے لیے چائے لاؤ۔“ وہ اسے ہدایت دیتا لٹے قدم باہر دوڑا۔ تب ہی چندا ذرا سا کسمپاسی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پھر ذہن

رہے ہوتے ہیں۔ سینے میں دل بن کر دھڑکتے ہیں۔ اور یقیناً "ماں کا رشتہ ایسا ہی رشتہ ہے۔" وہ نجانے کیوں آج اتنا بول رہی تھی۔ سائر کا گندی چہرہ دیکھنے لگا۔

"رات کافی ہو گئی ہے۔ اب سو جاؤ۔" وہ بے تاثر انداز میں کہہ کر اٹھا اور سگریٹ اٹھا کر ٹیرس پر نکلنے لگا۔

"آپ نے جواب نہیں دیا۔" اسے باہر لکھا دیکھ کر میرب کو اپنی بات یاد آئی۔

"جواب دے چکا ہوں۔" بے لچک لہجے میں وہ کہہ کر ٹیرس پر نکل گیا۔ میرب نے ٹھنڈی سانس لے کر کبیل خود بر تان لیا۔

ناحق کہہ کر بات گنوائی۔ اور یہ انہیں اچانک ہی نجانے کیا ہو جاتا ہے بیٹھے بٹھائے۔ ابھی اتنے مہربان ہیں گویا جان بھی نچھاور کر دیں گے اور پل ہی میں اتنے نامہربان کہ انسان بات کرنے سے قبل سو مرتبہ تو ضرور ہی سوچے پتا نہیں یہ گنجلک سا شخص کب سلجھے گا۔ سوتے سوتے بھی وہ یہ سب نہ چاہتے ہوئے بھی سوچے گئی۔ جبکہ باہر ٹیرس پر کھڑا سائر نجانے رات کے اس اندھیرے اور مہیب سناٹے میں کیا کھوج رہا تھا۔



"جانتی ہو کتنے دن بعد ملاقات کر رہی ہو؟" آغا ناراضی سے گویا ہوا۔ وہ دونوں اس صبح کے دلکش منظر سے سمندر کنارے بیٹھے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"ہاں۔ کافی دن ہو گئے۔" وہ بے توجہی سے بولی۔ اس کی نگاہیں سمندر پر جمی تھیں۔

"اتنے دن بعد ملنے آئی ہو تب بھی منہ لٹکا ہوا ہی ہے تمہارا۔ اجیہ میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔ تم آخر نارمل کیوں نہیں ہو پا رہی۔" اس کی آواز اونچی ہو گئی۔ اس نے جیسے اس کے لہجے پر چونک کر اسے دیکھا۔

"میری زندگی میں اب کچھ بھی نارمل نہیں رہا آغا! کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے جیسے میں کوئی ڈراؤنی فلم دیکھ

کرتا۔" وہ چبا چبا کر بولی۔ سائر کے سنجیدہ چہرے پر مسکان چٹک گئی۔

"مارکیتوں کی نفسیات پر عبور حاصل کیا ہے کیا تم نے؟" اس نے کافی اٹھا کر لیوں سے لگائی اور اسے بغور دیکھتا ہوا بولا۔

"عبور نہ سہی اتنی معلومات تو بہر حال ہے ہی۔" وہ پال کھول کر برش کرنے لگی۔

"ویسے کیا خریدنا ہے؟" اس نے سرسری لہجے میں پوچھا۔ وہ ستائشی انداز میں اس کے لچکلیے پال دیکھ رہا تھا۔

"ایسے ہی کچھ چھوٹی موٹی چیزیں۔" دراصل اسے سائر ہی کے لیے تحفہ خریدنا تھا۔

"تمہارے پال بہت حسین ہیں۔" وہ یک دم بولا۔ وہ چونک کر حیرانی سے پلٹی وہ مارے خجالت کے جلدی سے کپ رکھ کر سیدھا ہوا۔

"آپ نے کیا کہا؟" وہ دلچسپی سے پوچھنے لگی۔

"تمہارے بالوں کی تعریف کی ہے۔ لگتا ہے بہت محنت کی ہے ان پر تم نے۔" وہ اب لپ ٹاپ آف کر کے اسے سائیڈ پر کرتے ہوئے بولا۔

"اول ہوں۔ بالکل نہیں۔ بابا بتاتے ہیں کہ میری امی کے پال بالکل ایسے ہی تھے۔ مجھے یہ وراثت ملے ہیں میں ہو ہو اپنی امی کی کاپی ہوں۔" وہ فخر آمیز لہجے میں بولی۔ سائر اس کے بھکانے انداز پر مسکراتا رہا۔ پھر وہ پال سمیٹ کر بیڈ پر چلی آئی۔

"ویسے آپ کس پر گئے ہیں؟ انکل کی طرح تو نہیں لگتے۔ کیا آپ بھی میری طرح اپنی امی جیسے ہیں؟" وہ بولتے بولتے معاً "زور سے چونکی مگر آپ کی والدہ کی تو کوئی تصویر میں نے یہاں نہیں دیکھی۔ کیا وہ تصویریں نہیں کھنچوائی تھیں۔"

"ہمارے لاہور والے گھر میں آگ لگ گئی تھی۔ ساری تصویریں اس کے ساتھ ہی جل گئیں۔" وہ ساٹ لہجے میں بولا۔

"اوہ ہو یہ تو بہت برا ہوا مگر کچھ رشتے تصویروں کے محتاج نہیں ہوتے۔ وہ آپ کے جسم میں لہو بن کر روڑ

”مگر تمہیں نہیں معلوم آتا۔ وہ بابا کے مکمل انڈر میں ہیں“ اگر انہوں نے بجائے مجھے جواب دینے کے بابا کو کچھ بتا دیا تو؟“ وہ خائف لہجے میں بولی۔

”انتا ڈر کیوں رہی ہو یا۔ بات تو کرو۔“

”نہیں آتا۔ ابھی نہیں جو بھی ہے جیسا بھی ہے، فی الحال ایسا ہی چلنے دو۔ تم نہیں جانتے آتا میں کس لذت سے آشنا ہوئی ہوں۔ مدتوں میرے اندر محبت کا خانہ خالی رہا ہے۔ یہ کسی کی محبت سے کبھی بھرا ہی نہیں مگر میں یہ نہیں جانتی تھی کہ اندر کی پیاس تو صرف ماں کی محبت ہی بجھاتی ہے۔ باقی سارے رشتے غرض کے رشتے ہیں۔ فقط ماں ہی ہے جو آپ سے بے لوث محبت کرتی ہے اور میں نے اس کا ذائقہ چکھ لیا ہے آتا۔ مجھنی فی الحال کسی اور چیز کی کچھ تمنا نہیں۔“ وہ الودہی جذبے کے تحت جذب سے کہتی چلی گئی۔

”تم بہت جذباتی ہو رہی ہو اجیہ۔ تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا۔“ وہ بگڑے لہجے میں بولا۔

”وہ ہیں ہی ایسی آتا۔ کسی دن ملو اوں گی انہیں تم سے۔ تمہیں بھی ان سے انیسیت نہ ہو گئی تو کہتا۔“ وہ نقاخر سے بولی۔

”دیکھیں گے۔“ وہ کوفت زدہ لہجے میں بولا۔



”ہاں بھئی کیا رپورٹ ہے؟“ ماریہ نے کچھ اس انداز سے پوچھا کہ میرب کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”کیوں ہنس رہی ہو؟“

”تمہارے انداز پر۔ بالکل جاسوسوں کی طرح سوال پوچھا ہے۔“

”دیری فنی“ وہ چڑی“ اب ہنس چکی ہو تو بتا بھی چکو۔“ میرب ذرا سنبھلی پھر بولی۔

”بہت مشکل ہے ماریہ۔ سائران لوگوں میں سے ہیں جو خود سے بات کریں تو کریں وگرنہ لاکھ سوال کرتے رہو جو اب ہوں ہاں سے زیادہ نہیں ملتا۔“ وہ بے چارگی سے بولی۔

”ڈائری پڑھنے کی کوشش کی تم نے؟“

رہی ہوں۔“

”یہ تم نے بیٹھے بٹھائے کیا مسئلہ پال لیا ہے یا۔“

وہ سخت بے زاری سے بولا۔

”مسئلہ میں نے نہیں دو سروں نے کھڑا کیا ہے۔ میں تو صرف اس پر ایلیم کو Solve کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔“ وہ سخت لہجے میں بولی۔

”کیسے؟ ان سے یوں چھپ چھپا کر ملاقاتیں کر کے؟“ وہ استہزائیہ بولا۔

”فی الحال میرے بس میں ہی ہے۔“ وہ چونچ سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی ایک دم مضطرب ہو کر سیدھی ہوئی۔

”سیدھا سادا حل ہے اس بات کا تم جا کر اپنے ڈیڈ سے جواب طلبی کرو۔ یقیناً کچھ نہ کچھ تو اس طرف کی کہانی بھی ہوگی۔ اسے سنو پھر فیصلہ کرو یوں بیچ میں لٹکنے سے کیا ملے گا۔ نہ تم مجھے توجہ دے پا رہی ہو نہ خود کو یہ تو ٹھیک نہیں ہے نا اجیہ۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”ڈیڈ سے کیا بات کروں؟“ وہ طنزیہ بولی۔ ان کے نزدیک تو وہ مرچکی ہیں۔ مار چکے ہیں وہ انہیں کئی برس پہلے۔ اس بارے میں وہ کیا بات کریں گے؟“

”بھئی میں یہ ہی تو کہہ رہا ہوں آخر ایسا کیوں کیا انہوں نے کچھ معلوم تو پڑے اور پھر تمہارا تو اتنا بڑا خاندان ہے کیا کوئی بھی اس کے متعلق نہیں جانتا؟“

”انتا بڑا خاندان کہاں ہے ہمارا۔ کوئی بھی تو نہیں ہے یہاں اس شہر میں اک خالہ جانی رہتی تھیں وہ بھی بہت سال پہلے آسٹریلیا شفٹ کر گئی تھیں۔“ وہ کنفیوژن سے انگلیاں موڑنے لگی۔

”مگر مجھے تو یہ بات کسی طور ہضم نہیں ہو رہی“ خاندان والوں سے نہ سہی اپنے بھائی ہی سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرو۔“

”ہاں۔ ان سے میں پوچھنے کی کوشش تو کر ہی سکتی ہوں مگر کیا معلوم وہ بھی لاعلم ہوں؟“ وہ سوچتے لہجے میں بولی۔

”یہ تو ان سے پوچھنے ہی پر پتا چلے گا۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

”مجھے تم سے کچھ کام تھا۔“ وہ جھجک کر بولی۔ اس دن کے واقعے کے بعد سے میرب اس کے سامنے عجیب سی شرمندگی محسوس کرتی تھی۔

”کہیے؟“ وہ استعجاب سے اسے دیکھ کر بولی۔

”در اصل سائر کی برتھ ڈے ہے پرسوں۔ مجھے ان کے لیے تحفہ خریدنا ہے۔“ میرب نے تمہید باندھی۔

”تو کیا کرتا ہے ہمیں ساتھ چلوں؟“ وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”نہیں۔ تم لا دو اپنی پسند سے کوئی اچھا سا پرفیوم۔“

”آپ کو جانے سے بھائی نے منع کر دیا ہو گا؟“ اجیہ نے زہر خند لہجے میں قیاس آرائی کی۔

”ہاں۔ وہ انہیں پسند نہیں۔“ وہ گڑبڑا کر اسی قدر بول سکی۔

”ٹھیک ہے میں لا دوں گی۔“ وہ کہہ کر پھر سے ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”تم شاپنگ پر کیسے جاتی ہو میرا مطلب ہے کہ کس کے ساتھ؟“

”کبھی بھائی لے جاتے ہیں، کبھی ڈرائیور کے ساتھ، کسی فرینڈ کو پک کر کے۔“

”اوکے۔“ وہ کہہ کر نکلنے لگی، مگر اسے اک عجیب سا احساس ہوا۔ اس پر اتنی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں سائر نے اور بہن کے معاملے میں نسبتاً لاپرواہی۔ اس کا ذہن منحصرے میں پڑ گیا۔



”اسے اچھی طرح سے سمجھاؤں خالص۔ یہ کوئی بچی تو نہیں جو اس بات کی نزاکت اور سنگینی سے ناواقف ہو۔ میں اس کی ہر ضد ماننا آیا ہوں تو کیا مطلب ہے اس بات کا یہ مجھے بے وقوف سمجھنے لگی ہے؟ محبت کرتا ہوں اس سے اس لیے اس کی اس مکر وہ بات پر خاموش ہوں وگرنہ تو خیر آج کی رات یہ آپ کے ساتھ ہی رہے گی۔ اچھی طرح سمجھاؤں اسے میں بار بار اس کا یہ بے ہودہ مطالبہ برداشت

”درازا لاک ہوتی ہے۔“

”تم ذرا حاضر دماغی سے کام نہیں لے سکتیں؟ کیوں بو گئی بنی ہوئی ہو۔“ اس نے سلگ کر کہا۔

”حاضر دماغی کا مظاہرہ کر کے کیا کروں۔ لاک توڑ دوں یا چابی چروالوں؟“ وہ اس سے زیادہ تپ کر بولی۔

”یہ ہونی نا بات۔ اڑالو چابی۔ مگر شیاری سے آخر ہتا تو چلے اس دراز میں ہے کیا۔“ وہ خوش ہو گئی۔

”مجھے پتا ہے اس میں ان کی پرسنل ڈائریز ہیں۔“

”اور ان پرسنل ڈائریز میں کیا لکھا ہے؟“ اس نے طنز کیا۔

”ہاں۔ یہ نہیں معلوم۔“ وہ خجالت سے بولی۔

”تو یہی معلوم کرونا۔“ اس نے جیسے اس کی عقل پر ماتم کیا۔

”ہاں کرتی ہوں کچھ۔ فی الحال تو تم سے کام ہے۔“ وہ لجاجت سے بولی۔

”ہاں۔ بولو۔ کچھ دن میں احمد کے گھر والوں کو تاریخ لینے آتا ہے۔ بجائے اس کے کہ تم اس وقت میرا کام بٹاف۔ الشا مجھ ہی سے سارے کام کروالو۔“ وہ خفگی سے بولی۔

”تم جانتی ہو میری مجبوری پھر بھی ایسے کہہ رہی ہو۔“ وہ روہاسی ہو گئی۔ ”رہنے دو۔ میں خود کر لوں گی۔“ وہ اس کی بات سے اتنی دلبرداشتہ ہوئی کہ اس کے ”ارے۔ ارے“ کرنے کے باوجود فون رکھ دیا۔

فون پھر بجنے لگا۔ اسی کا نمبر تھا۔ وہ ریسیور کریڈل سے ہٹا کر اجیہ کے کمرے کی جانب چلی آئی۔ وہ کالج سے آنے کے بعد سے ابھی تک اپنے روم سے باہر نہیں نکلی تھی۔ ویسے اس نے آج کل باہر آکر سب کے درمیان بیٹھنا تقریباً ترک ہی کر دیا تھا۔ وہ دستک دے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

اسے دیکھ کر سیدھی ہوئی۔

”آئیے بھابھی۔ خیریت؟“

”ہاں۔ کیسی ہو؟ پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔“ وہ بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔

”سب ٹھیک ٹھاک ہے۔“ وہ مختصراً بولی۔

”آئیے بھابھی۔ خیریت؟“

”ہاں۔ کیسی ہو؟ پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔“ وہ بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔

”سب ٹھیک ٹھاک ہے۔“ وہ مختصراً بولی۔

چاہتی ہے تو؟“ بی بی سر تھام کر رونے لگیں۔ چندا نے کوفت سے انہیں دیکھا۔

”آخر ایسا کیا کہہ دیا میں نے؟ پرہگنٹ میں ہوں، مجھے بچہ نہیں چاہیے۔ بات ختم۔ آخر اس میں اتنا واویلا کرنے کی کیا ضرورت ہے آپ لوگوں کو۔“ وہ کٹھور لہجے میں بولی۔

”خدا سے ڈر چندا، لوگ تو فتنیں مانتے ہیں یہ دن دیکھنے کے لیے تجھے خدا نے کسی آزمائش میں ڈالے بنا ہی اس نعمت سے نواز دیا ہے تو کیوں ناشکری کر رہی ہے۔“ وہ سخت برانگیختگی سے بولیں۔

”مجھے نہیں چاہیے اولاد تو آخر وہ مجھ پر زبردستی کیوں کر رہا ہے۔“ وہ ہڈیانی انداز میں چیخی۔

”اولاد اس کی بھی ہے۔ اس کے متعلق فیصلہ کرنے میں اسے بھی اختیار ہے۔“ بی بی دو ٹوک لہجے میں بولیں۔

”عمر اس کی نکلی جا رہی ہے، میری نہیں، جو میں بچہ پیدا کرنے کو زندگی موت کا مسئلہ بنا دوں۔“ وہ پانگلوں کی طرح چیخی۔

”کیا بکو اس کر رہی ہے تو۔ کیا باؤلی ہو گئی ہے لڑکی۔ کہاں نکل رہی ہے اس کی عمر، جوان جہان آدمی ہے۔“ وہ زہج ہو گئیں۔

”مجھ سے دگنی عمر کا ہے۔ مجھے بوجھ کی طرح سر سے اتار پھینکا۔ ذرا خیال نہیں کیا میرا۔“ وہ اونچا اونچا رونے لگی۔ مانو اور نازو بھی کمرے میں کھڑی سنجیدگی سے یہ ڈرامہ دیکھ رہی تھیں۔

”ہاں سارے قصور اماں باوا کے ہیں۔ اکٹھا ہی جان سے کیوں نہیں مار دیتی تو ہمیں۔“ بی بی پھر رونے لگیں۔

”خدا کے لیے آپ دونوں چپ ہو جائیں، کیا نحوست پھیلا رکھی ہے۔“ نازو نے چڑ کر ہاتھ جوڑے۔

”جاؤ مانو بی بی کو پانی دو۔“

”ماں ہوں اس کی۔ بھلے کو سمجھا رہی ہوں۔ ارے سر پر تاج کی طرح سجا رکھا ہے جمیل میاں نے۔ کیوں بے جا ضد کر کے اپنا مقام کھو رہی ہے۔“ وہ روتے

نہیں کہوں گا۔“ جمیل کی اونچی غراتی آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔ اب سے کچھ ہی دیر قبل چندا، جمیل کے ساتھ بی بی کے پاس آئی تھی بلکہ جمیل ہی اسے لے کر آیا تھا۔ اچھے بکھرے بال، ملکیتی حلیہ، سوچی آنکھیں۔ بی بی تو اس کا حلیہ دیکھ کر دہل سی گئی تھیں۔ نازو چائے تیار کرنے باورچی خانے میں جا چکی تھیں، مانو بھی ان کی مددگار تھی۔ بی بی کے کمرے سے اٹھتے شور نے ان دونوں ہی کو شعورنی طور پر متوجہ کر رکھا تھا۔

”بیٹا۔ ذرا محل سے کام لو، میری بیٹی نا سمجھ ہے، نادان ہے، مگر نیت کی بری نہیں۔ میں تم بھانڈوں کی بے وقوف کو تم بیٹھو تو سہی۔“ بی بی لجاجت سے بولیں۔

”نہ میں بے وقوف ہوں نہ نادان۔ پوری عقل مندی سے یہ بات کر رہی ہوں۔ آخر میری عمر ہی کیا ہے ابھی جوان بکھیرٹوں میں پڑ جاؤں۔“ وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

”دیکھی۔ دیکھی آپ نے اس کی ضد، عاجز آچکا ہوں میں اسے سمجھا سمجھا کر۔“ وہ بالوں میں انگلیاں پھنسا کر بولا۔

”تم خاموش رہو۔“ بی بی نے اسے بری طرح جھڑکا۔ ”جمیل میاں! آپ چائے پیئیں آرام سے۔ دیکھتی ہوں میں یہ کیسے نہیں مانے گی۔“ وہ جلال میں آگئیں۔ ان کا انداز دیکھ کر جمیل کو کچھ اطمینان ہوا، تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلتا ہوں، مجھے کام ہے ذرا اور تم اپنا خیال رکھنا۔“ وہ اسے دیکھ کر بولا۔

”مجھے نصیحتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ ترخ کر بولی۔ وہ ضبط کر گیا۔

”بیٹا چائے تو پیتے جاؤ۔“ بی بی داماد کو یوں سوکھے منہ جانا دیکھ کر بوکھلا کر کھڑی ہو گئیں۔

”نہیں خالہ پھر کبھی سہی۔“ وہ بہ عجلت کہہ کر دروازہ اور پھر صحن عبور کر گیا۔

”اری۔ یہ کیا بچپنا لگا رکھا ہے تو نے۔“ وہ ہانپتی کانپتی واپس بیٹھ گئیں۔ ”تجھے ذرا شرم لحاظ ہے کہ نہیں، کیوں ہماری جان کا روگ بنی ہوئی ہے۔ آخر کیا

یہ ڈیفنس میں بنا دو منزلہ گھر تھا۔ جس کے نچلے فلور پر میڈم نسی کاویل ایکویڈ ویل فرنیچر پارلر پریس بیوی کلیننگ جبکہ سیکنڈ فلور پر ان کی رہائش تھی۔

”ہیلو۔“ پوریج سے اندر داخل ہو کر گل نے خوش دلی سے سب ہی کو مشترکہ ہیلو سے نوازا۔

”کسے لے آئیں؟“ کئی ایک نے اجیہ پر تو صوفی و ستائشی نگاہ ڈال کر سوال کیا۔

”میری بیٹی ہے؟“ وہ تقاضا آمیز بے نیازی سے بولی۔

”واہ ہو۔“

”اچھا۔“

”واہ بھئی۔“ سب کا ملا جلا رد عمل دیکھنے کو ملا۔ وہ ہنوز مسکراتی ہوئی میڈم نسی کے آفس کی طرف بڑھ گئی۔

”میرے پاس فی الحال جو کچھ تھا تمہیں دکھا چکی ہوں۔ اب تمہیں کچھ پسند ہی نہیں آ رہا تو میں کیا کروں؟“ میڈم نسی ڈیپ ریڈ گہرے گلے کے ٹاپ اور بلیک ٹراؤزر میں ملبوس گہری سرخ چیری رنگ کی لپ اسٹک لگائے ٹیبل کی دوسری طرف چیر پر جلوہ افروز تھیں۔ وہ ایک خوش شکل۔ سرخ و سفید رنگت کی حامل، اخرونی رنگ کے بالوں والی ڈھلتی عمر کی مگر کشش عورت تھیں۔ لب و لہجے سے بناوٹی پن جھلکتا تھا۔

”میں اندر آسکتی ہوں؟“ گل نے بھاری براؤن گلاس کا دروازہ دھکیل کر اجازت طلب کی۔

”ہاں آؤ۔“ انہوں نے سر کو خفیف سی جنبش دی۔

”ہیلو میم۔ کیسی ہیں آپ۔“ اس نے ان کی مزاج پر سی کی۔ میڈم جو بغور اجیہ کا جائزہ عینت نگاہوں سے لے رہی تھیں بولیں۔

”ہاں۔ ٹھیک ٹھاک۔ تم بیٹھو۔“ انہوں نے سامنے رکھی دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ اجیہ بائیں ہاتھ پر رکھے صوفوں پر بیٹھ گئی۔

”ہاں بھئی۔ ان سے مکویہ نیازی صاحب ہیں۔“

ہوئے کہنے لگیں۔

”اس کی تو عادت ہے اپنے خیر خواہوں کو ذک پہچانے کی۔“ نازو کرختی سے بولیں۔

”تم بیکو اس بند کرو“ وہ بد تمیزی سے اس پر چلائی۔

”تم اپنا یہ ڈرامہ بند کرو اور سکون سے جینے دو ہمیں۔ آخر کب تک اٹے سیدھے فیصلے کر کے اپنے ساتھ دو سروں کی زندگی بھی جنم بتاتی رہو گی۔“

تمہارے کرتوتوں کی وجہ سے ابامیاں بستر سے لگ گئے ہیں۔ اگر تم نے اور کوئی مسئلہ کھڑا کیا تو قاسم بھائی تمہیں جان سے مارنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔“

وہ اتنے برفیلے لہجے میں بولیں کہ چندا روٹا دھونا بھول کر اسے فکر ٹکرو دیکھنے لگی۔

”کچھ اونچ نیچ ہو گئی تو ہاشم تو تمہیں گھر میں بھی مہنے نہیں دیں گے“ اچھا ہے یا برا ہے وہ تمہارا شوہر ہے۔“

تمہیں اسی کے ساتھ جینا مرنے ہے جبکہ یہاں تو تمہیں تن تنہا ہی کرنا پڑے گا لہذا بہتری اسی میں ہے کہ تم عقل مندی کا مظاہرہ کرو اور اپنی تقدیر پر راضی رہنا سیکھو۔ بی بی آجائیں چائے میں نے صحن میں سخت پر لگادی ہے۔ قاسم اور ابابھی دکان سے آتے ہی ہوں گے۔“ وہ سکون سے اپنی بات مکمل کر کے کمرے سے چلی گئیں۔ چندا سمجھی یا نہ سمجھی۔ بی بی البتہ کچھ مطمئن ہو کر اب صحن میں جا رہی تھیں۔



”یہ آپ مجھے کہاں لائی ہیں؟“ اجیہ نے ٹیکسی سے اترتے ہوئے سامنے بنی عمارت کو دیکھ کر حیرت سے استفار کیا۔

”یہاں میں جا ب کرتی ہوں۔“ اس نے کہہ کر قدم آگے بڑھائے۔

”مجھے یہاں لانے کی وجہ؟“ وہ اس کی معیت میں قدم بڑھاتی ہوئی بولی۔

”تمہیں سب سے ملوانا چاہتی ہوں۔“ اس نے برجوش سے انداز میں کہا۔ اس کے انداز پر اجیہ مسکرا کر خاموش ہو گئی اور دلچسپی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

اپنے ایاز ہدانی ہیں تا انہوں نے بھیجا ہے۔ کوئی میگزین شوٹ ہے اس کے لیے نئے چہرے کی تلاش ہے انہیں۔ "میڈم نشی نے گل سے ان کا تعارف کروایا۔

"اوپ۔ اچھا۔" گل چونک گئی۔

"اور تم سناؤ۔ کے لیے چلی آئی ہو۔" وہ مسکرا کر بولیں۔ مسکراہٹ ان چہرے پر بھدی لگتی تھی۔

"میری بیٹی ہے اجیہ۔ آپ سے تذکرہ کیا تو تھا۔ شاید آپ کے ذہن سے نکل گیا۔" گل جلدی سے بولی۔

"اوہو اچھا۔ اچھا تمہاری بیٹی ہے۔" انہوں نے اب اجیہ میں مزید دلچسپی لی۔

"کیا کرنی ہو بیٹا؟" انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے صرف اپنی چیئر گھما کر پوچھا۔

"پڑھتی ہوں سیکنڈ ایئر میں۔" اس نے جواب دیا۔ اسے نامعلوم سی ابجمن ہو رہی تھی۔

"ہوں۔ گڈ۔ آپ بہت چارمنگ ہو۔ کسی نے بتایا آپ کو۔" ان کے لہجے پر اجیہ نے کچھ جھینپ کر گل کو دیکھا جو آنکھوں میں فاتحانہ چمک لیے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"جی۔ آئی نو۔" اس نے کچھ اس سادگی سے کہا کہ وہاں بیٹھے وہ دونوں نفوس بشمول گل کے تہقہ لگا کر نس دیے۔ ان کے ہنسنے نے اسے کنفیوژ کر دیا۔

"بہت انویٹنٹ ہے۔ از نٹ اٹ؟" انہوں نے سامنے بیٹھے نیازی صاحب سے تائید چاہی۔

"اوہ۔ پس۔" انہوں نے زور و شور سے اثبات میں سر ہلایا۔ "مجھے بس اسی طرح کا چہرہ درکار ہے اپنے پروڈکٹ کے لیے۔" انہوں نے یک دم کہا اور گل کا

جی چاہا کہ وہ خوشی سے دھماکے ڈالے۔ اسے اجیہ کے اوپر پورا بھروسہ تھا مگر اس کی قسمت پر نہیں مگر اب

شاید وہ اس کی قسمت پر بھی بھروسہ کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اجیہ نے بڑی حیرت سے اس کی بات سنی مگر

کچھ بولی نہیں۔

"مگر اسے تو کچھ بھی نہیں آتا۔" گل نے بڑی بے

ساختہ قسم کی پریشانی میں گھر کر کہا۔

"تو ہم یہاں کس لیے بیٹھے ہیں بڑی بڑی اناڑی

یہاں سے ہنڈرڈ پریسنٹ گروم کر کے بھیجی ہیں۔ اسے بھی کرس گے۔" میڈم نشی کا انداز چیلنج قبول کرنے

والا تھا۔ گل نے گہری طمانیت بھری سانس لی۔

"مگر جلدی میڈم نشی۔ اگلے مہینے پر ڈاکٹ کی

لاپٹنگ ہے۔" وہ بے چینی سے بولے۔

"فکر مت کریں۔ ان شاء اللہ آپ کا کام ہو جائے

گا۔" انہوں نے خالص کاروباری انداز میں انہیں تسلی دی۔

"لو کے پھر میں چلتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"لو کے۔ میں بتاتی ہوں پھر آپ کو۔" میڈم نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی ادھر آؤ۔" میڈم نے اجیہ جو بے زار بیٹھی اپنے فون میں کچھ کر رہی تھی کو پکارا۔ اس نے سر اٹھا کر اپنی ماں کو دیکھا وہ بھی اسے وہاں آنے کا اشارہ

کرنے لگی۔ وہ اٹھ کر میڈم نشی کے سامنے والی خالی ہوئی نشست پر بیٹھ گئی۔

"کیا خیال ہے؟ تمہیں تھوڑا تراش خراش دیں؟"

انہوں نے اپنی چیئر کی بیک سے ٹیک لگا کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پیوست کر کے پوچھا۔ اجیہ کے

تاثرات نامفہم سے ہو گئے۔

"کیا مطلب؟"

"ارے بھئی۔" انہوں نے دانستہ لہجہ سرسری بنایا۔ "اب اتنی پیاری صورت ہے تمہاری، مگر تم پر

تھوڑی توجہ دی جائے تو تم چوں ہویں کے چاند کی طرح چمکو۔ ہاں بھی تمہارے ویسے ہی پارے ہیں آگے

سے تھوڑے سیٹ کرنے پڑیں گے۔" وہ جاٹھتی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگیں۔

"سچ بالکل کترینہ کیف لگو گی۔" انہوں نے اس میں ہوا بھرنی چاہی۔ وہ ہنس دی۔

"آئی۔ آپ مذاق کر رہی ہیں؟ ای تو مجھے آپ لوگوں سے ملوانے لائی ہیں میں جیسی ہوں۔ ٹھیک

ہوں۔ گروم ہو کر کیا کروں گی؟" اس کی بات پر میڈم

نے چونک کر گل کی جانب دیکھا۔ اس نے آنکھ سے کچھ اشارہ کیا۔

”ہوں یہ بھی ہے۔ مگر کیا تم نہیں چاہتیں کہ لوگ تمہیں لائیک کریں؟“ انہوں نے اس کی فطری جبلت پر ہاتھ ڈالا۔

”مجھے لوگوں کی کچھ پروا نہیں۔“ اس نے سر جھٹک کر کہا۔

”گرو الو بیٹا۔ آئی اتنے پیار سے آفر کر رہی ہیں تو۔“ گل کو بالآخر دخلت کرنی پڑی۔

”مگر امی۔“
”مگر مگر چھوٹے۔ چلو آؤ میں تمہیں دکھاؤں میں کہاں کام کرتی ہوں۔“ گل نے اسے بولنے کا موقع نہ دیا۔

”ہاں۔ ہاں جاؤ۔ تم اسے دکھالو پھر تمہاری بیٹی کو چائے پلواتے ہیں۔“ میڈم نشی نے آفس کا فون اٹھا کر کوئی نمبر ڈائل کرتے ہوئے کہا۔



آج صبح ہی سے میرب بہت مصروف تھی۔ پہلے اس نے بہ طور خاص سائز کے پسندیدہ پکوان تیار کیے پھر ایک بیک کر کے سجا کر فریج میں رکھا۔ ان ہی سب تیاریوں میں کبھی ہر ڈھلی پتا ہی نہیں چلا۔

”واہ بھئی واہ۔ آج تو چکن سے بڑی مزیدار خوشبو میں اٹھ رہی ہیں۔“ وقار صاحب نے خوش دلی سے کہا۔

”جی بابا۔ سائز کی برتھ ڈے کی تیاری ہے۔“ میرب جو اپنے کمرے میں جا رہی تھی انہیں دیکھ کر ٹھہر گئی۔

”مگر اس کی سالگرہ تو کل ہے؟“
”جی۔ مگر آج رات بارہ بجے ہی ایک کٹوائس گے۔“ میرب نے مسکرا کر بتایا۔

”ہاں۔ یہ بھی اچھا ہے۔ تم نے اپنے گھروالوں کو انوائٹ کیا؟“ ان کے تذکرے پر میرب کچھ افسردہ سی ہو گئی۔

”نہیں۔ ہم گھر کے لوگ ہی کافی ہیں۔“
”تمہارے بابا کو بھی نجانے بیٹے کے ساتھ جانے کی کیا سوچھی۔ ایک ہی تو دوست تھا میرا۔ بے دید نے میرا خیال بھی نہیں کیا۔ یہیں رہتا تو اچھا تھا نا“ وہاں وہ خود بھی بیٹھا بور ہی ہو رہا ہے۔“ وقار صاحب سے بھی کبھی کبھار ان کی اسکاٹپ یا فون پر بات چیت ہو جاتی تھی۔

”جی بس۔ کیا کہوں۔“ وہ اداسی سے بولی۔
”ارے میں بھی کیا ہوں۔“ انہوں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ ”خوامخواہ میں یہ تذکرہ چھیڑ کر تمہیں اداس کر دیا، تم جاؤ، اپنی تیاری کرو۔ بلکہ کچھ چاہیے ہو تو مجھے بتاؤ۔“ وہ اپنی بے عقلی پر توف بھینچتے ہوئے بولے۔

”نہیں بس سب کچھ ہو چکا ہے۔ صرف آپ نے یہ کرنا ہے کہ آج رات انہیں اپنے کمرے میں کسی نہ کسی طرح بارہ بجے تک مصروف رکھنا ہے تاکہ انہیں سر پر اتڑ دیا جاسکے۔“

”ٹھیک ہے بھئی۔ یہ تو میں کر ہی سکتا ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولے۔ وہ مسکرائی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ تو وہ لالی کو چائے کے لیے آواز دینے لگے۔



”اچھا۔! تو آج تم اپنا میک اپ اور کروا کر آئی ہو؟ بہت خوب صورت لگ رہی ہو گی؟“ اتھالے دلچسپی سے استفسار کیا۔

”اس میں کیا شک ہے؟“ اجیہ نے اتنا اسی سے سوال کیا۔ وہ تلی بنی اپنے آپ کو آئینے میں بار بار خوشی و حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ ذرا سی محنت نے اس کے چہرے کو۔ کیسی تہنکی بخش دی تھی۔

”شک تو خیر کوئی نہیں ہے۔ بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ اس روئے زمین پر تم سا حسین کوئی نہ ہوگا۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ ماورائی حسن کی مالک میری محبوبہ ہے۔“ وہ دھیمے سروں میں اس کے گلن میں گنلتا یا۔ اس کے عارض گللابی تو ہو ہی رہے تھے دہکنے لگے۔

”مگر میں کیا کروں گی تمہارے بغیر۔“ اس کی آواز رندھ گئی۔

”یار پلیز میچور ہو جاؤ۔“ وہ چڑ گیا اس کے انداز پر۔
”اسی لیے تو کہتا ہوں کہ شادی کر لیتے ہیں۔ پھر ساتھ ہی چلیں گے۔“ اس کے پاس مسئلے کا حل موجود تھا۔

”مگر ایک دم یوں۔“ وہ گھبرا گئی۔ ”میرے گھر والوں نے کوئی پرابلم کری ایٹ کرنے کی کوشش کی تو؟“ اس کے انداز میں اندیشے تھے خدشے تھے۔

”محبت تم نے کی ہے۔ فائٹ بھی تمہیں کرنی ہوگی۔“ وہ کندھے اچکا کر بولا۔ ”اور یوں بھی کیوں مسئلہ کھڑا کریں گے وہ؟ کیا میں ڈھنگ نہیں ہوں؟ امیر نہیں ہوں؟“ اس کا لہجہ ٹیکھا ہو گیا۔

”مگر ان کے نزدیک شاید یہ باتیں قابل اعتنائہ ہوں۔“ وہ شدید ٹینشن میں گھر کر پھر سے کمرے میں چکرانے لگی۔

”وہاٹ؟ آج کل تو لوگ یہی کچھ تو دیکھتے ہیں۔ عجیب ہیں تمہارے گھر والے، بلکہ دقیانوسی زیادہ مناسب لفظ ہے۔“ وہ ہلکے سے غصے سے بولا۔

”نہ صرف دقیانوسی بلکہ اپنے نظریات میں انتہا پسند بھی۔ پتا ہے امی بتا رہی تھیں کہ ایک مرتبہ۔“
”یار تم یہ امی نامہ پلیز آج تو بند کرو۔ میں واقعی پریشان ہوں۔ مجھے تمہیں لے کے جانا ہے اپنے ساتھ۔“ وہ بولا۔ اجیہ کو بے حد بری لگی اس کی بات۔

تاہم اس کی پریشانی بھی بجا تھی۔
”اچھا۔ کچھ سوچتی ہوں میں تم اتنے ٹینس مت ہو۔“ اس نے اسے مقدور بھر تسلی دی۔

”ڈرا جلدی سوچ لو۔“
”ہاں۔ میں کرتی ہوں کچھ۔ تم۔“ اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ دروازہ ٹاک کر کے میرب اندر داخل ہو رہی تھی۔

”چلو میں بعد میں بات کرتی ہوں۔“ اجیہ نے بھجلت کہہ کر فون کاٹ دیا اور قدرے ناگواری سے میرب کو دیکھنے لگی۔

”نہ۔ اصل میں مجھے پوچھنا تھا کہ تم نے گفت

”تمہیں باتیں بہت بتانی آتی ہیں۔“ وہ لجا کر بولی۔
”تمہاری غلط فہمی ہے جان تمنا۔ میں صرف باتیں ہی نہیں بتاتا۔“ وہ معنی خیزی سے ہنسا۔
”آغا میری امی اتنی خوش ہوئی ہیں مجھے یوں دیکھ کر کہ مجھے لگا میں نے ان کی بات مان کر ٹھیک ہی کیا۔“ وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔

”کیا مطلب؟“ آغا اس رومانٹک گفتگو کے بیچ میں ایک خالص ان رومنٹک ہستی کا ذکر سن کر بری طرح بے مزہ ہوا۔

”بھئی۔ ان ہی کے اصرار پر تو میں نے یہ سب کروانے کی ہامی بھری تھی۔ پھر جب اپنا آپ دیکھا تو مجھے لگا کہ میں نے امی کی بات مان کر بالکل درست کیا ہے۔ پھر امی بھی خوش ہوئیں۔ ست۔“ وہ بتانے لگی۔

”اچھا ٹھیک ہے یار اب مجھ سے یوں دور نہیں رہا جا رہا۔ میں تم سے ملاقات کر کے کچھ سنجیدہ معاملات ڈسکس کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ مکمل سنجیدگی سے بولا۔

”کون سے سنجیدہ معاملات بھئی؟“ اجیہ نے یوں ہی پوچھا۔ اس کا سارا دھیان اپنی چمکتی اسکن ترشی ہوئی گماندار بھنوں اور ماتھے پر گری ٹیس لٹوں کی جانب تھا۔

”کیا تم مجھ سے سنجیدہ ہو؟“ اس نے دیکھت پوچھا۔
”یہ بھلا کیا بات ہوئی؟“ وہ نا سمجھی سے بولی۔

”یار۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔ ”میرا مطلب ہے شہزادی صاحبہ کہ کیا آپ بندہ ناچیز کے ہمراہ زندگی گزارنے کے لیے واقعی سنجیدہ ہیں؟“

”آف کورس۔“ وہ قطعی لہجے میں بولی۔ اب وہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔

”تو پھر شادی کر لیتے ہیں۔ ویسے بھی میں کچھ روز میں واپس اسٹیٹس جا رہا ہوں۔“
”آغا۔ تم جارہے ہو؟“ اس کا دل ڈوب گیا۔

”جانا تو ہے یار۔ ڈیڈ مسلسل مجھ پر خفا ہو رہے ہیں۔ وہاں کام کا حرج ہو رہا ہے مگر میں تمہارے چکر میں بہاں اڑکا ہوا ہوں۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔

ہو چلا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اس کا مطالبہ منظور نہیں ہوگا۔ پھر پہلی بار اس حالت سے گزر رہی تھی۔ نہیں تو اپنے طور پر ہی کوئی ٹونا ٹونکا کر کے اس "جھنجھٹ" سے چھٹکارا پانے کی تدبیر کرتی۔ ایک مرتبہ بشیرن سے کچھ جاننے کی کوشش بھی کی، مگر وہ تو کانوں کو ہاتھ لگا کر یوں بد کی گویا کسی قفل کی منصوبہ بندی میں اسے شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ تھک ہار کر وہ قسمت پر سب چھوڑے بیٹھی تھی۔ پھر جمیل نے بھی بہت سے وعدے و وعید کیے تھے کہ یہ دلائے گا وہ دلائے گا اور اس "یہ" "وہ" میں "گاڑی" "سوئے کے کنگن" اور "ملک سے باہر" گھمانے لے جانے کا اضافہ چندا نے کر لیا تھا سوا ب دل کی جلن کچھ کم تھی مگر انسان کا دل بھی عجیب شے ہے۔ جو میسر ہے اس پر راضی نہیں ہوتا۔ جس کو چاہتا ہے وہ میسر نہیں۔ اور کبھی کبھی تو اس کی چاہت مراد بر آجائے تب اس کی قدر نہیں کرتا۔ اور کہیں تو قدر کرتے کرتے اکتانے لگتا ہے۔ اور اکتا کر پھر کسی نئی چاہت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ قرار اسے دراصل پھر بھی نہیں ملتا۔



من پسند ڈنر کرنے کے بعد سارا اپنے کمرے میں جا رہا تھا تب ہی وقار صاحب نے اسے پکار لیا اور اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے گئے۔ میرب چکے چکے مسکرانے لگی۔ اجیبہ کا ذہن اپنی پریشانیوں میں لگا ہوا تھا۔ لالی سے برتن وغیرہ سمیٹنے اور سارا اور وقار صاحب کو چائے کافی پچانے کا کہہ کر وہ تیار ہونے کمرے میں چلی آئی۔ ابھی ساڑھے دس بجے تھے۔ اس کے پاس کافی وقت تھا۔ کچھ وقت یونہی گزار کر وہ تیار ہونے لگی۔ آج کے دن میرب نے ڈل گولڈن اور مندی کلر کی خوب صورت چنری کی بنگالی ساڑھی باندھنے کا ارادہ کیا تھا۔ یہ ساڑھی سائز انکلینڈ سے اس کے لیے لایا تھا۔ ساڑھی باندھ کر اس نے ہلکا پھلکا میک اپ کیا۔ بالوں کو یونہی کھلا چھوڑ کر صرف آگے سے بل لے کر سہرے کچھو میں جکڑ لیے۔ زمو کالاکٹ سیٹ پہن

خرید لیا۔ "وہ اس کی ناگواری بھانپ کر قدرے شرمندگی سے پوچھنے لگی۔

"جی۔ یہ لیں۔" اس نے اپنے تاثرات چھپا کر ایک ہلکے نیلے لائنوں والے ریسر میں ملفوف پرفیوم اسے سائیز ٹیبل سے اٹھا کر دیا۔

"شکریہ تمہارا بہت بہت۔ سائز کی برتھ ڈے رات میں سیلی برٹ کرنے کا ارادہ ہے میرا۔" اس نے گفٹ تھام کر اسے بتانا ضروری سمجھا۔

"چھا تو پھر۔؟" اس کے اجنبی لہجے پر وہ گڑبڑا گئی۔

"کم۔ پاپا اور صرف میں ہوں گے۔"

"چھا ٹھیک ہے۔" اس کا انداز ایسا تھا کہ گویا کہہ رہی ہو "اب دفع ہو جاؤ۔" اس لیے وہ مزید کچھ کہے بنا خاموشی سے دفع ہو بھی گئی۔ اپنے عقب میں اس نے ٹھک سے دروازہ لاک ہونے کی آواز سنی۔

"پتا نہیں کون سے مسئلے کو بند کر کے سلجھاتی رہتی ہے یہ لڑکی۔" وہ بریدر مائی۔



"نہ وہ منحوس انسان شیرازی میری زندگی میں آتا نہ مجھے اس کی وجہ سے یہ دن دیکھنے بڑتے۔ خواہ مخواہ ہی میں اس کے چکر میں بڑی۔ اچھی جھلی زندگی گزر رہی تھی، مگر وہ زندگی بھی اچھی بھلی کہاں تھی؟ کم از کم اس گھر میں مجھے نسبتاً سہولیات تو میسر ہیں۔ وہاں زندگی جی نہیں بس گزارا جاسکتی تھی، مگر کم از کم یہ جھنجھٹ تو نہیں تھا۔" وہ بیڈ پر چت لیٹی ایک ٹک چھت کو گھور رہی تھی۔ اس کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

"پتا نہیں عین موقع پر کہاں جا مرا۔ اگر اسی سے شادی ہو جاتی تو ٹھیک تھا، مگر جب قسمت ہی میں کہن لگا ہو تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔" اسے وہ کہہ کر آصف شیرازی کا خیال آ رہا تھا۔ نہ وہ اس کی زندگی میں آتا، اسے خواب دکھاتا اور نہ ہی یہ سب کچھ جو ہو گیا تھا ہوتا۔ اس کی طبیعت آج کل ٹھیک نہیں تھی۔ اپنے مکے سے آئے ہوئے بھی اسے مہینہ بھر سے زائد

سائری کی آنکھیں انکارہ بن گئیں۔

ان تینوں کی تالیوں میں سائری نے ایک کاٹا۔

”یہ لیں بھائی آپ کا گفٹ۔“ اجیہ نے سائری کو شاپر تھمایا اور ایک چکھے بنا ہی گویا تقریب بھگتا کر اندر بھاگی۔ وہ آج کل وقار کا سامنا کرنے سے گریز کرتی تھی۔ وقار نے بھی خوب صورت رسٹ و اچ اسے دی۔ تھوڑا سا کیک چکھا اور واپس اپنے کمرے میں چلے گئے۔ لالی اپنا حصہ وصول کرنے کے بعد سامان سمیٹنے لگی۔ سائری اٹھا بنا کچھ کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میرب نے بکے اٹھایا گفٹ سنبھالا اور اس کے پیچھے چل دی۔ وہ بڑے خوش کن خیالات میں گھری ہوئی تھی۔ لبوں پر دھیمی دھیمی مسکان سجائے وہ سچ قدم اٹھا رہی تھی۔ جوں ہی وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے اڑانا سائری دیوانوں کی طرح اس پر جھپٹا تھا۔

میرب کی دہشت کے مارے چیخ نکل گئی۔ اس نے سرخ گلابوں کو نوچ کر پھینک دیا۔ گفٹ جھپٹ کر دیوار پر دے مارا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

For Next Episode Visit
Paksociety.com

ہاتھوں میں سونے کے کنگن پہنے وہ بہت خوب صورت بہت مکمل لگ رہی تھی۔ اپنے اوپر پرفیوم اسپرے کرنے کے بعد اس نے ٹائم دیکھا، پونے بارہ ہو رہے تھے۔ وہ گفٹ اٹھائے باہر چلی آئی۔ شریف سے کہہ کر منگوایا سرخ گلابوں کا بو کے اس نے اسٹڈی سے اٹھایا اور لاؤنج کی سینٹر ٹیبل پر دونوں چیزیں لا کر رکھ دیں۔ پھر ایک نکال کر لائی اور خوب صورت رین لگی چھری اس کے برابر میں رکھ کر اجیہ کو بلانے گئی۔ اجیہ معمول کے حلیے میں تھی۔ اس نے اپنے کٹے بال پنہیں لگا کر چھپا رکھے تھے کہ مبادا کوئی پوچھ کچھ کرنے بیٹھ جائے۔ اس کا چہرہ تو خیر پہلے ہی کھلا پھول تھا۔ اس لیے چہرے کی رگڑائی و گڑائی سے کچھ خاص قابل توجہ فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ بے دلی سے ایک گفٹ شاپر پکڑے ہوئے تھی۔ جوں ہی بارہ بجے میرب نے لاؤنج کی بساری بتیاں بجھا دیں اور لالی کو حکم دیا کہ جب سائری لاؤنج میں آئے تب وہ لاؤنج روشن کر دے۔ اسٹڈی میں سچ قدم طرز کے گھڑیال نے بارہ بجائے۔ دو ایک منٹ کا انتظار کرنے کے بعد وقار صاحب سائری کو لیے لاؤنج میں چلے آئے۔

”یہ اتنا اندھیرا کیوں کر رکھا ہے لاؤنج میں۔“ سائری کی سنجیدہ آواز اندھیرے میں ابھری۔

”حیرت سے بھئی۔“ وقار مصنوعی پن سے بولے۔ تب ہی ایک کھٹکے سے لاؤنج روشنی میں نہا گیا۔ ”ابھی برتھ ڈے ٹویو۔“ میرب گنگنائی۔ اجیہ نے احسان کرنے والے انداز میں ساتھ دیا۔ وقار مسکرانے لگے۔ انہوں نے سائری کو گلے لگالیا۔

”سالگرہ مبارک ہو بیٹی“ اللہ پاک تمہیں دونوں جہاں کی لاتعداد خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔“ انہوں نے اس کا روشن ماتھا چوم کر نرم آنکھوں سے دعا دی۔

”چلو آؤ کیک کاٹو۔ تمہاری بیوی نے بڑی محبت سے بنایا ہے۔“ وہ اس کے کندھے پر بازو پھیلا کر اسے لیے ٹیبل تک آئے۔ اس نے اک نگاہ اٹھا کر میرب کو دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی آنکھیں ملیں۔ میرب کی آنکھوں میں تبدیل روشن تھی، مگر

سستی جلال سنگ



سستی جلال سنگ

شترہ بخاری

قیمت - 300 روپے

مکوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی - فون نمبر: 32735021

”آئی.... ممانے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے
بند کر کے کنڈی لگالی ہے، میں نے بہت ٹاک کیا مگر وہ
کوئی جواب ہی نہیں دے رہیں۔“ ننھی سی اجالانے
پریشان ہو کر فرح کا دامن تھام کر کہا۔
”ارے بیٹا اچانک کیا ہو گیا، سب خیر تو ہے؟“ فرح
نے پریشان ہو کر اپنی بلڈنگ میں رہنے والی اس پیاری
سی بچی سے پوچھا۔

صدف آصف

اردو صحیح

Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section

تسلی دی۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ وہ سنی کے ساتھ دوڑی دوڑی واپس اپنے گھر گئی اور سیل فون اٹھالائی۔

”چلو۔ تمہاری ماما کا نمبر ملاتے ہیں۔“ اس نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا اور زئیرا کا نمبر ملایا۔

انہوں نے کمرے کے دروازے پر کان نکا دیے۔ اندر سے ہلکی ہلکی تیل جانے کی آواز آئی۔ دونوں بچے امید بھری نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ ”شکر ہے تیل تو جا رہی ہے۔“ فرح کو تسلی ہوئی۔

”زونی۔ پلیز۔ فون۔ اٹھاؤ۔“ فرح نے خود کلامی کی۔ فون مسلسل بج رہا تھا، مگر کال ریسیو نہیں کی گئی۔ اس نے چارپانچ بار زرائی کیا، مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا، تھک ہار کر دونوں بچوں کو لے کرٹی وی لاؤنج کے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔

”بیٹا۔ لگتا ہے کہ کسی کو بلوا کر تالا تڑوانا پڑے گا۔ یہ بتاؤ تمہارے پیپا کب تک آئیں گے؟“ فرح نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ وہ کسی کے گھر میں اتنی مداخلت کرتے ہوئے ڈر رہی تھی، مگر یہاں مسئلہ ایک انسانی جان کا بھی تھا۔

”فرح آئی۔ پیپا تو آیا۔ ہفتے کے لیے آفس کی طرف سے اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔“ اجالانے ہونٹ لٹکا کر بڑی معصومیت سے بتایا۔ اچانک اس کا موبائل بج اٹھا، وہ سب چونک اٹھے۔

”ارے۔ یہ تو زئیرا کا فون ہے۔“ اس نے جلدی سے کال ریسیو کی، بچے بے قراری سے اسے ماں سے بات کرنا دیکھ رہے تھے۔

”زونی۔ سنوہاں۔ میں نے ہی تمہیں فون کیا تھا“ میں یہیں ہوں، پلیز دروازہ تو کھولو۔“ فرح شاید اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی، بچے یوں سننے لگے، جیسے بے جان مورت بن گئے ہوں۔

”دیکھو، جو بھی مسئلہ ہے بیٹھ کر بات چیت سے سلجھایا جاسکتا ہے، یوں بچوں کو پریشان کر کے تمہیں

”مجھے نہیں پتا۔ وہ سامنے والی نوشابہ آئی ہیں نا، غصے میں ہمارے گھر آئیں پتا نہیں کس بات پر ان کی ماما سے لڑائی ہوئی۔“ ان کے جاتے ہی ممانے خود کو کمرے میں بند کر لیا۔ ”اجالانے اٹک اٹک کر بتایا۔“

”اچھا۔۔۔ چلو۔ میں چل کر دیکھتی ہوں۔“ فرح نے حیرانی سے کہا اور پھولے گالوں اور سرخ ہونٹوں والی پیاری سی بچی کو تھکا۔

”جی۔ چلیں۔ سنی بھیا کرکٹ کھیل کر واپس آئے۔ تو وہ بھی بہت دیر تک دروازہ ناک کرتے رہے، مگر ماما کوئی جواب ہی نہیں دے رہیں، بھیانے ہی پریشان ہو کر مجھے آپ کے پاس بھیجا۔“ اجالانے سب بتاتے ہوئے روئی، فرح کو اس روئی بچی پر ترس آیا، فوراً چمٹا لیا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مسئلہ کیا ہے؟“ فرح سوچتی ہوئی اپنے فلیٹ کا دروازہ بند کر کے اس کے ساتھ باہر نکل گئی۔

سیکنڈ فلور کی میڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ پریشان ہوتی رہی۔ اوپر پہنچی تو زئیرا کے فلیٹ کے باہر سنی کو دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا پایا۔ فرح ان کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی۔ زئیرا کے بیڈ روم کے دروازے پر دستک دی، مگر کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے کان لگا کر سننا چاہا۔ کوئی آواز سنائی نہیں دی، وہ اب کنفیوز ہونے لگی۔

”آخر زئیرا کے ساتھ ایسا کیا ہوا؟ نوشابہ تو اس کی کالج کے زمانے کی دوست ہے۔ دونوں کے اتنے اچھے تعلقات رہے ہیں، ان فیکٹ دونوں گھرانوں کا ایک دوسرے کے یہاں ہر وقت کا آنا جانا تھا، پھر ایسا کیا ہوا جو نوبت لڑائی تک آپہنچی۔“ فرح نے خود کلامی کی۔

”آئی۔ پلیز۔ ماما کو کہیں نا۔ وہ دروازہ کھول دیں۔“ سنی نے اسے ہلایا تو وہ اپنی سوچوں سے باہر آئی۔

”اچھا۔ بیٹا۔ کچھ کرتے ہیں۔“ فرح نے اسے

کی وجہ بنے، معصوم سی خواہش پوری کرنے کی تک
وید میں اپنے اوپر خطا کار کا لیبل لگوا لیا، غلطی بھی میری
تھی۔ ”زیرا نے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔ فرح کا ذہن
اب کافی منتشر ہو چکا تھا۔ وہ جلد از جلد یہ عقدہ حل کرنا
چاہتی تھی۔

”زونی۔ مجھے کچھ سمجھتی ہو تو۔ مجھ سے وہ ساری
باتیں شیئر کرو، جن کی وجہ سے تمہارے اور نوشابہ کے
بیچ جھگڑا ہوا۔“ فرح نے زچ ہو کر کہا۔

”ہاں۔ مجھے بھی آج ایک ہمدرد کی ضرورت ہے
جس سے میں اپنے دل کی باتیں کہہ سکوں، میری
برداشت بھی جواب دے چکی ہے۔“ زیرا نے اپنے
سنہری بالوں کو سمیٹ کر جوڑے کی شکل دی، فرح نے
اسے بغور دیکھا، وہ اس بلڈنگ کی سب سے خوب
صورت عورت تھی، گلابی رنگت پر بڑی بڑی سرمئی
آنکھیں، جن پر چھائی اداسی ہر ایک کو اپنی طرف
راغب کرتی، متناسب خدو خال، وہ بلا کی پرکشش تھی۔
”پہلے۔ تو یہ بتاؤ کہ تم نے اپنے آپ کو کمرے میں
کیوں بند کیا؟“ فرح نے وہ سوال پوچھ ہی لیا جو اس کے
ذہن میں کلبلا رہا تھا۔

”نوشابہ نے اجالا کے سامنے مجھ پر جو الزامات
لگائے، اس کے بعد میرا حوصلہ ہی نہیں ہوا کہ اپنی بیٹی
سے نگاہیں ملا سکوں، بچوں کا سامنا کر سکوں، یہ تو آپ
کی بروقت آمد ہوئی تو بڑی مشکل سے خود کو باہر آنے
کے لیے قائل کیا۔“ زیرا پھر کھونے لگی۔

”کیا مطلب نوشابہ نے تم پر الزامات لگائے؟ وہ تو
تمہاری اچھی دوست تھی، پھر جھگڑا کیوں ہوا؟ آخر ایسی
بھی کیا بات ہو گئی جو۔ یوں۔؟“ فرح کے اندر کے
تجسس نے اسے چین نہیں لینے دیا۔ جلدی جلدی

سوال کی بھرمار کر دی۔

”اچھا۔ تو سنیں، میرے شوہر عمران اوصاف کی
زندگی میں ایک اور عورت ہے۔“ وہ اذیت سے
آنکھیں میچ کر بولی، اس کے انکشاف پر فرح نے اسے

کیا مل جائے گا۔“ فرح نے اسے سمجھاتے ہوئے
ڈانٹ پلائی۔ آخر اس پر فرح کی نرمی اور گرمی کا اثر
ہوا۔

ٹھک کی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا، دونوں بچے
بھاگ کر ماں سے لیٹ گئے، زارو قطار رونے لگے، زیرا
بھی گھٹنوں کے بل بیٹھی ان کو اپنے سے چمٹائے
روئے جا رہی تھی۔

فرح نے بڑی تگ و دو کے بعد ان سب کو الگ کیا۔
پانی پلایا، اجالا اور سنی کو ان کے کمرے میں بھیجا، خود
زیرا کے کچن میں جا کر روک پ چائے بنائی، اور اس کہ
قریب صوفے پر بیٹھ گئی، وہ جانے کن سوچوں میں
کھوئی ہوئی تھی، اس کے برابر میں بیٹھنے پر بھی نہ
چونکی۔

”زونی۔ کیا ہوا ہے؟“ فرح نے ہمدردی سے اس
کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ ایک دم اس کے گلے سے
لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فرح کے ہاتھ پاؤں
دوبارہ پھول گئے۔ آخر دل کی بھڑاس نکل گئی تو وہ
تھوڑی نارمل ہوئی۔

”فرح بھابھی۔ آپ کو میرے رویے سے بڑی
الجھن ہو رہی ہے نا، آپ ساری بات جاننے کے لیے
بے قرار ہوں گی؟“ زیرا نے چائے کا گھونٹ بھرا اور
خلاؤں کو تکتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔ تم نے بالکل صحیح سمجھا، گو کہ ایک ہی جگہ
رہنے کی وجہ سے ہم میں خاصی بے تکلفی ہے، پر تم
نے کبھی اپنے دل کی بات مجھ سے نہیں کی یہ اور بات
ہے کہ میں نے ہمیشہ تمہاری ہنسی کے پیچھے چھپے دکھ کو
پہچانا۔ اب اگر تمہاری منشا ہو تو اپنے دل کا بوجھ ہلکا
کر سکتی ہو۔“ فرح نے اپنائیت سے اس کے ہاتھ پر
ہاتھ رکھا تو حیرت سے اچھل پڑی۔ زونی کی گوری گوری

کلائیاں سرخ گلاب اور سفید موتیے کے گجروں سے
بجی ہوئی تھیں۔

”یہ۔ یہ؟“ فرح نے پوچھا تو وہ اذیت سے گلاب
کی پتیاں نوچتے ہوئے مسکرا دی۔ ”یہ ہی تو میری ذلت

دنیا بدل دی۔ آنکھوں میں پیمانے کے خواب سجائے
میں عمران کی زندگی میں شامل ہوئی۔
”اچھا تو۔۔۔ عمران بھائی کیسے نکلے؟“ فرح کا تجسس
عروج پر تھا۔

”ویسے تو شادی کے بعد میں نے ان میں کوئی کمی
نہیں پائی سوائے محبت کے، وہ اس معاملے میں عجیب
خشک مزاج آدمی ثابت ہوئے، انتہا سے زیادہ خشک
مزاج، میرے ساتھ ان کا رویہ اکھڑا اکھڑا سا رہا، مگر ایک
چیز بڑی امیزنگ لگی۔“ زینرا نے پھسکی سی مسکراہٹ
چہرے پر سجائی اور فرح کو دیکھا۔
”اچھا۔۔۔ وہ کیا؟“ فرح کی محویت ٹوٹی۔

”عمران کی اپنی ذات سے محبت۔“ وہ ایک دم بے
چینی سے بولی۔

”اپنی ذات سے محبت۔ کیا مطلب میں سمجھی
نہیں؟“ فرح نے کنفیوز ہو کر اس سے سوال کیا۔

”شادی کے چند دنوں بعد میں ڈرہنگ ٹیبل پر اپنی
کاسمیٹکس سجانے لگی تو وہاں پہلے ہی کافی ساری مروانہ
کریموں کو رکھا دیکھ کر حیران رہ گئی۔“ یہ کون استعمال
کرتا ہے؟“ میں نے چھوٹی نند سامیہ سے پوچھا۔

”ہمارے عمران بھائی۔ بھابھی! ایک بات یاد
رکھیے گا، وہ اپنی اسکن کے بارے میں بہت حساس
واقع ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کی کوئی بھی چیز یہاں سے
نہیں ہٹائیے گا۔“ اس نے بڑے فخر سے بتاتے ہوئے
مجھے تنبیہ کی تو میں نے گھبرا کر اپنی چیزیں واپس لے
جا کر دراز میں رکھ دیں۔

”اچھا۔۔۔ ایک بات اور بھائی صفائی کے معاملے
میں بھی بہت کانٹنٹس ہیں۔ اگر کوئی ان کا تولیہ استعمال
کر لے تو وہ بری طرح سے چڑجاتے ہیں۔“ سامیہ نے
باہر جاتے ہوئے پلٹ کر کہا تو میں نے گھبرا کر وہ تولیہ رکھ
دیا، جس سے ہاتھ پونچھنے والی تھی۔ شروع میں ہی ایسی
باتیں سن کر مجھ پر ایک رعب طاری ہو گیا۔ میں ایک
دم الٹ پوزیشن میں رہنے لگی۔ خیر زندگی معمول کی
طرف بڑھنے لگی۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ انہیں مجھ سے ذرا سا

دل کر دیکھا۔ اتنے سال ساتھ رہنے کے باوجود ان
لوگوں کو اس بات کا پتا نہیں چل سکا۔

”ک۔ کیا۔ مطلب، تم عمران بھائی کی دوسری
بیوی ہو؟“ وہ ہٹکائی۔

”نہیں۔ میں ان کی پہلی اور اکلوتی بیوی ہوں، مگر
رشنا ان کی محبت ہے۔ جس کے پاس وہ اسلام آباد ووڑ
ووڑ کر جاتے ہیں۔“ زینرا نم آنکھوں کے گوشوں کو انگلی
سے پونچھنے لگی۔

”مگر وہ اجالا تو کہہ رہی تھی کیسی پیلا۔ آفس
کے کام سے گئے ہوئے ہیں۔“ فرح کو یقین نہیں آیا تو
تصدیق چاہی۔

”جی۔ بچوں سے یہ بات چھپائی گئی ہے۔ کیا
کروں۔ سچ بتا کر ان کے دماغ میں ابھی سے باپ کے
خلاف گہر ڈال دوں؟ میں اپنے بچوں کی شخصیت کو بٹا
ہوا نہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔“ زینرا کالجہ تھکا تھکا سا
تھا۔

”یہ رشنا۔ کون ہے؟“ فرح نے وائٹ کچکچا کر
رشنا کہا اسے زونہ پر بہت ترس آیا۔

”رشنا۔ عمران کی کزن ہے، مجھ سے شادی سے
قبل ان کی انگیجمنٹ ہوئی تھی، وہ ایک دوسرے کو
بہت چاہتے تھے، اچانک دونوں کی فیملی میں زمین کے
تنازعہ پر جینا مرنا ختم ہو گیا۔ یوں عمران کے گھر والوں
نے رشنا سے رشتہ بھی ختم کر دیا۔ وہ بہت روئے بیٹھے
مگر ان کو خاندان کی عزت کا واسطہ دے کر خاموش کرا
دیا گیا۔

میری مرحومہ ساس نے جلد ہی عمران کے لیے لڑکی
تلاش کرنے کی مہم شروع کر دی۔ میں اور میری بچھلی
نند ساریہ ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ آئی ایک دن
کسی کام سے وہاں آئیں تو مجھ سے ملاقات ہوئی،
انہیں میری خوب صورتی نے بہت متاثر کیا۔ رشتہ
لے کر ہمارے گھر پہنچ گئیں۔ عمران سب کو پسند آگئے،
تھوڑی چھان بین کے بعد ہاں کر دی گئی۔ یوں میری ان
سے شادی طے ہو گئی۔ عمران کی پروجاہت شخصیت
اور میری سبیلوں کی گدگدائی باتوں نے میرے دل کی

بھی لگاؤ یا محبت نہیں بلکہ وہ مجھے بے عزت کرنے کے
بہانے ڈھونڈتے ہیں۔

”اوس۔ اچھا۔ افسوس کی بات ہے، ویسے بظاہر
عمران بھائی ایسے لگتے تو نہیں؟“ زبیرا کی کتھان کرفرح
کو افسوس ہوا، پڑوسی ہونے کی وجہ سے اس کا عمران
سے اکثر ٹکراؤ ہو جاتا تھا، وہ تو خود اس کی پراثر شخصیت
سے متاثر رہتی، بظاہر تو وہ اسے نرم طبیعت کا ہی لگا، مگر
حقیقۃً نہ کچھ اور نکلی۔

”زبیرا۔ زبیرا۔ یہ میرے تکیہ پر وہبہ کیسا ہے؟“
عمران نے سفید غلاف کو چٹکی سے پکڑ کر میرے سامنے
لہرایا، چیخ کر بولے۔ ان کا منہ اس وقت غصے سے لال
ہو رہا تھا۔

”ہمارے دونوں بچوں کی آمد سے بھی ان کے مزاج
پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ اچانک سر کا انتقال ہو گیا، یہ
ایسا موقع تھا کہ سارا خاندان انڈ پڑا اس وقت پہلی بار
مجھے رشنا کے بارے میں پتا چلا۔ جب میں نے اپنے
شوہر کو اس کے آگے پیچھے ہوتے دکھا۔

”جی۔ وہ بالوں میں تیل لگایا تھا، غلطی سے سر کے
نیچے آپ کا تکیہ رکھ لیا۔“ میں نے بالوں میں ڈھیر سارا
تیل لگا کر مساج کیا تھا، بے خیالی میں ان کا تکیہ رکھ کر
ہی لیٹ گئی۔

”بھابھی۔ اس رشنا سے عمران بھائی کو بجا کر
رکھنا۔ یہ ان کے پیچھے پاگل ہے۔ اتنی عمر ہو گئی شادی
بھی نہیں کی۔ اب دوسروں کا گھر خراب کرے گی۔“
میری نند شازیہ نے سارا ملہ رشنا پر گرایا اور بکتی جھکتی
وہاں سے چلی گئی۔

”اٹھو۔“ میں جو بستر پر سونے کے لیے لیٹ چکی
تھی، سنی ان سنی کر رہی تھی۔
”سنا نہیں میں نے کیا کہا۔“ اٹھو۔“ میں ان کے
انداز پر ڈر کر بستر سے باہر نکل آئی۔

دونوں خاندانوں کا میل ملاپ کیا ہوا، عمران کی پرانی
محبت جاگ اٹھی۔ اب وہ بزنس کا بہانہ بنا کر مہینے دو
مہینے میں ایک دو دن کے لیے اسلام آباد کے چکر لگانے
لگے۔ میں پوچھتی تو وہ ٹال جاتے۔“

”جاؤ۔ اس کو ابھی دھو کر ڈالو، آئندہ خیال
رکھنا۔“ ان کے انداز میں اتنی حقارت تھی کہ میرا دل
ہی ٹوٹ گیا۔ واش روم میں تکیہ کا غلاف دھوتے
ہوئے میرے آنسو بہہ نکلے۔ یہ ہی بات آرام سے
بھی بتائی جاسکتی تھی، مگر ان کے دل کا غبار صرف مجھ پر
ہی نکلتا۔

”تم نے ان سے اس مسئلے پر بات نہیں کی۔“ فرح
نے پوچھا۔

اس طرح کے کئی واقعات آئے دن ہوتے رہتے،
ان کی ہریات میں طنز ہوتا۔ میں اپنے کمرے میں ہی ڈر
ڈر کر رہتی کہ کوئی چیز خراب نہ ہو جائے، بستر گندہ نہ
ہو جائے یا کسی چھوٹی سی بات پر عمران کا موڈ آف نہ
ہو جائے، اس وقت تک مجھے یہ بات پتا نہیں تھی کہ وہ
رشنا سے پچھڑنے کا بدلہ گھر والوں کی جگہ مجھ سے لے
رہے ہیں۔

”مجھے آپ کا یوں دوڑ دوڑ کر اسلام آباد جانا اچھا
نہیں لگتا ہے۔“ میں نے ایک دن تنگ آ کر کہا۔ ان کا
چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔

ذہن پر پڑنے والے ہر وقت کے پریشانی کی وجہ سے
میرے سر میں درد رہنے لگا۔ میری عقل حیران تھی کہ
یہ کیسا شریک حیات ہے، جسے اپنی بیوی سے رتی بھر
بھی لگاؤ نہیں، پر کسی سے کہتی بھی تو کیا؟ سننے والا یہ ہی
کہتا کہ نہ تمہارا شوہر مارتا پیٹتا ہے، روپیہ پیسہ کی تنگی
ہے، تو پھر کیسی شکایت؟“ زبیرا نے ٹھنڈی سانس
بھری، تو فرح نے نہ سمجھ میں آنے والے انداز میں

”پلیز۔ زبیرا۔ میں نے صرف بچوں کی وجہ سے
تمہیں رکھا ہوا ہے، ورنہ تین بول بولنا کوئی مشکل بات
نہیں۔“ عمران کا غرور بھرا لہجہ، میرے دل کو شدید
ٹھیس پہنچی۔

اس رات پہلی بار۔ میں نے رشنا کو خوب برا بھلا
کہا۔ انہیں یہ بات بہت بری لگی۔ ایک ہفتہ منہ
پھلائے رکھا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک عجیب
روٹین بنالی، آفس سے ان کی واپسی رات گئے ہوتی،

”بھئی میں سوچی ہوں کہ بھلے عمران مجھے مارتے پیٹتے، مگر اپنے ہاتھوں سے میرے زخموں پر پیار سے مرہم لگاتے تو میں خوشی خوشی ان کے ہاتھوں پٹ بھی جاتی؟“ اس نے اتنی معصومیت اور مظلومیت سے کہا کہ فرح کی آنکھیں بھر آئیں۔

”ان کی بے رخی، عدم توجہی مجھے اندر ہی اندر کاٹے جارہی تھی۔ خاص طور پر جب وہ بچوں سے بھی کھینچے کھینچے رہتے تو مجھے بہت برا لگتا۔ ہم ایک انارمل زندگی گزار رہے تھے، مجھے اپنے ہی بچوں پر ترس آنے لگتا۔ اسی وجہ سے جب بھی کسی ڈرامے، فلم یا رشتہ داروں کے گھر جاتی اور پوری فیملی کو یکجا ہنستا کھیلتا دیکھتی تو میرا ڈپریشن بڑھ جاتا، سوچ سوچ کر میں اس معاملے میں جنونی ہونے لگتی ہوں۔ بچے بھی باپ سے کٹے کٹے رہتے ہیں۔ ہمارے گھر کا ماحول بالکل روایتی نہیں تھا۔“ زبیرا نے ماتھے پر انگلی رکھ کر کہا اور بچپن کی طرف چل دی۔ فرح خاموشی سے اس کی حالت کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس دوران وہ ایک ایک کپ چائے اور بنا لانی۔

”ان ساری باتوں کا تمہارے کمرے میں بند ہونے اور نوشاہہ سے ہونے والے جھگڑے سے کیا تعلق ہے؟“ فرح نے گھڑی پر نظر ڈالی، ”بھی اس کو رات کے کھانے کا بھی کچھ کرنا تھا، اسی لیے چائے کا کھونٹ لے کر بولی۔

”اگر میں آپ کو پس منظر نہ بتاتی تو آپ بھی شاید مجھے ہی غلط سمجھتیں۔“ زبیرا نے سادگی سے کہا تو فرح نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اچھا جہاں ستیا ناس وہاں سوا ستیا ناس اب تو پوری کہانی سن کر ہی جاؤں گی۔“ فرح نے مسکرا کر کہا۔

”جب میں شادی کے پانچ سال بعد یہاں شفٹ

ہوئی تو اتفاق سے میری ملاقات نوشاہہ سے ہوئی۔ وہ میری کالج کی دوست تھی، اس کی شادی مجھ سے پہلے ہوئی تھی۔ ہماری کافی اچھی دوستی تھی اس لیے اس کی پوری فیملی مجھے پہچانتی تھی۔“ وہ ماضی میں کھو گئی۔

اکثر تو میں انتظار کرتے کرتے سو جاتی۔ میں نے کیا پہنا، کیسی لگ رہی ہوں، کیسا پکایا، ان کو ایسی باتوں سے کوئی مطلب نہیں تھا، میرے معاملے میں وہ جیسے پتھر بن گئے۔“ زبیرا ایک دم گلوگیر لہجے میں بولی۔ فرح کا دل بھی دکھ گیا۔ وہ اس کو تسلی دینے لگی۔

”اوہ۔ یہ تو بہت غلط بات ہے۔“ فرح نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”میں انہیں رشنا کے چنگل سے نکالنا چاہتی تھی، خود پر خصوصی توجہ دینے لگی، عمران کے ارد گرد گھومتی، بہت برداشت سے کام لیتی، پر سب بے کار، عمران کی زندگی میں صرف ایک عورت تھی، رشنا۔ دونوں گھنٹوں فون پر باتوں میں مشغول رہتے۔ میں تھک ہار کر خاموش رہنے لگی۔“

”یہ تو برا ظلم ہے۔“ فرح نے اظہارِ افسوس کیا۔

”آپ بھی ایک عورت ہیں، جانتی ہوں گی کہ عورت کے لیے شوہر کی محبت اور توجہ کیا معنی رکھتی ہے مگر وہ۔“ اس کی خوب صورت سرمئی آنکھیں گلابی ہو کر اور دلکش لگنے لگیں۔ رخساروں پر بہتے آنسو، فرح کو عمران کی بد قسمتی پر افسوس ہونے لگا، جو اتنی اچھی بیوی کو اپنے پیار سے محروم رکھے ہوئے تھا۔

”عمران بھائی کو رشنا اتنی عزیز تھی تو اس سے شادی۔ میرا مطلب ہے۔ ایسے صرف دوستی رکھنا؟“ فرح نے بڑی مشکل سے یہ سوال کیا۔

”شادی نہ کرنے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کتنے خود پرست ہیں۔ ان کو جو محبت کا چارم اور خصوصی توجہ مل رہی تھی، وہ ختم ہو جاتی، دوسرے اس بات کا ابھی خاندان کے چند لوگوں کو ہی اندازہ ہے۔ عمران میں اتنا حوصلہ نہیں کہ اتنا بڑا قدم اٹھانے کے بعد اپنی برادری والوں کو فیس کر سکتے۔“ زبیرا نے وجہ بتائی۔

”چلو۔۔۔ چھوڑو۔۔۔ ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی۔ جنہیں اچھی چیزوں کی قدر نہیں ہوتی۔“ فرح نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

شاید ان لوگوں نے عقل کے ناخن لیے اور رشنا کا رشتہ طے کر دیا۔ عمران بڑے چڑچڑاتے ہوئے اسی میں شرکت کرنے گئے ہوئے ہیں۔ بلاواتو ہم سب کا تھا، مگر میں نے صاف منع کر دیا جس لڑکی کی وجہ سے میں اتنے سالوں دکھوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبی رہی۔ میں اس کی خوشیوں میں کس دل سے شرکت کرتی۔ ” وہ صاف گوئی سے بولی۔

”لوہ۔ چلو سر سے بلا تو ٹلی۔“ فرح نے سکون کا سانس لیا۔

”پتا ہے۔ میں برسوں سے ایسی زندگی کے خواب دیکھتی آرہی تھی۔ جیسی منیر بھائی اور نوشابہ گزارتے آرہے تھے۔“

”تم۔ ان لوگوں کو دیکھ دیکھ کر جلتی بھنتی رہتی تھیں۔“ فرح کو اس کی کہانی کا یہ موڑ کچھ عجیب لگا۔ اس نے مجرموں کی طرح سر ہلایا۔

”یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے ایک اعتراف کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے اپنا معمول بنا لیا تھا، جب بھی منیر بھائی آفس سے واپس آتے میں اس کھڑکی سے ان دونوں کو دیکھتی۔ آپ یقین مانیں میری کوئی بری نیت نہ تھی اور نہ ہی دل میں کبھی منیر بھائی کے حوالے سے کوئی برا خیال آیا، میں تو ان دونوں کا بہت احترام کرتی تھی بس وہ مجھے دنیا کے سب سے پرکشش مرد دکھائی دیتے۔“ زنیہ نے کھڑکی کی طرف بغور دیکھا جواب بند تھی۔

”زنیہ۔ جو باتیں تم کر رہی ہو، وہ کوئی بھی سنے گا تو تمہیں غلط ہی سمجھے گا۔ کسی نامحرم کے لیے اتنی پسندیدگی، کوئی اچھے معنوں میں نہیں آتی۔“ فرح نے اس کو ڈرایا۔

”میں بتا تو رہی ہوں۔ منیر بھائی کے لیے میرے جذبات پاکیزہ اور بے غرض تھے۔ جیسے کوئی اچھی چیز آپ کو بھاجاتی ہے، ویسے ہی وہ مجھے اچھے لگتے۔“ زنیہ نے اپنے کٹاؤ دار ہونٹوں کو چباتے ہوئے صفائی دی، مگر فرح کو زور کاٹھ کا لگا۔

”کیا کہہ رہی ہو، زنیہ! منیر بھائی دنیا کے سب سے

”ہاں۔ میں جانتی ہوں۔“ فرح نے جلدی سے حامی بھری۔

”بس۔ شاید نوشابہ کی پڑوسن بننے کے بعد میری تشنگی میں اضافہ ہوا۔ مجھے اپنی زندگی میں ایک بڑے خلا کا احساس زیادہ ہونے لگا۔“ زنیہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر بتایا۔

”پلیز۔ زنیہ۔ اب یہ سسپنس ختم کرو گی؟“ اس کے انداز بیاں پر فرح نے جھڑکا اور سامنے لگی وال کلاک میں وقت دیکھا جو بھاگ رہا تھا۔

”جی۔ میرے ڈرائنگ روم کی کھڑکی اس طرح سے ہے کہ وہاں سے نوشابہ کے گھر کا ٹی وی لاؤنج کا کچھ حصہ نظر آتا ہے اکثر بے خیالی میں میری نگاہ بھٹکتی اور میں منیر بھائی کو نوشابہ کے ساتھ چوچلے کرتے دیکھتی، اکثر وہ آفس سے واپسی پر پھولوں کے گجرے خرید کر لاتے، چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے کبھی کبھی اسے خود ہی پہنا دیتے۔ وہ اپنے بچوں کو گود میں بٹھاتے، پیار سے ان کی معصومانہ باتیں سنتے، چھٹی والے دن اکثر منیر بھائی اپنے بڑے بیٹے کی سائیکل چکانے میں اس کی مدد کرتے تو میرا دل کرچی کرچی ہو جاتا۔ میں بچوں اور گھر کے بہتر ماحول کے لیے ایک بار پھر عمران کی جانب بڑھی، مگر وہ تو اپنی پرانی محبت کے ماتم میں مصروف تھے۔

”بات۔ سنیں۔ کیا آج آپ واپسی پر میرے لیے پھولوں کے گجرے لیتے آئیں گے؟“ میں نے ایک دن ہمت کر کے عمران سے فرمائش کی۔

”پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔ بڑھاپے میں یہ چونچلے۔“ عمران نے اوپر سے نیچے تک تمسخر اڑائی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

اب میرے پاس عمران سے کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا، یہ بھی نہ کہہ سکی کہ تم کیوں اتنے جوان بن کر اسلام آباد وڑے چلے جاتے ہو، جب کہ اب تو رشنا کی شادی بھی طے ہو گئی ہے۔“

”رشنا کی شادی!“ فرح کو ایک اور جھٹکا لگا۔

”جی۔ اتنے سہل سراب کے پیچھے بھاگنے کے بعد

رٹے جا رہی تھی، آسو اس کے حسین رخساروں پر بننے لگے۔

”ایسا کیا مانگ لیا۔ بتاؤ نا، تم نے منیر بھائی سے کیا مانگا؟“ فرح کو جواب سننے کی بے چینی ہونے لگی۔

”میں نے۔۔۔ ان سے کہا۔“ زبیرا کچھ سوچ کر خاموش ہو گئی۔

”ہاں۔ کیا کہا، پلیز بتاؤ نا۔“ فرح بے تابی سے بولی۔

”میں نے ان سے کہا کہ وہ میرے لیے بھی موتیا کے گجرے لے آئیں۔“ زبیرا کے چہرے پر شرمندگی کی لالی چھا گئی، اس کی نظریں جھک گئی، سرخ ہونٹ کپکپا اٹھے۔

”کیا۔ تم نے منیر بھائی سے یہ فرمائش کی؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی فرح کی چیخ نکل گئی۔

”جی۔ بس۔۔۔ پتا نہیں کیسے میرے منہ سے یہ بات نکل گئی۔ منیر بھائی لمحے بھر کو چپ رہ گئے، البتہ نوشی کا موڈ سخت آف ہو گیا، اس نے جرح کرنا چاہی، مگر منیر بھائی نے بات ختم کر دی، کیوں کہ وہ مجھے اپنی سالی سمجھتے ہوئے، ہنسی مذاق میں بات کو اڑاتے وہاں سے چلے گئے۔ میں جب گھر واپس آنے لگی تو نوشی سخت خفا تھی۔“ زبیرا ایک دم متوحش ہو کر بولی۔

”تمہاری اس بات پر کیا وہ خوشی سے جھومتی۔ زبیرا نے اس سمجھانا چاہا۔

”جی۔ مجھے بھی لگا کہ میرے منہ سے نکلی بات غیر مناسب ہے، اسی لیے وہاں کبھی نہ جانے کا فیصلہ کیا، مگر غضب یہ ہوا کہ آج جب منیر بھائی نے میری فرمائش پوری کر دی تو نوشی تن فرن کرتی میرے گھر آئی، اس کے ہاتھ میں اخبار کا ٹکڑا تھا جس میں سے بھیننی بھیننی

گلاب اور موتیے کی خوشبو اٹھ رہی تھی، اس نے کانڈ سے وہ گجرے نکل کر میرے منہ پر دے مارے، اس کے بعد اس نے مجھے بد کردار عورت کا لقب دیا، ایسی عورت قرار دیا جو اس کے شوہر کو پھنسانے کی کوشش

”پرکشش مرد؟“ فرح نے زبیرا کو یوں دیکھا جیسے اس کی ذہنی حالت بر کوئی شبہ ہو۔

”یقیناً جینے گا، میرے دل میں کوئی برائی نہیں یا یوں کہہ سکتے ہیں، اپنے گھر والوں کے ساتھ ان کی محبت اور فکر مندی نے میری نگاہوں میں ان کا رتبہ بلند کر دیا۔ کبھی جب میں کوئی اچھی چیز پکاتی تو لے کر جاتی، نوشابہ مجھے چائے پر روک لیتی، بچے بھی ان کے بچوں کے ساتھ کھیلتے، ہم کافی وقت وہاں گزارنے لگے۔ ان لوگوں کو میرے ہاتھ کی پکی چیزیں بہت پسند آتیں، خوب تعریف کرتے۔ میں خوش ہو جاتی عمران جیسے خود پسند شخص نے تو آج تک کبھی مجھے نہیں سراہا۔ منیر بھائی کو بھی میرے پکائے ہوئے کھانے پسند آتے، میں تھوڑی سی تعریف پر خوش رہنے لگی، مزید جانفشانی سے کچھ پکا کر ان کے یہاں لے جاتی، مگر اب نوشابہ کچھ کھنچی کھنچی سی رہنے لگی، ہاں منیر بھائی کا رویہ ویسا ہی مشفقانہ سا تھا۔ مجھے نوشابہ کے انداز پر دکھ ہوا۔ اس لیے میں نے وہاں جانا کم کر دیا۔“ زبیرا نے ایک آہ بھری۔

”اچھا کیا۔۔۔ پھر جھگڑا کیوں ہوا؟“ فرح نے بغور دیکھا، وہ انگلیاں مسل رہی تھی۔

”معاملات برسوں سے بگڑنا شروع ہوئے، میں نے گاجر کا حلوہ بنایا تو خیال آیا کہ نوشی کو پسند ہے، بس ایک پاؤں اس کے لیے لے گئی، منیر بھائی نے تو خوب واہ واہ کر کے کھایا۔ نوشی البتہ خاموش رہی۔ اگر مجھے اس وقت اندازہ ہوتا کہ اس کے دل میں کسی قسم کے شکوک پل رہے ہیں تو اپنا منہ بند رکھتی، مگر حلوہ کھا کر منیر بھائی نے خوب واہ واہ کی اور پوچھا کیا انعام لوگی؟“ زبیرا کی آنکھیں ایک دم بھر آئیں۔

”تم نے کیا کہا؟“ فرح کو یقین تھا کہ یہیں کوئی بے وقوفی کی گئی ہے۔

”یقیناً کریں میں نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کہا، نہ ہی کوئی غلط ارادہ تھا۔ بس پتا نہیں کیسے بے ارادہ ہی میرے منہ سے نکل گیا اور وہ ہی بات نوشی کے دل پر جا گئی۔“ زبیرا مسلسل فرح کا ہاتھ تھامے ایک ہی بات

”دیکھو۔۔۔ زنیرا۔۔۔ یہ مانگے کی توجہ وقتی ہوتی ہے، جیسے شروع ہوتی ہے ویسے ہی ختم ہو جاتی ہے، دیرپا ثابت نہیں ہوتی، بالکل ان پھولوں کی طرح۔“ فرح نے زمین پر پتی پتی ہو کر بکھر جانے والے کجروں کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ ٹھیک کہتی ہیں۔۔۔ میں خود بھی یوں بھاگتے بھاگتے بہت تھک گئی ہوں۔ اب خود کو مضبوط بناؤں گی، سراب کے پیچھے بھاگنے سے بہتر حقیقتوں کا سامنا کرنا ہے، ویسے بھی اب میری زندگی تو ختم ہو ہی گئی ہے۔ میں اپنے بچوں کی نشانی اور پیاس مٹانے والی ہستی بن جاؤں گی۔“ زنیرا نے سر ہلا کر یقین دہانی کرائی۔

”ایک بات اور یاد رکھو۔۔۔ پرندہ دن بھر کتنا بھی آسمان کی وسعتوں میں اڑتا ہے، رات گئے لوٹ کر اپنے گھر ہی جاتا ہے۔ عمران بھائی کو بھی اس بات کا اور آگ جلد ہی ہو جائے گا، وہ تم لوگوں کی طرف ضرور لوٹیں گے۔“ فرح نے وہاں سے گھر جانے کے لیے اٹھتے ہوئے امید کی شمع روشن کر کے اس کے ہاتھ میں تھمادی، زنیرا اس کے گلے لگ گئی۔

فرح اس سے اجازت طلب کر کے اٹھی، سامنے سے منیر احمد بھی کہیں جانے کے لیے اپنے فلیٹ کے دروازے سے باہر نکل رہے تھے، کالے بھنگ، نانے سے قد اور گھنگھریالے بالوں والے منیر کو فرح نے نظر بھر کر دیکھا، ”ایسا کیا ہے، اس بد صورت آدمی میں جو زنیرا جیسی حسین مومی گڑیا، ان سے اتنا متاثر ہے۔“ فرح نے خود سے سوال کیا۔

”ارے۔۔۔ میرا بچہ۔۔۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے تھک جائے گا، آجا۔۔۔ آجا۔۔۔ پایا کی گود میں۔“ چھوٹا سا راحیل باپ کی پکار پر لپک کر ان کی گود میں چڑھ گیا، منیر بھائی نے اس کا منہ چوم لیا۔ فرح نے بغور دیکھا، محبت کی ایسی پیاری چمک ان کے چہرے سے پھوٹ رہی تھی کہ فرح کی آنکھیں بھی خیرہ ہونے لگیں۔ سچ تو ہے انسان کا کردار اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے اندر کی محبت، نرمی اور پیار نے منیر بھائی جیسے عام سے انسان کو خاص بنا دیا۔

کر رہی ہے، اس کے شوہر پر ڈورے ڈالنے والی ناگن کہا، میں نے بہت چاہا کہ اس کی غلط فہمی دور کروں کہ مجھے اس کے میاں سے کوئی واسطہ نہیں۔ پر وہ میری کوئی بات سننے کو تیار ہی نہ ہوئی، اب آپ بتائیے میں کیا کرتی اپنے بچوں کا سامنا کیسے کرتی؟“ زنیرا کے سوال پر فرح اسے دیکھ کر رہ گئی، وہ اسے ایک معصوم سی بچی لگی، بے ریا، بے غرض سی، شفاف آنکھوں والی بچی۔

فرح کا دل میں اندیشے جاگ اٹھے، اس کی محرومیاں آج اسے اس مقام پر لے آئی تھیں کہ وہ اب اپنا تماشا خود بنا رہی تھی۔ اپنے خیالات کی رو میں بہتی ہوئی، جس راہ پر چل پڑی تھی اس کی وجہ سے اس کی شادی شدہ زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

”دیکھو۔۔۔ زونی۔۔۔ میں تمہیں اپنی چھوٹی بہن کی طرح سمجھتی ہوں اس لیے بالکل صحیح مشورہ دوں گی، یہ ٹھیک ہے کہ قسمت نے تمہارے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا، مگر اپنی محرومیوں کے خاتمے کے لیے تم نے جو طریقہ اختیار کیا اسے کسی طرح بھی ٹھیک نہیں کہا جاسکتا۔ بجائے اس کے کہ تم اپنی اولاد کی طرف راغب ہو کر ان کی محبت میں گم ہو جاؤ۔ تم دوسروں سے پیار اور توجہ کی طلب گار بن گئی، میری مانو تو یہ پیار اور توجہ تم اپنے بچوں میں ڈھونڈنا شروع کرو، ان کے ساتھ شام کی چائے پو، ان کو لے کر باہر گھوم پھر آؤ، رشتے داروں میں چلی جاؤ یا گھر میں ان کے دوست جمع کر کے، ان کی خوشیوں کا سامان کرو۔ اگر تمہیں شوہر کی توجہ نہیں مل پارہی تو اس طرح کسی اور کی خوشیوں پر نظر رکھنا اخلاقیات کے خلاف ہے، دنیا میں ہی لوگوں کے ساتھ عجیب و غریب حادثے ہوتے ہیں، تم بھی اسے زندگی کا ایک حادثہ سمجھ کر نظر انداز کرو۔ اپنے جوان ہوتے بیٹے کو اپنا سہارا بناؤ۔ کیوں کہ تم جس راہ پر چل رہی ہو، وہ اپنے آپ کو دھوکا اور فریب دینے والی بات ہے۔“ فرح نے بڑے پیار سے زنیرا کو سمجھایا، اس کے مومی ہاتھوں میں پنپنے لگے نرمی سے اتارنے لگی۔ اس کی ساری پتیاں پہلے ہی جھڑ چکی تھیں۔

مشورہ ۶

شہر میں ہمارے ہے ہر طرح کی آزادی
جو بھی کام کرنا ہو روکتا نہیں کوئی
جس طرف بھی جانا ہو راستے کھلے ہیں سب
جو بھی بات کہنی ہو ٹوکتا نہیں کوئی

قول ہے بزرگوں کا "احتیاط اچھی ہے"
مصلحت ہو جس میں بھی بس وہ بات
اچھی ہے

اس جہانِ قافی میں چار دن تو رہنا ہے
مختصر سی مہلت یہ اور کم نہ ہو جائے
زندگی سی دولت یوں راہ میں نہ کھو جائے
سو یہی مناسب ہے

امن سے رہا جائے چین سے جیا جائے
جو بھی بات کہتی ہو جو بھی کام کرنا ہو
سوچ کر ہی جائے، پوچھ کر کیا جائے!
امجد اسلام امجد

ابھی کچھ پل ہمارے ہاتھ میں ہیں
کون جانے
کون سالحہ ہمارے ہاتھ سے پھسلے، گرے
اور پاؤں کی زنجیر ہو جائے
ابھی یہ دن جو لگتا ہے کہ ہم ایک دوسرے
کے ساتھ

رہ سکتے ہیں پل دوپل
نجانے کب کہاں دیوار بن جائے
ابھی دو چار سائیس بچ رہی ہیں
یہ تو بھونکا ہیں

کسے معلوم کس آہستگی سے یوں گزر جائیں
کہ ہم دریاؤں کے دو مختلف نا آشنا گونگے
کناروں پر کھڑے
اک دوسرے کی شکل دیکھنے کو ترس جائیں

میری آواز تیری یاد میں زندہ ہو بس
اور میں تری تصویر آنکھوں میں لیے رونا
چھپاؤں شہر والوں سے

ابھی کچھ پل ہمارے ہاتھ میں ہیں
ہم جو چاہیں گے تو کچھ کم کم بھی مل لیں گے
مگر جانے کہاں
کب...؟
کون سالحہ؟

فرحت عباس شاہ

غمِ عاشقی سے کہہ دو راہِ عام تک نہ پہنچے
مجھے خوف ہے یہ تہمت میرے نام تک پہنچے

نئی صبح پر نظر ہے مگر آہ یہ بھی ڈہے
یہ سحر بھی رفتہ رفتہ کہیں شام تک پہنچے

وہ نوائے مضمحل کیا نہ ہو جس میں دل کی دھڑکن
وہ صدائے اہلِ دل کیا جو عوام تک پہنچے

انہیں اپنے دل کی خبریں میرے دل سے مل رہی ہیں
میں جو ان سے روٹھ جاؤں تو پیام تک پہنچے

یہ ادائے بے نیازی تجھے بے وفا مبارک
مگر ایسی بے رُخی کیا کہ سلام تک پہنچے

وہی اک خاموش نغمہ ہے شکیلِ جامِ ہستی
جو زبان تک نہ آئے جو کلام تک پہنچے

شکیل بدایونی

جہنم میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں اور زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانہٴ دل کے میکسوں میں

پہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا عرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

محبت کے لیے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ لے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آگینوں میں

خموش اے دل! بھری محفل میں چلاتا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

برا سمجھوں انہیں؟ مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ میں خود بھی تو ہوں اقبال اپنے نکتہ پھینوں میں

علامہ اقبال

شکفتہ گاہ



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا اللہ فرماتا ہے، اس کو مصیبت سے دوچار کر دیتا ہے۔“
(بخاری)

انصاف،

امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے انصاف کی حالت یہ تھی کہ جب آپ کا انتقال ہوا تو آپ کی سلطنت کے دور دراز کے علاقے میں ایک چرواہا بھاگتا ہوا آیا اور لوگوں سے جلا کر مخاطب ہوا۔
”اے لوگو! عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ انتقال فرم گئے ہیں۔“
لوگ بہت حیران ہوئے اور پوچھا۔ ”تم مدینے سے اتنی دُور جنگل میں ہو، تمہیں کسی نے اطلاع دی ہے؟“
اس نے کہا۔ ”نہیں، مجھے کسی نے اطلاع نہیں دی۔“
لوگوں نے پوچھا۔ ”پھر تم ایسا کیسے کہہ سکتے ہو؟“
اس نے جواب دیا۔ ”جب عمرؓ زندہ تھے تو میری بھیڑ میں جنگل میں بے خوف پھرتی تھیں۔ کوئی ان کو نقصان نہیں پہنچاتا تھا۔ آج میری بھیڑ کے بچے بھیڑیا اٹھا کر لے گیا ہے۔ میں نے بھیڑیے کی جراثیم سے جان لیا کہ آج دُنیا میں عمرؓ موجود نہیں ہیں۔“
لوگوں نے تحقیق کی پتا چلا، اسی روز حضرت عمرؓ کی شہادت ہوئی تھی۔
تتا عبد القیوم۔ بنگہ چیمہ

رزق،

”یقین کر لو رزق حرام ہی سے ہماری آنے والی نسلوں

کو پاگل بن وراثت میں ملتا ہے۔“
(بانی قدسیہ۔ راجہ گدھ)
نوال افضل گھمن۔ لاہور۔

قابلیت،

کہا جاتا ہے کہ امریکہ کے صدر عام طور پر معمولی ذہانت کے حامل ہوتے ہیں اور اپنے ملک سے باہر کی دُنیا کے

بارے میں ان کی ذاتی معلومات اکثر اوقات عام امریکیوں کی طرح انتہائی ناقص ہوتی ہیں۔ سو ہوائیوں کہ جارج بوش کا انتقال ہو گیا۔ جب وہ اگلے جہان پہنچا تو داخلی دروازے پر سینٹ پیٹر نے اسے روکا اور پوچھا۔

”تم کون ہو؟“

بوش بہت جڑبڑ ہوا اور بولا۔ ”تم مجھے نہیں جانتے میں امریکہ کا صدر ہوں جارج بوش۔“

اسے بتایا گیا کہ یہاں دُنیاوی درجے اور تعارف نہیں چلتے اور ہر آنے والے کو اپنی شناخت کرانی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر کچھ عرصہ پہلے پکا سوا آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ مصدوم ہے۔ اس سے کہا گیا کہ وہ اپنے فن کے نمونے دکھائے سو اس نے ایک تصویر بنا کر دکھائی اور اسے داخلہ مل گیا۔ پھر اسٹیشن اسٹاٹن آیا اس نے کہا۔

”میں سائنس دان ہوں اور دُنیا کو ایٹم کی بھتوری دی ہے۔ استفسار یہ اس نے اپنی بھتوری کی وضاحت کی اور اس کی بات مان لی گئی۔“

بوش نے کہا۔ ”باقی بات بعد میں سنوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ یہ پکا سوا اسٹاٹن اسٹاٹن کون لوگ ہیں؟“
سینٹ پیٹر نے چند لمحے سوچا اور پھر دروازہ کھول کر کہا۔

ہوں، یا جا میں اس وقت بجاؤں گا جب سب سو رہے ہوں گے۔“
مسرت الطاف احمد۔ کراچی

تم اندر جا سکتے ہو۔ کیونکہ تمہاری معلومات سے ثابت ہو گیا ہے کہ تم واقعی امریکہ کے صدر ہو۔“
اقصی ناصر۔ کراچی

قرض،

قرض ”نیکی“ کی آواز کو خوش آمدید کہنے کا نام ہے۔ (ورد زودتھ)
حراقریشی۔ ملتان

ایک شعر،

ہے کس لیے دیکھتی ہو آئینہ
تم تو خود سے بھی خوبصورت ہو
(جون ایلیا)
خالہ پردین۔ گاؤں اوکھ

محبت،

محبت اندھی ہوتی ہے۔ چنانچہ عورت کے لیے خوبصورت ہونا ضروری نہیں۔ بس مرد کا نابینا ہونا کافی ہے۔
(آب گم گشتہ۔ مشتاق احمد یوسفی)

قابل ستائش،

مصائب تو مرد بھی جیسے تیسے برداشت کر لیتے ہیں۔ مگر عورتیں اس لحاظ سے قابل ستائش ہیں کہ انہیں مصائب کے علاوہ مردوں کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔
(مشتاق احمد یوسفی)

حاصل،

ترک الفت سے
کیا ہوا حاصل ۶۰۰۰؟
تب بھی مرتا تھا
اب بھی مرتا ہوں
(جون ایلیا)
آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

لہجہ،

الفاظ سے بات سمجھ میں آتی ہے۔ لہجے سے دل میں اتر جاتی ہے۔ جادو والی الفاظ میں نہیں لہجے میں ہوتا ہے۔ الف لیلیٰ خزانوں کا دروازہ ہر ایرے غیرے کے کھل جائے، سم کہنے سے نہیں کھلتا۔ وہ الہ دین کا لہجہ مانگتا ہے۔ دلوں کے قفل کی کلید بھی لفظ میں نہیں لہجے میں ہوتی ہے۔
(آب گم۔ مشتاق احمد یوسفی)
نمرہ، اقرآ۔ کراچی

اگر،

اقبال صدی کی تعریبات کے حوالے سے جگن ناتھ آزاد کی آمد پر عطاء الحق قاسمی نے اپنے گھر میں ایک کھانے کا اہتمام کیا تو خاص طور پر سبزیاں اور دالیں پکوائیں تاکہ مہمان کے لیے کوئی مسئلہ نہ ہو۔ مہمان خصوصی ہونے کے حوالے سے جگن ناتھ کو سب سے پہلے کھانے کی دعوت دی گئی۔ وہ آکر میسر کے سامنے کھڑے ہوئے ایک نظر مختلف سبز یوں اور دالوں پر ڈالی جو خاص طور پر ان کے لیے تیار کروائی گئی تھیں اور پھر مسکرا کر بولے۔
”یار۔! اگر تم لوگوں نے یہی کچھ کھانا تھا تو پاکستان کیوں بنایا تھا؟“

(چلو جاپان چلتے ہیں۔ اجدا سلام امجد)
نخبہ اکرم۔ گاؤں گولیکی

معصومیت،

راحیل نے اپنے نانا ابو سے کہا۔
”نانا ابو مجھے باجا لاؤں؟“
نانا ابو نے کہا۔ ”بیٹا! یا جا تو میں تمہیں لا دوں گا لیکن تم ہمیشہ اسے بجا بجا کر دوسروں کو تنگ کر دو گے۔“
راحیل نے جواب دیا۔ ”نانا ابو! میں وعدہ کرتا

جوگ،

جوگ کا پہلا قدم ت اٹھے گا۔ جب غصے کو ختم کیے گا۔ عزت و تکرار کا بنا کر حکم حکومت داؤ پر لگا دے گا۔ یہ رنگ اتار پھینک بھر جوگ کی سوچنا۔
(اشفاق احمد۔ من چلے کا سودا)
عائشہ فاطمہ۔ لودھراں

دکھ،

دکھ بھی تو آدمی ہوتے ہیں۔ آکے بنتے ہوئے لوگوں میں بیٹھ جاتے ہیں۔ گھروں میں رہنے لگتے ہیں۔ دلوں میں آباد ہو جاتے ہیں اور رنگ میں بھنگ ڈال دیتے ہیں۔ آنکھوں میں بسرا کر کے زندگی سے سکون کو نکال دیتے ہیں۔
آمنہ اجالا۔ ڈھری

چار نصیحتیں،

حاتم اصم سے ان کے ایک مرید نے عرض کی۔
”مجھے کوئی نصیحت کیجئے“
حاتم اصم نے جواب میں کہا۔
”چار چیزوں سے بچو۔ اول یہ کہ کسی ایسے شخص کو نا اہل نہ کرو جسے خوش کرنے کی آئندہ کبھی ضرورت پیش آئے۔ دوسرے یہ کہ اس عمارت کو نہ اجاڑو جس کی تعمیر کی آئندہ احتیاج ہو۔ تیسرے یہ کہ اپنی زبان سے کوئی ایسی بات نہ کہو، جس کے لیے بعد کو معذرت کرنی پڑے۔ اور چوتھی یہ کہ دنیا کی روشنی میں کسی مسلمان کا دل نہ دکھاؤ ناکہ قبر کے اندھیرے سے تکلیف اٹھاؤ۔“
مدیحہ فہمید۔ کراچی

سبق،

نعمت خان ایک مشہور گویا تھا۔ گویا ہونے کے سوا اس میں کوئی اضافی قابلیت نہ تھی مگر جہاں دارشاہ نے اسے ملتان کا گورنر مقرر کر دیا اور تقرری طے کے کاغذات

اپنے وزیر ذوالفقار خان کو بھیج دیے۔ وزیر نے کاغذات دبا لیے اور عمل درآمد میں تاخیر کی۔ نعمت خان نے اس سے ملاقات کر کے تاخیر کا سبب دریافت کیا۔

وزیر نے کہا: ”نعمت خان! شاید تمہیں میرے دفتر کا دستور معلوم نہیں ہے۔ میں کسی بھی تقرری کے کاغذات نقد رقم لیے بنا جاری نہیں کرتا۔ لیکن میں تم سے نقد رقم نہیں لوں گا۔ بس تم ایک ہزار سارنگیاں فراہم کر دو۔“
نعمت خان ایک ہفتے تک سارنگیاں جمع کرتا رہا۔ کل دو سو سارنگیاں جمع ہوئیں۔ وہ انہیں لے کر وزیر کے پاس آیا۔

وزیر نے کہا: ”تقرری کے کاغذات ایک ہزار سارنگیوں کے عوض ملیں گے۔“
نعمت خان کے لیے ایک ہزار سارنگیاں فراہم کرنا مشکل تھا۔ اس نے بادشاہ سے شکایت کر دی۔

جہاں دارشاہ نے وزیر کو طلب کیا اور پوچھا۔
”اس قدر سارنگیاں لے کر کیا کر و گئے؟“
وزیر نے جواب دیا۔

”جہاں پناہ! چونکہ مطربوں کو سولوں کی گورنری سونپی جا رہی ہے لہذا امرا اور سردار اپنا اسلحہ اتار پھینکیں گے۔ سارنگی بجانا سیکھیں گے اور سارنگی بجانا شروع کر دیں گے۔“

یعنی۔ مانسہرہ

مرد

ہر مرد اگر آج عورت کی کسی غلطی یا لاپرواہی کو کوئی بات نہیں کہہ کر ٹال رہا ہے تو وہ کل کو اس کا طعنہ ضرور دے گا۔

ہر مرد کتنا بھی کوآپر بیٹو کیوں نہ ہو، مگر سمجھتا کرنا اور جھکنا صرف عورت کو ہی پڑتا ہے۔

ہر مرد اپنی اہمیت اور عورت کی توجہ حاصل کرنے کے لیے چھوٹی چھوٹی باتوں کو طول دے کر جھگڑا شروع کر دیتا ہے۔

نعل تاج۔ کراچی



امت الصبور

خاتون کی ڈائری

اداس موسم کے رتجکوں میں،

ہر ایک لمحہ بکھر گیا ہے
ہر ایک رستہ بدل گیا ہے
پھر ایسے موسم میں کون آئے

کوئی تو جاتے ترے نگر کی مسافتوں کو سمیٹ لائے
تری گلی میں ہماری سوچیں بکھیر آئے
تجھے بتائے کہ کون کیسے اچھا لتا ہے وقل کے موتی
تمہاری جانب کوئی تو جاتے ...
مری زباں میں تجھے بلائے ... تجھے منائے
ہماری حالت تجھے بتائے ... تجھے رلائے
تو اپنے دل کو بھی چین آئے

حراقیشی کے ڈائری سے

اپنی ڈائری سے ایک خوبصورت غزل رگ جہاں
کی نذر۔ (سچ کہتے ہیں، بہت یاد کیا تھا)
ابھی تم سا تھا کوئی روبرو، تمہیں یاد ہم نے بہت کیا
بڑی راس بھری تھی وہ گفتگو، تمہیں یاد ہم نے بہت کیا
وہی مست آنکھوں کی مستیاں، وہی چاند چہرے کی چاندنی
وہی عرض حال تھا ہو ہو، تمہیں یاد ہم نے بہت کیا
وہی ہونٹ تھے، وہی پھول تھے، وہی بے مثال اداسیاں
وہی خواب تھا، وہی آرزو، تمہیں یاد ہم نے بہت کیا
وہی آرزوئے وصل تھی جو، روز و شب کی مثال تھی
وہی دلکشی، وہی رنگ و بو، تمہیں یاد ہم نے بہت کیا

حکے ڈائری سے

حمدہ واجد

وقت کے حوالے سے احساس زباں اور رقاقوں کی
نسبت سے احساس محرومی شدید ہوتی ہے۔ فراق گورکھ پوری
کی اس پھوٹی بھر کی غزل میں وقت کے حوالے سے جو رنگ
ابھرتا ہے اس میں افسوس اور تاثر نہیں ایک سرشاری
ہے۔

رات بھی، نیند بھی، کہانی بھی
ہائے کیا چسپہ ہے جوانی بھی

ایک پیغامِ زندگی بھی
عاشقی مرگِ ناکہانی بھی

اس ادا کا تری جواب نہیں
مہربانی بھی، سرگرائی بھی

دل کو اپنے بھی غم تھے دنیا میں
کچھ بلائیں تھیں آسمانی بھی

دل کو آداب بندگی بھی نہ کئے
کر گئے لوگ حکمرانی بھی

زندگی عین دید پار فراق
زندگی، جسیر کی کہانی بھی

حکے ڈائری سے

سیدہ نسبت زہرا

میری ڈائری میں تحریر سعد اللہ شاہ کی یہ نظم آپ سب
قارئین بہنوں کے لیے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

چاہا ہے میں نے جس کو بڑی شدتوں کے ساتھ
اس طرح سے اُس نے مجھ سے محبت کبھی نہ کی

ہر داستان تیری بہت عود سے سستی
لیکن بیان اپنی حکایت کبھی نہ کی

اک خواب تھا کہ اپنی شبوں پر رہا محیط
کیا خواب تھا کسی سے وضاحت کبھی نہ کی

اک آگ تھی کہ جلتے رہے جس میں عمر بھر
اک درد تھا کہ جس میں خیانت کبھی نہ کی

مریم گکے ڈاٹری سے

میری ڈاٹری میں تحریر یہ عزال آپ سب تارین
بہنوں کے لیے۔

میری پکوں پہ یہ کیسا بوجھ آ پڑا ہے
کہ جیسے میں نے خوابوں کا جال سا اورٹھا ہے

یہ میرا ہاتھ پکڑ کے تم کس جہاں میں لے آئے
ابھی تو میرے حقے کا سارا کام پڑا ہے

کسی جھیل کنارے بنتے بگڑتے دائروں کی صورت
چار سو بے سبب دیرانیوں کا جال بکھرا پڑا ہے

میں تمہیں فلسفہ زندگی کا سمجھاؤں کیسے
کہ بدھر دیکھو ہر شخص تو محبت کے پیچھے پڑا ہے

کس موڑ پہ لے آئی ہے یہ زندگی مجھے
یہاں تو زندگی کا ہی کال پڑا ہے

تم کیسے سمیٹو گے مجھے، نا ممکن ہے یہ اب
کہ میرے وجود کا ذرہ ذرہ دیت کی صورت بکھرا پڑا ہے



میری ڈاٹری میں تحریر افتخار عارف کی یہ دلفریب
عزل عزیز زبان ماریہ اعجاز گھمن اور ناہید منزل بٹ
کے نام۔

کچھ دل سے کسی نے کہہ دیا پھر
وخت کا چلے گا سلسلہ پھر

پھولوں پہ دھنک کی یارہیں ہیں
خوشبو سے ہوا ہے رابطہ پھر

بے نام رفاقتوں کا موسم
زخموں کا چمن کھلا گیا پھر

خوابوں سے ڈری ہوئی تھیں آنکھیں
ڈر ڈر کے کیا ہے حوصلہ پھر

پتھر اوڑھے کب تک بھیجیں گے
جو لوٹ گیا آئینہ پھر

اس شہر کے سارے داستان گو
دہرائیں گے ایک واقعہ پھر

گر یا شاہ گکے ڈاٹری سے

میری ڈاٹری میں تحریر اعتبار ساجد کی یہ غزل
تمام قاری بہنوں کی نذر۔

ہم نے تو خیر تجھ سے شکایت کبھی نہ کی
ایسا نہیں کہ دل نے بغاوت کبھی نہ کی

کس حال میں ہیں تیرے سٹلے ہوئے غریب
تو نے یہ پوچھنے کی زحمت کبھی نہ کی

محسوس کرے گا وہ اوروں کے درد کو
جس نے خود اپنے آپ سے الفت کبھی نہ کی

Downloaded From Paksociety.com



عذرا ناصر _____ کراچی
بات بڑھنے کو تو بڑھ جاتی بہت لیکن نظر
میں بھی کچھ کم گونھا، چپ رہنے کی خواہش کی بھی تھی
عائشہ _____ کراچی

میری داستان حسرت وہ سنا سنا کر روئے
مرے آزمانے والے مجھے آزما کر روئے
تری بے وفائیوں پر، تری کج ادائیگیوں پر
کبھی سر جھکا کے روئے، کبھی منہ چھپا کے روئے
فائزہ بھی _____ پتوکی

پیاسے لہجے میں بہت کرتا ہے میٹھی باتیں
ہو کر سیراب بدل جاتا ہے لہجہ اس کا
ایس۔ کنول _____ فیصل آباد

ہم خوشبو کے سوداگر ہیں سودا سچا کرتے ہیں
جو گا ہک پھولوں جیسا ہو، ہم بن ڈالیں بک جلتے ہیں
ہم شہر و قبا کے لوگوں کا ہم کو حال سنائیں گے
ہم زخم تو دل پہ کھاتے ہیں اور انسو تک پی جاتے ہیں
سیدہ لوباسجاد _____ کہر وڑپکا

کمال شخص تھا جس نے مجھے تباہ کیا
خلاف اس کے یہ دل ہو سکا ہے اب بھی نہیں
یہ دکھ نہیں کہ اندھیروں سے صلہ کی ہم نے
ملاں یہ ہے کہ اب صبح کی طلب بھی نہیں

اقصی ناصر _____ کراچی
لوگ کہتے ہیں کہ مسکان ہے ہوتوں پر میرے
کون جانے تصور میں ہنسا یا کس نے

عائشہ شہزادی، فاطمہ شہزادی _____ بہاول نگر
مجھے حیرت ہے میرے پاس کچھ نہیں پختا
میں اپنی ذات سے جب بھی تمہیں تفریق کرتا ہوں

نوال افضل گمن _____ لاہور
منزل خواب ڈھونڈنے والو
اپنی آنکھیں نڈھال مت کرنا

نمرہ، اقرا _____ کراچی
یہ دشت ترک محبت یہ تیرے قرب کی پیاس
جو اذن ہو تو تیری یاد سے گزر جاؤں
میں زندہ تھا کہ تیرا انتظار ختم نہ ہو
جو تو ملا ہے تو اب سوچتا ہوں کہ مر جاؤں
عینزہ علوی _____ لاہور

دکھ ہے، احساس جرم ہے، کیا ہے
کوئی اندر سے توڑتا ہے مجھے
نخبہ اکرم _____ گاؤں گوینکی

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی
یہ حسن و عشق تو دھرا ہے سب مگر پھر بھی
کوثر خالد _____ جڑانوالہ

کچھ دن تو بسو مری آنکھوں میں
پھر خواب اگر ہو جاؤ تو کیا
ایک وہم ہے یہ دنیا اس میں
کچھ کھو تو کیا اور پاؤ تو کیا
خالدہ پروین _____ گاؤں اولکھ

تو ہو، تیرا خیال ہو یا خواب
کوئی بھی رات بھر نہیں رہتا
جس گھڑی چاہو، تم ملے آؤ
میں کوئی چاند پر نہ کیس رہتا
مہوشوکت _____ لاہور

اندھیرا لاکھ ہو، مجھ کو سحر کی آس رہتی ہے
یہی وہ روشنی ہے جو مجھے دہانے نہیں دیتی
مجھے معلوم ہے وعدہ نبھانا سخت مشکل ہے
میری کم ہمتی انکار بھی کرنے نہیں دیتی

ثالثہ کنول جٹ _____ پیچہ وطنی
ہم پر ختم تھا محبت کا تماشا گویا
روح کو روزِ جسم سے جدا کرتے ہیں
زندگی ہم سے تیرے ناز اٹھائے نہ گئے
سانس لینے کی فقط رسم ادا کرتے ہیں

سدرہ اقبال _____ کراچی
مسافر تو پھرتے ہیں رفاقت کب بدلتی ہے
محبت زندہ رہی ہے محبت کب بدلتی ہے
تم ہی کو جانتے ہیں ہم تم ہی سے پیار کرتے ہیں
یہ ہی برسوں کی عادت ہے اور عادت کب بدلتی ہے
منال برامین _____ عبدالحمیم

تو نے نفرت سے جو دیکھا تو مجھے یاد آیا
کیسے رشتے تیری خاطر۔ تو نہیں توڑ آیا
کتنے دھندلے ہیں یہ چہرے جنہیں اپنایا
کتنی اجلی تھیں وہ آنکھیں جنہیں چھوڑ آیا
فرحت عباس _____ پیرو جنگ
جہاں رہے گا وہیں روشنی لٹائے گا
کئی چراغ کا اپنا مکان نہیں ہوتا

سیدہ نسبت زہرا _____ کبر و ڈپکا
آبٹ پر میرے پاؤں کی دھیرے سے چونک کر
دیکھا ہے اس نے مڑ کے مجھے اس ادا کے ساتھ
پھسلی ہے جسم و جان میں عجب ایک سرخوشی
خوشبو سی کوئی اڑنے لگی ہے ہوا کے ساتھ
گرہیا شاہ _____ کبر و ڈپکا

اک فسانہ ہے زندگی لیکن
کتنے عنوان ہیں اس فسانے میں
چاک دامان کی خیر ہو یا رب
ہاتھ گستاخ ہیں زمانے کے

سرت الطراف احمد _____ کراچی
اب اور کتنی دیر یہ دہشت، یہ ڈر، یہ خوف
گرد و غبار، عہدِ ستم اور کتنی دیر
شام آ رہی ہے، ڈوبتا سورج بتلنے کا
تم اور کتنی دیر ہو، ہم اور کتنی دیر

کائنات _____ ڈیر کی
گنوسب حسرت میں جو خوں ہوئی ہیں تن کے قتل میں
میرے قاتل حساب خوں بہا، ایسا نہیں ہوتا
ہر اک صبح ہر گھڑی گزرے قیامت میں تو ہول سے
مگر صبح ہو دور جزا، ایسا نہیں ہوتا
شبنم شمشاد _____ بزمِ زمان

برف ایسی کہ پگھلتی نہیں پانی بن کر
پس اس ایسی کہ بھاتے ہوئے تھک جاتا ہوں
اچھی لگتی نہیں اس درجہ شناسانی بھی
ہاتھ ہاتھوں سے ملاتے ہوئے تھک جاتا ہوں

گرہیا شاہ _____ کبر و ڈپکا
زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی
گیلانی سسٹرز _____ کبر و ڈپکا
ان ہی لفظوں کے اشک بنتے ہیں
جیسے کے باوجود بھی کچھ لوگ مر گئے

نمرہ، اقرآ _____ کراچی
سانسوں کے سلسلے کو نہ دو زندگی کا نام
جیسے کے باوجود بھی کچھ لوگ مر گئے
نسبت سنیہ _____ کبر و ڈپکا
تو نے چھیڑا تو یہ کچھ اور بکھر جائے گی
زندگی زلف نہیں ہے کہ سنور جائے گی
تھک کے بیٹھا ہوں میں سالیوں کے گئے جگ میں
سوچتا ہوں کہ ہر اک راہ کدھر جائے گی

صف عمران _____ کراچی
اب دل کے درپچوں پہ دستک نہ کوئی ہوگی
آنکھ سے کریں باتیں، اے موسمِ شہانی

حورین زینب _____ کبر و ڈپکا
کبھی سمندر سے جا لہنا، کبھی ہواؤں سے بیرنگنا
بنا ہے اپنا مزاج دنیا کے ناخداؤں سے بیرنگنا
کبھی تمازت، کبھی تراوٹ، کبھی اجالا، کبھی اندھیرا
سکھا دیا ہے مجھے یہ کس نے کہ دھوپ چھاؤں سے بیرنگنا



کرنے کے لیے۔ اس کے علاوہ ”آبدار کا کریکٹر بھی اچھا ہے کیا اس کا جوڑ سعدی کے ساتھ ہے۔ ”فارس اور زمر کی نوک جھونک بھی اچھی لگتی ہے پلیز زمر کو اینڈ میں مار نہ دیجئے گا۔ کہانی میں سعدی اور حنین کی شادی نہ کروائیے گا کیونکہ ان جیسا ہو تو کوئی سامنے آئے شیرو کی شادی ضرور کروائیے گا۔ شہین سے ہا ہا (اور گزارش ہے کہ پلیز نمبر جی کو کہیے کہ وہ ایک سلسلہ شروع کریں جس میں وہ قرآن کی تفسیر کو ہم تک پہنچا سکیں۔ نمبر جی کی ذاتی زندگی کے بارے میں کوئی انٹرویو بھی شائع کر دیں۔ اس کے علاوہ علی عباس سے ملاقات بھی اچھی لگی۔



نادرہ خاتون



ج ”پیاری روزینہ! آپ نے کیسے اندازہ لگایا کہ ڈائمنڈ رنگ تھی۔ آج کل تو ایسی آرضیفشل چولری بازار میں آگئی ہے کہ اچھے اچھے جوہری دھوکا کھا جائیں۔ ہمیں تو آج تک اصلی اور نقلی ہیرے میں فرق محسوس نہیں ہوا۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی نظم کے متعلق کیا کہیں۔ آپ خود سمجھ جائیں۔ خاندان ویل ایجو کیٹڈ نہیں ہے تو افسردہ نہ ہوں بڑے بڑے اعلا تعلیم یافتہ لوگ صحافت کے بڑے نام جو یہ دعوا کرتے ہیں کہ ان کے خاندان میں پشتوں سے تعلیم ہے جب ٹی وی پر تبصرہ کے نام پر منتخب وزیر اعظم کے لیے اخلاق سے گری ہوئی زبان استعمال کرتے ہیں۔ تو ان کی تعلیم کا پول کھل جاتا ہے (سمجھ تو گئی ہوں گی کہ ہمارا اشارہ کس طرف ہے)

خط بھجوانے کے لیے پتا

خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔

Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

روزینہ نعیم یا سمین نعیم..... گوجرانوالہ

اصل چیز تہذیب ہے۔ شرافت اور تربیت ہے۔ تعلیم بھی ہو تو سونے پر سہاگہ والی بات ہوتی ہے۔

آپ نے نوٹ نہیں کیا کہ ذہن ہاؤس میں بھی کم پڑھی لکھی بہونے گھر کو سنبھالا اور بچوں کو بہترین تربیت کی۔ پڑھی لکھی ہو تو چھوڑ کر چلی گئی۔

وردہ گل..... کوئٹہ

اکتوبر کے شمارے نے اتنا مزہ دیا کہ سوچا کیوں نہ کوئی خط لکھوں جسب عادت سب سے پہلے ”کرن کرن روشنی“ پڑھا جسے پڑھ کر روحانی خوشی ملی۔ عمیرہ احمد کا ”آب حیات“ بھی بہت زبردست رہا جبکہ عفت سحر طاہر کے

”بن مانگی دعا“ کے تو کیا کہنے۔ نمبر احمد تو بھی گریٹ ہیں ان کے ”نمل“ نے تو دل موہ لیا۔ ”شہر آشوب“ بھی بہت اچھا ہے سسپنس ہے۔ اس میں افسانے بھی زبردست

ٹائٹل کی نیلم منیر کی ڈائمنڈ رنگ کافی اچھی تھی (بھلا رسالے کے ساتھ ہر قاری بہن کو یہ بھی ایک Tcs کر دیتے۔ ٹھیک ہے نا.....) انشاجی کی نظم بھی بہت بہت اچھی تھی ”آب حیات“ میں ”عمیرہ احمد“ نے سود کے متعلق ہماری معلومات میں کافی اضافہ کیا آئیہ مقصود کے ناول میں روحی کا کردار بہت اچھا لگا۔ افسانوں میں ”تماشا“ نمبر لے گیا۔ میں ایک بیوی ہوں ٹھیک تھا ”محببتوں کا ہنر“ ذہن ہاؤس کی لڑکیاں۔ توبہ اتنی ذہین دل عیش عیش کراٹھا۔ میری بڑی خواہش ہے کہ ہمارا خاندان بھی تعلیم یافتہ ہو مگر۔

”شہر آشوب“ میں سائر کا کردار ایک نفسیاتی مریض کا سا ہے لگتا ہے کہ ناز اس کی ماں ہوگی اور اب باری یہ ہے دن اینڈ اونٹی ”نمل“ کی ذواہ کیا بات ہے الفاظ نہیں ملتے تعریف

تھے۔

انسان ہونا چاہیے آب حیات اور نمل کے علاوہ آب کو کچھ بھی خاص نہیں لگا۔ چلیں شکر ہے کہ سلسلے تو اچھے لگے۔

آسیہ ارم و سیم خان۔۔۔ ملیہ کراچی

خواتین اور شعاع بہت بچپن کے ساتھی ہیں پتا ہی نہیں چلا کب بچپن لڑکپن میں بدلا اور لڑکپن جوانی میں اور اب بڑھاپے کی طرف گامزن ہیں مگر یہ ساتھی ہمیشہ ساتھ رہے۔ آج کل جو سلسلے چل رہے ہیں مثلاً ”عمیرہ کا ” آب حیات “ صرف ایک کہانی نہیں ہے، یہ ایک معلومات کا خزانہ ہے۔ جیسے نمل کو لیں تو اس میں قرآن پاک کی تفسیر جس انداز میں بیان کی ہے یہ صرف نمرہ کا ہی کمال ہے عمیرہ اور نمرہ کو ایک ساتھ خواتین میں شامل کر کے خواتین کے چاند بڑھاپے گئے ہیں۔

میں عدنان کی انجینیں اور خطوط بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ اس دفعہ ہماری ایک بہن (اخت حماد شفقت، سبھراپور) نے لکھا ہے کہ اسلام نے صرف شوہر کی خدمت کے بارے میں کہا ہے کہ تو پلیز میری ان سے گزارش ہے کہ ہم لوگ صرف اپنے مطلب کا اسلام ہی کیوں پڑھتے ہیں کیا ہمیں دین اسلام نے حقوق العباد نہیں سکھائے اگر آپ غور کریں تو آپ پتا چلے گا کہ خدمت دراصل کہتے کئے ہیں۔ اپنی چار روٹیوں میں اگر ساس، منڈ، سر، دیور کے لیے بھی ڈال لیتی ہیں تو کیا قباحت ہے۔ آپ یہ تو دیکھ رہی ہیں کہ آپ خدمت (معذرت میں اسے خدمت نہیں کہتی) کر رہی ہیں مگر آپ یہ بھی دیکھیں کہ بدلے میں آپ کیا پا رہی ہیں۔ میں اگر کام کرتی تھی تو میری ساس

میرے بچوں کا خیال رکھتیں۔ بہت سی اچھی باتیں انہوں نے ہی سکھائی ہیں۔ آپ کا خط پڑھ کر آپ کی ذہنی سوچ کا پتا چلتا ہے جبکہ سائرہ نے واضح طور پر بتایا تھا کہ ماہا کو صرف ازین چاہیے تھا پیاری بہن! کبھی آپ بھی ماں ہوں گی۔ سوچیں آپ کا بیٹا بھی کسی کا شوہر اور باپ بنے گا تو اس کی دوری سے آپ پر کیا گزرے گی۔ میرا آپ کے خط پر تنقید کرنا بھی صرف اس لیے ضروری تھا کہ یہ رسالہ ہماری آج کی بچیاں بھی پڑھتی ہیں کہیں کوئی بھی آپ کی سوچ سے متاثر ہو گئی تو ایک فیملی تباہ ہوگی نندا اور دیور تو آپ کی زندگی سے ایک وقت میں خود ہی الگ ہو جاتے ہیں مگر لڑکے کے والدین جب تک حیات ہوں اس کے ساتھ ہی رہتے ہیں

پیاری وردہ! شامے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ کی فرمائش پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ انٹرویو کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔

شیماء ماریہ اور طوبی۔۔۔ گلشن اقبال، کراچی

خواتین کی تمام رائٹرز بہت اچھا لکھتی ہیں جس میں تفریح کے ساتھ ساتھ اصلاح بھی ہوتی ہے مگر ہماری موٹو فیورٹ رائٹرز نمرہ احمد اور عمیرہ احمد ہیں۔ سائرہ رضا بھی حقیقت سے قریب تر لکھتی ہیں۔

اب بات کرتے ہیں اکتوبر کے شمارے کی تو سب سے پہلے ٹائٹل پر نظر دوڑائی بس ٹھیک ہی لگا، ستمبر کا ٹائٹل زیادہ اچھا تھا اس کے بعد فوراً ”بن مانگی دعا“ پڑھی۔ اچھی جا رہی ہے مگر اب سفینہ بیگم کو سدھارنا ہو گا بہت ہو گئی۔ پھر دھک دھک کرتے دل کے ساتھ فیورٹ ناول ”نمل“ کو پڑھنا شروع کیا۔ اف کیا بتائیں ”نمل“ پڑھتے ہوئے ہمارے کیا احساسات ہوتے ہیں۔ ”حنین“ جو اسٹوری کا ایک زبردست کردار ہے اس کے ہیرو کے بارے میں ہم فرینڈز میں اختلاف ہے میرے (شیماء) خیال میں حنین کا ہیرو ہونا چاہیے اگرچہ وہ نیگٹو کردار ہے مگر میں نے شروع سے اسے حنین کے ہیرو کے طور پر سوچا ہے، بہر حال ماریہ اور طوبی کے خیال میں اس کا ہیرو ”احمر شفیع“ ہو گا کیونکہ وہ اسی کی طرح اسماٹ ہے لیکن اس کا فیصلہ تو نمرہ ہی کریں گی۔

اس کے بعد ”آب حیات“ پڑھنی شروع کی تو آخر میں پیٹرس ایبا کا کی میت وصول کرتے ہوئے سالار کی بہادری نے دنگ کر دیا۔

باقی مکمل ناولز، ناولٹ اور افسانے بس ٹھیک ہی تھے۔ زیادہ خاص نہیں تھے جیسا کہ پہلے ہوا کرتے تھے البتہ خواتین کے سلسلے بہت زبردست ہیں مثلاً ”آپ کا باورچی خانہ اور دیگر سلسلے۔“

ج شیماء ماریہ اور طوبی! حنین بہت اچھی لڑکی ہے، غلطی کرتی ہے لیکن سنبھل بھی جاتی ہے، اپنی غلطیوں پر نادم بھی ہوتی ہے، نفس پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہے۔ آپ ہاشم جیسے کرپٹ اور احمربیسے چالاک لڑکے کے ساتھ اس کا

READING
Section

نے کچھ اس طرح جواب دیا کہ لڑکیوں کو پڑھانے کے فوائد کے متعلق تو میں کچھ نہیں جانتی، تاہم ایک خرابی اس میں یہ ہے کہ لڑکیوں کو اگر لکھنا پڑھنا آگیا تو وہ خط (محبت نامے) لکھنے کے قابل ہو جائیں گی، بہر حال یہ تو ازراہ مذاق بات تھی۔

اب آتے ہیں اصل مدعا کی طرف، رمضان المبارک کے بابرکت مہینے کی مصروفیت کی وجہ سے اپنے مخصوص بک شال سٹھ شمارہ نہ خرید اعیاد کے بعد جب شمارہ لینے گئے تو کیا خبر تھی کہ اس قدر صدے سے دو چار ہوں گے جی ہاں اشاک کم آیا تھا اس لیے شمارہ مارکیٹ سے غائب، ساری مارکیٹوں سے پتا کروایا۔ آس پڑوس اور دوستوں سے نہ مل سکا۔ ہماری تو دنیا ہی (خیالوں کی) اندھیر ہو گئی اوپر سے مانگے کی روشنی بھی نہ ملی دل بے چین کو قرار کہاں، تلاش مسلسل میں سرگرداں نکل پڑے گوجرانوالہ کے بک شالوں پر بھی نہیں مل سکا۔

سچ ہے محبت نری خواری ہے اس سے بھی بڑا سچ یہ ہے کہ یہ خواری ہم سب کو پیاری ہے۔

ہماری ہر دل عزیز راضی عمیرہ احمد، نمرہ احمد، تنزیلہ ریاض، سائرہ رضا، سمیرا حمیدان سب تحریروں کے پیچھے جو پیپر ورک اور ریسرچ ورک اور جو محبت، محنت کار فرما ہوتی ہے اس کے بعد میں تو برملا یہ کہوں گی یہ صرف خواتین ڈائجسٹ نہیں بلکہ یہ خواتین اوپن یونیورسٹی ہے ویل ڈن۔

جون، جولائی، اگست، ستمبر کے خواتین ایک ساتھ پڑھنے کے بعد عمیرہ احمد اور تنزیلہ ریاض آپ کی تحریر کی تعریف میرے بس کی بات نہیں بس اتنا کہوں گی۔ ”ہمیں آپ پر فخر ہے۔“

”ہا ہا ہا۔۔۔ آپ کی مہم جوئی کا احوال پڑھ کر تو ہمارا ایک پاؤ خون بڑھ گیا۔ خواتین ڈائجسٹ کے عشاق کا کچھ ہی حال ہے۔ سچ پوچھیں تو خواتین سے اتنی محبت دیکھ کر کبھی کبھی ہمیں خود پر رشک آجاتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بری نظر سے بچائے۔ آمین

ایک مشورہ دیں کہ آپ مصروفیت کے باعث پڑھ نہ بھی سکتی ہوں تو بھی خرید کر رکھ لیا ورنہ بعد میں ملنے میں واقعی بہت دشواری ہوتی۔

ہمیں بالکل احساس ہے کہ ہماری بہنیں کن کٹھنائیوں

اگر آپ اس کی نصف بہتر ہونے کی وجہ سے اس کی ذمہ داریوں میں اس کا ساتھ دیں گی تو سوچیں دنیا میں بھی سرخروئی اور آخرت میں بھی۔ اگر آپ کو میری تنقید بری لگی ہو تو معذرت۔

کرن کرن روشنی بھی بہت اچھا سلسلہ ہے اس دفعہ تصویروں کے متعلق بتا کر آپ لوگوں نے بہت اچھا کیا ہے یہ ہمارے گھروں میں بہت عام ہے۔

آپ لوگوں نے یہ سلسلہ ”حرف سادہ کو دیا“ بڑے ہی مزے کا دیا ہے، ہمیں پڑھنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ مصنفین کے بارے میں جان کر خوشی ہوتی ہے۔ راشدہ رفعت، قانتہ رابعہ کی ڈائجسٹ کے لیے جو دعا ہے اس میں ہماری آمین بھی شامل کر لیں۔ ہمارے نام کے صفحات بڑھائیں۔ خط اور آپ کے جوابات پڑھنے میں بہت مزہ آتا ہے۔

میری اپنی رائٹرز سے درخواست ہے کہ کہاں گئیں وہ کہانیاں جن کو پڑھنے کے لیے ہمیں گھر کے کونے کھدرے ڈھونڈنے پڑتے تھے کہ کوئی ہمیں پاگل نہ سمجھے کہ اکیلے میں قہقہے لگا رہی ہیں۔

ج آئیہ بہن! پروردگار سے دعا ہے کہ وہ آپ کو طویل اور ایمان افروز زندگی عنایت فرمائے۔ آمین اللہ ہماری بہنوں اور بچیوں کو دین کا صحیح فہم عطا فرمائے۔ اس سلسلے میں جو ہم سے بن پڑا وہ ہم نے کیا اور کرتے ہیں۔ اللہ ہماری کاوشوں کو قبول فرمائے۔ خطوط کا مسئلہ یہ ہے کہ تاخیر سے موصول ہونے والے خط شامل ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ مگر وہ ہماری نظروں سے بچے بنا ڈسٹ بن میں جا ہی نہیں سکتے۔ آپ کا خط ستمبر کے بالکل آخر میں موصول ہوا

ہے جب پرچا شائع ہونے جا چکا ہے۔ مگر دیکھیں اس نے اپنی جگہ کیسے بنالی۔ ہنستی مسکراتی کہانیاں تو ہمیں بھی بہت اچھی لگتی ہیں لیکن کیا کریں ہماری مصنفین زیادہ تر سنجیدہ کہانیاں ہی لکھ رہی ہیں۔

فائزہ شیخ۔۔۔ قلعہ دیدار سنگھ گوجرانوالہ

ہر قاری کے خط لکھنے کے پیچھے کہانی کچھ بھی ہو مگر محبت ضرور ہوتی ہے جب میں میٹرک میں تھی تو اس وقت ایک مباحثہ میں بڑی دلچسپ بات ہوئی خواتین کی تعلیم سے متعلق اندرون سندھ سروے کیا گیا تو ایک عمر رسیدہ خاتون

کوئل فاطمہ۔ چک ڈھلو نمبراً، گجرات

آج لکھنے پہ مجبور کر دیا ہے۔ آبی عمیرہ کے ناول ”آب حیات“.... اور نمبر آبی کے نمل نے ان دونوں کے سحر سے نکلنا ناممکن سی بات ہے.... اس کے علاوہ مکمل ناول ”محببتوں کا شہر“ راشدہ رفعت بہت زبردست رہا افسانوں میں سمیہ یا سمین کا میں ایک بیوی ہوں۔ ”ہاہاہا بہت زبردست تھا۔

”فریدہ فرید“ کا ”ناشناس دھوپ“ سیدہ من میں اتر گیا۔ فریدہ جی اللہ رب العزت آپ کو عزتوں محبتوں سے نوازے.... اس گاؤں کی پہلی لڑکی ہوں جو اس محفل میں شرکت کے لیے.... اتنا لبا سفر طے کر کے آئی ہوں۔ اردو ادب میں ماسٹر کر رہی ہوں۔ اس کے ساتھ ایک پرائیویٹ ادارے میں جاب بھی کر رہی ہوں ”نیچنگ جیسے اہم فریضے کو ادا کرتے ہوئے.... بہت دفعہ مشکل کا شکار بھی ہوئی.... تو یہ میرے سگی سائھی شعاع.... اور خواتین ہر موقع پہ میری الجھنیں سلجھاتے رہے۔ میں جانتی ہوں خط طوالت کا شکار ہو رہا ہے۔ مگر کچھ باتیں بہت اہم ہیں۔ آج کل یہ جو ہر نیوز چینل پہ.... پرائیویٹ اسکول والوں کی زیادتیاں دکھائی جا رہی ہیں.... یہ بہت ہی گمبیر مسئلہ ہے۔ کچھ لوگوں نے واقعی تعلیم کو بھی کاروبار بنا دیا ہے.... لیکن ان بڑے بڑے اداروں میں اپنے بچوں کو بھیجنے والے بھی اگر صرف تعلیم کو معیار سمجھیں تو آج بھی ایسے ادارے اور لوگ موجود ہیں۔ جو صرف اور صرف تعلیم اور بچے کو اہمیت دیتے ہیں۔ ناکہ روپے پیسے کو....

میں نے خود ایک پرائیویٹ ادارے سے بڑھا ہے.... اور ادھر ہی نیچنگ بھی کر رہی ہوں۔ میرا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے.... اس کے باوجود کبھی نہیں.... اور بے جانی کسز کی پریشانی نہیں ہوئی.... پی ایچ ڈی....

اساتذہ میسر ہیں اور رزلٹ بھی شہر کے بڑے بڑے.... اداروں سے اچھا مگر.... اتنے سالوں میں میں نے کبھی کسی نیوز چینل.... اور اخبار کو اس طرح کے سچے انسانوں کی.... حوصلہ افزائی کرتے نہیں دیکھا۔

یہاں میں خاص طور پر اپنی ٹیچر اور کولیک ”میم مقدس“ کا ذکر کرنا چاہوں گی.... میم آپ لوگوں کی دیوانی ہیں۔ ادارے کے سربراہ کی بیوی کی حیثیت سے وہ صرف رعب جمانے والی ہستی نہیں ہیں بلکہ ہر بچے کے ساتھ ان کی

سے گزر کر اسے حاصل کرتی ہیں اور پھر خط لکھنا اور اسے پوسٹ کروانا ایک اور ہی داستان ہے۔

یہ آپ لوگوں کی محبت ہی ہے جو ہمیں تازہ دم و توانا رکھتی ہے اور محنت پر اکساتی ہے۔ اللہ پاک ان محبتوں کے رشتوں کو ہمیشہ قائم رکھے۔ آمین

ام طلبہ۔ کراچی

کچھ یاد نہیں پڑنا کہ شاید چھٹی یا ساتویں جماعت میں تھی جب پہلی بار ڈاٹجسٹ بڑھا۔ پھر زندگی آگے بڑھتی رہی، تعلیمی مدارج طے ہوتے گئے زندگی کا نیا سفر شروع ہوا۔ میاں جی نے پہلے ہی ماہ سے پرچا لگوا دیا۔ آج شادی کو بھی 5 سال ہو گئے۔ دونوں بچے میرا ڈاٹجسٹ دیکھتے ہی کہتے ہیں ”مئی کی بک آگنی“ نہ چھوٹا تو خواتین کا ساتھ نہ چھوٹا۔

آج جس تحریر نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ وہ ہے نمبر احمد کی نمل۔ نمبر الفاظ کم پڑ گئے میرے پاس۔ کیا لکھا ہے اور خوب لکھا ہے اتنی عمدہ سوچ، قرآن کا اتنا گہرا مطالعہ اور اتنی اعلیٰ تفسیر بیان کرتی نظر آ رہی ہیں کہ واقعی لفظ نہیں ہیں تعریف کے لیے۔ کرداروں کا چناؤ، کہانی کی بنت اور اس کا تسلسل بہترین ہے، خاص کر وہ کڑیاں جو ایک دوسرے سے جا کر ملتی ہیں اس کا جواب نہیں اب اگر تنزیلہ ریاض کی تعریف نہ کی تو یقیناً ”زیادتی ہوگی۔ میں تھوڑا تاخیر کا شکار ہو گئی اس کے لیے معذرت۔ قاری ایک لمحے کو بھی کہانی کے سحر سے نہیں نکل پایا۔ نور محمد اہل گرانٹ، شہروز اور نیو جیسے کردار راستہ دکھاتے نظر آتے ہیں۔ بہتر سے بھی بہترین ناول ہے جو مدتوں یاد رہے گا شکریہ تنزیلہ ہم تک اتنا عمدہ ناول پہنچانے کا بہت اعلیٰ لکھا آپ نے۔

ج پیاری ام طلبہ! خواتین کی محفل میں آپ کو خوش

آمدید کہتے ہیں۔ آپ لوگ خط کی طوالت اور تاخیر سے مت گھبرایا کریں۔ ہم تو آپ لوگوں کی آراء اور تجاویز کے منتظر ہوتے ہیں۔ یہ الگ مسئلہ ہے کہ وہ شائع ہوں یا نہ ہوں۔ مگر ہم آپ لوگوں کے خطوط پڑھ کر آپ کی پسند نا پسند سے بھی آگاہ ہوتے ہیں اور پرچے کو مزید بہتر بنانے کے لیے کوشاں بھی۔ آپ کی ڈھیروں دعاؤں کا شکریہ اور ان قارئین بہنوں کا بھی جو مصروفیات یا بعض اوقات موقع نہ ملنے کے باعث خاموش ہی رہتی ہیں۔

شہناز اختر۔ لاہور

آج بہت سی باتوں نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ پہلے تو میں یہ بتاتی چلوں کہ میں جب میٹرک میں تھی اس وقت سے آپ کا جریدہ پڑھ رہی ہوں۔ یہ بات ہے 1973ء کی۔ اس سے پہلے میں حور۔ زیب النساء بچوں کی دنیا۔ کھلونا۔ تعلیم و تربیت پڑھتی تھی۔

میں نے رسالہ کوئی بھی ہو، خاص طور پر خواتین، شعاع سے بہت کچھ سیکھا۔ میں کتنی بھی پریشان ہوں۔ مطالعہ نہیں چھوڑا۔ مجھے زندگی میں بہت سے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا ہے میں ہمیشہ مشکل میں اللہ یعنی نماز اس کے بعد خواتین ڈائجسٹ پڑھتی تھی اور اللہ تعالیٰ اس طرح میری مدد فرماتے تھے کہ میرے حالات سے ملتی جلتی کہانی سامنے ہوتی تھی اور اس میں میرے لیے سبق ہوتا تھا۔ اشارہ ہوتا تھا۔

اب میری عمر 60 سال ہے لیکن خواتین اور شعاع میرے سائیڈ بیبل پر ہوتے ہیں، صرف رسالے ہی نہیں باقی اسلامی کتابیں بھی ہوتی ہیں۔

پہلے ناول، افسانے، ناولٹ بہت اچھے معیاری، مختلف ہوتے تھے اور ملک کے حالات کے مطابق کوئی نہ کوئی افسانہ یا ناول ضرور ہوتا تھا جیسے کہوٹہ کا واقعہ اس کا ذکر ایک ناولٹ میں تھا۔ سیاحین تو کارگل فوجیوں کی جرات پر، فلسطین کے بارے میں رائٹرز لکھتی تھیں۔ بہت عرصے بعد ایمان نے واپسی افسانہ لکھا ہے۔

رائٹرز کے ڈراموں کی طرف جانے سے ہم قاری اچھی رائٹرز کی تحریروں سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ نئی لکھنے والیاں بہت اچھا لکھتی ہیں۔ لیکن وہی ایک جیسی کہانیاں۔ سوتیلی ماں کے ظلم۔ ساس کے ظلم دوسری شادی وغیرہ۔

ایک بات اور لکھوں گی۔ سچی کہانی کے طور پر ایک کہانی ضرور ہونی چاہیے یا پھر جو پروفیشن ہیں جیسے نرسنگ۔ ایرہوسٹس ان کے مثبت کردار بھی ہیں۔ ان پر کسی رائٹر نے قلم نہیں اٹھایا۔

بہر حال بہت کام ہو رہا ہے۔ سب سلسلے بہت اچھے ہیں میں پہلے صفحے سے لے کر آخر تک پڑھتی ہوں اور رسالہ بہت احتیاط سے رکھتی ہوں۔ کیونکہ مجھے ان سے بہت پیار ہے۔ میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ صبر برداشت۔

ذہنی اور قلبی انیچمینٹ ہے۔ کافی لمبا ہو گیا ہے۔ نمرہ بخاری کو صدا دی جائے اور نعمان اعجاز، سہیل سمیر اور جاوید چودھری کا انٹرویو جلد کیا جائے۔

ج : پیاری کوئل! ہم آپ سے متفق ہیں۔ بہت سے تعلیمی ادارے ایسے ہیں جہاں بھاری فیس اور دیگر سرگرمیوں کے نام پر ہزاروں لاکھوں وصول کیے جاتے ہیں اور وہاں پڑھائی برائے نام ہوتی ہے۔ نام بڑا اور درشن چھوٹے ایسے ہی اداروں کے لیے کہا گیا جبکہ بہت سے تعلیمی ادارے خاموشی سے خدمت کر رہے ہیں خصوصاً "چھوٹے شہروں میں ایسے بہت سے ادارے ہیں جہاں بہت کم فیسوں کے باوجود تعلیمی معیار بہت اعلیٰ ہے جہاں تک چینل والوں کا تعلق ہے تو انہیں سیاست دانوں کو برا بھلا کہنے اور گالیاں دینے سے فرصت ملے تو کچھ اور دکھائیں۔ سمیہ یا سمین کی یہ پہلی تحریر تھی اور واقعی بہت دلچسپ تھی۔ ہمیں بھی بہت اچھی لگی۔ فریدہ فرید بھی بہت اچھا اضافہ ہیں۔ ان کی تحریروں میں الفاظ کا چناؤ اور انتخاب بہت خوب صورت ہوتا ہے۔ اگر انہوں نے کہانی پر توجہ دی تو یقیناً "ان کا نام بھی بہت اچھی مصنفین کی فہرست میں شامل ہو گا۔"

صائمہ بشیر۔ گجرات

"نمل" میں وہ لمحہ آہی پہنچا جب زمر اور حندل کر کام کریں گی۔ یعنی نمل ایک قافلہ بن ہی گیا۔ کیا اس قافلے میں شہرین بھی ہوگی؟ اس بات نے چونکے پر مجبور کیا کہ کیا ہاشم کی کوئی بہن بھی تھی یا ہے؟ کیا آسٹریلیا سے بیج لینے والی کہانی بھی سچی ہے؟ اگر ایسا ہے تو یہ بہت خوفناک حقیقت ہے۔ کیا واقعی ان کی وجہ سے اسلام آباد کا پانی کھارا ہو گیا؟ اف! برائے مہربانی آبدار کو سعدی کی ہیروئن مت بنائیے گا۔ کیونکہ سعدی تو ہم سب کا ہیرو ہے۔ خاص طور پر میرا۔ (ہاہاہا) اور اس کے علاوہ اس ناول کے بعد نمرہ کو روبرو میں ضرور لائیے گا۔ باقی ابھی پورا رسالہ نہیں پڑھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسالہ 8 یا 10 تاریخ تک ملتا ہے۔ ج : محترمہ صائمہ! یہ تو آپ ہم پر ظلم کرتی ہیں کہ ہم کو اپنے بصرے سے محروم رکھتی ہیں پورا جریدہ پڑھ کر ہمیں اطمینان سے خط لکھا کریں، خط شائع ہو کہ نہ ہو۔ ہم آپ کی رائے سے تو آگاہ ہو جائیں گے۔

پاک کی تفسیر پڑھ رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا ذوق و شوق قائم رکھے۔ کسی مصنف کی اس سے بڑھ کر کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی تحریروں سے کسی کو اجالوں کا روشنیوں کا راستہ ملے اور ہم پر بھی اللہ کا بڑا کرم ہے کہ ہم اس کا ذریعہ بنے۔

شبم شمشاد۔ یزمان

آج سے دو سال پہلے جب ”شعاع کے ساتھ ساتھ“ اور ”میری خاموشی کو بیاں ملے“ میں شرکت کی تب بادولت بی ایس سی کے طالب علم تھے اور آج اللہ کے فضل سے ایم ایس سی میٹھس کر چکی ہوں اور میٹھس میں ایم فل کرنے کا ارادہ کر رہی ہوں قصہ مختصر ان دو سالوں میں بہت کچھ ٹوٹ گیا، ختم ہو گیا۔ بہت سے خواب، بہت سے لوگ پیچھے رہ گئے۔ ان بھاگتے دوڑتے دنوں میں اگر کچھ نہ چھوٹا تو وہ شعاع و خواتین کا ساتھ ہے کبھی کبھی کچھ ایسا شائع ہو جاتا ہے جو معیار سے میچ نہیں کرتا پر خیر! نمرہ! نمل میں اتنے زبردست کردار، مکالمے اور سب سے بڑھ کے ہم سب کا پیار اسعدی! ان فیکٹ میرے پاس اس ناول پر بصرہ کرنے کے لیے الفاظ ہی نہیں ہیں۔

بج پیاری شبم! خواب ضرور دیکھنے چاہئیں اور ان کی تعبیر بھی حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے لیکن اگر وہ ٹوٹ جائیں تو غم نہ کریں، یقین رکھیں۔ کہ بہتری اسی میں تھی، جو ہم نہیں جان سکتے۔ وہ رب جانتا ہے اور وہ ہم پر ستر ماؤں سے زیادہ مہربان ہے۔ خواتین آپ کے ساتھ ہے تو اس سے بڑھ کر دوست کون ہو سکتا ہے۔

مریم انصاری۔ بہاول پور

رنگوں کی بہار لیے یہ گلہ تے میرے ہاتھوں میں آتے ہیں تو میری غم نصیب زندگی میں چند دنوں کے لیے بڑی خوشگوار تبدیلی آجاتی ہے گویا انتہائی مخلص دوستوں کا ٹولہ میرے پاس آ گیا ہے۔

عمیرہ احمد کا ”آب حیات“ آب حیات ہی ہے۔ ساثرہ رضا کی تحریر میں پانی کی سی روانی اور موسیقیت پائی جاتی ہے۔

نمرہ احمد ہمارے اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ، قانتہ رابعہ ہماری دنیا و آخرت کی بھلائی چاہنے والی۔ میں کس کس پیاری رائٹر کا ذکر کروں۔ یہ شمارے انتہائی جامع

اللہ سے محبت۔ بچوں کی تربیت گھر کا انتظام و انصرام۔ اور بہت کچھ۔

ج۔ شہناز بہن! سب سے پہلے تو آپ کا شکریہ کہ آپ نے ہمیں اتنا جامع اور مفصل خط تحریر کیا۔ یہ اور بات ہے کہ ہم پورا خط شامل نہ کر سکے۔ بے شک ہماری تمام قارئین (چاہے وہ ہم سے مخاطب ہوں یا خاموش رہتی ہوں) کی محبت ہی ہمارے لیے سب سے بڑا اثاثہ ہے اور ہم ان کی پسند و ناپسند کو مد نظر رکھ کر ہی شمارے کو ترتیب دیتے ہیں۔

جن موضوعات کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے ان پر کوئی اچھی کہانی لکھی گئی تو ضرور شائع کریں گے۔ ہم آپ جیسے چاہنے والوں کے ذوق کو مد نظر رکھ کر ایسی کہانیوں کو بھی ضرور شمارے میں جگہ دیتے ہیں جو حالات حاضرہ سے متعلق ہوں۔ اب جہاں تک ٹی وی میں جانے والوں کی بات ہے تو سمجھ لیں کہ ہمارا ادارہ لکھنے والوں کے لیے نرسری کا کام دیتا ہے۔ ان کی صلاحیتوں کو سامنے لانے اور انہیں پالش کرنے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے کہ ٹی وی کی وجہ سے ہم اچھی رائٹرز کی تحریروں سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہماری رائٹرز نے ٹی وی پر جانے کے بعد بھی ہمیں نہیں چھوڑا ہے۔ رخسانہ نگار عدنان، فائزہ افتخار، فرحت اشتیاق، عمیرہ احمد ٹی وی کے ساتھ ساتھ ہمارے لیے بھی لکھ رہی ہیں۔

دعاؤں کے لیے شکریہ اور آپ کے لیے بھی دعا گو ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بہت ساری خوشیاں دے آمین۔

علیہ عروہ۔ رتبہ

زندگی میں یہ ہمارا پہلا خط ہے اس کی وجہ صرف ”نمل“ ہے میری عمر ابھی چودہ سال ہے لیکن امی مجھے منع نہیں کرتیں نمرہ کا ناول پڑھنے سے اور ”نمل“ میں میرا پسندیدہ کردار فارس ہے۔ امی اور میری خالہ کا سعدی، اس بار نمرہ نے قرآن کی اتنی اچھی طرح تفسیر لکھی ہے۔ ہم کبھی قرآن کی تفسیر پڑھی ہی نہیں تھی اب ہم شوق سے قرآن اور تفسیر پڑھتی ہیں اور نمل کے بعد نمرہ احمد کا انٹرویو ضرور شائع کرنا چاہیے اور نمرہ حاجی پلینز ہاشم کو تڑپا تڑپا کے زندہ رکھنا۔

ج۔ عروہ اور علیہ اتنی کم عمری میں ماشاء اللہ آپ کی ذہانت قابل داد ہے کہ آپ نمرہ کی تحریروں میں چھپے پیغام کو سمجھ سکتی ہیں، قرآن فہمی کا شوق پیدا ہو گیا ہے اور قرآن

ہیں۔

کی طرف سے ہوتا ہے۔ کسی کی طرف سے بدگمانی یا یہ سوچنا فلاں نے مجھ پر جادو کر دیا ہے یہ بھی شیطانی دوسو سے ہیں۔

رحمانی وحی یہ ہے کہ مصیبت بر صبر کرنا یہ سوچنا یہ اللہ کی طرف سے ہے، کسی کی مدد کرنا، کسی کے کام آنا یہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔

ج :- پیاری مریم! اشارے تو جامع ہیں ہی، آپ کا خط بھی جامع ہے۔ غم نصیب اور مفلس تو وہ ہوتا ہے جس کا کوئی دوست نہ ہو اور یاد رکھیں اللہ انسان کا سب سے بہترین دوست ہے۔ اور پھر آپ کو تو شعاع اور خواتین ڈائجسٹوں جیسی مخلص رفاقت بھی حاصل ہے تو پھر کیا غم۔ دعا ہے کہ اللہ آپ کی زندگی کو بھی رنگوں اور خوشبوؤں سے بھر دے۔ (آمین)

Downloaded From
Paksociety.com

عقیقہ خیام۔ کراچی

اقراء شریف۔ چونیاں، مقصور

ڈھیروں دعاؤں اور پیار کے بعد ایک خوشی کی خبر سنائی ہوں کہ 13 اپریل 2015ء کو اللہ تعالیٰ نے مجھے دوسرے بیٹے سے نواز کے اپنی رحمتوں سے مزید مالامل کر دیا ہے۔

کل میں ایک شادی اینڈ کرنے گئی وہاں پر میری ایک کزن نے سلام دعا کے فوراً بعد مجھے کہا کہ عقیقہ تم نے

12 ربیع الاول کے بارے میں جو خط لکھا تھا، اس کے بعد سے ان لوگوں نے تمہارے خطوط شائع کرنے پر پابندی لگا دی ہے۔ تو یہ سب سن کر میں حیرت میں مبتلا ہو گئی کہ کیا

ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ جب اب حیات شروع ہوا تھا اس وقت پیر کامل کے حوالے سے میں نے ایک لمبا چوڑا خط لکھا تھا جو شائع نہیں ہوا جب میں نے ”پیر کامل“ پڑھا تھا تو اس کا آخری صفحہ پڑھتے ہوئے میرے دل سے بے ساختہ

دعا نکلی تھی کہ اے اللہ جس سے بھی میری شادی ہو، اس انسان نے یہ ناول ضرور پڑھا ہوا ہو اور آپ یقین مانیں،

میرے میاں نے زندگی میں صرف ایک ناول پڑھا ہے اور وہ ہے پیر کامل اور نہ صرف پڑھا ہے بلکہ اپنا خرید بھی ہوا تھا۔ میں نے تو قرآن و حدیث کے حوالے سے ایک مسئلہ

پوچھا تھا۔ کچھ عرصہ بعد ایک بہن نے میرے اس خط پر تنقید بھی کی تھی جسے میں نے کھلے دل سے قبول کیا تھا کہ اس پرچے پر جتنا میرا حق ہے اتنا ہی باقی قاری بہنوں کا حق

ہے، تو مانڈ کرنے کی تو تک ہی نہیں جتی۔ ج :- محترمہ عقیقہ خیام! خاطر جمع رکھیں۔ ہم نے آپ کی کسی بات کا برا نہیں مانا بلکہ اپنی کسی بھی قاری بہن کی کسی بھی بات کا برا نہیں مانتے۔ ان کی تنقید اور تجاویز کو کھلے دل سے سنتے ہیں

اور قابل عمل ہوں تو عمل کرتے بھی ہیں۔ خط شائع نہ ہونے کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ تاخیر سے موصول ہونا یا موصول نہ ہونا صفحات کی کمی آپ کی کزن نے یقیناً

آپ کو تنگ کرنے کے لیے ایسا کہا ہے ورنہ خود سوچیں جب آپ نے خط ہی نہیں لکھا تو شائع نہ کرنے کا کیا

آج پہلی بار خط لکھنے کی جرأت کر رہی ہوں جس کی ایک ذاتی وجہ ہے۔ مجھے نمبر احمد سے پوچھنا ہے کہ ہمارے دل میں وارد ہونے والے خیال ’شیطانی وحی‘ ہے یا رحمانی وحی

یہ ہم کیسے جج کر سکتے ہیں۔ نمبر احمد نے اکتوبر کی قسط ’میل‘ میں اس پر بات کی ہے مگر تفصیل نہیں بتائی بلکہ لکھا ہے کہ شریعت کے مطابق جج کرے۔ میں نے بہت کھوج لگائی مگر

ہر جگہ یہ وحی کی تفصیل محض انبیاء پر نازل ہونے والی وحی کی صورت میں ملی۔ ایک عام انسان کے دل میں جو خدا کی طرف سے پختہ خیال آئے مگر وہ پورا نہ ہو تو وہ وحی شیطانی

ہوگی یا کیا؟ آپ یقین کرے میری جان سولی پہ لٹکی ہوئی ہے۔ میں اپنے خدا سے بدظن ہو رہی تھی مگر یہ لائن پڑھنے کے بعد

کہ وحی شیطانی بھی ہو سکتی ہے۔ ”میرے ایمان میں دوبارہ جان پڑی میں نے ہر جگہ وحی کی تفصیل پڑھی مگر جواب نہ پاسکی کہ شریعت کے وہ کون سے اصول ہیں جن کے ذریعے

ہم اپنے دل میں آنے والی وحی کو جج کر سکیں کہ وہ شیطانی ہے یا رحمانی۔“

ج :- پیاری اقرار! جس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں منع کیا ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کام نہ کرنے کی تاکید کی ہے اور وہ کام وہ کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے ایسا کام، کرنے کا خیال کسی کے دل میں

آئے تو یہ شیطان کی طرف سے ہے۔ کسی کی طرف سے بدگمانی، کسی کا برا چاہنا، حسد، جلن، شیطان ایسے خیال میں ڈالتا ہے جبکہ کوئی اچھا کام کرنے کا خیال آئے تو یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

آپ نے پڑھا ہوگا، کچھ لوگ اپنے بچوں کو مار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ نے ان کو ویسا کرنے کو کہا تھا تو یہ شیطان

سوال۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر سوچانہ کریں اور اس بات کو ذہن میں رکھا کریں کہ یہ ”دنیا ہے“ جب مجھ سے ناٹا جوڑا ہے شعاع کا سلسلہ ہے۔ اس کے لیے علیحدہ خط لکھیں۔

حذیفہ۔ ہری پور

نمل کی قسط زبردست تھی۔ اس کے بعد بن مانگی دعا پڑھا شکر ہے معیذ احمد بیچ گیا اس کے بعد شہر آشوب پر نظر گرم کی اجیہ کی خوب صورتی نے متاثر کیا۔
ج حذیفہ! بہت شکریہ کہ آپ مصروفیت کے باوجود خواتین کے لیے ٹائم نکالتی ہیں۔ آپ نے سانحہ پشاور پر کہانی لکھی ہے۔ اس سانحہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس لیے معذرت۔ کسی اور موضوع پر لکھیں۔

حمیرا طاہر۔ کوٹ رادھا کشن قصور

خواتین ڈائجسٹ کھولتے ہی فہرست میں ”میں ایک بیوی ہوں“ سمیٹہ یا سمین میری توجیرت کی انتہا ہو گئی۔ جلدی سے صفحہ 125 کھولا تصدیق کی تو پتا چلا۔ یہ تو بیچ میں میری اس شفیق استاد کا افسانہ تھا جس نے میرے قلم کو بھی لکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کالج کے دن یاد آئے کہ کیسے کالج میگزین کا مواد اکٹھا کرتی تھیں۔ خواتین ڈائجسٹ کے سارے سلسلے بہت پیارے ہیں لیکن عمیرہ احمد کا ناول اس کی جان ہے۔ عمیرہ احمد میری پسندیدہ مصنفہ ہیں۔
ج۔ حمیرا! آپ کی استاد کا افسانہ واقعی بہت دلچسپ تھا۔ ہمیں بھی بہت پسند آیا۔

عمیرہ تک آپ کی تعریف پہنچائی جا رہی ہے۔

مریم۔ ہجو گاؤں

آپ یقین جانے کہ میری تربیت ہی ان ہی رسالوں نے کی ہے۔ آج میں جو بھی ہوں، مجھ میں جو خوبیاں ہیں طریقہ سلیقہ ہے۔ ادب و آداب مذہب سے لگاؤ۔ گروار کی مضبوطی ہے تو صرف اور صرف ان ہی سے ورنہ ہمیں کہاں احساس تھا کہ قرآن پاک کو اس طرح سے پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے جس طرح سے پیاری سی نمروہ جی نے ہمیں احساس دلایا۔ انہوں نے احساس دلایا کہ پردہ کرنا ضروری

ہے کیوں ضروری ہے ”کرن کرن روشنی“ نے ہر مسئلہ سے آگاہی فراہم کی تو یادگار لکھوں نے سوچ کے نئے زاویے تلاش کرنے کا عزم دیا۔

زندگی کے کسی موڑ پر کوئی الجھن سے تو کسی نہ کسی افسانے ناول، مکمل ناول سے رہنمائی کے لیے استفادہ کیا۔
ج پیاری مریم تاخیر سے موصول ہونے کے باوجود آپ کا خط اس لیے شامل کر رہے ہیں کہ آپ مطمئن ہو جائیں کہ ہمیں مل گیا ہے۔
خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

قارئین متوجہ ہوں!

- 1- خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔
- 2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔
- 3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔
- 4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔
- 5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔
- 6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
- 7- خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر جبری کروائیں۔

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



”گر بیجویت ہوں اور میرے بنیادی مضامین فلم اینڈ ٹیلی ویژن اور جرنلزم تھے۔“

8 ”بچپن کا کیا خواب تھا تعلیمی میدان میں؟“

”بچپن کے تو بہت خواب ہوتے ہیں۔ بننا انسان وہی ہے جو اس کے نصیب میں لکھا ہوتا ہے۔“

9 ”پہلی جاب؟“

”ہم ٹی وی اور میری یہ جاب مجھے میرٹ کی بنیاد پر ملی۔“

10 ”کون سا ڈراما وجہ شہرت بنا؟/ آن ایئر ڈرامے؟“

”ڈائجسٹ رائٹر آن ایئر میں ”اعتراض“ کھلونا میرے جیون ساتھی۔“

11 ”آپ کی صبح کا سورج کب طلوع ہوتا ہے؟“

”صبح 10 بجے سے تقریباً۔“

12 ”آنکھ کھلتے ہی پہلی خواہش؟“

”کہ آج کام یہ نہ جانا پڑے۔“

13 ”ملک کے کن لوگوں سے شکوہ ہے؟“

ڈائجسٹ رائٹر کے فنکار

کوہن شید ہے باتیں

شاہین رشید

”قوانین بنانے والوں سے کہ انہیں اپنا کام ایمانداری سے کرنا چاہیے اور جو قوانین بنائیں ان پر عمل بھی کروائیں۔“

14 ”فیملی ساتھ ہو تو؟“

”ہردن عید ہر شب شب برات لگتی ہے۔ انہی کے ساتھ تمام تہوار شوق سے مناتا ہوں ہر خوشی شیئر کرتا ہوں۔“

15 ”جسمانی ساخت میں کیا کمی محسوس کرتے ہیں؟“

”کچھ بھی نہیں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔“

16 ”بھوک میں آپ کا مزاج؟“

”چڑچڑاہو جاتا ہے۔“

17 ”ہفتے کا کون سا دن اچھا لگتا ہے؟“

”اتوار کا۔۔۔ کیونکہ چھٹی ہوتی ہے۔“

1 ”اصلی نام؟“

”گوہر رشید۔“

2 ”پیار کا نام؟“

”گوہر۔“

3 ”تاریخ پیدائش / شہر؟“

”2 مئی / لاہور۔“

4 ”اشار / قد؟“

”ٹورس / چھ فٹ۔“

5 ”بہن بھائی / آپ کا نمبر؟“

”ہم تین بہن بھائی ہیں / میرا نمبر آخری ہے۔“

6 ”شادی؟“

”ابھی اسٹیبلش ہونا ہے۔ ابھی ارادہ نہیں ہے۔“

7 ”تعلیمی قابلیت؟“

- 18 "کام سے فارغ ہو کر کہاں جانے کو دل چاہتا ہے؟"
- "کہیں نہیں صرف اور صرف گھر۔"
- 19 "خوشی کا اظہار کس طرح کرتے ہیں؟"
- "ہلا گلا کر کے۔"
- 20 "طبیعت میں کتنی ضد ہے؟"
- "کچھ بھی نہیں۔"
- 21 "دماغ کب خراب ہوتا ہے؟"
- "جب کوئی جھوٹ بولتا ہے اور غلط کام کرتا ہے۔"
- 22 "غصے میں اظہار کیفیت؟"
- "کوشش ہوتی ہے کہ بات ہی نہ کروں گھر سے چلا جاؤں مگر جب کوئی اکساتا ہے تو پھر ٹھیک ٹھاک اظہار کر دیتا ہوں۔"
- 23 "خواتین کی کیا بات اچھی لگتی ہے؟"
- "میرا خیال ہے کہ بہت زیادہ مخلص ہوتی ہیں۔"
- 24 "خواتین کی ایک بری بات؟"
- "کہ بات کا بہت بتنگزرتی ہیں۔"
- 25 "لڑکیاں آپ کو گھوریں تو؟"
- "میں اپنی نظریں نیچی کر لیتا ہوں۔"
- 26 "گھر میں ڈرتے ہیں؟"
- "امی سے کیونکہ ان کا غصہ تیز ہے۔"
- 27 "کسی بھی قسم کی لائٹری لینے کا شوق ہے؟"
- "نہیں۔۔۔ کبھی برا تڑبانڈ بھی نہیں لیے۔"
- 28 "کچھ وقت کے بعد ملایا وقت پر؟"
- "اللہ کا بڑا کرم ہے کہ جو کچھ ملا وقت پہ ملا۔ کسی چیز کے لیے انتظار نہیں کرنا پڑا۔ محنت کرنا گیا صلہ ملا گیا۔"
- 29 "جو اسٹاکاؤنٹ پسند ہے یا سنگل؟"
- "نہیں سنگل ہی ٹھیک ہے۔ اکاؤنٹ اپنا اپنا۔"
- 30 "پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟"
- "لاہور کی فوڈ اسٹریٹ بہت پسند ہے۔"
- 31 "خرچ کرتے وقت جیب پہ نظر ہوتی ہے یا ہاتھ پہ؟"
- "دونوں پہ۔۔۔ فضول خرچ نہیں ہوں مگر کنجوس بھی نہیں ہوں جہاں خرچ کرنا ہوتا ہے کر دیتا ہوں۔"
- 32 "آپ کے دنیا میں آنے کا کیا مقصد ہے؟"
- "میرے خیال میں یہی کہ میں دوسروں کے کام آسکوں۔ دوسروں کا بھلا کر سکوں۔"
- 33 "برا وقت جو گزارا ہو؟"
- "جب ریٹیکل لائف میں آیا اور پھر جب کراچی آیا تو کافی نف ٹائم دیکھا۔"
- 34 "کیا بات موڈ کو اچھا کر دیتی ہے؟"
- "کوئی اچھی خبر۔"
- 35 "بہترین تحفہ؟"
- "آپ کسی کے ساتھ سچائی اور ایمانداری سے پیش آئیں۔ یہ دوسروں کے لیے ایک بہترین تحفہ ہے۔"
- 36 "بستر سے اٹھنے میں کتنی دیر لگاتے ہیں؟"
- "سوچتا رہتا ہوں کہ بس ابھی اٹھوں کہ نہ۔"
- 37 "مخلص کون ہوتے ہیں؟"
- "اس کے لیے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جب آزمائش کا وقت آتا ہے تب ہی پتا چلتا ہے کہ کون مخلص ہے کون نہیں۔"
- 38 "چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتے ہیں؟"
- "نیملی کے ساتھ۔"
- 39 "لباس میں آپ کی پسند؟"
- "شلوار قمیص۔"
- 40 "اپنی شخصیت کے لیے کوئی دو لفظ؟"
- "گھر اور سچا۔"
- 41 "لڑکی ذہین ہو یا حسین؟"
- "ذہن۔"
- 42 "گھر میں کس کے پاس سکون ملتا ہے؟"
- "امی کے پاس۔"
- 43 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتے ہیں؟"
- "گھر والوں کے اور بہت ہی قریبی دوستوں کے۔"
- 44 "یوریت کس طرح دور کرتے ہیں؟"
- "کچھ پڑھ کر یعنی مطالعہ کر کے یا کوئی اچھی سی مووی دیکھ کر یوریت دور کرتا ہوں۔"
- 45 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائے؟"

- 57 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"
 "پہلے تھی مگر اب اتنی زیادہ نہیں ہے۔"
- 58 "کب آپ کا دماغ ساتویں آسمان پہ ہوتا ہے؟"
 "کبھی نہیں، کیونکہ اللہ کو غرور پسند نہیں ہے۔ تو میں کیسے مغرور ہو سکتا ہوں۔"
- 59 "ایک بات جو ہر وقت لبوں پہ رہتی ہے؟"
 "یا اللہ تیرا شکر ہے۔"
- 60 "وہی کھانے پسند ہیں یا؟"
 "وہی اپنے ملک کے کھانوں کی تو کیا ہی بات ہے۔"
- 61 "کون سا کھانا آپ بہت اچھا پکا لیتے ہیں؟"
 "کوئی بھی نہیں۔"
- 62 "عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرو؟"
 "آج کل تو مرد ہوتے ہیں۔"
- 63 "بہترین کک؟"
 "عورت۔"
- 64 "کس شخصیت کو اغوا کرنا چاہیں گے اور تو ان میں کیا وصول کریں گے؟"
 "کسی کو نہیں۔۔۔ بری بات۔"
- 65 "کس بات سے بہت ڈرتے ہیں؟"
 "کسی غریب اور مفلس کا دل دکھانے سے اور غیبت۔"
- 66 "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"
 "جی بالکل اندھی ہوتی ہے۔"
- 67 "کن کیڑوں سے گھن آتی ہے؟"
 "لال بیگ۔"
- 68 "شادی میں پسندیدہ رسم؟"
 "مندی۔"
- 69 "تحفہ یا کیش؟"
 "کیش دیں تاکہ وہ اس کو بہتر جگہ پہ لگا سکیں۔"
- 70 "ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟"
 "صرف اور صرف امی کے ہاتھ کا۔"
- 71 "ایک خواہش کہ؟"
 "کہ قائد اعظم سے ملوں اور بتاؤں کہ اپنے ملک کا حال

- "ہاں ہاں کیوں نہیں کئی بار۔"
- 46 "مہمانوں کی آمد؟"
 "اچھی لگتی ہے۔"
- 47 "اگر پاور میں آجائیں تو؟"
 "اس ملک میں جتنے بھی بے ایمان لوگ ہیں اور جو بھی پاکستان کے ساتھ مخلص نہیں ہیں اور بڑی بڑی سیٹوں پہ بیٹھے ہوئے ہیں انہیں ملک بدر کر دوں گا۔"
- 48 "کن چیزوں کا ذخیرہ ہے؟"
 "یادوں کا اور ان یادوں کو مزید یادگار بنانے کے لیے میں نے اپنی فیملی کی اور اپنے بہت ہی مخلص لوگوں کی تصاویر کی البم بنائی ہوئی ہے تو ڈھیروں تصاویر ہیں میرے پاس۔"
- 49 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
 "جو بلا وجہ کی ہو۔"
- 50 "انسان کی زندگی کا سب سے اچھا دور کون سا ہوتا ہے؟"
 "جب وہ اپنا فیوچر بنانے کے لیے جدوجہد کر رہا ہوتا ہے۔"
- 51 "وقت کی پابندی کرتے ہیں؟"
 "کوشش کرتا ہوں۔"
- 52 "کن لوگوں پر خرچ کرنے کو دل چاہتا ہے؟"
 "اپنے بھانجے بھانجیوں پر اور اپنے قریبی دوستوں۔"
- 53 "کبھی کچھ اپنے لیے بھی خریدا؟"
 "جی جی۔۔۔ لیٹ اپ خریدا۔"
- 54 "کھانے کے لیے بہترین جگہ چٹائی ڈائننگ ٹیبل یا اپنا بیڈ؟"
 "زمن پہ بیٹھ کر کھانے کا مزہ آتا ہے۔"
- 55 "کھاتے وقت سنت پوری کرتے ہیں یا چھری کاٹنے؟"
 "میں ہاتھ سے کھاتا ہوں سنت پوری کرتا ہوں۔"
- 56 "ایک مخصوص جگہ جہاں کھانا کھانا پسند کرتے ہیں؟"
 "گھر پہ اس سے بہتر جگہ کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔"

”بہت زیادہ ہے۔“

86 ”گرو میں بدلتے ہیں؟“

”جب نیند نہیں آتی تب۔“

87 ”سوئے وقت کیا چیزیں اپنے پاس لازمی رکھتا ہوں؟“

”پانی، ریموٹ اور دیگر ضروری چیزیں۔“

88 ”اللہ کی حسین تخلیق؟“

”ہر چیز حسین بنائی ہے اللہ تعالیٰ نے۔“

89 ”کھانے کی ٹیبل پہ کیا نہ ہو تو کھانے کا مزہ نہیں

آتا؟“

”میں پانی بہت پیتا ہوں۔ تو پانی نہ ہو تو کھانا نہیں کھا

سکتا۔“

90 ”محنت سے پیسہ ملتا ہے یا قسمت سے؟“

”پیسہ کمانا اس دنیا میں مشکل نہیں ہے۔ میں محنت کرتا

ہوں عزت کمانے کے لیے۔۔۔ قسمت کا بھی بہت عمل

دخل ہوتا ہے۔“

91 ”ڈاؤن ٹوار تھ رہے یا؟“

”بہت محنت کی تب یہ مقام پایا ہے۔“

92 ”کوئی گہری نیند سے اٹھاوے تو؟“

”تو بہت برا ہوتا ہے اس کے ساتھ۔“

93 ”اپنے گھر والوں سے کس چیز کا ایوارڈ لیتا چاہتے

ہیں؟“

”کسی چیز کا نہیں۔“

94 ”کسی کا دل نہ دکھے اس کا خیال رکھنے کے لیے

آپ کی حکمت عملی؟“

”تب میں جھوٹ بولتا ہوں۔ اس کو دکھ اور پریشانی سے

بچانے کے لیے۔۔۔ اور تسلیاں بھی دیتا ہوں۔“

95 ”اپنی شخصیت میں کیا چیزیں لانا چاہتے ہیں؟“

”کچھ نہیں۔۔۔ میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہوں اور بہت اچھا

بنایا ہے میرے رب نے مجھے۔“

96 ”کب اپنے آپ کو بہت فریش محسوس کرتے ہیں؟“

”فجر کی نماز کے وقت دن کا آغاز اچھا ہو تو سب کچھ اچھا

ہوتا ہے۔“

دیکھیں۔“

72 ”کتنی بار فون نمبر تبدیل کیا؟“

”ایک بار بھی نہیں۔۔۔ شروع سے ایک ہی ہے۔“

73 ”آپ کو فوبیا ہے؟“

”جی بالکل ہے کہ کہیں میں اپنے قریبی لوگوں کو نہ

کھو دوں میں انہیں کھونا نہیں چاہتا۔“

74 ”کیا چیزیں لازمی ساتھ رکھتے ہیں؟“

”گاڑی کی چابی والٹ اور سیل فون۔“

75 ”کارنامہ جو انجام دینا چاہتے ہیں؟“

”میں ایک بہت ہی اچھی فلم بنانا چاہتا ہوں۔“

76 ”پہچان کر کیا کہتے ہیں؟“

”تعریف ہی کرتے ہیں۔ تنقید بھی بہت پیار سے کرتے

ہیں۔“

77 ”پاکستان کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟“

”یہ پوچھیں کہ کیا نہیں کر سکتا۔“

78 ”اگر غلطی ہو جائے تو؟“

”تو اعتراف کر کے سوری کر لیتا ہوں۔“

79 ”آپ کی کوئی اچھی عادت؟“

”یہ تو دوسرے ہی بتا سکتے ہیں مگر میری ایک اچھی عادت

ہے کہ اگر کسی سے دوستی کرنا ہوں تو پھر کبھی نہ توڑنے کے

لیے۔۔۔ دوستی کو قبر تک ساتھ لے جانے کا قائل ہوں۔“

80 ”بری عادت آپ کی؟“

”بہت سی ایسی جگہوں پہ جہاں سچ نہیں بولنا چاہیے میں

سچ بول دیتا ہوں۔“

81 ”جھوٹ کب بولتے ہیں؟“

”جھوٹ ہی تو نہیں بولتا۔“

82 ”غصے میں پہلا لفظ؟“

”میں خاموش رہتا ہوں اور گھر سے باہر نکل جاتا ہوں۔“

83 ”دل سے سنتے ہیں یا دماغ کی؟“

”صرف دل کی سنتا ہوں۔“

84 ”کبھی کھانے پہ غصہ نکلا؟“

”ہاں۔۔۔ اکثر۔“

85 ”مذہب سے لگاؤ؟“



خبریں ویریں

واصفہ سہیل

کے موضوعات اور ایک ہی طرح کی فلموں کی وجہ سے بھی انڈسٹری تباہ ہوئی (اور اب۔؟)

قدم

لیجئے جناب! یہاں تو ہوا ہی یہ چل پڑی ہے کہ ٹی وی اداکارائیں فلم انڈسٹری پر بھی چھا جائیں اب سچل علی کیوں اس دوڑ میں پیچھے رہ جائیں سوانہوں نے بھی سلور اسکرین کی طرف قدم بڑھا دیے ہیں سننے میں آیا ہے کہ سچل علی نے ”عشق 2020“ نامی فلم سائن کر لی ہے۔ جس میں ان کی مقابل نیب بٹ کو مرکزی کردار کے لیے کاسٹ کیا گیا ہے۔ (ہم تو سچل کے لیے دعا ہی کر سکتے ہیں کیوں کہ نیب بٹ ایک فلاب فلم کے ہیرو ہیں تو ہمیں اس کا اثر سچل پر۔) اس فلم کی عکس بندی کراچی نار ان کاغان کے علاوہ آسٹریلیا میں بھی کی جائے گی۔

سنا ہے کہ کسی کے جانے سے کسی کے آنے کی نوید



دعوے

پاکستان فلم انڈسٹری کے اداکار معمر رانا کہتے ہیں کہ پروڈیو سر اپنی فلموں میں کام کرانے کے لیے ان کی ترلے، فٹیں کر رہے ہیں۔ (اور یہ بے چارے فلم کے بجائے ٹی وی ڈراموں میں کام کر رہے ہیں اور وہ بھی۔؟) فلم پروڈیو سر کو اب ترلے فٹیں کرنے کے بجائے معیاری فلمیں بنانا ہوں گی (یہ بات آپ کو ٹی وی میں کام کرنے کے بعد بتا چلی۔!) معمر رانا نے مزید کہا کہ ٹی وی کا ایکٹر کبھی بھی فلم اشار نہیں بن سکتا (اور فلم اشار اگر ٹی وی پر کام کرے تو وہ؟) میں بھی اب ٹی وی میں کام کر رہا ہوں لیکن یہ سچ ہے کہ لوگ فلم کے ہیرو کے لیے ٹکٹ خریدتے ہیں۔ جب وہ انہیں ٹی وی پر نظر آجائے گا تو انہیں کیا ضرورت ہے کہ وہ ٹکٹ خرید کر اسے دیکھنے جائیں۔ (اللہ رے خوش منہی۔!) معمر رانا نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ فلم انڈسٹری کی تباہی کے ذمہ داروں میں ان کا بھی کردار ہے۔ (اسے کیا کہتے ہیں۔ ڈھٹائی یا۔؟) ایک ہی قسم



Downloaded From
Paksociety.com

(عطاواالحق قاسمی۔ روزن دیوار سے)

☆ پاکستانی میڈیا دنیا بھر میں سب سے زیادہ ”باخبر“ ہے۔ جس بات کی خبر ساری دنیا کے میڈیا میں کسی کو نہیں ہوتی، یہاں ہوتی ہے۔ اسی لیے باقی دنیا میں کہیں پر یہ ”نقل“ نہیں ہے کہ عرب ممالک بے رحم اور بے حس ہیں کہ شامی پناہ گزینوں کی مدد نہیں کر رہے۔ پاکستانی میڈیا کو کون بتائے کہ پچاس لاکھ سے زیادہ شامی مہاجرین کو عرب ملکوں نے پناہ دے رکھی ہے۔

سودی عرب میں یہ گنتی سب سے زیادہ ہے۔ اس نے 25 لاکھ شامیوں کو نہ صرف پناہ دی ہے بلکہ ان کی ساری ضروریات بھی پوری کر رہا ہے۔ دس لاکھ سے زیادہ شامی لبنان اور کئی لاکھ اردن میں ہیں۔ اتنے ہی شامیوں نے ترکی میں پناہ لے رکھی ہے۔ یہاں ان کی حالت کچھ بہتر ہے لیکن سعودی عرب جیسی نہیں۔

(عبداللہ طارق سہیل۔ وغیرہ وغیرہ)

ایسے لوگ فوجی آدموں کے پسندیدہ ہوتے ہیں جو قوم کی توجہ بے کار لایعنی، بے معنی، بے مغز، فضول، کمتر، معمولی، جزوی، سطحی اور چھوٹی باتوں کی طرف مرکوز رکھتے ہیں اور آمر سکون سے حکومت کرتے رہتے ہیں۔

(ڈاکٹر ضیاء الدین خان)

☆ کاش منور رانا صاحب پاکستان آئیں اور دیکھیں یہاں مہاجر آرمی چیف بنتا ہے۔ مسلح افواج کا سپریم کمانڈر بنتا ہے سپریم کورٹ کا جج بنتا ہے۔ وزیر مشیر بنتا ہے۔ وہ لاہور کے دھرم پورہ میں آباد ہے۔ وہ پشاور کی لال کرتی میں بستا ہے، وہ کوئٹہ کے لیاقت بازار میں ملے گا، وہ سکھر، نواب شاہ، میرپور خاص میں ملے گا۔ اسے وہ جتنا کا کنارہ غلطی نہیں لگتی جہاں آپ کے اخلاق حسین کو صرف اس لیے مار دیا جاتا ہے کہ اس نے گائے کا گوشت کیوں کھایا تھا جہاں ایک مسلمان ڈرائیور کی جان اس لیے لے لی جاتی ہے کہ اس پر گائے بیچنے کا الزام ہے۔

(سیلانی۔ دیکھتا چلا گیا)

ہو گئی ہے ہم بات کر رہے ہیں نادیا خان کی۔ جی نادیا خان اب دوبارہ مارنگ شو کریں گی اس چینل کا جس چینل نے ”کسی کے“ آنے کی وجہ سے نادیا خان سے آنکھیں پھیر لی تھیں (بھئی شائستہ لودھی نا) اب جب وہ ”کسی“ کسی اور چینل پر چلی گئی ہیں تو انہیں اپنی ساکھ بچانے کے لیے پھر نادیا خان کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ اس مقصد کے لیے نادیا خان وہی سے کراچی شفٹ ہو گئی ہیں، سنا ہے کہ انہیں کمرشل اور ماڈلنگ کی آفر کے ساتھ ساتھ ٹی وی ڈراموں کی آفرز بھی ہو رہی ہیں (آہم۔ ہم، ہم، ہم۔ بھئی یہ ”کس“ نے اڑائی ہے کہ۔ تھوڑی کم کر لیں بھئی۔ کمرشلز، ماڈلنگ، ڈراما اور فلم۔؟ کمال ہے بھئی، ہم کو تو نہیں آپ کو ہے۔ بھئی بین۔ اور کیا۔؟)

کچھ ادھر ادھر سے

وزیر اعظم امریکہ کے دورے پر تھے، کوئی ملک اپنے وزیر اعظم کو اتنے وسوسوں کے ساتھ باہر روانہ نہیں کرتا، کیا بیدیاں تھا جو نہیں اگلا گیا۔ جولی وی اسٹیشن لگایا، لگا کہ ”آکاش وانی“ ہے۔ شو مٹی قسمت اب تو ایسے ایسے ریشٹرز قسم کے ماہرین اسکریٹوں پر جلوہ گر ہیں کہ دم گھٹنے لگتا ہے شاید یہ بے باندھ لیا گیا ہے کہ جتنا حکومت پر لعن طعن کرو کے اتنے ہی کامیاب۔

(امتیاز عالم۔ انگلیخت)

☆ کسی وزیر اعظم نے کبھی قومی مفاد کا سودا کیا؟ یادش بخیر، ہم کی بنیاد رکھی، بھٹو نے، دھما کا کیا نواز شریف نے، میزائل ٹیکنالوجی لائی بے نظیر اور پھر بھی مطعون ہوئے وزیر اعظم۔

(امتیاز عالم۔ انگلیخت)

☆ میں خان صاحب کو ایک مشورہ اور دینا چاہتا تھا، وہ مشورہ یہی ہے کہ وہ اپنے مخالف سیاست دانوں کو صرف کرپٹ کہا کریں۔ کرپٹ ترین نہیں کیونکہ جہاں گہر ترین ان کی پارٹی کے معزز رہنما ہیں۔ خان صاحب کو لفظوں کے استعمال میں احتیاط سے کام لینا

چاہیے۔

آپ کا باورچی خانہ

نبیلہ گلزار احمد

آنے لگے تو سوچی میں ملا دیں اور ایک منٹ بعد اتار کر
ٹرے میں پھیلا دیں۔ ٹکڑے تیار ہیں۔ اب ان کو چوکور

ٹکڑوں کی شکل میں کاٹ لیں۔

س:۔ صبح ناشتے میں آپ کیا بناتی ہیں ایسی خصوصی چیز کی
ترکیب جو آپ اچھی بناتی ہیں؟

ج:۔ صبح کے ناشتے میں چائے لازمی چیز ہے اور ہم پرائیڈ
بھی بناتے ہیں اور آلیٹ بھی۔ سردیوں میں سب حلوہ بھی
پسند کرتے ہیں تو وہ بھی تازہ بنایا جاتا ہے۔ ہم سب کو میٹھا
بہت پسند ہے۔ پر ہر چیز گھر کی۔

س:۔ آپ مہینے میں کتنی بار کھانا کھانے باہر جاتی ہیں۔

(1) جب کوئی لے جائے۔ (2) کسی کی سالگرہ پر (3) یا
کسی خوشی کے موقع پر

ج:۔ باہر کھانے کا رواج ہے پر اب ہم گھر ہی منگوا لیتے
ہیں اور سب فیملی ممبرز بھی آجاتے ہیں تو اچھا بنتا ہے۔ اور
تہواروں پر تو سب کے ہاں آنا جانا لگتا ہے تو گھومنا پھرنا
بھی ہو جاتا ہے۔ اور ملنا ملنا بھی جو پورا سال ہی رہتا ہے پر
ان خاص موقعوں کی بات ہی کچھ اور ہے۔

س:۔ اچھا کھانا کھانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟

ج:۔ میں کھانا ہمیشہ اچھے موڈ میں بناتی ہوں اور بناتی بھی
جب ہوں تو موڈ ہوتا ہے اور مجھے کھانا بنانے کا بہت شوق
ہے۔ اس لیے مختلف ڈشیں بھی بناتی ہوں جو خواتین
ڈائجسٹ میں شائع ہوتی ہے۔ اور سب کی داد وصول کرتی
ہوں۔

چاول بوائل کرتے ہوئے اس میں دھنیے کی ڈنڈیاں ڈال
دیں تو اچھی مہک آجاتی ہے۔

اور آخر میں اپنا تعارف میرا نام نبیلہ گلزار احمد ہے اور
میں نے بی کام کے پیپر زدے ہیں اور اب مجھے اپنے نتیجے کا
انتظار ہے۔



س:۔ کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی
ہیں پسندنا پسند غذائیت یا گھروالوں کی صحت؟

ج:۔ ہم کھانا پکاتے ہوئے صرف تیل کا خیال رکھتے ہیں
کیونکہ امی اس معاملے میں ذرا بھی کوتاہی برداشت نہیں
کرتیں اس لیے ہم آٹلی کھانا زیادہ نہیں کھاتے۔ صحت
بھی ٹھیک اور غذائیت بھی ساتھ ساتھ۔ ویسے کھانا پکاتے
ہوئے ڈیڈی کی پسند کا خیال رکھتے ہیں کیونکہ ڈیڈی اور
مجھے دونوں کو چٹ پٹے کھانے پسند ہیں۔

س:۔ کھانے کا وقت ہے؟ گھر میں اچانک مہمان آگئے
ہیں کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیار کر کے
تواضع کر سکیں

ج:۔ اچانک مہمان گھر آجائیں تو ہم گھبراتے نہیں
بزیاں گھر میں اتنی وافر مقدار میں آتی ہیں کہ ہم فوراً ان
کو ابال کر کباب، چائینز، چاول یا سالن میں ملا لیتے ہیں اور
میٹھا تو ہوتا ہی ہے اور امی بھی سالن بنالیتی ہیں۔ اور سوچی
کے ٹکڑے تو ہم لوگ بنا کے رکھتے ہیں اور مہمان بھی شوق
سے کھاتے ہیں۔ محنت لگتی ہے پر ذائقہ دار بھی بنتے ہیں۔

سوچی کے ٹکڑے

آدھا کلو	گھی
دو کلو	چینی
آدھا چھٹانک	ناریل
آدھا پاؤ	بادام
آدھا چھٹانک	چھوڑے
آدھا چھٹانک	کشمش
دو کلو	سوچی

ضروری اجزا :

سب سے پہلے گھی ڈال کر سوچی کو بھون لیں پھر الگ
پتیلی میں چینی میں شیرہ تیار کر لیں۔ سارے میوے دھو کر
باریک باریک کاٹ کر سوچی میں ڈال کر شیرہ میں جب تار

نومبر 2015

کے شمارے کی ایک جھلک

بہنوں کا شعاع

آینا ماہنامہ

نومبر 2015

کا شمارہ شعاع

ہو گیا ہے

Available On
Paksociety.com
To Download

- ۞ ”وہی راستے وہی منزل“ مریم عزیز کا مکمل ناول، ۞ ”جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے“ نیا سلسلہ،
۞ ”جام آرزو“ مہوش افتخار کا مکمل ناول، ۞ ”انور مقصود اور عمرانہ مقصود“ کا بندھن،
۞ نیلیہ عزیز کا سلسلہ وار ناول ”رقصِ بگل“، ۞ معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ”وسرک“،
۞ صائمہ اکرم کا ناول ”سیاہ حاشیہ“، ۞ خط آپ کے، مسکراہٹیں، آئینہ خانے میں، کھلتا کسی پہ،
۞ عنبرین ولی کا ناول ”میں اور تم“، ۞ موسم کے پکوان اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،
۞ ہماچودھری کا ناول ”دل کے بھید“، ۞ ”پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں“
۞ سمیرا حمید، مہناز یوسف، شازیہ جمال نیر، ۞ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم،
اور سویرا فلک کے افسانے،

شعاع کا شمارہ پڑھ کر اپنی رائے سے ضرور نواز لیں گے، ہم منتظر ہیں۔

شعاع کا نومبر 2015 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

READING
Section

موسم کے پکوانے

خالدہ جیلدانی

میدہ ڈال کر بون لیس، خوشبو آنے لگے تو دودھ اور مسٹرڈ پیسٹ شامل کر لیں اور گاڑھا ساس بنالیں۔ اس میں فرائی کیا ہوا گوشت ڈال کر دو، تین منٹ پکائیں۔ آخر میں کریم اور لیموں کا رس شامل کر کے فرائیڈ رائس کے ساتھ سرو کریں۔

مسٹرڈ پیسٹ بنانے کی ترکیب

ضروری اشیاء :

مسترڈ پاؤڈر
گیہوں کا آٹا
نمک
ٹائری
پسی چینی
پسی ہلدی
تیل
لہسن
پانی
سفید سرکہ

ایک کھانے کا چمچ
دو سے تین کھانے کے چمچے
آدھا چائے کا چمچ
ایک چٹلی
ایک چوتھائی چمچ
آدھا چائے کا چمچ
دو کھانے کے چمچے
آدھا چمچ (پسا ہوا)
آدھا کپ
ایک کھانے کا چمچ

ترکیب :

پہلے دو کھانے کے چمچے تیل گرم کر کے پسا ہوا لہسن ڈال کر بھون لیں۔ پھر اس میں ہلدی اور پسا ہوا میتھی دانہ (مسٹرڈ پاؤڈر) شامل کر کے اس میں گیہوں کا آٹا شامل کر دیں اور دو منٹ کے لیے پکائیں۔ پھر پانی، چینی، نمک اور ٹائری ڈال کر اچھی طرح ملا لیں۔ جب آمیزہ گاڑھا ہو جائے تو اس میں سرکہ ملا کر چولہا بند کر دیں۔ جب پیسٹ ٹھنڈا ہو جائے تو اسے صاف بوتل میں بھر کر فریج میں رکھ دیں۔

چکن چلیز سبزیوں کے ساتھ

ضروری اشیاء :

چائینز چکن یوساس و دھ فرائیڈ رائس

ضروری اشیاء :

مرغی کا گوشت
سیاہ مرچ پاؤڈر
سفید مرچ پاؤڈر
کارن فلور
تیل
دودھ
مکھن
میدہ
پانی
چائینز نمک
لہسن کے جوئے
لیموں کا رس
مسٹرڈ پیسٹ
کریم
فرائیڈ رائس

آدھا کلو
آدھا چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
ایک کھانے کا چمچ
حسب ضرورت
ایک کپ
دو کھانے کے چمچے
دو کھانے کے چمچے
حسب ضرورت
آدھا چائے کا چمچ
تین سے دو عدد
ایک کھانے کا چمچ
دو کھانے کے چمچے
آدھا کپ
حسب ضرورت

ترکیب :

چکن کا بون لیس گوشت لیں اور کیوب کی شکل میں کاٹ لیں۔ پھر گوشت دھو کر خشک کر لیں۔ ایک پیالے میں گوشت، نمک، ایک چمچ مکھن، کارن فلور، چائینز نمک، سفید مرچ پاؤڈر اور سیاہ مرچ پاؤڈر ڈال کر فریج میں ایک گھنٹے تک میرونیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔

فرائی پین میں تیل گرم کر کے اس میں لہسن کے جوئے ساتھ کر کے گوشت مل لیں اور پلیٹ میں نکال کر رکھ دیں۔

فرائی پین میں ایک چمچ تیل اور مکھن گرم کر کے

چکن چاؤ من

ضروری اشیاء :

آدھا کلو	چکن
تین کھانے کے چمچے	سویا ساس
ایک چائے کا چمچ	کارن فلور
ایک پیالی (باریک کٹے ہوئے)	ہری پیاز کے پتے
ایک ڈلی	پیاز
	(باریک لسانی میں کٹی ہوئی)
ایک چائے کا چمچ (پسی ہوئی)	کالی مرچ
ایک پھول	بند گو بھی
	(باریک لسانی میں کٹی ہوئی)
تین عدد	شملہ مرچ
	(باریک لسانی میں کٹی ہوئی)
ایک پیالی	پنہز سپراؤٹ
چار کھانے کا چمچے	تیل
دو عدد	چک کیوز
تین کھانے کے چمچے	سفید سرکہ
آدھا کھانے کا چمچ	میدہ
حسب ذائقہ	نمک
ایک چائے کا چمچ	چینی
ایک چائے کا چمچ (پسی ہوئی)	سفید مرچ
تین عدد (باریک کٹی ہوئی)	گاجر
ایک چائے کا چمچ (پسا ہوا)	اورک ہسن
ایک پیکٹ	نوڈلز
چند قطرے	تیل

ترکیب :

بغیر ہڈی کی چکن لے کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں۔ پھر اس میں سرکہ، سویا ساس، نمک اور کارن فلور ملا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ ایک بڑی دیگی میں خوب ڈھیر سارا پانی گرم کریں جب پانی کھولنے لگے تو نوڈلز ڈال دیں ساتھ میں ایک چمچ تیل ڈال دیں، جب نوڈلز گل جائیں تو چھلنی سے چھان لیں، فوراً ہی ٹھنڈے پانی سے نوڈلز کو اوپر نیچے کر کے دھو

آدھا کلو

چار عدد

چھ عدد (کیوز بنالیں)

دو عدد (کیوز بنالیں)

چار عدد (لمبی باریک کٹی ہوئی)

دو کھانے کے چمچے

ایک کھانے کا چمچ

حسب ذائقہ

چند قطرے

دو ڈلی (پرت الگ کر لیں)

دو عدد (گول قتلے کاٹ لیں)

ایک کھانے کا چمچ

دو کھانے کے چمچے

ایک چائے کا چمچ

ایک چائے کا چمچ

چار کھانے کے چمچے

چکن کشمیری مرچ
ہسن کے جوے

شملہ مرچ

ہری مرچ

سویا ساس

میدہ

نمک

تل کاتیل

پیاز

گاجر

کارن فلور

سفید سرکہ

سفید مرچ (پسی ہوئی)

چینی

تیل

ترکیب :

بون لیس چکن لے کر چھوٹی بوٹی بنوالیں۔ چکن بوٹی ایک جگہ پھیلا کر رکھیں اور کسی بھاری چھری سے ساتھ ہلکا ہلکا کچل لیں، پھر ہسن کے جوے، سویا ساس، سرکہ، سفید مرچ، چینی، نمک، میدہ اور کارن فلور ملا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ جب کھانے کے لیے پیش کرنا ہو تو ایک کڑاہی میں دو چمچے تیل ڈال کر گرم کریں، پھر میرہنٹ کی ہوئی چکن ڈال دیں، آج تیز کر دیں اور چکن کو ہلکا سا بھون لیں، پھر ایک پیالی پانی کارن فلور گھول کر چکن میں ڈال دیں اور چمچے چلاتے رہیں، گاڑھی ساس بن جائے تو چولہا بند کر دیں۔ اب ساری سبزیاں ایک پیالے میں ڈال کر سویا ساس، سرکہ، میدہ اور سفید مرچ ملائیں۔ ایک بڑے فرانسنگ پین میں باقی تیل ڈال کر گرم کریں۔ میرہنٹ کی ہوئی سبزیاں ڈال کر تیز آج پر اسٹر فرانی کر لیں، پھر چکن میں ڈال کر ملا لیں اور گرم گرم پیش کریں۔

READING
Section

یس اور ایک چائے کا چمچ تیل ملا دیں تاکہ توڈلز چیک نہ جائیں، ایک بڑی کڑاہی میں تیل گرم کریں۔ پیاز ڈال کر ہلکی گلابی کر لیں۔ سرکہ، نمک، کالی سفید مرچ، میدہ اور چینی ڈال کر پانچ منٹ تک بھون لیں، پھر نوڈلز ڈال کر مکس کریں اور بھنڈا سپراؤٹ اور پتے ڈال دیں اور گرم گرم کھانے کے لیے پیش کریں۔

اسٹرفرائی سبزیاں

ضروری اشیاء :

بند گوبھی
ہری پیاز
کھیرا
سویا ساس
چینی
سفید مرچ
لسن کے جوے
شملہ مرچ
مشرومز
گاجر
بھنڈا سپراؤٹ
دور سٹرشائز ساس
میدہ
سفید سرکہ
نمک
تیل
ترکیب :

ایک پھول (کیوزینا لیں)
چار عدد (پتے سمیت کٹی ہوئی)
دو عدد (گول قتلے کاٹ لیں)
دو کھانے کے چمچے
ایک چائے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ (پسی ہوئی)
چار عدد (باریک کٹے ہوئے)
تین عدد (کیوزینا لیں)
ایک ٹن
دو عدد (گول قتلے کاٹ لیں)
ایک پیالی
ایک کھانے کا چمچ
ایک کھانے کا چمچ
دو کھانے کے چمچے
حسب ذائقہ
دو کھانے کے چمچے

ضروری اجزا :

مرغی کی رانیں
سفید سرکہ
نمک
کالی مرچ پسی ہوئی
چینی
انڈے
(سفیدی زردی الگ پھینٹ لیں)
سویا ساس
شہد
چکن کیوب ملا ہو امیدہ
سفید مرچ پسی ہوئی
تلنے کے لیے تیل
ترکیب :

بارہ عدد (گہرے کٹ لگو لیں)
دو کھانے کے چمچے
حسب ذائقہ
آدھا چائے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ
چار عدد
دو کھانے کے چمچے
ایک کھانے کا چمچ
ایک کھانے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ
حسب ضرورت

سب سے پہلے مرغی کی رانوں کو گرم پانی سے دھو کر ایک پیالے میں ڈال کر میدہ، چینی، سرکہ، سویا ساس، شہد، کالی سفید مرچ، نمک اور زردی ملا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ جب تلنا ہو تو انڈوں کی سفیدی پھینٹ کر ایک ایک ڈرم اسٹک سفیدی میں ڈبو کر ہلکی آنچ پر ڈیپ فرائی کر لیں، جب گولڈن براؤن ہو جائے تو نکال کر نشوونما پر رکھ لیں تاکہ چکنائی جذب ہو جائے فوراً "چکنی بھر بیسن چھڑک دیں۔"



سرواق کی شخصیت

ماڈل ----- عشنا زکی
میک اپ ----- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی ----- موسیٰ رضا

گہلائی گھونٹ

زینب وحید کراچی

س : میں اپنی کہانی کہاں سے شروع کروں۔ چودہ سال کی تھی جب والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا میں اس وقت آنکھوں کلاس میں تھی والد کی چھوٹی سی کریبانہ کی دکان تھی۔ ان کی وفات کے بعد دکان بند ہو گئی آمدنی کا ذریعہ ختم ہو گیا۔ ہم چار بہنیں ڈو بھائی تھے۔ میں سب سے بڑی تھی۔ دو ماہ اسی طرح گزرے پھر ماموں نے دکان کرائے پر دے دی دکان میں بازار میں نہیں تھی۔ اس لیے کرایہ بہت کم تھا وہ بھی کبھی ملتا کبھی نہ ملتا۔ میں نے جیسے تیسے میٹرک کر لیا۔ اس کے بعد آگے پڑھنے کے لیے حالات اجازت نہیں دے رہے تھے۔ امی گھر پر تھوڑا بہت سلائی کا کام کرتی تھیں اس سے گھر کے اخراجات تو پورے ہو جاتے چھوٹے بہن بھائیوں کی تعلیم سب پڑھ رہے تھے۔ میں نے کالج میں داخلہ لینے کا خیال چھوڑ کر ملازمت تلاش کرنا شروع کر دی، لیکن صرف میٹرک پاس کو کیا ملازمت ملتی جس اسکول میں پڑھا تھا اس کی مالک میرے حالات سے واقف تھیں انہوں نے مجھے اسی اسکول میں کلرک کی ملازمت دے دی۔ تنخواہ بہت کم تھی، لیکن اس ملازمت سے کم از کم اتنا ضرور ہوا کہ دو چھوٹی بہنوں کی قیام معاف کر دی گئی وہ میرے ساتھ پڑھتی تھیں دونوں بھائی اور ایک بہن کو تو سرکاری اسکول میں داخلہ دلایا تھا۔ لیکن ان کا بھی کتابوں کا پیوں کا خرچہ تھا۔ میں اسکول کے بعد گھر جا کر خواتین کی ضرورت کی اشیاء فروخت کرتی۔ میں نے پرائیویٹ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا تھا، لیکن پڑھائی کے لیے بہت کم وقت ملتا، رات کو بستر پر جاتی تو تھک کر چور ہوتی، پھر بھی ہمت کر کے اٹھتی اور کتابیں کھول کر بیٹھ جاتی، میری محنت رائیگاں نہ گئی، انٹر کے امتحان میں کامیاب ہوئی تو میری ہمت بڑھ گئی، اس کے بعد پرائیویٹ لی اے بھی کر لیا۔ اسکول میں میری تنخواہ بڑھ گئی۔ میرا سپلائی کا کام بھی اچھا جا رہا تھا۔ گھر کے حالات بہتر ہو گئے تھے دونوں چھوٹی بہنوں نے بمشکل انٹر کیا پھر پڑھائی کو خیر یاد کہہ دیا، انہیں پڑھنے کا بالکل شوق نہیں تھا۔ میری عمر اٹھائیس سال ہو چکی تھی۔ امی چاہتی تھیں کہ میری شادی ہو جائے۔ کئی جگہ میرے رشتہ کی بات چلائی، لیکن جو بھی رشتہ آتا چھوٹی بہنیں بن سنور کر سامنے آ جاتیں اور وہ میری جگہ ان کو پسند کر کے رشتہ دے جاتے۔ امی نے جب ایک دو بار انکار کیا تو چھوٹی بہنوں کا منہ بن گیا۔ انہوں نے مجھ پر طنز کرنے شروع کر دیے۔ آخر میں نے امی سے کہا کہ آپ پہلے ان کی شادی کر دیں۔ امی راضی نہ تھیں، لیکن بہنوں کے تیور دیکھ کر انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ جو کچھ امی نے میرے لیے بنایا تھا۔ انہیں دے کر رخصت کیا۔ شادی کے لیے قرض لینا پڑا۔ جو میں نے کمپنیاں ڈال کر اتارا۔ چھوٹے بھائی نے انٹر کے بعد نیکیشن کا ڈپلوما لیا، وہ باہر جانا چاہتا تھا۔ اس نے مجھ سے پیسے مانگے۔ میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ بھائی نے کہا کسی سے قرض لے لیں میں ملازمت ملے ہی اتار دوں گا۔ خیر کسی نہ کسی طرح پیسوں کا انتظام کر کے بھجوا دیا۔ بھائی کسی ایجنٹ کے ذریعے غیر قانونی طریقے پر گیا تھا۔ پکڑا گیا۔ پانچ سال وہاں بیل میں رہا، پھر پاکستان واپس آیا تو شدید ڈپریشن کا شکار ہو چکا تھا۔ اب بھی کوئی کام نہیں کرتا، دوسرے بھائی نے بی اے کے بعد ایک کھاتے پتے گھرانے کی لڑکی سے شادی کر کے الگ گھر بسالیا۔ اس کے سسرال والوں نے اسے ملازمت بھی دلا دی۔ اس دوران امی کا انتقال ہو گیا۔ دونوں چھوٹی بہنیں بھی اب شادی کے قابل تھیں۔ بڑے، مائی تو ہمیں بھول ہی چکے تھے۔ چھوٹا بھائی کسی قابل نہیں تھا۔ ان کی شادی میری ذمہ داری تھی اب ان کی شادی ہو چکی ہے۔ میں تنہا ہوں ذہن کی کیفیت عجیب ہے اگر ہجوم میں بھی ہوں تو اپنے ارد گرد سناٹا، رہنمائی محسوس ہوتی ہے۔ کوئی کام

کرنے کو دل میں چاہتا۔ اسکول سے واپس آکر سو جاتی ہوں تو رات جاگتے گزرتی ہے۔ ذہن ماؤف ہوتا جا رہا ہے۔ نماز پڑھنے کھڑی ہوتی ہوں تو دعائیں بھول جاتی ہوں بار بار وضو کرتی ہوں۔ اسکول میں بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ پرانی نوکری ہے اس لیے کھل کر نہیں کہا لیکن وہ بے لفظوں میں مشورہ دیا ہے کہ مجھے آرام کی ضرورت ہے۔

مجھے لگتا ہے میری زندگی بے کار اور رائیگاں گزری ہے، میری عمر 45 سال ہے لیکن میں اپنی عمر سے دس سال بڑی نظر آتی ہوں۔

Downloaded From Paksociety.com

ج : آپ نے بہت مصروف زندگی گزارنی ہے محنت اور جدوجہد کی ہے۔ اسی وجہ سے کسی سے دوستی بھی نہ کر سکیں۔ بہن بھائی چھوٹے تھے کبھی ان سے بھی دل کی بات نہ کر سکیں۔ مصروف زندگی نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ کبھی اپنے لیے بھی کچھ سوچتیں، کوئی تفریح نہیں، کوئی خوشی نہیں، ایک مشین کی طرح اپنے فرائض کی انجام دہی میں لگی رہیں۔ اب سب بہن بھائی اپنے گھروں کے ہو چکے ہیں۔ خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں تو آپ کو اپنی زندگی بے مصروف معلوم ہوتی ہے۔ بلاشبہ آپ نے ایک مشکل زندگی گزارنی ہے، لیکن کیا یہ احساس باعث طمانیت نہیں کہ آپ کی وجہ سے بہت سی زندگیاں سنور گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس قابل کیا کہ آپ دوسروں کے لیے کچھ کر سکیں۔ یہ سوچ ہی غلط ہے کہ آپ کی زندگی رائیگاں گئی۔ آپ نے تو بہت کار آمد زندگی گزارنی ہے اور ابھی بھی بہت کچھ کر سکتی ہیں، آپ کی عمر زیادہ نہیں ہے اگر عمر سے زیادہ نظر آتی ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ نے کبھی خود پر توجہ نہیں دی۔ اپنے آپ پر توجہ دیں، اپنے لباس پر، بالوں پر، اپنی شخصیت پر، جب آپ میں ظاہری تبدیلی آئے گی تو آپ اپنے اندر بھی تبدیلی محسوس کریں گی۔ جو خول آپ نے اپنے گرد بنا رکھا ہے اس سے باہر نکلیں، کسی مخلص اور اچھی لڑکی سے دوستی کریں اور آپ اپنی شادی کے متعلق بھی سوچیں، آپ کو اب بھی کوئی اچھا رشتہ مل سکتا ہے، اپنی بہنوں سے بھی بات کر سکتی ہیں کہ وہ آپ کے لیے کوشش کریں۔ اب تک آپ نے ان کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اب ان کی باری ہے۔

Downloaded From Paksociety.com عائشہ احمد۔۔۔ راولپنڈی

یونیورسٹی میں میرے ساتھ ایک لڑکاف پڑھتا تھا۔ میری اس سے دوستی تھی۔ دوستی کب پسندنی اور محبت میں ڈھل گئی۔ پتا ہی نہیں چلا۔ دو سال ہم ساتھ رہے۔ ایم اے کے بعد گھر میں میری شادی کی بات چلی تو میں نے اسے بتایا۔ وہ اس وقت جا ب تلاش کر رہا تھا۔ اس نے کہانی الحال میں اس پوزیشن میں نہیں کہ گھر میں اپنی شادی کی بات کر سکوں، میں نے کہا تم صرف رشتہ بھجوادو، اپنے گھر والوں سے میں خود بات کر لوں گی۔ میں اس کے لیے انتظار کر سکتی تھی، لیکن اس نے مجھے ٹال دیا اور ایک دن مجھے بتائے بغیر ملک چھوڑ کر کنیڈا پہلا گیا، مجھے پتا چلا تو بہت دکھ ہوا، میں نے اس سے سچی محبت کی تھی۔ گھر والوں سے کیا کہتی، کس بنا پر شادی سے انکار کرتی۔ میرے پاس انکار کا کوئی جواز ہی نہیں تھا، گھر والوں نے ایک اچھا رشتہ دیکھ کر شادی کر دی۔ بظاہر میرے شوہر بھی ٹھیک ٹھاک تھے، ان میں کوئی خرابی نہ تھی لیکن ان کا مزاج عجیب و غریب تھا۔ با میں ہی سمجھ نہ پائی۔ انہیں خاموشی کے دورے پڑتے تو ہفتوں چپ رہتے، اگر اس دوران میں بات کرنے کی کوشش کرتی تو کاٹ کھانے کو دوڑتے۔ ان کے گھر والے بھی اس موڈ میں ان سے بات نہ کرتے۔ کوئی بچہ بھی نہ ہوا کہ مزاج میں تبدیلی آجاتی۔ مجھے بہت الجھن ہوتی۔ اسی طرح پانچ سال گزر گئے۔ ایک دن اچانک ف کافون آگیا۔ مجھے اس پر بہت غصہ تھا۔ میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میری شادی ہو چکی ہے، اب مجھے فون نہ کرے۔ اس نے کہا کہ صرف ایک بار مل لو لیکن میں نے غصہ میں فون بند کر دیا۔

ایک دن میرے شوہر اچھے موڈ میں تھے۔ میں نے ان سے ان کی خاموشی کے دوروں کی وجہ پوچھ لی۔ تب انہوں

نے بتایا کہ وہ کسی لڑکی کو چاہتے تھے لیکن وہ دوسرے مسلک سے تعلق رکھتی تھی اس لیے شادی نہ ہو سکی لیکن وہ آج بھی اسے بھول نہیں پائے ہیں۔ نہ ذہنی طور پر اپنی شادی کو تسلیم کر پائے ہیں۔ مجھے یہ سن کر ذہن کا سا لگا۔

ف نے مجھے فون کیا تو میں اس بار اس سے ملنے پر راضی ہو گئی۔ ہماری کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر میں اپنے شوہر کو چھوڑ دوں تو وہ مجھ سے شادی کر لے گا۔

ج۔ اچھی بہن! پانچ سال گزر گئے ڈیڑھ سال آپ کی متنگی رہی اس دوران اس کو ایک بار بھی آپ کی یاد نہیں آئی۔ باہر جانے سے پہلے اس نے آپ کو جانے کے متعلق بھی نہیں بتایا۔ خاموشی سے چھوڑ کر چلا گیا۔ اب واپس آیا تو اسے آپ کی یاد آئی۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کے شوہر سے آپ کو وہ توجہ اور محبت نہیں ملی جو آپ کا حق تھا لیکن آپ اس شخص پر بھی اعتماد نہیں کر سکتیں۔ زندگی ڈراما یا ناول نہیں ہے۔ شادی 'طلاق' دوسری شادی آسان نہیں ہے۔ آپ ایک شخص کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھی ہیں۔ آج اس شخص کی خاطر اپنا گھر توڑ دیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ آپ سے شادی کر لے گا یا شادی کر کے اسے نبھا بھی سکے گا۔ اس کے مزاج کو دیکھتے ہوئے بظاہر تو ایسا نہیں لگتا۔ بہتر یہی ہے کہ آپ اس سے رابطے منقطع کر لیں۔ وہ آپ کے ساتھ سنجیدہ نہیں ہے جہاں تک شوہر کے رویے کا تعلق ہے تو اب تک آپ ان کی ذہنی کیفیت اور خاموشی کی وجہ سے لاعلم تھیں۔ اب جبکہ آپ سب کچھ جان چکی ہیں۔ ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے آپ کو تھوڑی سی کوشش کرنا ہوگی پھر وہ سب کچھ بھول کر آپ کے ہو جائیں گے۔ خوابوں خیالوں کے سہارے کوئی کب تک جی سکتا ہے۔ ایک دن حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔

ح۔ حسین، حضور

س : میری دوست کے ساتھ یہ مسئلہ ہے کہ وہ اعتماد کے ساتھ بات نہیں کر سکتی اور اگر کسی کی طرف دیکھ کر بات کرے تو اس سے بات ہی نہیں ہوتی اور اس کا چہرہ زرد ہو جاتا ہے جیسے اس سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہو وہ اس طرح شرمندہ سی ہو جاتی ہے۔ وہ بہت پیار کرنے والی لڑکی ہے ہر کسی سے محبت سے پیش آنے والی لیکن اب پتا نہیں اسے کیا ہو گیا ہے بندوں سے چھپتی رہتی ہے جیسے کوئی جرم ہو گیا ہو۔ اس کا پتا کرنے کو سب سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے۔ وہ بہت پریشان ہے، وظیفے بھی کرتی رہتی ہے کچھ دن اثر ہوتا ہے تو بہت خوش ہوتی ہے لیکن تھوڑے دن بعد پھر اسی طرح ہو جاتی ہے۔ بی اے پاس ہے، ماحول بھی اچھا ہے لیکن تھوڑا سخت ماحول ہے کیا وہ سختی کی وجہ سے ایسی ہے۔

ج : بہت زیادہ حساس لوگوں کے ساتھ یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ ذہن بھی ہوتے ہیں۔ کوئی واقعہ پیش آجائے تو کوشش کے باوجود اسے بھول نہیں پاتے۔ وہ ان کے ذہن پر اس طرح نقش ہو جاتا ہے کہ ان کی پوری شخصیت بدل جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں انہیں گھنٹوں پریشان رکھتی ہیں، کسی نے سختی سے بات کی یا کوئی جملہ کہہ دیا۔ کسی نے انہیں نظر انداز کیا وہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتے رہیں گے۔

آپ کی سہیلی کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے لیکن پریشانی کی بات نہیں۔ آپ اس کی دوست ہیں اس کو سمجھاتی رہیں۔ آہستہ آہستہ اسے بولنے کی طرف راغب کریں۔ کسی جگہ جائیں تو اس کے ساتھ رہیں۔ اس کو لوگوں سے ملوائیں اور سب سے ہم بات یہ ہے کہ اس سے پوچھیں کہ کیا وجہ ہے جو وہ کسی کے سامنے بات نہیں کر سکتی۔ ممکن ہے اس کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہو جس نے اس کے ذہن پر اثرات مرتب کیے ہوں۔

وظیفے و وظائف چھوڑ دیں۔ بہت زیادہ وظیفے پڑھنے سے بھی ذہن متاثر ہوتا ہے۔



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

شکر، گڑ، شہد، مٹھائی، بند ڈبوں والے پھل، کھجور، پیسٹری، کیک، نان، ختائی، بیکری بسکٹ، چاکلیٹ، چیونگم، سوفٹ ڈرنک، تازہ پھلوں کے رس، گنا، شکر، قندی، انجیر، کشمش، جام، میٹھا دودھ، آئس کریم، اسکوالش، پڈنگ۔

غذا جو کم مقدار میں لے سکتے ہیں

روٹی، چاول، اسپیکٹھی، نوڈلز، دلیہ، دالیں، مکی، آم، کیلا، تریوز، سنگترہ، شریفہ، سیب، خوبانی، آلو بخارا، آڑو، پپیتا، امرود، چیکو، خربوزہ، چقدر، گاجر، شلجم، اروی، آلو، مونگ کی دال کی جڑ، مٹر، کھانے کا تیل، مارجرین، بڑے کا گوشت، تلی ہوئی اشیاء۔

غذا جو حسب مشاوری لے سکتے ہیں

بیسن، بھنڈی، پھول گو بھی، بند گو بھی، کدو، اروی کے تے، ہری مرچ، توری، سلاد، ککڑی، کھیرا، کریلا، بیگن، لیموں، سفید اور لال مولی، ہری، سوکھی پیاز، چھوٹا گوشت۔

عصمت... علی پور چٹھا

س: سردیوں کا آغاز ہوتے ہی میرے پیروں کی ایڑیاں پھٹنے لگتی ہیں جو نہ صرف تکلیف دیتی ہیں بلکہ پیر کالے بھی لگتے ہیں اور کام کرنا بھی دشوار ہوتا ہے۔ کوئی گھریلو نسخہ بتائیں کیونکہ مہنگے لوشن اور کریمیں میں نہیں خرید سکتی۔ گاؤں میں رہتی ہوں۔

ج: ایک بہت آسان نسخہ لکھ رہے ہیں۔ شلجم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں۔ انہیں ابال لیں۔ جب پانی نیم گرم ہو جائے تو اسے بالٹی یا نسلے میں ڈال لیں۔ آدھا چمچ نمک، ایک چمچ سرسوں کا تیل ڈالیں۔ دس منٹ تک پاؤں اس پانی میں رکھیں۔ پھر نکال لیں۔ پاؤں پھٹنا بند ہو جائیں گے۔



امت الصبور



ثانیہ نانہ... کراچی

س: ہمارے خاندان میں بہت سے افراد کو شوگر ہے۔ امی اور ابو بھی اس کا شکار ہیں۔ جب سے شوگر کا پتا چلا ہے امی نے شکر کا استعمال ترک کر دیا لیکن انہیں پھل بہت پسند ہیں۔ ابو بھی شکر کی حد تک تو پرہیز کر لیتے ہیں لیکن باقی چیزوں کے لیے نہیں مانتے۔ ہمارے منع کرنے کے باوجود وہ فریج سے نکال کر کھا لیتے ہیں۔ تنگ آکر ہم نے گھر میں پھل اور مٹھائی لانے کی ممانعت کر دی ہے۔ تب سے امی سخت ناراض ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا انہیں کیسے سمجھایا جائے۔

ج: ثانیہ! آپ کا سوال بیوی بکس سے تعلق نہیں رکھتا لیکن یہ بہت سارے لوگوں کا مسئلہ ہے۔ اس لیے ہم نے اسے بیوی بکس میں شامل کر لیا ہے۔ شوگر کا مرض پوری دنیا میں تیزی سے پھیل رہا ہے اور ہمارے ملک میں بھی اس کا تناسب بڑھتا جا رہا ہے۔ اس مرض کا جڑ سے ختم ہونا تو ممکن نہیں لیکن مناسب احتیاط اور تدابیر سے اس کو کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔

جہاں تک آپ کے امی، ابو کا تعلق ہے تو آپ نے ان کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ شوگر کے مرض میں کچھ پھل، سبزیاں ایسی ہیں جو کم مقدار میں کھائی جائیں تو نقصان نہیں ہوتا۔ البتہ کچھ چیزوں کی سختی سے ممانعت ہوتی ہے۔ ہم ایک چارٹ دے رہے ہیں جس سے آپ جان جائیں گی کہ کون سی چیزیں بالکل نہیں دینا چاہئیں، کون سی کم مقدار میں دے سکتی ہیں اور کون سی وہ چیزیں ہیں جو حسب خواہش لے سکتے ہیں۔